Thamarāt

Tawāṣī bi-ṣ-ṣabr.

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

پینسٹھواں وعظ مسمّٰی بہ

التواصی بالصبر

جزو دوم التواصی بالدین

منجملہ ارشادات حکیم الامّۃ حضرت مرشدی ومولائی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمائش جناب ناظم صاحب ادارہ المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک واشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شائع کیا

۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی ب

التواصی بالصبر وھو الجزو الثانی من التواصی بالدّین

اَین	کہاں ہوا	مکان چودہری نصیر الدین صاحب مظفر نگر۔
متیٰ	کب ہوا	شب ۶ شوال ۱۳۴۱ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ
کیف	کس ہیئت پر ہوا	جالسًا علی الکرسی۔
لِمَ	کیا سبب تھا	چودہری نصیر الدین صاحب کی درخواست پر ہوا
ماذا	کیا مضمون تھا	ایک دن پہلے تبلیغ اصول پر ایک بیان ہوا تھا اس بیان میں تبلیغ فروع کا طریقہ بتلایا گیا۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ نافع تھا	ہر طبقہ کو عمومًا
من ضبط	کس نے لکھا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی مقدار	تقریبًا ۳۰۰ مرد
الاشتات	متفرقات	مجمع مستورات بھی پردہ میں تھا جسکی مقدار معلوم نہو سکی

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم **اما بعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۝ والعصر۝ ان الانسان لفی خسر۝ الا الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۝ یہ وہی سورت ہے جسکی تلاوت شب گذشتہ میں کیگئی تھی اور اسکے متعلق ایک جزو کا بیان کیا گیا تھا۔ حاصل اُس کا

یہ تھا کہ اس سورت میں تبلیغ و دعوت الی اللہ کی ضرورت ثابت کیگئی ہے۔ اور اسکے دو جزو ہیں ایک دعوت الی الحق (بمعنی العقائد) اور ایک دعوت الی الصبر (بمعنی الاعمال) اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ہم ان دونوں میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ انہیں سے ایک جزو یعنی دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد کی طرف گذشتہ رات میں زیادہ روئے سخن تھا گو بیان مشترک ہی ہوا تھا مگر مقصود زیادہ تر یہی جزو تھا اور اسی کی تفصیل کیگئی تھی اسوقت ایک جزو تفصیل سے رہ گیا تھا یعنی قصداً اُس کا بیان نہوا تھا گو ضمناً اس کا بیان بھی کسیقدر ہوا تھا۔ اور وعدہ کیا گیا تھا کہ اگلی شب اگر خیریت رہی اور بیان کا موقعہ ملا تو دوسرے جزو کے متعلق قصداً بیان ہوگا سو یہ وقت ہے اس وعدہ کے ایفار کا۔ اسلئے اسوقت میں تبلیغ اعمال کے متعلق کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں سنئے ہماری حالت یہ ہے کہ جیسا تبلیغ اعمال کا اہتمام کرنا چاہیئے ویسا ہمکو اس کا اہتمام نہیں ہے بلکہ اسمیں بہت کوتاہی ہو رہی ہے جیسا کہ دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ اور جیسا ایک امر مانع ہو رہا ہے تبلیغ عقائد اور دعوت الی الایمان سے اسی طرح ایک امر مانع ہو رہا ہے تبلیغ اعمال سے .... اور وہ امر یہ ہے کہ ہمکو عادت ہو گئی ہے ترک دعوت الی الاعمال کی۔ اور اسکے مانع ہونیسے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یہ عادت عذر ہے کیونکہ جب میں اس کا لغو ہونا بیان کردوں گا تو اس سے عذر نہونا معلوم ہو جائیگا اور اسکے یہ معنی نہیں کہ ترک دعوت الی الاعمال کیلئے کوئی عذر فی نفسہ بھی نہیں۔ اگر اعذار شرعیہ موجود ہوں اور اُن کا تحقق ہو جائے تو اُسوقت ترک دعوت جائز ہے مگر اسوقت میں اُن اعذار شرعیہ کو بیان نکروں گا نہ بیان کی ضرورت ہے کیونکہ کسی عمل کے متعلق بیان اعذار کی ضرورت جب ہو کہ ہمکو اُس عمل کا اہتمام ہو اور جہاں مخاطب کو عمل ہی کا اہتمام نہو وہاں اعذار کو بیان نکیا جائے گا بلکہ اولاً اُس کو اہتمام عمل پر متوجہ کیا جائیگا جب وہ عمل کا اہتمام کرنے لگے اور عمل میں مشغول ہو جائیگا پھر اُسکو اعذار شرعیہ سے مطلع کیا جائیگا جیسے ایک شخص نمازی ہے نماز کو ضروری سمجھتا ہے اُسکی پابندی بھی کرتا ہے وضو کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور ہمکو معلوم ہے کہ وہ بیماری کی حالت میں بھی وضو کو ترک نہیں کرتا وہاں ضرورت ہے اعذار شرعیہ بتلانے کی کہ ان اعذار سے وضو ساقط ہو کر تیمم جائز ہو جاتا ہے تطہیر ثیاب معاف ہو کر ناپاک کپڑوں ہی سے

ف تبلیغ سے مانع امر

ف اعذار شرعیہ کے بیان کا موقع کہاں ہے

نماز درست ہو جاتی ہے استقبال قبلہ معاف ہو کر جس طرح بھی نماز پڑھ سکے نماز صحیح ہے اور قیام پر قادر نہو تو قعود سے اور قعود پر قدرت نہو تو اضطجاع سے نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں بیان اعذار کی ضرورت کا راز یہ ہے کہ اگر ایسے شخص کو اعذار نہ بتلائے جائیں تو اسکو اعتقادی اور عملی تنگی پیش آئے گی۔ اعتقادی تنگی تو یہ ہو گی کہ اسکو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا کے صدق میں وسوسہ اور شبہ ہو گا جو کہ زوال یا ضعف ایمان کا سبب ہے، اور عملی تنگی یہ پیش آئیگی کہ اگر اسکو تیمم کا قاعدہ نہ بتلایا گیا تو وہ عذر کے وقت مجبور ہو کر وضو ترک کریگا اور چونکہ وضو کو شرط سمجھتا ہے اسلئے بے وضو نماز پڑھے گا نہیں یہ عملی تنگی ہے۔ پس ایسے شخص کے سلامت ایمان اور سلامت اعمال کیلئے ضروری ہے کہ اسکو اعذار شرعیہ کے احکام سے مطلع کیا جائے اس سے اس کا ایمان تو سلامت رہیگا کہ اسکو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا کے صدق میں وسوسہ نہو گا۔ اور عمل یوں سلامت رہے گا کہ وہ کسی عذر کے وقت عمل کو فوت نکرے گا۔ غرض بیان عذر کی ضرورت وہاں ہو گی جہاں مخاطب ضرورت عمل کا قائل ہو اعتقاداً بھی اور عملاً بھی پھر اسکو کسی موقعہ پر تنگی پیش آتی ہو بخلاف اسکے جو ابھی نفس عمل ہی کی ضرورت کا قائل نہیں وہ تو اعذار کو سنکر ترک عمل کا بہانہ ڈھونڈیں گے اور کھینچ تانکر اپنے کو معذوروں کی فہرست میں داخل کرینگے پس اگر ہم یہ دیکھتے کہ ہملوگ امر بالمعروف کا اہتمام پوری طرح کرتے ہیں تو اسوقت البتہ بیان احکام اعذار کا موقع تھا۔ اور جب اس کا اہتمام ہی نہیں چنانچہ عملاً اہتمام نہونا تو مشاہد ہے اور اعتقاداً بھی بعض لوگ اسکی ضرورت کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے جیسا کہ قرائن احوال اسپر شاہد ہیں تو ایسی حالت میں تو اعذار کو سنکر ہر شخص ترک امر بالمعروف کا بہانہ ڈھونڈیگا اور کوئی بھی اپنے کو عذر سے خالی نہ سمجھے گا اور اس فریضہ کو اپنے اوپر سے بالکل ساقط کر دیگا حالانکہ ایسا کونسا عذر ہے جس سے فرض بالکل ہی ساقط ہو جائے۔ دیکھو نماز و وضو کیلئے بھی بعض عذر ہیں مگر وہ ایسے نہیں جنسے وضو اور نماز بالکل ہی ساقط اور معدوم ہو جائے مگر جس عمل کا اہتمام ہی قلب میں نہو اسکے اعذار کو سنکر مخاطب عذر کے میدان کو اتنا وسیع کر لیتا ہے کہ فرض کو بالکل ہی ساقط کر دیتا ہے تو ایسے شخص کو اعذار سے ہنوز مطلع نکیا جائیگا اسی لئے میں نے رات بھی عذر کو بیان نہیں کیا بلکہ یہ عرض کیا تھا کہ حالتیں دو قسم کی ہیں ایک تو یہ کہ ہم کام کو اپنے ذمہ ضروری سمجھ

پھر عذر سے تنگی پیش آئے اور ایک حالت یہ ہے کہ کام ضروری ہی نہ سمجھے تو جن اعمال کو ہم اپنے
ذمہ ضروری سمجھتے ہیں جیسے نماز وضو وغیرہ اُن میں عمل کو شروع کرنیکے بعد عذر سے سوال ہوتا ہے
اور جنکو اپنے ذمہ ضروری نہیں سمجھتے اُن میں قبل از عمل ہی عذر سے سوال کیا جاتا ہے تو مجیب کو
لازم ہے کہ پہلی صورت میں تو اعذار کو بیان کرے اور دوسری صورت میں بیان نکرے۔
لہٰذا اسی اصل کے موافق میں اسوقت بھی اعذار کو بیان نہیں کرتا بلکہ تبلیغ اعمال کی ضرورت
پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں۔ رات میں نے تبلیغ ایمان یعنی دعوت الی العقائد سے مانع یہ بتلایا تھا
کہ اس تبلیغ میں مبلغ مخاطب کو ایسے امور سے باز رکھنا چاہتا ہے جو اُسکے زعم میں دین اور طاعات
ہیں جس سے اُسکو ناگواری ہوتی ہے اور اس ناگواری کے خیال سے مبلغ کھٹکتا اور تبلیغ سے
رکتا ہے اسکا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ اول تو عنوان تبلیغ کا ایسا ہونا چاہئے جس سے مخاطب کو
ناگواری نہو اور وہ عنوان قرآن ہی نے ہمکو بتلا دیا ہے کہ عقائد کو اخبار صادقہ کے عنوان سے
بیان کرو اور جو شخص اس سے بھی ناگواری کرے تو اسکی پروا نکی جائے۔ نیز میں نے یہ بھی کہا تھا
کہ اسی ناگواری مخاطب کی وجہ سے تبلیغ عقائد کو مقدم کیا گیا۔ اور تواصی بالعمل کو مؤخر کیا گیا لیکن
اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تبلیغ اعمال فی نفسہ مہتم بالشان نہیں کیونکہ اگر یہاں ایک وجہ اضافی
قلت اہتمام کو مقتضی ہے تو دوسری وجہ شدت اہتمام کو بھی مقتضی ہے وہ شئے یہ کہ بلاغت کا قاعدہ
یہ ہے کہ کلام کو جس بات پر ختم کیا جاتا ہے وہ مہتم بالشان اور زیادہ مقصود ہوتی ہے چنانچہ اہل
بلاغت اسکو خوب جانتے ہیں اسی لئے بلغار کا قاعدہ ہے کہ وہ کلام کو اول و آخر میں زوردار
کرتے ہیں کیونکہ ابتدا بھی مقصود سے کیجاتی ہے اور انتہا بھی مقصود پر ہوتی ہے۔ تو اب یہاں
دو جزو ہیں جنمیں ایک جزو کا اہتمام تقدیم سے ظاہر کیا گیا دوسرے جزو کا اہتمام ختم کلام پر واقع
کرنے سے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ جس چیز پر کلام ختم کیا جاتا ہے وہ مخاطب کے ذہن میں باقی رہ جاتی ہے
اسلئے ختم کلام پر مقصود اہم ہی کو بیان کیا جاتا ہے پس قرآن کی عجیب بلاغت ہے کہ اُس نے
دونوں اجزار کا مہتم بالشان ہونا دو طرز سے ظاہر کر دیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ دو چیزوں کا ایک درجہ میں
مہتم بالشان ہونا تو بعید ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک درجہ میں مہتم بالشان
نہیں کہتے بلکہ تبلیغ عقائد کی اہمیت اسلئے ہے کہ وہ اصل ہیں اسی لئے اُن کی اہمیت کو تقدیم

اعمال کے مہتم بالشان ہونے کی دلیل بلاغت

سے ظاہر کیا گیا (فان الاصل مقدم علی الفرع) اور اعمال کی اہمیت ایک اعتبار خاص سے ہے وہ اعتبار خاص یہ ہے اور یہ حقیقت میں وجہ اول ہی سے ناشی ہے کہ جو لوگ عقائد کو اصل سمجھکر مہتم بالشان سمجھتے ہیں وہ اعمال کو فرع سمجھکر اُن کا اہتمام بالکل ترک کر دیتے ہیں اور اتنا اہتمام بھی نہیں کرتے جتنا فرع کا ہونا چاہیئے پس یہ لوگ عقائد ہی کو ضروری سمجھتے ہیں اعمال کو ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ تعریف میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے عقائد بہت اچھے ہیں۔ اس تعریف کو کافی سمجھتے ہیں اور صحت عقائد کے بعد اسکے اعمال پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اسی لئے اعمال کے متعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی نہیں کرتے بلکہ غضب یہ ہے کہ اعمال کی کوتاہی کو منکر بھی نہیں سمجھتے۔ ہمنے مانا کہ عقائد کا اچھا ہونا بڑی بات ہے اور یہ بھی بجائے خود قابل مدح ہے مگر سوال یہ ہے کہ اعمال کو غیر ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے اور اُنمیں کوتاہی کرنے کو نقص کیوں نہیں سمجھا جاتا اگر آپ کہیں کہ اعمال فرع ہیں تو میں کہتا ہوں کیا فرع کے نقصر سے شئے میں نقص نہیں آتا دیکھیے آپ ایک درخت امرود کا لگائیں جسکا بیج الہ آباد سے عمدہ امرودوں کا بڑے اہتمام سے انتخاب کر کے منگایا گیا تھا مگر آپ کے باغ میں آکر اس عمدہ بیج سے درخت تو بہت بڑا لگ گیا لیکن پھل ایک بھی نہ آیا تو کیا اس صورت میں آپ اپنے دوستوں کے سامنے خوش ہو ہو کر اس درخت کی یوں تعریف کرینگے کہ یہ بڑا قیمتی درخت ہے اس کا بیج بہت عمدہ الہ آباد کے نفیس امرودوں میں سے ہے یا افسوس کے ساتھ یوں کہیں گے کہ اس کا بیج بڑے اہتمام سے منگایا گیا تھا مگر افسوس اس نے پھل نہیں دیا اور اگر اتفاق سے پھل بھی آیا مگر الہ آباد جیسا شیریں نہوا بلکہ معمولی امرودوں سے بھی بدتر نکلا تو اس صورت میں ہرگز آپ بیج کی تعریف کر کے اپنا جی خوش نکرینگے بلکہ سخت رنج و افسوس کے ساتھ یہ کہیں گے کہ بڑی مشقت سے میں نے اسکے لئے الہ آباد سے عمدہ بیج منگایا تھا مگر ساری محنت ضایع گئی پھل بالکل خراب نکلا۔ میرا مقصود اس مثال سے یہ ہے کہ آپ دنیوی امور میں محض اصل کی عمدگی کو مدح کیلئے کافی نہیں سمجھتے بلکہ اسکے ساتھ فرع کی عمدگی پر بھی نظر ہوتی ہے پھر دین کے معاملہ میں کیا وجہ ہے کہ صرف عقائد (واصول) کی عمدگی پر نظر کیجاتی ہے اور اسی کو مدح کیلئے کافی سمجھتے ہیں اعمال (وفروع) کی عمدگی پر کیوں نظر نہیں کیجاتی اور اس کے نقص سے افسوس کیوں نہیں

کیا جاتا۔ اور اس افسوس کا اثر آپ میں کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔ دیکھئے اگر ایک شخص کا چہرہ حسین ہے مگر ہاتھ پیر بھدّے ہیں یا انگلیاں ٹیڑھی ہوئی ہیں تو ہرچند کہ حسن میں چہرہ ہی کا حسن اصل ہے مگر یہ نہیں کہ ہاتھ پیر کا اعتدال مطلوب نہ ہو گو اس سے آپ کو اتنی نفرت نہ ہوگی جتنی اس شخص سے ہوتی ہے جس کا چہرہ بھی بدشکل ہے مگر ظاہر ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پیر (جو فرع ہیں ۱۲ منہ) اور انگلیاں بھی حسین ہوں اور چہرہ بھی حسین ہو اسکی طرف زیادہ میلان ہوگا۔ اور پہلے شخص کے حسن کی تعریف کرتے ہوے جب آپ یہ کہیں گے کہ چہرہ آنکھ ناک بڑی خوبصورت ہے ساتھ ہی یہ بھی کہیں گے کہ مگر افسوس اس کا ہے کہ اسکی انگلیاں ٹیڑھی ہوئی ہیں اگر یہ نقص نہ ہوتا تو بہت ہی حسین ہوتا۔ اب بتلائیے کہ اسی طرح حسن دین میں فساد فروع یعنی فساد اعمال کو آپ منکر کیوں نہیں سمجھتے اور ایسے شخص سے آپکا دل کیونکر ملتا ہے جو فروع ایمان میں ناقص ہے اس سے بلا تکلف دوستی کس طرح کیجاتی ہے حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من رائی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فمن لم یستطع فبلسانہ فمن لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان (او کما قال) کہ جو کوئی تم میں سے امر منکر کو دیکھے تو اسکو ہاتھ سے مٹائے یا زبان سے یا دل سے یہ مقتضا ہے امر منکر کا شرعًا پھر یہ کیا غضب ہے کہ ہم لوگ امر منکر کو دیکھکر نہ ہاتھ سے روکتے ہیں نہ زبان سے نہ دل سے نفرت کیجاتی ہے۔ بلکہ اعمال میں کوتاہی کرنیوالوں کی ساتھ وہی بشاشت ہے وہی دوستی ہے جیسے کامل الایمان کے ساتھ ہوتی ہے گویا آپ خدا تعالےٰ کی طرف سے وکیل ومختار ہیں کہ جس چیز کو چاہیں معاف کردیں اور جس منکر سے چاہیں قطع نظر کرلیں تو بات یہ ہے کہ لوگوں نے عقائد کی اہمیت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے وہ یہ سمجھ گئے کہ اہمیت عقائد کا مطلب یہ ہے کہ اسکے بعد اصلاح اعمال کی ضرورت ہی نہیں اور یہ بالکل غلط ہے اسلئے اس اعتبار خاص سے اعمال زیادہ مہتم بالشان ہوگئے اسواسطے یہاں کلام کو تواصی بالاعمال کے ذکر پر ختم کیا گیا تاکہ اس طرز خاص سے مخاطب کو معلوم ہوجائے کہ گو اعمال عقائد سے ذکر میں مؤخر ہیں مگر ختم کلام پر مذکور ہونے سے اُنکی اہمیت بھی مطلوب ہے، اور وہ بھی مہتم بالشان ہیں۔ سو یہ اتنی تو ضروری چیز مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اعمال کی طرف سے ہم بہت بیفکر ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ عقائد اصل ہیں اور اعمال فروع مگر میں بتلا چکا ہوں کہ فروع بھی مطلوب ہوتے ہیں اور اُن کے انعدام یا نقصان سے اصل میں بھی نقصان آجاتا ہے جیسا کہ اوپر مثالوں میں واضح کیا گیا۔

دوسری دلیل

دوسرے نصوص قرآنیہ میں غور کرنیسے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کی تعلیم سے تکمیل اعمال بھی مقصود ہے یعنی عقائد کی تعلیم اسلئے بھی کیگئی ہے کہ اُن سے اعمال میں کام لیا جائے۔ اسکی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ما اصابکم من مصیبۃ فی الارض ولا فی السماء الا فی کتب من قبل ان نبرأھا ان ذلک علی اللّٰہ یسیر۔ (ترجمہ) تمکو جو کچھ بھی مصیبت ارضی یا سماوی پہونچتی ہے وہ سب مقدر ہو چکی ہے قبل ازیں کہ مصیبت کو پیدا کریں (اور چونکہ خدا تعالیٰ کا علم کامل ہے اسلئے بیشک یہ بات خدا کیلئے آسان ہے (کہ وہ ظہور سے پہلے مصائب وغیرہ کو مقدر کردیں) اسکے بعد فرماتے ہیں لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم (یہ مضمون تمکو اسلئے بتلایا گیا) تاکہ تم کسی فوت شدہ چیز پر غم نکرو اور حاصل شدہ پر اتراؤ نہیں۔ یہ تعلیل ہے ماسبق کی جس کا تعلق اخبرناکم بذلک مقدر سے ہے یعنی ہمنے تمکو اس مسئلہ کی تعلیم اسلئے کی تاکہ تم مغموم نہو اور اتراؤ نہیں۔ اب غور کے قابل یہ امر ہے کہ لام کے غایت کے واسطے لایا جاتا ہے۔ اور اوپر مسئلۂ تقدیر کا ذکر ہے تو اسکی علت وغایت دوسری آیت میں بتلائی گئی ہے مطلب یہ ہوا کہ ہمنے تمکو مسئلہ تقدیر اس لئے تعلیم کیا ہے کہ جب تم اسکے معتقد ہوگے تو تمکو حزن وفرح نہو گا۔ اور مسئلۂ تقدیر کا یہ اثر مشاہد ہے جو لوگ تقدیر کے معتقد ہیں وہ مصائب و حوادث میں منکرین تقدیر سے زیادہ مستقل اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کا ثمرہ ایک عمل بھی ہے یعنی حصول تفویض و توکل اور اس کا عمل ہونا ظاہر ہے پس عقائد ہر چند کہ خود بھی مقصود ہیں مگر اُن کو تکمیل عمل میں بھی بڑا دخل ہے اور یہ دخل مطلوب بھی ہے جیسا کہ آیت میں لکیلا تأسوا سے مستفاد ہوتا ہے اب اسی پر تمام عقائد کو قیاس کر لیجئے کہ مثلاً توحید کی تعلیم خود بھی مقصود ہے اور اس سے اعمال کی تکمیل بھی مقصود ہے کیونکہ جس شخص پر جسقدر توحید کا غلبہ ہوگا اتنا ہی اسکے اعمال اکمل ہونگے اسکی نماز دوسروں کی نماز سے اکمل اسکی زکوٰۃ وروزہ دوسروں کی زکوٰۃ وروزہ سے افضل ہوگی اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

اور شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

۳۲

امید و ہراسش نباشد ز کس ہمین ست بنیاد توحید و بس

غرض موحد کامل کی یہ حالت ہوگی جو شیخ نے بیان فرمائی ہے جوادنی توحید والے کو حاصل نہیں ہوسکتی تو عقائد گو بظاہر جمل خبریہ ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان میں عرض کیا ہے مگر ان سے مقصود جمل انشائیہ ہیں اعتقادیہ بھی عملیہ بھی جیسا ابھی مذکور ہوا اس بنا پر اللہ واحد کا مطلب یہ ہے کہ اس اعتقاد کے ساتھ عمل میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ اللہ ایک ہے اُس کا کوئی شریک نہیں پس اپنے عمل میں خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ بناؤ ورنہ ریا ہو جائیگی جو شرک صغری ہے اور توحید کامل کے خلاف ہے اسی طرح عقلاً خدا کے سوا کسی سے طمع و خوف نہ رکھو کہ یہ بھی توحید کے خلاف ہے (ہاں طبعی طمع و خوف کا مضائقہ نہیں کیونکہ وہ تو اضطراراً بے اختیار ہوتا ہے جیسے سانپ کو دیکھکر طبعاً ڈر جانا یا شیر سے ہیبت زدہ ہو جانا مگر عقلاً یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہنا چاہئے کہ بدون مشیت الٰہی کے کوئی چیز نفع یا ضرر نہیں دیسکتی وما ہم بضارین بہ من احد الا باذن اللہ وان یمسسك اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو وان یردك بخیر فلا راد لفضلہ

۵ گر گزندت رسد ز خلق مرنج کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست کہ دل ہر دو در تصرف اوست ۱۲ جامع)

ف اور یہ بڑا قیمتی مضمون ہے کہ جمل خبریہ سے محض خبر مقصود نہیں ہوتی بلکہ کوئی انشا مقصود ہوتی ہے اسکی ایک دوسری واضح مثال ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمکو خبر دی ہے کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو حق تعالی آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور اس نزول کی نسبت اجمالی عقیدہ کافی ہے کیونکہ ہمکو نہ اللہ تعالی کے افعال کی کنہ معلوم نہ صفات کی نہ ذات کی بس جو حضور نے فرما دیا ہے اسپر ہمارا ایمان ہے ہاں اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ عقائد کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اخبار متواترہ یا قرآن سے ثابت ہوں وہ تو قطعی ہیں دوسرے وہ جو اخبار آحاد صحیحہ سے ثابت ہوں وہ ظنی ہیں قسم اول کا اعتقاد فرض اور ثانی کا واجب ہے اوّل کا انکار کفر اور ثانی کا انکار فسق ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا اب غور کیجئے کہ حضور نے جو یہ خبر دی ہے اس سے آپکا مقصود کیا ہے کیا صرف یہی مقصود ہے کہ اس نزول کا اعتقاد رکھو یا کچھ اور بھی مقصود ہے ظاہر ہے کہ مقصود یہ ہے کہ اسوقت کو ضائع نہ کرو بلکہ اسوقت

۳۳
ف جمل خبریہ سے محض خبر مقصود نہیں بلکہ انشاء مقصود

حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے نماز و استغفار میں مشغول ہونا چاہئے چنانچہ دوسری احادیث میں حضورؐ نے اسکی خود تصریح فرمادی ہے قیام لیل اور تہجد کی آپنے بہت ترغیب دی ہے اور اسکی فضیلت میں بیشمار احادیث ہیں اسی طرح دعائے نیم شبی کی فضیلت میں بکثرت احادیث ہیں۔ اور بلکہ خود ایک ایسی ہی حدیث کے اخیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نزول فرماکر مخلوق کو خطاب فرماتے ہیں ھل من مسترزق فارزقہ ھل من مستغفر فاغفرلہ اوکما قال کیا کوئی رزق کا طالب ہے کہ میں اسکو رزق دوں کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے کہ میں اسکو بخشدوں یہ صاف بتلارہا ہے کہ حضورؐ کا اس سے ہمکو مطلع کرنا اسی لئے ہے تاکہ اسوقت میں ہم اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگ لیا کریں پس اسی طرح تمام اخبار اعتقادیہ کو سمجھو کہ اُن سے اشارات بھی مقصود ہیں یہ مت سمجھو کہ عقائد سے صرف اعتقاد ہی مطلوب ہے بلکہ اُن سے تکمیل اعمال بھی مطلوب ہے کہ ان عقائد سے عمل میں کام لیا جائے گویا بلفظ دیگر یوں کہئے کہ عقائد کو تکمیل اعمال کا آلہ بنایا گیا ہے اور عقائد کا تکمیل اعمال میں دخیل ہونا اس طرح ہے کہ مثلاً دو شخص فرض کیجئے جنھوں نے راستہ میں بادشاہ کو دیکھا جنمیں ایک تو بادشاہ کو پہچانتا ہے ایک نہیں پہچانتا ظاہر ہے کہ بادشاہ کو دیکھنے کے بعد دونوں کی حالت میں بین فرق ہوگا جو شخص بادشاہ کو بادشاہ سمجھتا ہے وہ تو فوراً آداب و تعظیم بجالائیگا اور پوری طرح خدمت و اطاعت کیلئے آمادہ ہوجائیگا اور جو اُسکو معمولی آدمی سمجھتا ہے وہ اس طرح آمادہ نہوگا پس شریعت نے جو عقائد ہمکو تعلیم کئے ہیں اُن سے ایک تو مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اپنے دل میں جماؤ دوسرا مقصود یہ ہے کہ اس عظمت کے مقتضا سے عمل میں کام لو تو اب اعمال کو غیر مہتم بالشان سمجھنا کتنا بڑا غضب ہے جنکا مقدمہ اور آلہ تکمیل عقائد کو بنایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کے مقدمات اتنے معظم ہیں وہ خود کتنا معظم ہوگا گو من وجہ سہی۔ دوسری تیسری بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ ابتلا و امتحان کیلئے جیسا کہ آیت واذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات اسپر دال ہو کیونکہ کلمات سے مراد احکام ہیں اس سے معلوم ہوا کہ احکام سے مقصود ابتلا ہے۔ اور ابتلا ہوتا ہے مخالفت نفس سے کیونکہ اسمیں مشقت ہوتی ہے اور بدون مشقت کے ابتلا کا تحقق نہیں ہوسکتا معلوم ہوا کہ مقصود خلق انسان سے مجاہدہ و مشقت ہے چنانچہ دوسری جگہ صاف ارشاد ہے لقد خلقنا الانسان

اہتمام عمل کی تیسری دلیل

فی کبد۔ اب خود سمجھ لیجئے کہ مشقت عقائد میں زیادہ ہے یا اعمال میں۔ تو ظاہر ہے کہ عقائد میں کیا مشقت ہے کچھ بھی نہیں ہاں پہلی بار عقائد باطلہ کو ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے مگر یہ ابتدا میں تھوڑی دیر کیلئے ہوتی ہے یہ نہیں کہ ہر وقت ایک آرہ سا چلتا ہو اور اعمال میں ہر وقت مشقت ہے ہر دم دل پر آرہ سا چلتا ہے کہ اب یہ کرو اب وہ کرو یہی ہے لقد خلقنا الانسان فی کبد کا مصداق۔ صاحبو! ایک مشاق نمازی کو بھی بیماری اور سفر میں اول ہی دن جیسی مشقت ہوتی ہے۔ بارش اور اندھیری رات اور جاڑے سردی میں نماز کیلئے گھر سے نکلنا اور وضو کرنا سہل نہیں اسی لئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسباغ وضو علی المکارہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اندھیری میں نماز کیلئے آنیوالوں کو بشارت سنائی ہے کما فی الحدیث المشہور بشر المشائین فی الظلم الی المساجد بالنور التام یوم القیمۃ۔

تیسری بات (جو دوسری بات ہی سے متفرع ہے) یہ ہے کہ عقائد کو ایک بار اختیار کر لینے کے بعد ابقاء کی حاجت تو ہے تجدید کی احتیاج نہیں مثلاً اللہ واحد ایک بار سمجھ لیا تو اب اسکے ابقاء کی ضرورت تو ہے کہ اسکے ضد کا اعتقاد نکیا جاے باقی یہ ضروری نہیں کہ روزانہ اسکے امثال کی تجدید کیجائے بخلاف اعمال کے کہ انمیں ہمیشہ تجدید کی ضرورت ہے ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے وقت۔ ایضاً۔ کہدینا کافی نہیں بلکہ عملاً نماز کی تجدید لازم ہے ایسے ہی روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ ہے گو نماز روزہ کے سب افراد متماثل ہیں مگر متحد تو نہیں ہیں بلکہ ہر فرد کا وجود مستقل ہے۔ اور اللہ واحد کہنے کے بعد اسکی ضرورت تو ہے کہ اسکے خلاف کا عقیدہ نہو مگر تجدید لازم نہیں گو افضل ضرور ہے جیسا کہ حدیث میں ہے جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللہ مگر یہ فرض نہیں چنانچہ اگر کسی شخص کو دن بھر اللہ واحد کا تصور نہ آوے مگر اسکے خلاف کا بھی احتمال نہ آے تو یہ گنہگار نہو گا پس اللہ واحد کے تصور کی ضرورت صرف اول بار تھی جبکہ اسکے ذہن میں شرک کا عقیدہ تھا یا شرک اور توحید دونوں ہی خالی الذہن تھا۔ اسکے بعد نہ اس کا تصور فرض نہ تجدید لسانی فرض ہاں افضل و مستحب ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ایک بار اعتقاد کر لیا ہو تو پھر اگر ساری عمر بھی اس کا استحضار نہو یہ

ف۔ وسوسہ غیر اختیاری مراد نہیں کیونکہ وہ مضر نہیں بلکہ احتمال اختیاری مراد ہے ۱۲ ط

مطلب نہیں کہ نماز بھی نہ پڑھے جسمیں اشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ ہر قعدہ میں آتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کے اجزاء کو سمجھکر نہ پڑھے جیسا کہ عموماً نمازیوں کی حالت ہے اور ظاہر ہے کہ بے سمجھے نماز پڑھنے سے استحضار مضمون رسالت نہیں ہوگا تو اہل فتوٰی کا اتفاق ہے کہ یہ شخص گنہگار نہیں گو برکات عظیمہ سے محروم ضرور ہے سو یہ اور بات ہے۔ بخلاف نماز کے کہ اسکی تجدید رات دن میں پانچ دفعہ فرض ہے خواہ سمجھکر پڑھے یا بے سمجھے۔ ان وجوہ سے ثابت ہوا کہ مجاہدہ نفس عمل میں زیادہ ہے عقائد میں اتنا مجاہدہ نہیں اور مجاہدہ ہی مقصود ہے انسان کی پیدائش سے تو جسکو اس مقصود میں زیادہ دخل ہوگا وہ اہمیت سے خالی نہیں ہوسکتا بس یہ وجوہ ہیں اہمیت اعمال کے۔ خلاصہ یہ کہ بعض وجوہ سے عقائد زیادہ مہتم بالشان ہیں مثلاً اس وجہ سے کہ وہ اصل ہیں اور صحت اعمال موقوف ہے عقائد پر بدون صحت عقیدہ کے عمل ضائع و برباد ہے اور صحت عقائد وجود عمل پر موقوف نہیں اور بعض وجوہ سے عمل زیادہ مہتم بالشان ہے اور یہ ضرور ہے کہ اہمیّت عقائد کے وجوہ زیادہ قوی ہیں مگر میں نے اسوقت اہمیّت اعمال پر زیادہ زور اسلیئے دیا ہے کہ ہم لوگوں کو انکی اہمیت سے بالکل غفلت ہے ہم انکو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اور ظاہر ہے کہ جب اعمال میں بھی وجوہ اہمیت موجود ہیں تو یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم انکی ساتھ اہتمام کا برتاؤ نکریں میں آج کل عام طور پر اپنی جماعت کا حال دیکھ رہا ہوں کہ وہ کسی کے عقائد اچھے دیکھکر پھر اس کی عملی کوتاہی پر اصلا نظر نہیں کرتے نہ اسکے اعمال سے نفرت ظاہر کرتے ہیں نہ دل سے کراہت و انکار کرتے ہیں اور یہ حالت خطرناک ہے حدیث میں اس حالت پر وعید وارد ہے۔ یہ مضمون اہتمام عمل کا کل رات بیان نہوا تھا۔ الحمد للہ کہ یہ آج بیان ہوگیا۔ اب رہ گئی یہ بات کہ ہم اصلاح اعمال و تبلیغ احکام عملیہ میں کیا کوتاہی کر رہے ہیں سو یہ کوئی طویل یا غامض مضمون نہیں جب لوگ اعمال کی ضرورت اور اہمیت ہی سے غافل ہیں تو انکی اصلاح و تبلیغ سے غفلت بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ حالت ہماری یہ ہے کہ ہفتہ کے ہفتے گزر جاتے ہیں کہ ہم کسی کو افعل کذا و لا تفعل کذا کبھی نہیں کہتے۔ اور یہ کوتاہی اصلاح اعمال و تبلیغ احکام عملیہ میں اسدرجہ بڑھ گئی ہے کہ جنپر قدرت نہیں ہے انکی تبلیغ کا تو کیا اہتمام ہوتا جنپر قدرت بھی ہے وہاں بھی اس کا استعمال نہیں ہوتا جنپر قدرت ہے وہ یہ لوگ ہیں۔ بیوی۔ بچے۔ نوکر۔ مرید۔ شاگرد۔ اور جنپر قدرت نہیں وہ یہ لوگ ہیں

تبلیغ میں اسقدر کوتاہی ہوئی کہ موقع قدرت میں بھی نہیں کیجاتی۔

دوست احباب ۔بھائی ۔ برادری ۔عزیز ۔قریب اور اجنبی لوگ ۔ پھر جنپر قدرت نہیں اُن میں
دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جنکو تبلیغ کرنے میں ضرر کا اندیشہ ہے جیسے دشمن اور مخالف ۔اور
بعض وہ ہیں جہاں ضرر کا کچھ اندیشہ نہیں صرف ناگواری کا خطرہ ہے اور انمیں زیادہ تر ایسے
ہی ہیں چنانچہ دوست احباب بھائی اور عزیز سے ضرر جسمانی یا مالی کا کوئی خطرہ نہیں ۔بس انکی
تبلیغ سے محض اسواسطے پہلوتہی کیجاتی ہے کہ انکو ہماری روک ٹوک ناگوار ہوگی ۔سو اس کا علاج
یہ ہے کہ نصیحت کا عنوان ایسا اختیار کرو جس سے ناگواری نہو اور اسپر بھی کسی کو ناگواری ہو
تو اسکی پروا نکرنا چاہیئے مسلمان کا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

اور جب وہ لوگ بھی جنکو بظاہر قدرت سے خارج سمجھا جاتا ہے زیادہ تر محل تبلیغ ہیں اور انکی
ترک تبلیغ میں بھی ہم معذور نہیں تو بتلایئے جو لوگ ضابطہ سے ہمارے ماتحت ہیں اور ظاہر ہے
اُنکی تبلیغ ہماری قدرت میں داخل ہے وہاں ترک تبلیغ سے ہم کیونکر معتوب و ماخوذ نہوں گے
مگر حیرت ہے کہ ہم موقع قدرت میں بھی تبلیغ و نصیحت سے طرح دیجاتے ہیں اور اس سے بڑھکر یہ کہ
جنپر قدرت ہے وہ بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ جنھوں نے التزام اطاعت کا ہمسے معاہدہ نہیں کیا
جیسے بیوی بچے کہ گو شرعاً اُنپر ہماری اطاعت واجب ہے مگر اُنھوں نے صراحۃً اس کا التزام
نہیں کیا کہ تم ہمکو تبلیغ کرو ہم تمھاری تعلیم پر عمل کرینگے مگر ایک تعلق ایسا ہے جسمیں دوسرا شخص
معاہدہ صریحہ سے ہماری اطاعت کا التزام کرتا ہے اور وہ تعلق پیری مریدی کا ہے ۔کیونکہ پیری
مریدی نام ہی ہے معاہدۂ اطاعت من جانب المرید و معاہدۂ تعلیم و اصلاح من جانب الشیخ کا صرف
ہاتھ میں ہاتھ لیکر سبق سا پڑھ دینے کا نام پیری مریدی نہیں جیساکہ آج کل عام طور سے اسمیں غلطی
ہو رہی ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کو بیعت سمجھتے ہیں اور تعلیم و اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے اس لئے
مجھے اسمیں کلام ہے کہ آج کل کسی طالب بیعت کو چپکے سے جلد بیعت کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں کیونکہ
اسمیں تقریر ہے اسکی غلطی کی ۔اس طرح بیعت کر لینے سے وہ یہی سمجھے گا کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت
کی حقیقت ہے نیز آج کل یہ بھی عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بدون بیعت کے نفع نہیں ہوتا گویا لوگوں
نے اصل مقصود کو اس فرع کے تابع کر دیا ہے میرے نزدیک ان غلطیوں پر تنبیہ لازم ہے اور اسکی

ضرورت ہے کہ طالب کو اولاً اسپر متنبہ کیا جائے کہ بیعت (یعنی ہاتھ میں ہاتھ دینا) نہ مقصود ہے نہ کسی مقصود کا موقوف علیہ ہے صرف رسم مشائخ ہے اور حقیقت بیعت کی یہ ہے کہ مرید کی طرف سے اتباع کا التزام ہو اور شیخ کی طرف سے تعلیم کا التزام ہو اگر دو شخصوں میں ایسا معاہدہ ہو جائے خواہ قولاً یا حالاً کیونکہ معاہدہ کبھی حالیہ بھی ہوتا ہے تو بس بیعت کا تحقق ہو گیا خلاصہ یہ ہے کہ بیعت کی حقیقت التزام ہے یعنی شیخ اور طالب دونوں ایک امر کا التزام کرتے ہیں طالب اطاعت واتباع کا۔ شیخ تعلیم واصلاح کا اب میری شکایت کا حاصل یہ ہے کہ جہاں صریح التزام ومعاہدہ ہے اطاعت کا غضب کی بات ہے کہ وہاں بھی آج کل تبلیغ نہیں کیجاتی اور اگر بیعت کو صریح التزام نہیں مانتے تو اسکی کیا وجہ ہے کہ مرید کی جانب عملاً دونوں اسکو لازم سمجھتے ہیں چنانچہ مرید اگر پیر کی کسی بات کو نمانے تو اُسپر عتاب کیا جاتا اور دربار سے نکالدیا جاتا ہے یہ عمل خود بتلا رہا ہے کہ آپ بیعت کو صریح التزام سمجھتے ہیں مگر یہ بے انصافی ہے کہ ایک جانب التزام مانا جاوے دوسری جانب نہ مانا جاوے ایک جانب تو یہ شدت ہے کہ اگر مرید خدمت سے انکار کر دے یا کسی دنیوی کام میں شیخ کی مخالفت کرے تو فوراً معتوب ہو جاتا ہے اور دین کے معاملہ میں نہ شیخ اسکو کچھ کہتے ہیں نہ وہ آمیں شیخ کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم سمجھتا ہے میں کہتا ہوں کہ جب مرید صراحةً آپ کی اطاعت کا التزام کر چکا ہے پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ اب بھی شیوخ مریدین کی دینی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ صاحبو! تبلیغ سے ایک تو مانع عدم قدرت تھا اور ایک مانع عدم التزام تھا گو عدم التزام واقع میں مانع نہیں بلکہ قدرت کے بعد تبلیغ واجب ہے گو دوسرے نے صراحةً التزام نکیا ہو مگر میں آپ کی خاطر سے تھوڑی دیر کیلئے عدم التزام کو بھی مانع مانکر کہتا ہوں کہ جہاں قدرت بھی ہے اور التزام بھی ہے وہاں حضرت شیخ کیسے خاموش ہیں جسمیں ترک تبلیغ کے گناہ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے کیونکہ جسطرح مرید نے اطاعت کا وعدہ کیا ہے ایسے ہی شیخ بھی تو اصلاح کا وعدہ کئے ہوئے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مقتضی موجود ہے اور موانع سب مرتفع ہیں پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں کچھ روک ٹوک نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ شیوخ پیری مریدی کی حقیقت کو نہیں سمجھے۔ یا عمداً جان بوجھکر پہلوتہی کرتے ہیں۔ بس آج کل تو پیری مریدی کی حقیقت لوگوں نے

ف: شیخ کا ترک تبلیغ گناہ وعدہ خلافی اور خیانت ہے۔

ف: عوام میں غلطی پیری مریدی کے متعلق۔

یہ سمجھ رکھی ہے کہ پیر صاحب قیامت میں بخشوالیں گے لوگوں نے رسم بیعت کو مغفرت کا سبب سمجھ رکھا ہے گو اسکے بعد کتنے ہی گناہ کرلیں ۔ چنانچہ اسکے متعلق کچھ الہامات اور مکشوفات یاد کر لئے ہیں کہ فلاں بزرگ سے منقول ہے کہ انکو الہام ہوا تھا کہ ہم تمھارے سب سلسلہ والوں کو بخشدیں گے یہ تو وہ ہیں جو دوسروں سے اسلم ہیں ورنہ بعضے اس سے بھی گرے ہوئے ہیں اُن کا خیال یہ ہے کہ بیعت اسواسطے ضروری ہے کہ اس سے ہمارے سر پر ایک بزرگ کا سایہ ہو جائیگا تو دنیوی مقاصد میں ہمکو سہولت ہوگی ۔ مقدمات میں دعا اور تعویذ گنڈے کرالیں گے اور بیعت سے ہماری تنخواہ میں ترقی ہو جائے گی چنانچہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں ڈپٹی کلکٹری سے اس طرف کوئی رہتا ہی نہیں ۔ ان کا مقصود بیعت سے محض دنیا ہے اور ان کے نزدیک دین سے اسکو کچھ تعلق نہیں ۔ یہ تو مریدوں کے خیالات تھے اب پیروں کی سنئے ۔ ان کے نزدیک بیعت سے مقصود یہ ہے کہ مریدوں کے ذمہ ان کی ششماہی یا سالانہ مقرر ہو جائیگا جیسے چار کمینوں کا فصلانہ مقرر ہوتا ہے ۔ پھر پیر صاحب کا کام کیا ہے جسکے عوض یہ فصلانہ دیا جاتا ہے انکا کام وہ ہے جو بھنگی کرتا ہے ۔ بھنگی نجاست ظاہرہ کا حامل ہے اور پیر صاحب فصلانہ لیکر گناہوں کی نجاست کے حامل ہیں ۔ چنانچہ بعض دیہات میں پیر کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو کمینوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ایک چودھری کے یہاں فصل پر اناج تیار ہوا اور گھر والے چاروں کمینوں کا فصلانہ نکالنے لگے تو چودھری کہتا ہے کہ اس سوہرے پیر کا بھی تو حق نکالدو وہ بھی تو اپنا حق مانگنے آویگا ۔ واقعی یہ عجیب راحت و آرام کا پیشہ ہے کہ پیر صاحب گئے اور فصلانہ لے آئے اور سال بھر آرام سے اپنے گھر بیٹھے رہے ۔ اور پیشہ والے اگر فرض منصبی کو انجام نہ دیں تو تنخواہ بند ہو جاتی ہے مگر پیر کی تنخواہ بند ہی نہیں ہوتی ۔ اور خواہ کچھ ہی کرلیں انکی پیری بھی منسوخ نہیں ہوتی چاہے شراب پی لیں یا بدمعاشی کرلیں کیونکہ مشہور ہے کہ پیر کی پیری سے کام اُسکے فعلوں سے کیا کام ۔ اگر پیر صاحب ڈھنگ کی باتیں بولیں تو حقائق و معارف ہیں اور بے ڈھنگی بے تکی ہانکیں تو رموز ہیں اور خاموش رہیں تو مراقب اور چپ شاہ ہیں انکی ہر حالت میں جیت ہے ۔ افسوس آج کل پیروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کے ساتھ کر رکھا تھا وقالت الیہود والنصاریٰ نحن ابناء اللہ واحباءہ کہ خدا کے بیٹے اور اُسکے محبوب بنتے تھے (نعوذ باللہ

حاشیہ: جاہل پیروں کی غلطی

استغفر اللہ) ان کو سب کچھ معاف ہے جو چاہیں کریں اس طریقہ میں عمل کی ضرورت ہی نہیں عمل سے کچھ سروکار ہی نہیں۔ یاد رکھو کہ ایسی پیری مریدی کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں یہ سراسر بے دینی ہے اور خیر بعضے ایسے تو نہیں ہیں بلکہ بیعت کے بعد عمل کی بھی ضرورت سمجھتے ہیں مگر کونسے اعمال کی فرائض و واجبات کی نہیں بلکہ وظائف و اوراد کی ضرورت سمجھتے ہیں کچھ وظیفے پیر سے معلوم کر لئے ہیں ان میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا چاہے فرائض ناغہ ہو جائیں۔ نماز کی پروا نہیں کہ وقت پر ہوتی ہے یا بے وقت معاملات سر سے پیر تک گندے ہیں سود لیتے ہیں اور دیتے ہیں رشوت کا بازار گرم ہے اور اسکے ساتھ تہجد کے پابند ہیں اشراق کے پابند ہیں تسبیح بہت لمبی ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے اور پیر صاحب بھی ان مریدوں کی سود کی آمدنی سے ہدایا لیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کے ایک شخص نے خود مجھ سے فخراً کہا کہ نماز تو چاہے قضا ہو جائے مگر پیر نے جو وظیفہ بتلا دیا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ جب قضا آئے گی اسوقت اسکا نتیجہ معلوم ہوگا کہ نماز زیادہ ضروری تھی یا وظیفہ۔ اور انمیں بھی اسلم وہ ہیں جو وظیفے ثواب کیلئے پڑھتے ہیں۔ ورنہ اکثر تو دنیا ہی کے واسطے پڑھتے ہیں چنانچہ کوئی قصیدہ غوثیہ کا ورد کرتا ہے کوئی حزب البحر کا۔ اگر انکو ثواب مطلوب ہوتا تو ادعیہ ماثورہ میں ان سے زیادہ ثواب ہے مگر دنیا مطلوب ہے اسلئے ادعیہ ماثورہ سے دلچسپی نہیں بلکہ اس قسم کے وظائف سے دلچسپی ہے جنسے دنیوی منافع بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ان سے بڑھکر ایک طبقہ اور ہے جو صوفیہ کہلاتے ہیں وہ اسلئے بیعت ہوتے ہیں تاکہ کیفیات اور کشف و کرامت حاصل ہو جائیں یہ لوگ کیفیات کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں اسکے لئے ترک لذات کرتے ہیں نیند کم کرتے ہیں غذا کم کرتے ہیں اور اس کا نام رکھا ہے مجاہدہ و ریاضت۔ حالانکہ مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ مخالفت نفس فی المعاصی روٹی کھانے یا ٹھنڈا پانی پینے میں نفس کی مخالفت کرنا مجاہدہ نہیں۔ بلکہ مجاہدہ یہ ہے کہ نفس نے مثلاً تقاضا کیا کسی امرد یا عورت کے دیکھنے کا یا گانا سننے کا یا کسی کی غیبت کرنیکا اسمیں نفس کی مخالفت کی اسی طرح تمام معاصی میں غور کر لو۔ مگر یہ صوفی جو مجاہدہ کے مدعی ہیں ان مواقع پر نفس کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ بہت سے لڑکوں اور عورتوں کے گھورنے میں مشغول ہیں اور غضب یہ کہ گناہ کرکے تاویل یہ کیجاتی ہے کہ ہم تو صنعت حق کا مشاہدہ کرتے ہیں مولانا محمد مظہر صاحب سہارنپوری رحمہ نے ایک ایسے ہی مسخرہ کو خوب جواب دیا تھا کہ اپنی ماں کی شرمگاہ میں جاکر صنعت حق کو دیکھ

ف: بعضے بیعت کے بعد اعمال کا اہتمام کرتے ہیں مگر فرائض کا نہیں بلکہ وظائف کا۔

۴۰ ف: اکثر سالکین کیفیات کے طالب ہیں۔

ف: مجاہدہ و ریاضت کی حقیقت اور اسمیں صوفیوں کی غلطی۔

(باقی آئندہ)

کہ ایسی ذراسی تنگ جگہ سے تو اتنا بڑا آدمی پیدا ہو گیا۔ غرض ان لوگوں نے مجاہدہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھی اور ریاضت کے معنی اصل لغت میں سدھانیکے ہیں کیونکہ یہ ماخوذ ہے روض الدابہ سے جسکے معنی ہیں گھوڑے وغیرہ کو سدھانا۔ اور اصطلاح میں ریاضت کے معنی ہیں تحصیل اخلاق حمیدہ وازالۂ اخلاق ذمیمہ۔ پس مجاہدہ تو یہ ہے کہ شہوت وغضب وغیرہ کا جب تقاضا ہو تو اس تقاضے کو روکا جائے اور ریاضت یہ ہے کہ اس تقاضے کے منشا کو زائل کر کے اسکے بجائے خلق حسن اور ملکہ فاضلہ پیدا کیا جائے۔ کیونکہ جتنے معاصی ہیں سب کے مناشی اخلاق ہیں اور ریاضت اسی مرتبۂ خلق کے ازالہ کا نام ہے اور زائل کرنے سے مطلب یہ ہے کہ منشا مضمحل وضعیف ہو جائے کیونکہ اخلاق رذیلہ کا ازالہ ممکن نہیں یہ سب رذائل فطری ہیں اور حدیث میں ہے اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل زال عن جبلتہ فلا تصدقوہ اور ان رذائل کے فطری ہونیکی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو بھی غصہ آتا ہے اور محققین کا قول ہے کہ غضب کبر سے پیدا ہوتا ہے پھر غضب سے غیبت پیدا ہوتی ہے جب بچوں میں غصہ ہے تو معلوم ہوا کہ انمیں تکبر بھی ہے تو بچوں کے اندر ان امور کے ہونیسے معلوم ہوا کہ یہ امور فطریہ ہیں اور امور فطریہ کا ازالہ کلیۃً نہیں ہو سکتا تو جو سالک انکو بالکل زائل کرنا چاہے وہ اس کا مصداق ؎ دماغ بیہدہ پخت وخیال باطل بست

اور یہ میں نے اسلئے ظاہر کر دیا کہ سالکین اس حقیقت کے نہ جاننے سے بہت پریشان ہوتے ہیں بعض دفعہ مجاہدہ کر کے سالک یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھسے کبر زائل ہو گیا اسکے بعد کسی موقعہ پر وہ پھر ابھرا تو یہ شکستہ دل ہو جاتا ہے اور ہمت پست ہو جاتی ہے کہ افسوس ساری محنت ہی برباد گئی مجاہدہ ضائع ہو گیا یہ بلا تو ہنوز موجود ہی پھر اس غم میں بعض تو خودکشی کر لیتے ہیں اور بعضے خودکشی کر لیتے ہیں یعنی بعضوں نے جان دیدی اور بعض نے اپنے کو طریق سے الگ کر لیا کہ اس راہ میں تو کامیابی دشوار ہے ممکن ہی نہیں اسواسطے میں کہتا ہوں کہ زوال سے مقصود اضمحلال ہے اور اضمحلال کے معنی یہ ہیں کہ بعد مجاہدہ کے ان اخلاق رذیلہ کی مقاومت میں پہلی جیسی مشقت نہیں ہوتی ورنہ یاد رکھو کہ مجاہدہ سے نہ حریص کی حرص زائل ہوتی ہے۔ نہ بخیل کا بخل نہ متکبر کا تکبر ہاں اضمحلال ہو جاتا ہے جس کا ثمرہ یہ ہے کہ ان کے مقتضا پر عمل نہ ہو کیونکہ عمل اختیاری ہے پس مقتضائے رذیلہ پر عمل نکرنا یہی بڑی کامیابی ہے اور مجاہدہ وریاضت سے یہی سہل وآسان ہو جاتا ہے غرض اس تقریر سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ایک درجہ تو ہے تقاضائے معصیت کا

ف: مجاہدہ سے اخلاق رذیلہ بالکل زائل نہیں بلکہ مضمحل ہو جاتے ہیں

اسکی مخالفت کرنا تو مجاہدہ ہے اور ایک اس تقاضے کا منشا ہے خلق رذیل اس کے ازالہ یعنی اضمحلال
کو ریاضت کہتے ہیں یہ تو انکی حقیقت ہے جسمیں ترک اکل و شرب کو کوئی دخل نہیں یہ اور بات ہے کہ
اس حقیقت کی تحصیل میں ترک اکل و شرب وغیرہ سے سہولت ہوجاتی ہے تو وہ مقدمہ ہوا مگر یہ کیا
غضب ہے کہ مقدمہ کو مقصود بنالیا گیا کہ اصل مجاہدہ کا تو پتہ نہیں نہ امردوں کا گھورنا چھوڑیں نہ
عورتوں کا دیکھنا اور کھانا پینا سونا کم کرکے مجاہد بنگئے۔ یہ تو جہلاء صوفیہ کا حال ہے اور جو ذرا لکھے
پڑھے ہیں وہ ترک معاصی کا بھی اہتمام کرتے ہیں مگر وہ اس مرض میں گرفتار ہیں کہ احوال و کیفیات
کو مقصود و مطلوب سمجھے ہوئے ہیں کسی سے انھوں نے سن لیا تھا۔ المجاہدۃ مفتاح المشاہدۃ
بس یہ لفظ تو یاد کرلیا مگر تفسیر کسی محقق سے دریافت نکی بلکہ اپنی رائے سے معنی گھڑے۔ مجاہدہ کے
معنی تو مرنا کھپنا لئے کہ کھانا بھی چھوڑ دے اور پینا بھی اور مشاہدہ کی یہ تفسیر کی کہ اللہ کی طرف خود
بخود بدون ارادہ کے لو لگی رہے ذوق شوق ہو کشف ہو یکسوئی ہو استغراق ہو بس وہ اسی کے
واسطے ساری کوشش کرتے ہیں اگر کوئی اثر ظاہر ہوگیا کہ تھوڑی دیر کو وساوس کم ہوگئے شوق و
ذوق پیدا ہوگیا تو خوش ہوگئے کہ بس ہم کامیاب ہیں اور اگر کبھی ایسا نہوا تو اب پریشانی میں مبتلا
ہیں شیخ سے شکایتیں کرتے ہیں کہ مجھے تو ذکر سے نفع نہیں ہوتا وساوس بند نہیں ہوتے شوق و ذوق
پیدا نہیں ہوتا شیخ اگر اناڑی ہے تو وہ ہر شکایت پر دلجمعی کیلئے ایک وظیفہ اضافہ کرکے مرید کو مجموعۃ الوظائف
بنادیگا جیسے علی حزین شاعر نے اپنے ہمسایہ کو تذکرۃ الاولیا بنایا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ علی حزین جب دہلی آیا
تو اسکے لئے ایک محل بہت عمدہ تجویز کیا گیا وہ اسمیں رہنے لگا اسکے دہلیز میں ایک مداری فقیر رہتا تھا وہ
رات کو ایک لمبا شجرہ پڑھا کرتا تھا چند روز میں مالک مکان علی حزین کی مزاج پرسی کیلئے آئے کہ اگر کسی
قسم کی تکلیف ہوئی ہو تو ظاہر فرمایا جائے تاکہ اس کا بندوبست کیا جائے علی حزیں نے کہا اور تو کچھ
تکلیف نہیں مگر اس تذکرۃ الاولیاء کو کہیں اور کسی جگہ بسادو۔ راتوں کا سونا ظالم نے تنگ کردیا ہے
اس کا شجرہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ تو جیسے علی حزیں نے اس فقیر کو تذکرۃ الاولیا بنایا تھا ایسا ہی میں
کہتا ہوں کہ اناڑی شیخ اپنے مریدوں کو مجموعۃ الوظائف بنادیتا ہے پھر بعضے تو ایسے وظائف بتلاتے
ہیں جو شرع کے موافق ہیں اور بعضے تو بہت ہی بے تکے وظائف بتلاتے ہیں جو خلاف شرع ہیں۔
جیسے یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ۔ اور ایک وظیفہ مشہور ہے اللہ الصمدی یا محمد مددی آمین

ف ترک طعام و منام مجاہدہ نہیں بلکہ مقدمہ مجاہدہ کا ہے

ف احوال و کیفیات کو مقصود سمجھنا غلطی ہے

ف قلت حالات و کیفیات کے علاج میں اناڑی شیوخ کی غلطی۔

ف ایک لطیفہ

ف بعضے وظائف بے تکے اور خلاف شرع ہیں۔

صمد کی اضافت الی ، لیا ، مع لام تعریف کے نہ معلوم کیسی اضافت ہے یہ تو لفظی غلطی ہے اور معنوی غلطی ندا غیر اللہ ہے ۔ اسی طرح کلکتہ میں کرانہ کے ایک پیرزادے ہیں انکا رات دن وظیفہ یہ تھا یاحی یاقیوم کچھ دے نقدی کچھ دے تو تم ۔ پھر سنا ہے کہ انکو کلکتہ پہونچکر نقدی بہت ملی ۔ اور ایک وظیفہ بعضے لوگ یہ بتلاتے ہیں ۔ اُڑ بھنبیری ساون آیا ۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس کا مطلب کیا ہے تو کہتے ہیں اجی بزرگوں کے کلام میں برکت ہوتی ہے معنی سے کیا بحث ۔ سبحان اللہ اہل کلام میں برکت کیونکر تسلیم کرلی جائے چاہے وہ کیسا ہی بے تکا کلام ہو ۔ کوئی خدا و رسول کا کلام تو نہیں جو ایمان لے آیا جائے ۔ اور خدا و رسول کا کلام بے تکا ہو ہی نہیں سکتا ۔ یہ تو وظائف میں گڑبڑ ہے بعض لوگ اشغال میں گڑبڑ کرتے ہیں چنانچہ ایک شغل یہ بتلایا جاتا ہے کہ سانس آنکھ ناک کان کو بند کرلو ۔ اور اسکو بڑا ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اسپر غضب یہ کہ مولانا رومی رح کو اس شغل کا موجد بتلاتے ہیں اور دلیل میں یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند　　　گر نہ بینی نور حق بر من بخند

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہمنے یہ شعر مثنوی میں دیکھا نہیں نہ ہمکو اسمیں ہونا یاد ہے اور اگر ہو بھی تو میں بقسم کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاصی سے ان اعضاء کو بچاؤ ۔ کیونکہ نور حق کا وعدہ طاعات کے امتثال ترک معاصی ہی پر ہو سکتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم ذلک ازکی لھم ط اور حدیث میں بھی ہے کہ جو شخص کسی نامحرم سے اپنی نگاہ کو روکے یا ہٹائیگا وہ ایک حلاوت اپنے دل میں پائیگا دوسرے مولانا کے زمانہ میں یہ اشغال نہ تھے یہ تو جوگیوں سے لئے گئے ہیں اسلئے کہ طبی قاعدہ سے حصول یکسوئی میں یہ اشغال مفید ہیں باقی ثواب میں انکو کچھ دخل نہیں ۔ غرض یہ لوگ اسی اُدھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں کہ کیفیات وغیرہ کیلئے وظائف پڑھیں یا اشغال کریں اور اسکو بڑا مجاہدہ اور ثواب سمجھتے ہیں حالانکہ ان کو مقصود سے کچھ بھی مس نہیں اور جو شیخ اس حالت میں ان مریدوں کو وظیفے ہی بتلاتا جائے اُسکے متعلق محقق یوں کہے گا ؎

بے خبر بود نداز حال درون　　　استعیذ اللہ مما یفترون

اسکو اصل مرض کی خبر نہیں جو اس شخص کی پریشانی کا سبب ہے اصل مرض صرف یہ ہے کہ

اشغال میں غلطی کہ جس مع کو ثواب سمجھتے ہیں

مولانا رومی کے شعر سے اسپر استدلال اور اسکا جواب

اس نے یکسوئی اور کیفیت ذوق وشوق وغیرہ کو مقصود سمجھ رکھا ہے اسلئے پریشان ہے اس مرض کا اصلی علاج یہ ہے کہ اسکے ذہن نشین یہ مسئلہ کر دیا جائے کہ یہ کیفیات مقصود نہیں ہیں کیونکہ یہ مامور بہا نہیں ہیں اور مقصود وہی ہے جو مامور بہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحصیل استغراق وغیرہ کا نصوص میں کہیں امر نہیں کسی کو دعوےٰ ہو تو دکھلاوے ہاں شوق وخشیت کیلئے حدیث میں دعا آئی ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ بعض احوال محمود ہیں مگر مقصود ہونا تو ثابت نہوا کیونکہ یاد رکھو کہ شریعت نے انہی اشیاء کو مقصود بنایا ہے جو بندہ کے اختیار میں ہوں اور جو شے اختیار انسان سے باہر ہو وہ مامور بہ نہیں ہوتی نہ مقصود ہوتی ہے شاید اسپر آپ کہیں کہ مغفرت و دخول جنت بھی تو غیر اختیاری ہے یہ بھی مقصود نہوئی ورنہ اگر یہ مقصود ہیں تو بتلاؤ قرآن میں ان کا کہاں امر ہے۔ میں کہتا ہوں قرآن میں تو ان کا امر جا بجا صراحۃً مذکور ہے سابقوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا کعرض السماء والارض اور اس کا امر اسلئے ہے کہ ان دونوں کا حصول انسان کے اختیار میں ہے شاید آپ اس سے چونکیں گے کہ حصول مغفرت و دخول جنت اختیار میں کہاں تو میں کہتا ہوں کہ امور اختیاریہ کا اختیاری ہونا جس درجہ میں ہے اور جو مبنیٰ ان کے اختیاری ہونیکا ہے وہ مبنیٰ یہاں بھی موجود ہے اور اس کا بھی وہی درجہ ہے۔ کیونکہ تمام امور اختیاریہ کے اختیاری ہونیکا مبنیٰ یہی ہے کہ اُس کا سبب انسان کے اختیار میں ہے باقی یہ کہ مسبب براہ راست اختیار میں ہو سو یہ کسی امر میں بھی نہیں۔ دیکھیئے سیراب ہونا پیٹ بھرنا ملازمت زراعت سے روپیہ حاصل کرنا وغیرہ جو اختیاری کہلاتے ہیں اسی معنی کے اعتبار سے کہ ان کے اسباب اختیار میں ہیں ورنہ مسبب تو کسی کے بھی اختیار میں نہیں عقلاء سب اسپر متفق ہیں۔ اور جب یہ ہے تو بتلاؤ جنت ومغفرت اختیاری کیوں نہیں جبکہ اُن کے اسباب اختیاری ہیں یعنی اعمال صالحہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جا بجا اعمال پر مغفرت و دخول جنت کو متفرع فرمایا ہے اور اعمال اختیاری ہیں تو یہ بھی اختیاری ہے کیونکہ سبب اختیار میں ہے اور سبب ہی کے اختیاری ہونے پر شے کا اختیاری ہونا مبنی ہے۔ باقی ان احوال وکیفیات کی طلب و تحصیل کا امر تم بتلاؤ کہاں ہے یا کس عمل پر ان کے ترتب کا وعدہ کیا گیا ہے بس سالکین کی زیادہ تر پریشانی کا راز یہ ہے کہ وہ غیر مقاصد کے درپے ہوتے ہیں۔

ف کیفیات کے مقصود نہونے کی دلیل۔

ف اشکال کہ جنت ومغفرت بھی مامور بہ نہیں کیونکہ قدرت سے خارج ہے تو وہ بھی مقصود نہوئی اور اس کا جواب۔

۴۰

ف جس شے کے اسباب اختیاری ہوں وہ اختیاری ہے اسلئے جنت ومغفرت اختیاری ہے۔

ع فان قلت قال تعالیٰ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون وھذا ھو الشوق وقال وایای فارھبون وھذا ھو الخشیۃ فکیف لا یکونان مامورین بہما قلت ان المامور بہ درجۃ الشوق و الخوف العقلی دون الطبعی ۱۲ جامع۔

(باقی آئندہ)

یہ حال تو محققین کا ہے کہ وہ کیفیات کے طالب ہیں اور ان کے انعدام سے پریشان ہوتے ہیں
وجہ یہ کہ یہ محق ہونیکی ساتھ غیر محقق ہیں۔ اور ایک جماعت مبطلین کی ہے جنکو غیر محققین بھی کہا جاتا
ہے ان کی یہ حالت ہے کہ احوال وکیفیات کی طلب میں ان لوگوں سے معاصی تک سرزد ہوتے
ہیں مثلاً بیوی بچوں سے ترک تعلق کر دیتے ہیں تاکہ کیفیت میں فرق نہ آئے۔ میرٹھ کا واقعہ ہے کہ میں
وہاں اپنے گھر میں کے علاج کے واسطے انکی ساتھ گیا ہوا تھا اسوقت ایک مسماۃ نے بیعت کی درخواست
کی چند عورتوں نے اسکو کہا تو ان سے بیعت نہ ہو بلکہ ہمارے پیر سے مرید ہونا جنھوں نے پچاس سال
سے بیوی کا منہ نہیں دیکھا اور یہ تو بیوی کو سفر میں لئے لئے پھرتے ہیں اُس مسماۃ نے اس قسم کا جواب
دیا کہ تمھاری پیر سے تو میں ہرگز بیعت نہونگی وہ تو پچاس برس سے خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہے کہ بیوی بچوں کے
حقوق ادا نہیں کرتا میں تو ان سے ہی مرید ہوں گی ان کا طرز سنت کے موافق ہے۔ تو اس ظالم نے
پچاس برس سے بیوی کو چھوڑ رکھا تھا شاید اسی لئے علیحدہ رہا ہوگا تاکہ بیوی کے اختلاط سے یکسوئی
وغیرہ کی کیفیت میں خلل نہ آجائے مگر جو کیفیت معصیت کے ساتھ بھی مجتمع رہے ایسی کیفیت خود مردود ہے
یاد رکھو کہ بعض دفعہ کیفیات محمودہ وکیفیات غیر محمودہ میں صورۃً اشتباہ ہو جاتا ہے مثلاً تذلل و تملق
و تواضع کی صورت بعض دفعہ یکساں ہوتی ہے اسی طرح۔ استغنار عن الخلق وکبر کی صورت متشابہ ہو جاتی
ہے ایسی ہی نفسانی یکسوئی اور روحانی یکسوئی میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ بیوی بچوں سے الگ رہکر جو
یکسوئی حاصل ہوتی ہے وہ نفسانی یکسوئی ہے روحانی نہیں ہے۔ اس تشابہ و تشاکل کو مولانا
رومیؒ اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں درمیاں شاں برزخ لا یبغیاں

جب کیفیات میں باہم تشابہ ہے تو اب کسی معیار کی ضرورت ہوئی جس سے معلوم ہو سکے کہ کونسی
کیفیت محمودہ ہے اور کونسی مذمومہ سو اسکے لئے معیار صرف شریعت مقدسہ ہے یعنی جو کیفیت کسی
گناہ کا مقدمہ ہو جائے وہ مذموم ہے ورنہ محمود ہے اگر یہ معیار سامنے نہو تو پھر کیفیات تو جوگیوں کو
بھی نصیب ہو جاتی ہیں کیا انکو بھی صوفی اور ولی کہوگے۔ اور آج کل اس کہدینے میں بھی استبعاد
نہیں کیونکہ جب لوگوں نے کیفیات ہی کو مقصود سمجھ لیا ہے اور تصوف انھی کا نام رکھ چھوڑا ہے
تو ان کے نزدیک ہر صاحب کیفیت صوفی ہے خواہ مسلم ہو یا کافر۔ چنانچہ آج کل ایک کافر جسکا صنعت ریاضت

ف اہل باطل کیفیات کی طلب میں معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں

ف ایک واقعہ

ف بعض کیفیات محمودہ اور مذمومہ میں تشابہ ہے اور ان میں امتیاز کا معیار

ف کیفیات کفار کو بھی حاصل ہوتی ہیں

کے بہت سے مسلمان معتقد ہیں۔ اور مظفر نگر میں سنا تھا کہ ایک ہندو بابو کے بہت سے مسلمان مرید ہیں۔ اسی طرح بعض دفعہ ہندو کسی مسلمان پیر سے مرید ہوتے ہیں اور وہ مسلمان پیر صاحب اسکو مرید کر لیتے ہیں اور مرید صاحب ہندو کے ہندو ہی رہتے ہیں یہ مصلحت سمجھتے ہیں کہ شاید کسی وقت مسلمان ہو جاویں۔ مگر ہمارے اکابر نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔ گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہ کے پاس ایک ہندو مرید ہونے آیا اور تعجب یہ کہ وہ ایک بہت بڑے بزرگ زمانہ سے مرید تھا اُن کا انتقال ہو گیا تھا اسلئے مولانا کے پاس تجدید بیعت کیلئے آیا اور اُن مرحوم بزرگ کے ایک معتقد کا خط لایا حضرت مولانا نے صاف فرما دیا کہ بیعت کرنیسے انکار نہیں مگر ہمارے یہاں بیعت کی سب سے اول شرط اسلام ہے مسلمان ہو جاؤ ہم مرید کر لیں گے۔ اُس نے یہ شرط قبول نکی حضرت نے مرید نکیا۔ بعد میں بعضوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اسکو اسی حالت میں مرید کر لیا جاتا تو اسلام سے قریب ہو جاتا۔ فرمایا ہرگز نہیں بلکہ اور بعید ہو جاتا کیونکہ ذکر و شغل میں خاصیت ہے کہ اس سے کیفیات طاری ہوتی ہیں اور کیفیات میں خاص لذت بھی ہوتی ہے جسکو یہ شخص قرب حق کی لذت سمجھتا اور اس کو کافر رہکر بھی یہ کیفیات حاصل ہو جاتیں تو اس کا یہ خیال پختہ ہو جاتا کہ قرب الٰہی میں اسلام کو کچھ دخل نہیں نہ اسلام کی ضرورت ہے بلکہ کافر رہکر بھی قرب حق حاصل ہو سکتا ہے تو پھر کسی وقت بھی اسکے اسلام لانیکی امید نہ رہتی اور اب جو کورا جواب دیا گیا ہے کہ بدون اسلام کے خدا کا راستہ نہیں مل سکتا اب امید تو ہے کہ شاید کسی وقت اسلام کی ضرورت کا خیال اسکے دل پر غالب ہو۔ اس قصہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کیفیات کافر کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس چیز کے حصول میں اسلام بھی شرط نہ ہو وہ کیونکر مقصود اور قرب کا موقوف علیہ ہو سکتی ہے ہرگز نہیں خوب سمجھ لو کہ ان کیفیات کو قرب میں کچھ دخل نہیں نہ یہ مقصود تصوف ہیں۔ اور ایک مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کفار کو مرید کرنا اسلام سے انکو قریب کرنا نہیں ہے بلکہ بعید کرنا ہے آجکل ایک صاحب پیر بنے ہوئے ہیں اُن سے ہندو بھی مرید ہیں۔ اور ستم بر ستم یہ کہ آپنے ایک رسالہ میں یہ بھی شائع کیا ہے کہ میرے بعض ہندو مرید مجھسے کہتے ہیں کہ اگر آپ کہیں تو ہم مسلمان ہو جائیں میں نے اُن کو لکھدیا ہے کہ نہیں مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہندو رہکر بھی کامیاب ہو سکتے ہیں (یا اسی کے قریب کچھ الفاظ تھے) بتلائیے جو شخص مسلمان ہونیوالیکو اسلام سے

ف بعض مسلمان ہندوؤں کو اپنا مرید بنا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اسلام سے قریب ہو جائینگے حالانکہ بعید ہو جاتے ہیں۔

ف ایک جاہل صوفی نے اپنے ہندو مریدوں کو لکھدیا کہ مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں۔

روکے اور یہ کہے کہ اسلام کی ضرورت نہیں اُسکے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے مگر یہ کمبخت پھر بھی
شیخ طریقت اور پیر ہونیکے مدعی ہیں نہ معلوم یہ کیسا تصوف ہے جسکے لئے اسلام کی بھی ضرورت
نہیں سلف کے نزدیک تو تصوف کے معنی تعمیر الظاہر والباطن تھے کچھ عرصہ سے تعمیر ظاہر
کو تو لوگوں نے تصوف سے نکال ہی ڈالا تھا اب ایسے خلف (بسکون اللام ۱۲) پیدا ہوئے جنھوں نے تعمیر باطن
کو بھی اُس سے الگ کردیا کہ ایمان واسلام سے بھی دل کو آباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب ایمان
وعمل دونوں اجزا جاتے رہے تو فرمائیے وہ تصوف کیا خاک رہا۔ بلکہ محض جوگ رہ گیا۔ پھر یہ لوگ
اپنے کو صوفی کس لئے کہتے ہیں جوگی کہنا چاہیئے۔ انہی وجوہ سے بعض لوگ تصوف سے بداعتقاد
ہوگئے کہ یہ عجب گورکھ دھندا ہے جسمیں اسلام کی ضرورت نہ ایمان کی نہ عمل کی نہ معاصی سے بچنے
کی اور ظاہر ہے کہ سب مسلمان تو ایسے جاہل نہیں کہ اُنکو دین کی کچھ بھی عقل نہو وہ اس حالت کو
یقینی بددینی سمجھتے ہیں اور ان جوگیوں کی وجہ سے جنھوں نے شیخ اور صوفی کا لقب اختیار
کر رکھا ہے اس فیصلہ پر مجبور ہوئے کہ تصوف زندقہ اور بددینی کا نام ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ
کیا چند اناڑی عطائیوں کے غلط سلط نسخوں سے فن طب یا محقق اطبا سے بھی آپ بداعتقاد
ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ عطائی صوفیوں کی حرکات سے آپ تصوف کو چھوڑ دیں
اور محقق صوفیہ سے بھی بداعتقاد ہو جائیں جسطرح آپ علم طب میں محقق طبیب کی تلاش کرتے ہیں
اسی طرح تصوف میں بھی محقق صوفی کو تلاش کرنا چاہیئے سب سے بداعتقادی کی کیا وجہ ہے۔
غرض میں کیفیات کے غیر مقصود ہونیکو بتلا رہا تھا کہ ان کے حصول میں اسلام کی بھی ضرورت
نہیں تو پھر یہ مدار قرب کیونکر ہو سکتے ہیں اب ایک بات اور کہتا ہوں کہ دین میں مقصود وہ ہوتا ہے
جو بدون تحصیل کے حاصل نہو جسکا حصول صرف اختیار پر موقوف ہو اور قرآن میں منصوص ہے کہ
بعضے احوال جیسے کشف مرتے ہی سبکو خود بخود حاصل ہو جائیں گے یہانتک کہ کفار کو بھی چنانچہ
ارشاد ہے وبدا لھم من اللہ مالم یکونوا یحتسبون اور فرماتے ہیں فکشفنا عنک غطاءک
فبصرک الیوم حدید۔ اور ارشاد ہے اسمع بھم وابصر یوم یاتوننا۔ باقی میرا یہ مطلب
نہیں کہ یہ محمود بھی نہیں۔ اگر کسی کو کیفیات محمودہ حاصل ہوں (جسکی محمودیت کا معیار آپ کو ابھی
معلوم ہو چکا ہے کہ اُس سے طاعت میں ترقی اور گناہوں میں کمی ہو) تو نور علی نور ہے خدا کی نعمت ہے

اسکی قدر کرے اور نہ حاصل ہوں تو کچھ غم نکرے اسوقت اُسکو مولانا رومی رح کا یہ شعر سنایا جائیگا ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست — تو بماں ای آنکہ جز تو پاک نیست

ہمارے حضرت حاجی صاحب رح سے جب کوئی یہ کہتا کہ اتنی لاکھ دفعہ ذکر کرتا ہوں مگر نفع نہیں ہوتا تو فرمایا کرتے کیا یہ نفع تھوڑا ہے کہ اتنی لاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہوگئی - ہمارے ایک دوست بھی ذکر وشغل کے پابند ہیں مگر طالب کیفیات ہیں اور کیفیات انکو حاصل نہیں ہوتیں کیونکہ کیفیات کا مدار یکسوئی پر ہے اور یکسوئی کم عقلوں کو زیادہ ہوجاتی ہے عاقلوں کو خاصکر صاحب ذکاوت مفرطہ کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اُسکا دماغ ہروقت حرکت فکریہ میں رہتا ہے اسی لئے میں نے اُن سے کہدیا تھا کہ تمکو کیفیات کبھی حاصل نہونگے تم صرف ذکر وشغل کو غنیمت سمجھکر کئے جاؤ - مگر وہ طلب سے باز نہ آئے ایک صاحب توجہ وتصرف بزرگ کے پاس گئے انھوں نے ان سے روزے رکھوائے اور درود واستغفار نمعلوم کتنا پڑھوایا پھر ان پر توجہ ڈالی - ایک دن ڈالی پھر دوسرے دن پھر تیسرے دن مگر اثر ہی نہوا ایک کیفیت بھی حاصل نہوئی - اسوقت انکو میرے قول کی تصدیق ہوئی کہ واقعی میں کیفیات کے قابل نہیں ہوں اسوقت طلب کیفیت دل سے نکلی اور اسکے قبل ان ہی کا ایک واقعہ اور ہوا تھا کہ انکو ایک ریاست میں جہاں عرصہ تک ملازم رہے تھے کسی کام سے جانا پڑا مجھسے اجازت لی میں نے اجازت دیدی گو میں جانتا تھا کہ اس سفر سے معمولات ناغہ ہوں گے مگر میں نے قصداً یہی سمجھکر اجازت دی تھی کہ ذرا ان کو ذکر وشغل کی قدر تو معلوم ہو چنانچہ اس سفر میں معمولات کے ناغہ ہونیسے انکو اپنے قلب میں ایک ظلمت سی محسوس ہوئی اور وہ جو ذکر اللہ سے خاص نور پیدا ہوا تھا اُسمیں کمی ہوئی تو وہ بڑے گھبرائے اور نہایت قلق ہوا میرے پاس خط لکھا جسمیں اپنی تباہی اور بربادی کا رونا رویا تھا میں نے لکھا کہ آج ان معمولات کے ناغہ ہونیکی فکر کیوں ہے اُسکا قلق اسقدر کسلیئے ہے یہ تو وہی ہے جسکی تم تحقیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بدون کیفیت کے معمولات لاشے ہیں ان واقعات کے بعد وہ چین سے بیٹھے اور سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا ہی بڑی دولت ہے یہ دولت ہر اک کو حاصل نہیں ہوتی - اگر وہ تمسے توفیق سلب کرلیں اور تم ایک دفعہ بھی اللہ کا نام نہ لیسکو تو بتلاؤ کیا کرلوگے ؎ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے سنبھلو کیا کیفیات لئے پھرتے ہو - تم اس غیر مقصود کی طلب میں مقصود کی بیقدری کرکے کہیں اس سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھنا

عاقلوں کو کیفیات کم ہوتی ہیں اس پر ایک واقعہ

۸

توفیق ذکر بڑی دولت ہے اس پر ایک عبرتناک حکایت

کیونکہ ایک صورت قہر نازل ہونے کی یہ بھی ہے کہ خدا کا نام لینے کی توفیق سلب ہو جائے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ کلمہ توحید زبان سے نکالنا چاہا مگر زبان نہ چلی اور سب باتوں میں زبان چلتی تھی مگر کلمہ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ یہ عارف تھے گھبرا گئے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اسکا کیا سبب ہے الہام ہوا کہ فلاں دن جسکو اتنے سال ہوئے تمنے ایک بیجا کلمہ زبان سے نکالا تھا اور ابتک اُس سے توبہ نہیں کی آج اُس کی یہ سزا مل رہی ہے کہ کلمہ کی توفیق سلب ہو گئی اس گناہ سے توبہ کرو تو عذاب ٹلے۔ چنانچہ انھوں نے توبہ کی توبہ قبول ہوئی اور یہ وبال رفع ہوا حضرت اسکو معمولی بات نہ سمجھئے کہ آپ کو ذکر کی توفیق ہو گئی واللہ یہ بڑی دولت ہے ورنہ ہزاروں لاکھوں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں جنکی زبان کو خدا نے توفیق ذکر سے بند کر دیا ہے۔ جیسے ایک حکایت ہے کہ غلام اور آقا بازار کو گئے راستہ میں مسجد آگئی غلام نمازی تھا آقا بے نمازی غلام نے نماز پڑھنے کیلئے آقا سے اجازت چاہی اُس نے اُسکو اجازت دیدی اور خود مسجد کے دروازہ پر بیٹھ گیا جب نماز ختم ہو گئی اور نمازی مسجد سے نکلنے لگے تو آقا صاحب کو انتظار ہوا کہ اب غلام بھی آتا ہو گا مگر وہ نہ آیا اور بہت دیر لگادی۔ اسپر آقا نے جھلا کر پکارا کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں۔ غلام نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتے! کہا کون نہیں آنے دیتا۔ کہا جو تمکو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجکو باہر نہیں آنے دیتا صاحبو! یہ توفیق اور عدم توفیق ہی تو ہے کہ غلام مسجد کے اندر نواب بنا بیٹھا ہے۔ اور آقا صاحب باہر سیڑھیوں پر منتظر نوکر بنے بیٹھے ہیں مگر آج کل ایسے مذاق کے بھی لوگ موجود ہیں جو بجائے اسکے کہ اس خذلان پر قلق کریں فخر کرتے ہیں چنانچہ ایک شخص کا بچھڑا ہاتھ سے چھوٹ کر مسجد میں گھس گیا مؤذن جھلانے لگا کہ لوگ جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں تو وہ بچھڑے والا جواب دیتا ہے کہ میاں جی کیوں بگڑتے ہو جانور بے سمجھ تھا مسجد میں آگیا بھلا کبھی تمنے ہمیں بھی یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کمبخت کے نزدیک مسجد میں جانا کم سمجھ لوگوں کا کام ہے۔ مگر ایسے نامعقولوں کو موت کے بعد جواب معلوم ہو جائیگا یہاں وہ قابل خطاب نہیں ہیں۔ بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذکر اللہ ہی بڑی دولت ہے اسکی قدر کرو اور کیفیات کے درپے ہو کر اسکی بیقدری نہ کرو۔ مولانا رومی قدس سرہ نے اسپر ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک سالک کو شیطان نے دھوکہ دیا کہ تم برسوں سے ذکر شغل تہجد وغیرہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ کوئی پیام ہے نہ سلام ہے تو پھر تم ہی کیوں سر مارتے ہو جب وہ پوچھتے تک بھی نہیں۔ اس دھوکہ کا اُسکے ذہن میں کچھ جواب نہ آیا تو اس

حکایت غلام و آقا کی

9

حکایت ایک سالک کی جسکو شیطان نے دھوکہ دیا اور ...

رات اُس نے ذکروشغل و تہجد سب ترک کر دیا سوتے ہوئے کوئی لطیفہ غیبیہ خواب میں آیا اور اس نے
حق تعالیٰ کی طرف سے پوچھا کہ کیوں صاحب آج ہم کو چھوڑ کر کیوں سو گئے نہ ذکر کیا نہ تہجد میں اٹھے
اُس نے وہی جواب دیا جو شیطان نے دھوکہ میں پڑھایا تھا کہ اُدھر سے تو کچھ پیام و سلام ہے ہی
نہیں پھر میں ہی کیوں سر مارُوں وہاں سے جواب ارشاد ہوا ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

کہ یہ اللہ اللہ کہنا خاصکر ایک دفعہ اللہ کہکر دوبارہ زبان سے اللہ نکلنا یہ ہمارا جواب ہی تو ہے کہ ہاں
ہمنے پہلا قبول کر لیا ہے اگر پہلا قبول نہوتا بلکہ ناگوار ہوتا تو زبان بند کر دیتے اور ذکر کی توفیق
سلب کر لیتے کیونکہ جس شخص کا دربار میں آنا بادشاہ کو ناگوار ہو اور بادشاہ صاحب قدرت بھی ہو تو
وہ پہلی ہی دفعہ کان پکڑ کر اُسکو نکالدیتا ہے۔ حاجی صاحب رح نے اس سے ایک مسئلہ مستنبط فرمایا ہے
کہ جس طاعت کے ایک دفعہ کرنیکے بعد دوبارہ اُسکی توفیق ہو جائے تو سمجھو کہ پہلی طاعت قبول
ہو چکی یہ علامت قبول کی ہے اور گو یہ استنباط قطعی نہیں مگر ظاہر عادۃ اللہ اور وسعت رحمت الٰہی کے
مقتضی ہے پس تغلیب رجا میں یہ بہت نافع ہے جو کہ شرعاً مامور بہ ہے لا یموت احدکم الا وھو
یحسن الظن بربہ الغرض آج کل بیعت کی حقیقت و غایت میں عام طور سے غلطی ہو رہی ہے لوگ
مقاصد و غیر مقاصد میں فرق نہیں کرتے نہ اعمال کا اہتمام کرتے ہیں نہ اعمال پر روک ٹوک ہے
حالانکہ تعلق بیعت میں طرفین سے التزام بھی ہے اطاعت کا اور معاہدہ ہے اصلاح کا پھر بھی وہاں روک
ٹوک نہیں صرف وظائف کی بھرمار ہے اور اگر کچھ روک ٹوک ہے بھی تو صرف دو چار اعمال پر جنکا ضروری
ہونا سبکو معلوم ہے حالانکہ وہ باتیں زیادہ بتلانا چاہئیں جنکی مخاطب کو ضرورت ہی معلوم نہیں
مگر ایسی باتیں کیونکر بتلائیں اُنکی ضرورت سے خود شیخ ہی منکر ہیں اور منکر اسلئے ہیں کہ اُن سے خود کورے ہیں
اسی لئے امام غزالی رح فرماتے ہیں کہ اے عزیز! تمھاری اصلاح کی کیا امید ہو جبکہ تمھارے طبیب ہی مریض ہیں
صاحبو! بیعت ہونیکے بعد جن چیزوں پر روک ٹوک زیادہ ضروری ہے وہ اس قسم کی ہیں۔ کبر و عجب
اضاعت حقوق العباد حسد و بغض۔ فساد ذات البین وغیرہ مگر آج کل ان امور پر مطلق روک ٹوک نہیں
حالانکہ پہلے زمانہ میں مشائخ کو اول اسی کا زیادہ اہتمام تھا وظائف تو سالہا سال کے بعد تعلیم کرتے تھے
اور یہی نہیں کہ محض زبان سے ان امور پر روک ٹوک کریں بلکہ تدبیروں سے ان امراض کو قلب سے نکال لیتے تھے

ف شیوخ اگر روک ٹوک کرتے بھی ہیں تو دو چار مشہور اعمال پر حالانکہ ضرورت ان امور پر تنبیہ کی ہے جنکی ضرورت کا انکو علم نہیں۔

مثلاً کسی کو زینت پرستی میں مبتلا دیکھا تو اُسے سڑکوں پر یا خانقاہ میں جھاڑو دینا بتلایا اور جسمیں تکبر دیکھا اُسکو نمازیوں کے جوتے سیدھا کرنا تعلیم کر دیا جسمیں ایک جولاہے کے بھی جوتے تھے جو اس متکبر کی رعیت کا جولاہا ہے اُسکے جوتے سیدھے کرتے ہوئے بس جگر ہی تو کٹ گیا اور دل پر آرہ ہی تو چل پڑا مگر یہ حالت ایک دو دفعہ میں ہوتی ہے پھر افعال تواضع میں خاصیت ہے کہ ان سے قلب میں بھی تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ کرتے کرتے ہر قسم کی عادت ہو جاتی ہے حضرت شیخ ابو سعید گنگوہیؒ کا قصہ میں نے بارہا بیان کیا ہے غالباً سامعین اکثر اس سے واقف ہونگے کہ سلطان نظام الدین بلخیؒ نے انکے عجب کا کس طرح علاج فرمایا تھا کہ اول انکو حمام جھونکنے کی خدمت سپرد کی پھر سال بھر کے بعد بھنگن سے کہا کہ ان کے سر پر ذرا سی اپنے ٹوکرے کی مٹی جھاڑ دے جب وہ اسپر جھلائے تو ایک مدت تک پھر یہی خدمت اور لی اور اسکے بعد مدت تک پھر بھی خدمت لی پھر شکاری کتوں کی خدمت سپرد کی اور یہ کام اس شخص سے لئے جو گنگوہ کے پیرزادے بھی تھے اور قطب زادے بھی تھے اس قسم کی خدمتیں لیکر پھر کہیں ذکر شغل بتلاتے تھے۔ اے صاحب اس قسم کی تعلیم کا تو آج کل کہیں پتہ بھی نہیں۔ حالانکہ ضرورت اسی کی ہے کیونکہ شیخ کو طبیب کیطرح ہونا چاہئے کہ ہر مریض کو ایک ہی نسخہ نہ دے بلکہ نسخے بدلتا رہے جیسا مریض دیکھے ویسا ہی نسخہ بتلائے اور ایک مریض کو بھی ایک نسخہ نہ دے بلکہ اسکے لئے بھی حسب ضرورت تبدل وتغیر کرتا رہے مگر آج کل شیوخ کے یہاں بس ایک ہی طریقہ سبکے لئے ہے یہ طرز ٹھیک نہیں بلکہ ہر شخص کے مناسب اسکے امراض کی تشخیص کے بعد جدا جدا تعلیم ہونا چاہئے۔ اور اُنکو رات دن اعمال و اخلاق پر ٹوکنا چاہئے۔ اور جن اعمال کا دین ہونا عام طور سے معلوم ہے اُس کا اہتمام اسقدر زیادہ ضرور نہیں بلکہ جن باتوں کا دینی ہونا لوگوں کو معلوم نہیں اُن کا خاص اہتمام کرنا چاہئے۔ مثلاً اصلاح اخلاق کو آج کل دنیوی امور سے سمجھتے ہیں اصلاح اخلاق کو دین نہیں سمجھتے مثلاً لوگوں کو اسکا اہتمام ہی نہیں کہ ہمارے فعل یا قول سے کسی کو ایذا نہ پہونچے نہ اسکو دین کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ کہ مسلمان وہ ہے جسکی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں حضورؐ نے اسپر اسلام ہی کو موقوف فرمایا ہے گو علماء نے اسمیں تاویل کر لی کہ مراد کمال اسلام کا موقوف ہونا ہے مگر حضورؐ کے الفاظ تو یہی ہیں کہ مسلمان وہی ہے جسکے ہاتھ اور زبان سے

واقعہ حضرت شیخ ابو سعید گنگوہیؒ کا

شیخ کو طبیب کی طرح ہونا چاہئے کہ ہر مریض کو ایک ہی نسخہ نہ دے

اصلاح اخلاق کا اہتمام زیادہ کرنا چاہئے

مسلمان بچے رہیں یعنی جو ایسا نہو وہ مسلمان ہی نہیں گیا ان الفاظ کا اطلاق کچھ اثر نہیں رکھتا گو مراد وہی ہو جو علماء نے فرمائی ہے۔ اب میں ایک واقعہ آپکو سناتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اسکا کس درجہ اہتمام تھا حدیث میں آتا ہے کہ ایک رات آپ حضرت عائشہ رضہ کے گھر تھے کیونکہ اُنکی باری تھی اور وہ رات شب برات کی تھی حضور کو نصف شب کے وقت حکم ہوا کہ جنۃ البقیع کے مسلمانوں کیلئے جاکر دعا کریں تو آدھی رات آپ اُٹھے جسکی کیفیت حضرت عائشہ یوں بیان فرماتی ہیں کہ قام رویدا وفتح الباب رویدا ثم خرج رویدا ثم اغلقہ رویدا حضور آہستہ سے اٹھے آہستہ آہستہ چلے۔ آہستہ ہی دروازہ کھولا آہستہ ہی باہر تشریف لیگئے آہستہ ہی اسکو بند کیا ہر کام آہستہ کیا تاکہ حضرت عائشہ رضہ کی آنکھ نہ کھل جائے انکو تکلیف نہو حالانکہ حضرت عائشہ رضہ کون تھیں حضور کی عاشق تھیں جن کا محبوب کیلئے بزبان حال یہ قول تھا ؎ گر بر سر و چشم من نشینی + نازت بکشم کہ نازنینی۔

اول تو عموماً بیوی کو شوہر سے ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اگر خاوند سوتی ہوئی کو جھنجھوڑ بھی دے تب بھی اُسکو ایذا نہو بلکہ راحت ہو اور خصوص حضرات ازواج مطہرات تو حضور کی سب سے زیادہ عاشق نہیں اور بالخصوص اُن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مگر اس تعلق پر بھی حضور نے انکی نیند کا اسقدر خیال فرمایا کہ سب کام آہستہ کئے۔ مگر یہ تو عاشق تھیں انکو خبر کیسے نہوتی گو حضور نے سامان ایسا کیا تھا کہ انکو خبر نہو مگر جب مکان حضور سے خالی ہوا تو حضرت عائشہ رضہ کے قلب نے حالت نوم ہی میں اسکا احساس کیا اور انکی آنکھ کھل گئی آنکھ کھولنے کے بعد جب حضور کو نہ پایا تو بڑی پریشانی ہوئی کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید آپ کسی بیوی یا باندی کے پاس چلے گئے یا آخر پریشانی میں گھر سے نکلیں اور آپکو جاتے ہوئے دیکھکر بقیع کی طرف چلیں دیکھا کہ حضور امت کیلئے دعا فرما رہے ہیں یہ حالت دیکھکر اطمینان ہوا اور یہ واپس ہوئیں اور پیچھے پیچھے حضور بھی واپس ہوئے اور راستہ میں حضرت عائشہ رضہ کے قریب ہی آپ بھی پہونچ گئے۔ حضرت عائشہ رضہ نے اس خیال سے کہ حضور کو معلوم نہ ہو تیز تیز چلنا شروع کیا حضور کو خیال ہوا کہ یہ آگے آگے کون ہے آپنے بھی تیز چلنا شروع کیا یہانتک کہ حضرت عائشہ رضہ بھاگنے لگیں اور حضور سے پہلے اپنے گھر میں داخل ہو کر بستر پر لیٹ گئیں مگر سانس پھولا ہوا تھا اُسکو کیونکر دباتیں۔ حضور جو گھر میں تشریف لائے تو آپ کو حضرت عائشہ رضہ کا سانس پھولا ہوا معلوم ہوا فرمایا یا عائشۃ مالک حشیا رابیۃ یہ لمبا لمبا پھولا ہوا سانس کیوں آرہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرے آگے آگے تم ہی بھاگی ہوئی آرہی تھیں اسپر حضرت عائشہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل

حضور کا ایک اور واقعہ

ہنس پڑیں تو حضور نے فرمایا اتخافین ان یحیف اللہ علیک و رسولہ اسی طرح حضرت مقداد بن الاسود صحابی فرماتے ہیں کہ ہم چند آدمی بھوکے پیاسے مدینہ پہونچے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمکو اپنے ذمہ کرلیا حضور کے یہاں چند بکریاں پلی ہوئی تھیں اُن کا دودھ آپنے ہمکو بتلادیا ہم سب بھی پی لیتے اور حضور کیلئے بھی رکھدیتے۔ حضرت مقداد فرماتے ہیں کہ ایک رات حضور کو مکان پر تشریف لانے میں ذرا دیر ہوئی میں یہ سمجھا کہ شاید کسی نے آپ کی دعوت کردی ہوگی اس خیال سے میں نے آپ کے حصہ کا بھی دودھ پی لیا۔ پی تو لیا مگر بعد میں خیال ہوا کہ اگر حضور کی دعوت نہوئی ہو اور حضور بھوکے پیاسے رہے تو کیونکر ہوگی بس یہ خیال آنا تھا اور مجھے بیچینی لگی اب ہر چند کروٹیں بدلتا ہوں مگر چین نہیں آتا یہانتک کہ حضور بہت دیر میں تشریف لائے اور آہستہ کواڑ کھولے اور ایسا آہستہ سلام کیا جسکو جاگنے والا سن لے اور سونیوالا نہ جاگے اللہ اکبر کیسا عدل جامع بین حق اللہ وحقوق العباد تھا کہ نہ تو سونیوالوں کی اتنی رعایت کہ سلام ہی نکریں کیونکہ احتمال اس کا بھی ہے کہ شاید کسی عارض سے کوئی جاگ رہا ہو۔ اور نہ اتنا غلو کہ زور سے اس طرح سلام کریں کہ سبکی آنکھ کھل جائے چنانچہ آجکل صوفی اور سالکین بھی ان امور کی رعایت نہیں کرتے رات کو اٹھتے ہیں تو زور کے ساتھ کھٹ پٹ چلتے ہیں۔ استنجا کیلئے ڈھیلے بھی زور سے پھوڑتے ہیں۔ پانی بھی زور سے بھرتے ہیں کلی بھی زور سے کرتے ہیں۔ آخر یہ کیا طریقہ ہے کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ کسی دوسری قوم کیلئے ہی کہ وہ اسپر عمل کریں اور تم عمل نکرو۔ پورا قصہ یہ ہی کہ پھر حضور اُس برتن کی طرف چلے جسمیں دودھ رکھا جاتا تھا اسکو خالی پایا تو آپ نماز میں مشغول ہوگئے اور نماز کے بعد حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ اسوقت جو مجھے کھانا کھلائے اُسکو آپ بھی روزی دیجئے اُسوقت حضرت مقداد سے نرہا گیا اور اللہ کا نام لیکر بکریوں کے نیچے جا بیٹھے تو دیکھا کہ حضور کی دعا کی برکت سے سب کے تھن خوب بھرے ہوئے ہیں تب بہت سا دودھ لیکر آپ کے پاس آئے آپنے پی لیا تو ان سے کہا کہ تم بھی پیو اسپر یہ بہت ہنسے حضور نے سبب پوچھا تو سارا واقعہ سنایا۔ غرض حضور کا تو یہ طریقہ تھا مگر ہمکو اتباع نبوی کا ذرا اہتمام نہیں اور ایک مرض ہم میں یہ ہے کہ کسی جگہ سے کوئی چیز اٹھائیں گے تو اسکو بے جگہ رکھدیں گے جس سے دوسروں کو تلاش میں پریشانی ہوتی ہے۔ چارپائی بچھائیں گے تو بالکل راستہ میں پھر اسکو وہیں چھوڑکر کھڑی ہوجائیگی چاہے رات کو کوئی اُلجھ کر ہی گر پڑے اور ہاتھ پاؤں یا سر ہی پھوٹ جائے۔ اسی طرح جماعت کے بعد نفلوں کی

نیت ایسی جگہ باندہیں گے جس سے لوگوں کو چلنے پھرنے میں تکلیف ہو کسی جگہ سے برتن میں کھانا آیا تو اب یہ نہیں ہوتا کہ اُس کا برتن جلدی خالی کر دیں بلکہ اُسی میں کھانا شروع کر دیں گے بلکہ کئی روز تک اُسکو محبوس رکھیں گے اور دوسرا شخص برتن مانگے تو کہتے ہیں کیا ہم رکھ لیں گے میں کہتا ہوں کہ دیر کرنے میں یہی اندیشہ ہے کہ تم رکھ لو یعنی رکھکر بھول جاؤ چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی کے برتن جلدی واپس نہ کئے اور رکھکر بھول گئے پھر مہینوں تک وہ اپنے ہی گھر پڑے رہے اگر مالک کو خود ہی یاد آگئے تو وہ خود بلا سے لیجائے ورنہ بس وہیں رہ جاتے ہیں۔ آخر یہ باتیں کلفت کی ہیں یا نہیں۔ پھر ان سے احتراز کیوں نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح مریدوں کی عادت ہے کہ پیر کے ساتھ کسی جگہ جائیں گے تو جماعت کی جماعت بیس پچیس آدمیوں کی ساتھ جائے گی اور وہ پیر بھی حضرت ہیں جو اس لشکر کو ساتھ لئے جا رہے ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ تمنے مرید کیا ہے یا لام بندی کی ہے۔ کسی پر چڑھائی کروگے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جس شخص کے یہاں یہ بیس پچیس آدمی جا کر مہمان ہوں گے۔ کیا اُسکو گرانی نہ ہوگی پیر کی دعوت اور خدمت کو تو وہ فخر سمجھے گا مگر اس لشکر کی خدمت وضیافت ضرور اُس کو گراں ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ان تکالیف کی پروا نہیں ہوتی اور اُن کو جان جانکر ایذا دی جاتی ہے اور ذرا دلپر چوٹ نہیں لگتی۔ اب اگر کوئی ان باتوں پر روک ٹوک کرے تو وہ بدنام ہوتا ہے کہ بڑے قانونی ہیں ہر بات کیلئے ان کے یہاں قانون ہے کہ یوں بولو۔ یوں اٹھو۔ یوں کھڑے ہو۔ اے صاحب تم بزرگوں کا تذکرہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مشائخ کے یہاں زمان سابق میں اسی قسم کی تعلیم تھی اور انہی باتوں پر روک ٹوک تھی میرے استاد فرماتے تھے کہ ایک بزرگ کا معمول تھا کہ جو شخص اُن کے یہاں مہمان ہوتا اُسکے لئے انداز سے کچھ زاید روٹی سالن بھیجتے پھر جب سالن روٹی بچکر آتا تو دیکھتے اگر تناسب سے بچا ہوتا تب تو وہ اُسکو اپنے سلسلہ میں داخل فرماتے ورنہ صاف کہدیتے کہ تمھاری طبیعت میں بیڈھنگا پن ہے ہمسے تمسے نباہ نہوگا۔ ایک حکایت اور سنی گئی ہے کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء دہلوی کے یہاں دو شخص مرید ہونے آئے۔ وہ آپسمیں مسجد کا حوض دیکھکر کہنے لگے کہ ہماری مسجد کا حوض اس سے بہت بڑا ہے۔ سلطان جی نے یہ گفتگو سُنلی بلایا اور پوچھا کہ تمھارا حوض اس سے

ف: ان باتوں کا بیان جنسے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے۔

ف: بزرگوں کی تعلیم کا طرز۔

ف: حضرت سلطان نظام الدین اولیا کی حکایت۔

کتنا بڑا ہے، کہا حضرت پیمائش تو معلوم نہیں۔ فرمایا اچھا جاؤ اس حوض کی پیمائش کر کے لیجاؤ اور اُسکو پیمائش کر کے آؤ چنانچہ وہ گئے اور پیمائش کر کے واپس ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت ہمارا حوض ایک بالشت بڑا ہے۔ فرمایا تم تو کہتے تھے بہت بڑا ہے ایک بالشت زیادہ کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے جاؤ ہم تمکو بیعت نکرینگے۔ یہ مت سمجھنا کہ حضرت سلطان جی نے ان کو محروم واپس کر دیا نہیں بلکہ اتنی بڑی دولت دیکر واپس کیا جو تمام عمر کام آئے گی وہ کیا؟ احتیاط فی الکلام کا سبق ایسا پڑھایا جو عمر بھر نہ بھولیں گے یہی تو فرق ہے محقق و غیر محقق میں کہ محقق دھتکارتا بھی ہے تو کچھ دیکر اور غیر محقق عمر بھر چمکارتا ہے مگر محروم کا محروم رکھتا ہے۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا ہے اور انکا واقعہ سنا ہے کہ ان کے پاس ایک بڑھیا آئی اور آکر فقر وغیرہ کی شکایت کی آپنے خادم سے فرمایا کہ اس سے کہدو خدا فضل کرے مرید نے یوں کہا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ بس یہ بزرگ اس خادم کے سر ہو گئے کہ میں نے کب کہا تھا تمنے یہ گا اپنی طرف سے کیوں لگایا۔ حضرت غور کیا جائے تو یہ بات ٹوکنے کی ضرور تھی کیونکہ اس تغیر سے کلام کے معنی بدل گئے صورت اولیٰ میں دعا تھی کہ اللہ فضل کرے اور اس صورت میں پیشین گوئی ہو گئی کہ بیفکر رہو خدا فضل کر دے گا اسی لئے اُن بزرگ نے سخت تنبیہ کی کہ تمنے میری بات کو کیوں بدلا تجھے غیب کی کیا خبر! اب اگر کوئی یہ کہے کہ ذرا سی بات پر بگڑنا ظلم ہے تو میں کہتا ہوں یہ ظلم نہیں بلکہ عدل ہے اور اسکی ایسی مثال ہے جیسے ڈاکٹر و طبیب بیمار کی بد پرہیزی پر روک ٹوک کرتا ہے یقیناً اسکو کوئی ظلم نہیں کہسکتا۔ ایسے ہی یہ بھی ظلم نہیں ایک طبیب میرے دوست ہیں وہ کہتے تھے کہ میرے زیر علاج ایک بمبئی کا سیٹھ تھا اُس نے کوئی بد پرہیزی کی مجکو معلوم ہوا تو میں نے نبض دیکھنے سے انکار کر دیا اور کہدیا کہ جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو تمہارا علاج کیسے کروں اُس نے خوشامد شروع کی میں نے کہا کہ اب تو میں دس ہزار روپیہ لیکر نبض دیکھونگا۔ دوسرے تیسرے دن وہ شخص دس ہزار روپیہ کے نوٹ لیکر آیا کہ یہ تو نبض دیکھنے کیلئے فیس ہے اور علاج کی فیس اس سے الگ دونگا مگر اُن دوست نے ہمت کی کہ یہ رقم واپس کر دی اور کہدیا کہ مجھے تو تیرا علاج ہی منظور نہیں دس ہزار کا ذکر محض تعجیز کیلئے تھا تحدید کیلئے نہ تھا۔ تو حضرت اطبار جسمانی میں جو صاحب کمال طبیب ہیں وہ بھی مریض کی بدعنوانیوں پر ایسی سخت دار و گیر کرتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اطبار روحانی

ان کی خوشامد کریں ہرگز نہیں بلکہ ان کو سب سے زیادہ کرنا چاہئے کیونکہ ان سے تعلق ہی محض اسواسطے ہوا ہے کہ مرید ان کی اطاعت کرے اور یہ اُس کی اصلاح کریں۔

حضرت ذوالنون مصری رح کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت کا فلاں مرید شراب پیکر فلاں جگہ بدمست پڑا ہے آپ کو محسوس ہوا کہ یہ اُس کو حقیر اور اپنے کو افضل سمجھتا ہے اُس کا یہ علاج کیا کہ فرمایا جاؤ اُس کو اٹھا لاؤ وہ جب تک وہاں رہے گا سلسلہ کی بدنامی ہے۔ اسمیں اس کے تکبر کی اصلاح تھی کہ جسکو اس نے حقیر سمجھا تھا اُسی کی خدمت اس کے سپرد کی۔ جب وہ اُسکو لیکر چلا رستہ میں جو ملتا تھا کہتا تھا کہ یہ صوفیوں کا حال ہے دونوں نے شراب پی ہے۔ دوسرا ابھی ہوش میں ہے یہ اخفار حالت کے لئے اُس کو لیکر چلا ہے۔ تو یہ طریقہ تھا پہلے بزرگوں کا وہ اس طرح مریدوں کی اصلاح کرتے تھے وجہ یہ کہ اُن کو امر بالمعروف اور تبلیغ کی اہمیت کا علم تھا۔ آج کل افسوس ہے کہ ہملوگ اس فریضہ کو چھوڑے ہوئے ہیں جسکی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے قلوب مخلوق کی ہیبت سے بھرے ہوئے ہیں اس لئے ہمکو تبلیغ سے رکاوٹ ہے اور ہر شخص کو تبلیغ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی خواہ ہمکو کیسی ہی قدرت ہو اور دوسرا ہمارا ماتحت ہی کیوں نہو۔ رہا یہ کہ امر بالمعروف اور تبلیغ کسی عذر سے بھی معاف ہو جاتی ہے یا نہیں سو اس کو عمل شروع کرنے کے بعد بتلاؤں گا پہلے تم عمل شروع کردو اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب سے مخلوق کی ہیبت نکالدے اور ہمکو تبلیغ وامر بالمعروف کی توفیق عطا فرمائے آمین وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین۔

اشرف علی

۱۶ رجمادی الاولی سنہ ۱۳۴۷ھ۔

ف حضرت ذوالنون مصری کا واقعہ

ف تبلیغ میں کوتاہی کا راز ہم پر کہ دل پر مخلوق کی ہیبت ہمار ۱۶

ف دعا اور ختم بیان۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

اٹھارہواں وعظ مسمی بہ

الفصل والانفصال

فی

الفعل والانفعال

منجملہ ارشادات حکیم الامت حضرت مرشدی و مولائی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شایع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمی ب

الفصل والانفصال

فی

الفعل والانفعال

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	ما ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس خصوصیت سے [illegible]	کس نے ضبط کیا	سامعین کس قدر تھے [illegible]	متفرقات
[illegible] کی کوٹھی میں	۲۲ شوال ۱۳۲۷ھ	۳ ۱/۲ گھنٹہ	جالسا علی الکرسی	بعض حضرات کی درخواست پر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت ربنا لا تؤاخذنا ان
نسینا او اخطأنا ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولا
تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم
الکافرین ٥ میں نے برکت کیلئے سب آیتیں پڑھ دی ہیں مگر مقصود بالبیان صرف اول کے
جملے ہیں ہر چند کہ یہ مضمون اہل علم کے زیادہ مناسب ہے اور ان میں سے بھی زیادہ مناسب اُنکے
ہے جو اہل عمل ہیں اور اہل عمل میں بھی اہل حال کے زیادہ مناسب ہے مگر سب مسلمان فی الجملہ علم
وعمل وحال سے متصف ہیں ہی اسلئے فی الجملہ یہ مضمون سب کے مناسب ہے گو بظاہر خشک
مضمون ہے مگر ضرورت کی وجہ سے تر مضامین پر مقدم اور اُن سے اہم ہے۔ اور یہ مضمون مختصر
بھی ہے اور عمل میں سہل بھی ہے ان وجوہ سے بھی یہ اہم ہے کہ ضرورت کا بھی ہے مختصر بھی
ہے سہل بھی ہے۔ اور مختصر مضمون اسلئے بھی اختیار کیا گیا کہ طبیعت کسلمند ہے بیان کا قصد
تو بالکل نہ تھا مگر بعض مہمانوں کی خاطر قصد کر لیا گیا۔ اور ارادہ کے بعد خیال یہ ہوا تھا کہ مدرسہ
میں بیان کروں مگر بعض مہمان مستورات بھی ہیں اُنکو بھی سنانا چاہا اسلئے گھر میں بیان
تجویز ہوا گو مستورات سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اسکو سمجھ سکیں گی مگر توکلا علی اللہ یہ ارادہ کر لیا
گیا کیونکہ ان مستورات کو بعض احوال تکوینیہ ایسے پیش آئے ہیں جنکی تعدیل کیلئے یہ مضمون زیادہ
مناسب ہے گو اُن کی سمجھ میں بھی نہ آئے تاہم احکام شرعیہ میں کچھ ایسا لطف ہے کہ جسکی وجہ
سے ہر سننے والے پر اُن کا اثر ہوتا ہے گو وہ کسی کے سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ احکام شرعیہ طبعًا
دل میں گھر کر لیتے ہیں اسلئے مجمع مستورات کو بھی فائدہ کی امید ہے کیونکہ مضمون فی نفسہ سہل ہے
و بعض مقدمات دقیق ہیں جو غیر اہل علم کی فہم میں نہ آئیں مگر اصل مضمون کچھ دقیق نہیں اور
عملًا تو بہت ہی سہل ہے۔ یہ ایک اجمالی حاصل ہے مضمون کا اور اُسکے محرک کا اور اُسکے سبب
اختیار کا اب میں وہ مسئلہ بیان کرتا ہوں۔ اور جو غلطی اسمیں کیجاتی ہے اُسکو رفع کرنا چاہتا ہوں جو
آیات میں نے تلاوت کی ہیں یہ مسئلہ اُنکے ابتدائی جملوں کا مدلول ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے جسکو
میں اکثر بیان کیا کرتا ہوں گو جسطرح آج اس آیت کے تحت میں سمجھ میں آیا ہے اس طرح کبھی بیان
نہیں ہوا اسلئے اسمیں گونہ جدت بھی ہے کیونکہ طرز بیان کے جدید ہونے سے بھی مضمون میں ایک قسم

جدت آجاتی ہے۔ مگر جدت فی نفسہا مطلوب نہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ مضمون میں جدت
نہونا رحمت حق ہے کیونکہ جدید محض ذہن سے مانوس نہیں ہوتا اور غیر جدید یا مانوس ہوتا ہے
اور جس بات سے ذہن کو انس ہوتا ہے وہ جلدی دل میں گھر کر لیتی ہے پس تعلیمات شرعیہ کا
پرانا ہونا اور سبق کہنہ ہونا ہمارے لئے رحمت ہے اگر احکام شرعیہ جدید محض ہوتے تو ذہن
سے مانوس نہوتے۔ اور غیر مانوس سے طبیعت اچھٹتی ہے پس جو لوگ بیان میں جدت کے
طالب ہیں وہ گویا مضمون غیر مانوس کے طالب ہیں۔ اب مقصود کو سنئے کہ حاصل اس مضمون کا
جسکو میں بیان کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ امور اختیاریہ قابل توجہ ہیں اور امور غیر اختیاریہ
غیر قابل توجہ ہیں اسکے بعد سمجھئے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں ایک اعمال یہ تو اختیاری ہیں
جنمیں بعض اعمال تو کرنے کے ہیں اور بعض بچنے کے ہیں مثلاً نماز روزہ زکوٰۃ وحج وغیرہ یہ اعمال
تو کرنے کے ہیں اور غیبت نکرنا تکبر نکرنا کسی کا مال غصب نکرنا قرض نہ مارنا یہ اعمال کف کے
متعلق ہیں کیونکہ کسی عمل سے بچنا بھی عمل ہے اعمال عدمیہ من حیث العدم تو عمل نہیں لیکن
من حیث الکف عمل ہیں۔ دوسرے احوال ہیں یہ غیر اختیاری ہیں پس حاصل یہ ہوا کہ اعمال
قابل توجہ ہیں اور احوال قابل توجہ نہیں کیونکہ اعمال سب اختیاری ہیں خواہ ظاہرہ ہوں یا باطنہ
یہ تعمیم اسلئے کی کہ بعض لوگ اعمال ظاہرہ کا تو اہتمام کرتے ہیں مثلاً نماز روزہ کا۔ مگر اعمال باطنہ
کا اہتمام نہیں کرتے مثلاً خدا سے محبت کرنا حالانکہ شرعاً یہ بھی مثل نماز کے ضروری ہے۔ بدون
محبت حق کے نماز بھی نماز نہیں مگر لوگوں کو اس کا اہتمام نہیں چنانچہ کبھی دلکو ٹٹولکر نہیں دیکھتے
کہ ہمیں خدا کی محبت کتنی ہے اور یہ بہت بڑی کوتاہی ہے۔ حدیث میں ہے لایکون احدکم
مومنا حتی یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما (ترجمہ۔ کوئی تم میں سے مومن
نہوگا جب تک اللہ اور اسکا رسول اسکے نزدیک سب ماسوا سے یعنی اپنے نفس اور مال اور
اہل وعیال سب سے زیادہ محبوب نہو جائیں ۱۲) یہ ایسی حدیث ہے جسمیں کوئی تاویل نہیں ہو سکتی
کیونکہ یہ کسی نص کے معارض نہیں اور تاویل تعارض ہی کی وجہ سے کیجاتی ہے۔ اب ہر شخص دیکھ لے
کہ اسکے دل میں اللہ ورسول کی محبت زیادہ ہے یا برادری واہل وعیال کی۔ سو بعض کو
تو اسکی فکر ہی نہیں۔ اور جنکو فکر ہے انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ محبت تو غیر اختیاری ہے

جب ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہے تو کیا کریں اور بعض نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی صورت تو یہ ہے کہ گھر بار ہر بیوی بچے چھوڑ کر ایک حجرہ میں بیٹھ جاؤ اور یہ ہو نہیں سکتا پس محبت الٰہی کا حاصل ہونا محال ہے اور محال نہیں تو دشوار تو ضرور ہے۔ بس یہ حساب اپنے دل میں لگا کر بیٹھ گئے اور تحصیل محبت الٰہیہ میں سعی چھوڑ دی رہا یہ کہ ترک محبت پر اللہ تعالیٰ مواخذہ فرمائیں گے سو اس کا اول تو انکو وہم ہی نہیں ہوتا اور اگر کچھ خیال ہوتا ہے تو دل کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ قیامت میں کہدینگے کہ یا اللہ جیسے اور گناہ آپ معاف فرمائیں گے ویسے ہی اس گناہ کو بھی معاف فرما دیجئے۔ مگر افسوس دنیا کے متعلق کسی نے یہ حساب نہیں لگایا جسطرح عذاب آخرت کے متعلق دلکو یہ سمجھا لیا ہے کہ کُٹ پٹ کر ایکدن نجات ہو ہی جاوے گی اسی طرح دنیا کے متعلق بھی تو دلکو سمجھانا چاہئے تھا کہ اگر دنیا میں راحت نہوئی تو بلا سے ایک دن سب تکالیف کا خاتمہ ہو ہی جائیگا۔ بلکہ دنیا کے متعلق یہ حساب اہون تھا کیونکہ دنیا کا زوال وانقطاع قریب وقت میں مشاہد ہے اور آخرت میں اگر ایکدن کو بھی عذاب ہو گیا تو آخرت کا ایک دن ہزار سال کے برابر ہے۔ وان یوماً عند ربك كالف سنة مما تعدون اور اگر خدانخواستہ دو چار دن کیلئے عذاب ہوا تو پھر کیا ٹھکانا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ دنیا کی تکالیف کا تو تحمل نہیں اور یہاں ہر شخص اپنے لئے راحت ہی تجویز کرتا ہے حالانکہ دنیا کی راحت وتکلیف چند روزہ ہے اور آخرت کی تکلیف وعذاب سے اسقدر بیفکری ہے کہ اسکے لئے ہر شخص نے اپنے دل میں ایک حساب لگا رکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم دنیا سے ترک تعلق کر کے جنید وشبلی بنجاؤ میں تو اس کا متمنی ہوں کہ مسلمان بنجاو۔ افسوس تو اسی کا ہے کہ آج کل اکثر مسلمانوں کا ایمان ہی کمزور ہے کہ نہ خدا ورسول کی محبت کی فکر ہے نہ آخرت کا خوف ہے۔ ایک مہینہ کی جیل سے جتنی وحشت ہے، عذاب جہنم کا اتنا بھی خوف نہیں۔ اب سنئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو اس حدیث میں مطلقاً فرماتے ہیں لا یؤمن احدکم جس کا مطلب یہ ہے کہ بدون اللہ ورسول کی محبت کے آدمی مومن ہی نہیں ہوتا۔ اگر خوارج ومعتزلہ نہوتے جو مرتکب کبیرہ کو کافر یا لا مومن ولا کافر کہتے ہیں تو علماء کو اس حدیث کی تقیید کی کچھ ضرورت نہتھی کیونکہ تقیید کے بعد وہ اثر نہیں ہوتا جو اطلاق کا اثر ہوتا ہے۔ مگر حضرات علماء نے

جو تقیید بضرورت کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دوسرے نصوص کو ملا کر یہ معلوم ہو گیا
کہ مقصود مقید ہے تو اعتقاد تقیید کا رکھو مگر اثر اطلاق کا لو۔ رہا یہ کہ لفظی اطلاق کا اثر ہی
کیا ہو گا جبکہ اعتقاد تقیید کا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ الفاظ کا اثر بھی بہت ہوتا ہے ورنہ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بجائے من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر کے فقد عصیٰ
فرماتے میرے پاس تاثیر الفاظ کے دلائل موجود ہیں کہ باوجود اتحاد معنی کے ہر لفظ کا اثر جدا
ہوتا ہے۔ جیسے باپ کو قبلہ وکعبہ کہو تو اور اثر ہے ابا کہو تو اور اثر ہے۔ اور ماں کا خصم کہو
تو جدا اثر ہے۔ بتلائیے یہ کس چیز کا اثر ہے معنی کا اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ معنی سب کے متحد ہیں یہ
اختلاف اثر محض اختلاف لفظ کی وجہ سے ہے مجھے خود ایک واقعہ پیش آچکا ہے کہ ایک زمانہ
میں مجھے اختلاج قلب کا مرض ہوا اور قوت اسدرجہ سلب ہو گئی کہ ایک طبیب نے قارورہ دیکھکر
یہ کہا کہ حیرت ہے یہ شخص زندہ کیونکر ہے قارورہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرارت غریزیہ بالکل
فنا ہو گئی قارورہ لیجانے والے میرے ایک دوست تھے انھوں نے یہ قول مجھسے آکر کہدیا
میں اُن پر بہت خفا ہوا کہ تمکو مریض سے ایسی بات نہ کہنا چاہیے تھی وہ نادم ہوئے اور کہنے
لگے کہ اب تو غلطی ہو گئی اس کا تدارک کیونکر ہو میں نے کہا اس کا تدارک یہ ہے کہ تم یہاں سے
واپس جاؤ اور کچھ دور سے لوٹکر آؤ اور مجھسے یوں کہو کہ میں نے پہلے جو بات کہی تھی وہ غلط تھی
حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ حالت اچھی ہے کچھ خطرہ نہیں انشاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ وہ دوست
کہنے لگے میرے اس کہنے سے کیا تدارک ہو گا جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ ہی کا پڑھایا ہوا
سبق آکر سنادونگا میں نے کہا تم نہیں جانتے اللہ تعالیٰ نے الفاظ میں بھی خاص اثر رکھا ہے
چنانچہ وہ گئے اور تھوڑی دیر میں آکر وہی الفاظ کہے جو میں نے سکھلائے تھے۔ تو میں نے اسوقت
اپنے اندر ان الفاظ کا اثر خود محسوس کیا اور دیکھتا تھا کہ ان الفاظ کے سننے سے وہ وحشت
جاتی رہی جو پہلے حکیم صاحب کا قول سنکر پیدا ہوئی تھی پھر خدا کے فضل سے چند روز ہی میں
مجھے صحت ہو گئی۔ تو جب اپنے پڑھائے ہوئے الفاظ میں اتنا اثر ہے تو غور کیجئے کہ جو الفاظ
اپنے سکھلائے ہوئے بھی نہیں ہیں اُن کا کیا کچھ اثر ہو گا گو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مراد کیا ہی
حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے فقد کفر فرمایا ہے فقد عصیٰ نہیں فرمایا گو مطلب

وہی ہے جو قتل عمد کا ہے مگر فقط کفر میں خاص اثر ہے۔ اور اسی لئے رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا و رسول کی محبت کے متعلق لا یؤمن فرمایا ہے کہ اسکے بغیر
آدمی مؤمن نہیں ہوتا اب بتلائیے اسکی فکر کیوں نہیں ہے ٹٹول کر دیکھو کہ دل میں اللہ و رسول
کی محبت زیادہ ہے یا بیوی بچوں کی۔ شاید تم کہو کہ تعارض آثار سے دونوں طرف ذہن جاتا ہے
اس کا معیار بتلاؤ جس سے فیصلہ کیا جاوے تو وہ معیار یہ ہے کہ جس معاملہ میں ایک طرف
اللہ و رسول کا حکم ہو اور ایک طرف اپنے نفس کی یا بیوی بچوں کی خواہش ہو تو اسوقت
یہ دیکھو کہ تم کسکو ترجیح دیتے ہو اگر تم نے اللہ و رسول کے حکم کو ترجیح دی تو بیشک تمکو اللہ
و رسول کی محبت ہے گو جوش و خروش نہو کیونکہ محبت کے الوان ہیں اسکو صوفیہ نے اچھی
طرح سمجھا ہے ورنہ اہل ظاہر تو سبکو کافر ہی بنا دیتے کیونکہ اُن کے نزدیک تو محبت جوش و
خروش ہی کا نام ہے اگر جوش نہو تو اُن کے نزدیک محبت ہی نہیں تو وہ سبکو محبت سے خالی کہتے
مگر صوفیہ نے کہا ہے کہ محبت کے دو لون ہیں ایک شوق کا رنگ ہے اسمیں جوش و خروش
ہوتا ہے ایک لون انس کا ہے اسمیں جوش و خروش نہیں ہوتا جیسے ایک محبت چھوٹے
بچہ سے ہوتی ہے ایک بڑے لڑکے سے دونوں کا لون مختلف ہے۔ اسی تحقیق سے محققین نے
احادیث مختلفہ میں تطبیق دی ہے کہ بعض احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
سے دریافت کیا گیا من احب الناس الیك کہ آپ کو آدمیوں میں کس سے محبّت زیادہ ہے
تو حضور نے اس سوال کے جواب میں کبھی تو فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے
زیادہ محبوب ہیں اور کبھی حضرت فاطمہ کا نام لیا اور بعض روایات میں ابو بکر صدیق کا نام
آیا ہے۔ محققین نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں تعارض کچھ نہیں کیونکہ محبت کے الوان و
انواع ہیں۔ ایک نوع محبت کی وہ ہے جو بیوی سے ہوتی ہے اس نوع میں حضرت عائشہ
کا مساوی کوئی نہیں ایک نوع محبت کی وہ ہے جو اولاد سے ہوتی ہے اسمیں حضرت فاطمہ کے
برابر کوئی نہیں ایک نوع وہ ہے جو دوستوں سے ہوتی ہے اس نوع میں حضرت صدیق کی
برابر کوئی نہتھا و علی ہذا القیاس۔ غرض محبّت کیلئے جوش و خروش کی ضرورت نہیں بدون
اسکے بھی محبت ہوسکتی ہے پس جو شخص اللہ و رسول کے احکام کو اپنی نفسانی خواہش اور

بیوی بچوں کی خواہش پر ترجیح دے اُسکو اللہ ورسول سے اسی درجہ کی محبت حاصل ہے
گو جوش نہو اور جو اپنے نفس یا اہل وعیال کی خواہش کو ترجیح دے اُسکو اللہ ورسول سے وہ
محبت نہیں تو اب کیا یہ بات فکر کی نہیں کہ ہمکو اللہ ورسول سے تعلق ہے یا نہیں ہیں یہ کہہ رہا تھا
کہ اعمال دو قسم کے ہیں ظاہرہ وباطنہ۔ اور آجکل بہت لوگوں کو اعمال باطنہ کی فکر نہیں نیز میں نے
کہا تھا کہ اعمال سب اختیاری ہیں اسلئے اعمال سب کے سب قابل توجہ ہیں اور جو لوگ محبت الٰہی کو
دشوار یا محال سمجھے ہوئے ہیں یہ اُن کی غلطی ہے کیونکہ انھوں نے محبت الٰہی کی حقیقت یہ سمجھی ہے
کہ تعلقات دنیویہ کو کلیۃً ترک کر دیا جائے بیوی بچوں کو چھوڑ کر ایک حجرہ سنبھال لیا جائے
یہ خیال جاہلانہ ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کسی کو اللہ تعالیٰ سے محبت نتھی اور انبیاء
علیہم السلام اکثر صاحب ازواج وذریہ تھے اور کسی نے بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرہ نہیں سنبھالا بلکہ
سب اُن کے حقوق کو اہل دنیا سے زیادہ ادا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولقد ارسلنا
رسلا من قبلک وجعلنا لھم ازواجا وذریۃ ط وقال وما ارسلنا من المرسلین الا
انھم لیاکلون الطعام ویمشون فی الاسواق ط اور حدیث میں ہے ان من اکمل المؤمنین
ایمانا احسنھم خلقا والطفھم باھلہ (رواہ الترمذی) تم میں کامل الایمان وہ ہے جو اپنے
گھر والوں کے ساتھ خلق ولطف سے پیش آوے پس خوب سمجھ لیجئے کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرہ
سنبھالنا محبت الٰہی نہیں بلکہ معصیت حق ہے محبت الٰہیہ ان کے چھوڑنے کا امر نہیں کرتی
بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی دلداری ودلجوئی کا امر کرے گی۔ یہ گفتگو تو اعمال کے متعلق تھی۔ ایک دوسری
چیز انسان کے اندر اور ہے جسکا نام حال ہے جیسے شوق وجذب ووجد وغیرہ یہ اختیاری نہیں
ہیں وہبی ہیں اور صاحب حال وغیر صاحب حال میں تفاوت یہ ہے کہ غیر صاحب حال کو
مثلاً رشوت سے نفرت تو ہوتی ہے مگر ایسی نہیں جیسے گوہ سے اور صاحب حال کو گناہوں سے
ایسی ہی نفرت ہوتی ہے جیسی نجاست ظاہرہ سے اسلئے احوال کے محمود ہونے میں کلام نہیں مگر
وہ مقصود نہیں ہیں کیونکہ غیر اختیاری ہیں اسی لئے مقصود ان پر موقوف نہیں مثلاً مقصود گناہ
سے بچنا ہے تو یہ بدون حال کے بھی حاصل ہو سکتا ہے گو بدون حال کے گناہوں سے ایسی نفرت
نہو گی جیسی گوہ سے مگر ایسی نفرت تو ہو سکتی ہے جیسی سنکھیا سے سو گناہوں سے بچنے کیلئے

نفرت بھی کافی ہے اسی طرح مصیبت کے وقت صبر مطلوب ہے کہ اسکو خدا کا تصرف سمجھکر
راضی رہے اور دل میں خدا سے شکایت نہ لائے نہ ظاہر میں جزع فزع کرے یہ تو اعمال
اختیاریہ میں سے ہے جسکے مکلف ہم سب ہیں اب بعض لوگ کسی عزیز کی موت کے وقت
صبر کر کے اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ہمکو اسکا خیال ہی نہ آئے تو یہ غیر اختیاری ہے غلبہ
حال میں ایسا بھی ہو جاتا ہے مگر حال اپنے اختیار میں نہیں اب دینداروں کی غلطی یہ ہے
جسمیں عوام بھی بعض دفعہ مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اُنکو اعمال سے زیادہ احوال کا اہتمام
ہو جاتا ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت ایسا صبر آئے کہ عزیز کے مرنیکا خیال
ہی دل سے نکل جائے۔ اور نماز میں ایسا دل لگے کہ ڈھول بھی بجتے ہوں تو خبر نہو اسی لئے
ذاکرین شیوخ سے کہتے ہیں کہ ذکر میں دل نہیں لگتا ذکر کر کے جی پھیکا پھیکا رہتا ہے تہجد کا
ہمکو ایسا اہتمام نہیں جیسا اسٹیشن پر جانیکا اہتمام ہوتا ہے یا تہجد و ذکر کے ناغہ ہونے کا
اتنا قلق نہیں ہوتا جتنا مال چوری ہو جانیکا قلق ہوتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سالکین نے
اعمال صالحہ کی بیقدری شروع کر دی کہ جب نماز میں بیوی بچوں کا خیال آگیا تو وہ نماز ہی
کیا ہوئی یہ شخص ناشکری میں مبتلا ہو گیا میرا یہ مطلب نہیں کہ نماز کو اپنی نماز سمجھے اور اُسکو
اپنا کمال سمجھے کیونکہ نماز تو اپنی جب ہوتی کہ اپنے اسباب سے کام لیا ہوتا یہاں تو اعضاء
وارادہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں [illegible]
ہے یہ اعمال قابل قدر ہیں یعنی عطائے حق ہونے کی وجہ سے یہ نماز و روزہ جس درجہ میں بھی ہے
قابل قدر ہے (مصرعہ) بلا بودے اگر ایں ہم نبودے + اسکی ایسی مثال ہے جیسے ایک چمار
کو بادشاہ موتی دیدے تو وہ اپنے کو چمار ہی سمجھے گا مگر اسکے ساتھ ہی موتی کو موتی بھی سمجھیگا
یہ نہیں کہ اپنے چمار ہونے کی وجہ سے موتی کو بھی ٹھیکرا سمجھنے لگے۔ یا موتی کو موتی سمجھنے سے اپنے
کو چمار نہ سمجھے بس یہ مطلب ہے شکر کا کہ اپنے کو تو چمار سمجھو مگر اعمال صالحہ کو عطائے حق ہونے کی وجہ
سے قابل قدر سمجھو اور نعمت حق کی بیقدری نکرو مجھے اسپر ایک حکایت یاد آئی الہ آباد میں ایک
بزرگ محمدی شاہ صاحب تھے جو ولایتی تھے اور مجذوب بھی تھے الہ آباد والے کہتے تھے کہ رات کو
جب یہ ذکر کرتے ہیں تو سارا شہر گونج جاتا ہے بہت لوگ اُن کے معتقد تھے اور اکثر اہل مقدمات

اُن کے پاس بہت جاتے تھے اور بعضے بزرگوں کے پاس طالبانِ دین زیادہ جاتے ہیں
اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کہ لوگ کسی کے پاس دین کی طلب کو جائیں بحمداللہ ہمارے
حضرات کے پاس اکثر اہل دین اور طالب آخرت ہی آتے ہیں۔ میں بھی ایک دفعہ والد صاحب
کے ساتھ ان بزرگ کے پاس حاضر ہوا ہوں یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ والد صاحب کیوں گئے تھے
کسی مقدمہ کی وجہ سے دعا کیلئے گئے تھے یا محض زیارت اہل اللہ کا قصد تھا۔ ان بزرگ کا
ایک واقعہ حافظ عبدالرحمٰن صاحب بگھروی بیان کرتے تھے کہ وہ ایک شخص کے ساتھ ان
بزرگ کے پاس حاضر ہوئے۔ اس دوسرے شخص کو محمدی شاہ صاحب جانتے تھے اُن سے
حافظ عبدالرحمٰن صاحب کی تعریف پوچھی تو انھوں نے کہا یہ حافظ بھی ہیں حاجی بھی ہیں ذاکر
شاغل بھی ہیں اسپر حافظ عبدالرحمٰن صاحب نے تواضعاً کہدیا کہ حضرت میں تو کچھ بھی نہیں یہ سنکر
محمدی شاہ صاحب بگڑ گئے اور فرمایا اچھا تو تم حافظ نہیں ہو تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمھارا
حفظ قرآن سلب کرلیں اور تمھارا حج باطل ہوجائے حافظ عبدالرحمٰن کہتے تھے کہ انھوں نے
میری ایسی خبر لی کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا اور اسکے بعد جب کبھی حافظ جی اُن کے پاس حاضر
ہوتے تو وہ کہتے آؤ ناشکرا آؤ ناشکرا۔ انھوں نے ان کا لقب ہی ناشکرا رکھ لیا۔ غرض ہمارے
اعمال میں دو حیثیتیں ہیں اور اسکو اہل علم اچھی طرح سمجھیں گے۔ اسی لئے کچھ درسی کتابوں کے
[illegible] حیثیت سے تو یہ اعمال کچھ نہیں ہیں مگر دوسری
حیثیت سے قابل قدر ہیں کہ عطائے حق ہے گو وہ لوٹا ہی ہوا برتن دیدیں۔ پس سالکین
پر تو احوال کے مقصود سمجھنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے اعمال کی بیقدری کرنے لگے اور عوام پر
یہ اثر ہوا کہ انھوں نے عمل ہی کو چھوڑ دیا کہ جب نماز میں خیالات دنیویہ کا سلسلہ بند
نہیں ہوتا تو ایسی نماز کو کیا کریں سالکین تو عمل کے بعد معطل ہوے تھے۔ عوام کو قبل عمل
ہی کے تعطل ہوگیا۔ چنانچہ یہ لوگ کسی بزرگ کے پاس جائیں گے تو یہ کہیں گے کہ کوئی ایسی
تدبیر بتلا دیجئے کہ نماز کا شوق ہوجائے حالانکہ شوق ہوتا ہے نماز پڑھنے ہی سے۔ نماز تو یہ چاہتی
ہے کہ یہ اسکو پڑھیں تو شوق پیدا ہو اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے شوق ہوجائے تو نماز پڑھیں
اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص چاہے کہ کھانا پختہ ہوجائے مگر جو اسباب ہیں پختہ ہونیکے

انکو جمع نکرے تو کیسے پختہ ہوگا البتہ ایسا پختہ ہو جائیگا جیسے ایک مسخرہ کی حکایت ہے کہ انکو رس کی کھیر کا شوق ہوا لوگوں سے اسکی ترکیب پوچھی معلوم ہوا کہ چاول اور رس کو ملا کر آگ پر پکانا پڑتا ہے اور گھوٹنا بھی پڑتا ہے کہنے لگا یہ تو بکھیڑا ہے آپنے کیا کیا کہ چاول کچے پھانک کر اوپر سے رس پی لیا اور چولھے کی طرف سرین کر کے کھڑا ہو گیا کہ آنچ لگ کر پیٹ میں سب پک جائیگا۔ تو جیسے اس شخص کی کھیر پک گئی تھی ایسا ہی ان لوگوں کو شوق حاصل ہوگا جو بدون عمل کے شوق کے طالب ہیں اور اس غلطی کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ بدون حال کے عمل کو کالعدم سمجھتے ہیں اور یہ ناس کیا ہے واعظوں نے جو اپنے وعظوں میں علی الاطلاق کہدیتے ہیں ؎

برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر　　این چنیں تسبیح کے دارد اثر

اگر یہ لوگ محقق سے رجوع کرتے تو کبھی یہ حالت نہوتی مگر غیر محقق واعظوں کی تعلیم نے مخلوق کا ناس کر دیا ان کی یہ حالت ہی کہ ایک واعظ نے رمضان میں کسی دیہاتی سے کہا کہ آج روزہ رکھا ہے کہا ہاں رکھا ہے کہا نیت بھی کی تھی کہا ہاں کی تھی پوچھا کس طرح کی تھی اس نے بتلایا کہ سحری کھاتے ہوئے دل میں خیال کر لیا تھا کہ کل کو روزہ رکھیں گے واعظ صاحب بولے کہ یوں نہیں بلکہ زبان سے یوں کہنا چاہئے نویت الصوم للہ تعالیٰ غدا دیہاتی نے کہا بہت اچھا اب سے یوں ہی کہا کرونگا اگلے دن واعظ صاحب نے دیکھا کہ چودھری چوپال میں بیٹھے ہوئے حقہ بجا رہے ہیں کہا میاں یہ کیا ؟ رمضان میں حقہ پیتے ہو کیا روزہ نہیں ہے کہا نہیں آج روزہ نہیں رکھا کیونکہ نیت یاد نہیں ہوئی جب نیت یاد ہو جائے گی تب روزہ رکھونگا۔ دیکھئے اس واعظ نے بیچارے دیہاتی کا کیسا ناس کیا کہ اسکو روزہ سے محروم کر دیا بس انکی وہ حالت ہے جو اناڑی حکیم کی حالت ہوتی ہے چنانچہ ایک ایسے ہی حکیم نے ایک بیمار کو مسہل دیا تھا معلوم کیا خاک بلا دیدی کہ غریب کو بے انتہا دست آگئے۔ حکیم صاحب کو مسہل دینا تو آتا تھا مگر دست بند کرنے کی ترکیب معلوم نتھی تیمار داروں نے آکر اطلاع کی کہ دست بہت آرہے ہیں بند نہیں ہوتے کہا کچھ حرج نہیں مادہ فاسد ہے نکلنے دو۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اطلاع کی کہ بہت ضعف ہو گیا ہے کہا کچھ ڈر نہیں

مادہ فاسد ہے نکلنے دو پھر اطلاع کی کہ اسکو تو نزع کی سی کیفیت طاری ہے کہا مادہ فاسد ہی نکلنے دو پھر اطلاع دی کہ وہ تو مر بھی گیا تو آپ فرماتے ہیں اللہ رے مادے جسکے نکلنے سے مر گیا اگر وہ اندر رہتا تو کیا ہوتا۔ یہ ویسا ہی جواب ہے جیسے بوجھ بجکڑ نے جواب دیا تھا جسکا قصہ یہ ہے کہ ایک گانوں میں ایک شخص تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا چڑھ تو گیا مگر اترنا جانتا نہ تھا لگا چلانے کہ مجھے اتارو گانوں والے سارے بیوقوف تھے۔ کسی کے سمجھ میں تدبیر نہ آئی تو بوجھ بجکڑ کو (یعنی گانوں کے عاقل کو) بلایا گیا وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے کہ بس تدبیر سمجھ میں آگئی ایک لمبا سا رسّا لاؤ اور اسکے پاس پھینکو کہ اسکو اپنی کمر سے مضبوط باندھ لے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اسکے بعد حکم دیا کہ زور سے جھٹکا دو۔ چنانچہ یہ بھی کیا گیا وہ نیچے تو آگیا مگر روح اوپر کو اڑ گئی گانوں والے بوجھ بجکڑ سے سر ہو گئے کہ یہ کیا ہوا تو آپ جواب دیتے ہیں کہ اسکی قسمت میں نے تو بہت آدمیوں کو اسی تدبیر سے کنویں سے نکالا ہے۔ بس یہی حالت آج کل کے واعظوں کی تعلیم کی ہے کہ تحت کو فوق پر قیاس کرتے ہیں اور عوام کا ناس کرتے ہیں ان ہی لوگوں کی نسبت عارف فرماتے ہیں ؎

خستگانرا چو طلب باشد و قوت نبود　　گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

واقعی ایک کاروباری آدمی کو یہ مجاہدہ بتلانا کہ چالیس دن تک تجارت و زراعت و اہل و عیال سے الگ ہو کر ایک کونہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے۔ بیداد و ظلم ہے بلکہ ہر شخص کو اسکے مناسب حال طریقہ بتلانا چاہیے مولانا فرماتے ہیں ؎

چار پارا قدر طاقت بار نہ　　بر ضعیفاں قدر ہمّت کار نہ

اسی طرح واعظوں نے یہ شعر پڑھ پڑھ کر ؎ برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر + عوام کو نماز وغیرہ سے متوحش کر دیا ہے۔ یہ شعر مثنوی کا نہیں بلکہ نان و حلوا کا ہے جس کا مصنف شیعی ہے مگر نقال صوفی ہے کیونکہ ہر فن میں نقال ہی ہوتے ہیں اسی لئے میں نے اس شعر کو یوں بدلا ہے ؎ برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر + ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر + یعنی گو دل میں گاؤ خر کے وساوس آتے ہوں مگر پھر بھی نماز و تسبیح کا اثر ضرور ہوتا ہے بیکار نہیں ہے ہاں ایک ذرا سی شرط ہے۔ اور کیمیا تو ایک ہی چٹکی سے بنتی ہے وہ یہ کہ نماز و تسبیح کے وقت یہ ارادہ رکھو کہ اس نماز سے ہمارے وساوس و خطرات بھی دور ہو جاویں اور نماز کا حق

ی پیدا ہو جائے۔ پھر اسی نماز سے ایک دن یہ حال ہو گا ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور کلبہ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے فارغ مباش

تا دم آخر دمے آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود

صاحبو! اعمال احوال سے مقدم ہیں، حصول احوال کا طریق ہی یہ ہے کہ اعمال میں لگجاؤ بدون اسکے احوال حاصل نہیں ہو سکتے۔ قاعدہ کی رو سے سلوک ہی جذب سے مقدم ہے اور وہبب کا ذکر نہیں مگر لوگ جذب کو مقدم کرنا چاہتے ہیں اور یہ سخت غلطی ہے۔ نصوص سے قاعدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلوک جذب سے مقدم ہے اور جذب سلوک پر مرتب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ان رحمت اللہ قریب من المحسنین رحمت جذب ہے اور احسان سلوک ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رحمت الٰہیہ نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے اور دوسری آیت میں یعنی اللہ یجتبی الیہ من یشاء میں جو اجتہاد یعنی جذب کا مدار محض مشیت پر رکھا ہے وہ جذب موہوب ہے باقی کسب کے درجہ میں وہ ترتیب ہے جسکو اسی آیت کے دوسرے جملہ میں فرمایا ہے یہدی الیہ من ینیب بہرحال دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ سلوک جذب سے مقدم اور سلوک ہی کی بدولت جذب کے درجہ قویہ کا تحمل ہو سکتا ہے۔ اور اگر جذب قوی سلوک سے مقدم ہو جائے تو اس کا تحمل بھی نہ ہو سکے چنانچہ وحی بھی اسی جذب کی ایک قسم ہے جسکی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لو انزلنا ھذا القران علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ یہ تو جبل کی نسبت فرمایا اور آپ کے قلب کی نسبت فرماتے ہیں فانہ نزلہ علی قلبك اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے قلب نے اس چیز کا تحمل کیا جسکا تحمل جبل سے نہیں ہو سکتا تھا بس یہ حضور ہی کا دل تھا جس نے وحی الٰہی کے اس ثقل کا تحمل کیا ورنہ واقعات حدیثیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے وقت اگر آپ اونٹنی پر سوار ہوتے تو اونٹنی آپ کو لیکر بیٹھ جاتی تھی اور نزول وحی کے وقت ایک صحابی کی ران پر آپ کا سر تھا تو ان کو اپنی ران کے پھٹ جانیکا اندیشہ ہوا نیز سخت سردی کے موسم میں بھی نزول وحی کے وقت آپ کی پیشانی پسینہ پسینہ ہو جاتی

تھی ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی میں ثقل باطنی کے ساتھ ثقل ظاہری بھی تھی اور جذب قوی کے دوسرے افراد میں گو اس درجہ کا ثقل نہ ہو لیکن اس ثقل کا تحمل بھی قبل سلوک نہیں ہوسکتا اسلئے مقتضائے حکمت یہی ہے کہ سلوک جذب سے مقدم ہوتا کہ جذب کا تحمل ہوجائے۔ اور نزلہ علی قلبك کے متعلق ایک بات طلبہ کے کام کی یاد آئی گو مقام سے اجنبی ہے مگر استطراداً اسی آیت کی ذکر کی مناسبت سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض اہل باطل کے نزدیک یہ الفاظ قرآنیہ منزل من اللہ نہیں ہیں اور اُن کو نزلہ علی قلبك سے دھوکہ ہوا کہ اسمیں محل نزول قرآن قلب کو فرمایا ہے اور قلب معانی کا مورد ہوتا ہے اور الفاظ کا مورد سمع ہوتا ہے نہ کہ قلب۔ سو واقع میں یہی غلط ہے کیونکہ الفاظ دل میں بھی ہوتے ہیں چنانچہ ہر حافظ قرآن سوچ لے کہ الحمد للہ وغیرہ کے الفاظ دل میں ہیں یا نہیں یقیناً ہیں اسی کو ایک شاعر کہتا ہے ؎

ان الکلام لفی الفؤاد وانما　　　جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

البتہ اسپر یہ سوال ضرور ہوگا کہ گو قلب پر بھی الفاظ کا ورود ہوتا ہے مگر بواسطہ سمع کے ہوتا ہے تو یہاں سمع کا ذکر چھوڑ کر قلب کی قید کی کیا ضرورت تھی اس کا جواب ایک محقق نے خوب دیا ہے کہ مادری زبان اور غیر مادری زبان میں فرق ہوتا ہے۔ غیر مادری زبان میں تو اول التفات الفاظ پر ہوتا ہے پھر معانی پر اور مادری زبان میں بالعکس ہے کہ التفات اول معانی پر ہوتا ہے پھر الفاظ کی خصوصیات پر گو خارج میں دونوں مقارن ہیں مگر التفات میں تقدم و تاخر ضرور ہے پس نزلہ علی قلبك میں اسی امر کو بتلایا گیا ہے کہ چونکہ قرآن آپ کی مادری زبان میں نازل ہوا ہے اسلئے اس کا نزول اول آپ کے قلب پر ہوتا ہے یعنی الفاظ پر التفات ہونے سے پہلے قلب کو معانی کا ادراک ہوجاتا ہے واقعی یہ بات بہت عجیب ہے اور یہ بات اسی شخص کو معلوم ہوسکتی ہے جسکی عادات و طبائع پر نظر ہو۔ اسی لئے قرآن کو سب سے زیادہ وہ شخص سمجھتا ہے جو عادات و جذبات انسانیہ پر نظر رکھتا ہو نہ کہ دقائق منطقیہ پر کیونکہ قرآن میں جذبات و عادات کی رعایت بہت زیادہ ہے مصنفین کی طرح دقائق فلسفہ کی رعایت نہیں کیگئی یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جذب کا تقدم مفید نہیں کیونکہ اس صورت میں اس کا تحمل اشد ہے اسی لئے ایسے لوگ جنپر سلوک سے پہلے جذب قوی طاری ہوتا ہے مجذوب ہوجاتے ہیں

نماز روزہ وغیرہ اعمال شرعیہ سے بھی محروم ہیں گو وہ مقبول ہیں مگر کامل نہیں ہاں کامل کہو ممکن ہے ان کی ایسی مثال ہے جیسے چھوٹا بچہ کہ محبوب تو ہے مگر کامل نہیں بلکہ ہگتا موتتا پھرتا ہے۔ ننگا بھی رہتا ہے اور بڑا بچہ محبوب بھی ہے اور کامل بھی ہے کہ تہذیب و ادب کیساتھ آراستہ ہے۔ پس مجذوب گو مقبول ہیں مگر کامل نہیں کیونکہ وہ اعمال سے محروم ہیں اور ترقی اعمال ہی سے ہوتی ہے ورنہ ارواح کو عالم ارواح سے عالم اجسام میں نہ بھیجا جاتا کیونکہ عالم ارواح میں ارواح حامل احوال تھیں مگر حامل اعمال نہ تھیں چنانچہ ارواح میں محبت اسدرجہ تھی کہ اس محبت ہی کیوجہ سے حمل امانت پر آمادہ ہو گئیں اس کا منشا محبت ہی تھا ورنہ تمام عالم اس امانت کے تحمل سے عاجز تھا اور محبت کی منشا حمل ہونے کی طرف شیرازی نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

باوجودیکہ حمل امانت کا اسکو امر بھی نہوا تھا بلکہ محض استفسار ہی تھا مگر جب محبوب کیطرف سے کلام ہوا تو عاشق کی کیا مجال تھی کہ امانت محبوب کیلئے تیار نہو جاتا وہ تو اس کلام ہی سے مست ہو گیا پھر یہ سوچکر کہ اس امانت کے تحمل کے بعد مکالمت زیادہ ہوا کرے گی فوراً روح انسانی نے بار امانت کا تحمل کر لیا یہ تو محبت کی حالت تھی جو احوال میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اب معرفت کی حالت دیکھئے کہ وہ مسئلہ توحید جسمیں بڑے بڑے مدعیان عقل کو اختلاف ہو گیا ارواح انسانیہ نے عالم ارواح میں اسکو بدون فکر کے فوراً حل کر دیا کہ جب سوال ہوا الست بربکم تو معاً بلیٰ کہدیا۔ یہ معرفت اضطراری تھی غرض محبت و معرفت دونوں ارواح کو حاصل تھیں پھر کیا مصیبت تھی کہ انکو عالم اجسام میں پھینکدیا گیا۔ یہ وہ بات ہے کہ جسکو سوچکر بعض مغلوبین تو بیچین ہو جاتے ہیں کہ ہائے ہم یہاں کیوں بھیجے گئے عالم ارواح ہی میں محبت و معرفت میں مستغرق رہتے تو اچھا تھا چنانچہ مولانا نیاز اسی بیچینی کی حالت میں فرماتے ہیں

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

مرا وہ خیال جو ناسوت میں آکر از خود رفتہ کر رہا ہے

اہل ظاہر اس سوال کا جواب دیں کہ ارواح کو عالم اجسام میں کیوں بھیجا گیا کیا چیز ان کو یہاں کھینچکر لائی۔ حضرت وہ وہ چیز ہے جسکو اہل ظاہر نہیں سمجھ سکتے۔ سنئے یہاں ارواح کو

بھیجنے سے مقصود قرب حاصل تھا یعنی وہ قرب جو اعمال سے ہوتا ہے اور احوال سے نہیں ہوتا کیونکہ اعمال اختیاری ہیں اور احوال غیر اختیاری۔ اور اس قرب کا مدار صرف اختیار پر ہے اور بہت سے اعمال وہاں یعنی عالم ارواح میں ممکن نہ تھے کیونکہ بعض اعمال کا تعلق جسد سے ہے اور وہاں روح مجرد تھی مثلاً روزہ کیسے رکھا جاتا کیونکہ وہاں بھوک ہی نہ تھی حج کیسے ہوتا وہاں خانہ کعبہ ہی نہ تھا۔ زکوۃ کیسے ادا ہوتی وہاں مال ہی نہ تھا۔ اور مصائب پر صبر کیسے ہوتا وہاں بیماری اور موت ہی نہ تھی۔ پس یہ قرب خاص اعمال پر موقوف تھا اسلئے حکمت حق مقتضی ہوئی کہ ارواح کو عالم اجسام میں بھیجا جائے تاکہ قرب خاص حاصل ہو یہ ہے سلوک پھر اسکے بعد جذب حاصل ہوتا ہے مگر چونکہ اثنار سلوک میں استعداد کامل ہو جاتی ہے اسلئے اب اس جذب کا ایسا غلبہ نہیں ہوتا کہ حواس معطل ہو جائیں اور اعمال سے محروم ہو جائیں اسی تفاوت استعداد کے سبب مبتدیوں پر احوال کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اور متوسطین پر ان سے کم اور منتہی پر سب سے کم۔ اور منتہی پر گاہ گاہ غلبۂ احوال کا ہونا یہ ایک غیر مشہور مسئلہ ہے جو شاید اس سے پہلے نہ سنا ہو سالکین کا عام طور پر خیال یہ ہے کہ کاملین پر غلبۂ احوال بالکل نہیں ہوتا مگر یہ صحیح نہیں کاملین پر بھی بعض دفعہ غلبہ ہوتا ہے جسکی دلیل نصوص میں بھی ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کو رب لو شئت اہلکتہم من قبل وایای اتہلکنا بما فعل السفہاء منا ان ہی الا فتنتک تضل بہا من تشاء وتہدی من تشاء بعض مفسرین نے ادلال پر محمول کیا ہے اور ادلال غلبۂ حال ہی میں ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنی تفسیر میں اسکو ادلال سے نکال دیا ہے اور صحو کی حالت کے مناسب تفسیر کی ہے۔ کیونکہ انبیاء میں صحو اصل ہے اور سکر نادر تو جب تک صحو پر محمول ہو سکے ادلال پر محمول کرنے کی کیا ضرورت ہے خیر یہ آیت تو محتمل ہے مگر حدیث اسمیں صریح ہے یعنی جب غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی مختصر جماعت کفار کے بڑے لشکر کے مقابل ہوئی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام کی نصرت و فتح کیلئے دعا فرمائی اور دعا میں اسقدر الحاح فرمایا کہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے صادر ہوئے اللهم ان تهلك هذه العصابة لم تعبد بعد اليوم اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہو گئی تو آج کے بعد کوئی آپ کی عبادت نہ کرے گا۔ آخر یہ کیا تھا یہ واقعی ادلال تھا

۱۶

یہاں اسکے سوا کوئی احتمال ہی نہیں جس سے معلوم ہوا کہ حضرت انبیاء علیہم السلام پر بھی کبھی کبھی غلبۂ حال ہوتا ہے۔ اور احادیث سے تو ملائکہ پر بھی غلبۂ حال کا ہونا معلوم ہوتا ہے چنانچہ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ میری وہ حالت دیکھنے کے قابل تھی کہ جب فرعون ڈوبنے لگا اور اُسکی زبان سے نکلا آمنت انہ لا الٰہ الا الذی آمنت بہ بنو اسرائیل میں اُسکے منہ میں کیچڑ ٹھونستا تھا کہ کہیں اسپر رحمت نہو جائے۔ حضرت محبت حق چین سے نہیں بیٹھنے دیتی نہ کسی کامل کو نہ فرشتہ کو۔ اگر حضرت جبریل کے اس فعل کو غلبۂ حال پر محمول نکیا جائے تو سخت اشکال واقع ہوتا ہے کہ ایمان مطلوب اعظم ہے اور حضرت جبریل علیہ السلام اسی کے واسطے وحی لاتے ہیں مگر حضرت جبریل کو فرعون کے ایمان پر غصہ آرہا ہے کہ یہ ایمان لاکر جہنم سے نہ بچ جائے بس اسکی توجیہ یہی ہے کہ اسوقت حضرت جبریل علیہ السلام پر بغض فی اللہ کا اسقدر غلبہ تھا کہ مغلوب ہو گئے۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس تدبیر سے کچھ نفع نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان کا تعلق اصلی قلب سے ہے اور تکلم بالایمان یعنی اقرار باللسان قدرت کے وقت فرض ہے اور کیچڑ ٹھونسنے کے بعد اُسکی قدرت سلب ہو گئی تو اب تکلم کا فرض اسکے ذمہ سے ساقط ہو گیا نیز حضرت جبریل جانتے تھے کہ اسوقت کا ایمان معتبر نہیں کیونکہ عالم آخرت کا فرعون کو انکشاف ہو چکا تھا اور انکشاف عالم آخرت کے بعد ایمان معتبر نہیں مگر پھر بھی حضرت جبریل نے ایسا کام کیا جسکی کوئی غایت نتھی حالانکہ وہ بڑے درجہ کے فرشتہ ہیں جنکی تعریف میں عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین۔ وارد ہے بس منشا اس فعل کا وہی ہے کہ حضرت جبریل پر بغض فی اللہ کا غلبہ تھا۔ بہرحال یہ مسئلہ نصوص سے ثابت ہے کہ کاملین پر بھی کبھی غلبہ ہوتا ہے ہاں اتنا فرق ہے کہ منتہی کو ایسے وقائع کم پیش آتے ہیں اور متوسط کو زیادہ جیسے مشاق سوار بھی گرتا ہے مگر کم اور سیکھتر زیادہ گرتا ہے تو یہ جذب کاملین کو بھی نچاتا ہے جیسا کہا گیا ہے ؎

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم — جنید و شبلی و عطار شد مست

اب اگر یہ جذب سلوک سے پہلے کسی کو حاصل ہو جائے، تو سمجھ لیجئے کیا حال ہوگا یقیناً اعمال

سے معطل ہو جائے گا اور بعض دفعہ ممکن ہے کہ ہلاک بھی ہو جائے چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ کی توجہ سے ایک شخص مرگیا تھا حضرت خاتم مثنوی نے یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب متوکل تھے بعض دفعہ فاقہ بھی ہوتا تھا چنانچہ ایک دن حضرت کے یہاں فاقہ تھا اتفاق سے اسی دن مہمان آگئے۔ حضرت کو مہمانوں کی وجہ سے فکر ہوا۔ ایک بھٹیارہ حضرت کا معتقد تھا اُسکو حضرت کی فکر کا احساس ہوا تو وہ فوراً کھانا سب مہمانوں کیلئے تیار کر کے لایا۔ حضرت کو اس سے بیحد خوشی ہوئی اور جوش مسرت میں فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ بھٹیارہ نے کہا کہ حضرت وعدہ کر لیجئے کہ جو میں مانگوں گا آپ دیں گے فرمایا ہاں میرے پاس جو کچھ ہے اسمیں سے جو مانگو گے دوں گا کہا میں ایسی ہی چیز مانگوں گا جو آپ کے پاس ہے۔ فرمایا ہاں ہاں مانگو کہا مجھے اپنا جیسا کر لیجئے۔ حضرت نے فرمایا ؎ آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

بہت سمجھایا کہ یہ بات تمھارے تحمل سے زیادہ ہے اس ہوس سے باز آؤ مگر اُسنے نمانا جب اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو اپنے حجرہ میں لیجاکر اُسپر توجہ اتحادی ڈالی جس کا یہ اثر ہوا کہ توجہ کے بعد جو دونوں حجرہ کے باہر آئے ہیں تو صورت میں بھی اتحاد ہو گیا تھا۔ کسی کو یہ امتیاز نہ ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب کونسے ہیں اور بھٹیارہ کونسا ہے صرف یہ فرق تھا کہ بھٹیارہ پر اضطراب غالب تھا اور حضرت پر سکون مگر نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد بھٹیارہ مرگیا اس سے تحمل نہ ہو سکا کیونکہ سلوک سے پہلے جذب قوی وارد ہو گیا تھا۔ رہا یہ کہ پھر خواجہ صاحب نے اُسکی درخواست کو کیوں منظور کیا اور ایسی توجہ کیوں دی جس سے ہلاکت واقع ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ مر ہی جائیگا یہ خیال ہوا ہوگا کہ بہت سے بہت مجذوب ہو جائیگا لیکن اسدرجہ ضعف کا علم نہ تھا کہ زندہ بھی نہ رہے گا کیونکہ دوسرے کا ضعف پوری طرح معلوم نہیں ہو سکتا نقشبندیہ کے یہاں توجہ اور تصرف بہت زیادہ ہے یہ حضرات سلاطین ہیں یہ دوسروں پر بھی تصرف کرتے ہیں اور چشتیہ مساکین ہیں ان کا سارا تصرف اپنی ہی ذات پر ہوتا ہے ضرب بھی اپنی ہی ذات پر ہے اور سوزش و شورش بھی انکا تو وہ حال ہے ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن　　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموختست

پس جذب اگر سلوک سے مقدم ہوتا ہے تو یا ہلاکت ہوتی ہے یا اعمال سے تعطل ہوتا ہے اور دونوں حالتوں میں ترقی بند کیونکہ ترقی اعمال سے ہوتی ہے اور اسی لئے مسلمان کیلئے طول حیات موت سے افضل ہے جبکہ وہ اپنی زندگی میں اعمال صالحہ کرے کیونکہ اعمال سے ترقی ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ دو شخص ساتھ ساتھ مسلمان ہوئے تھے انمیں سے ایک تو شہید ہو گیا اور دوسرے رفیق کا ایک ہفتہ کے بعد بستر پر انتقال ہوا تو حضرات صحابہ نے دوسرے کو یہ دعا دیدی اللھم الحقہ بصاحبہ کہ اے اللہ اسکو اسکے ساتھی کے ساتھ ملا دیجئے یعنی اسکو بھی وہی درجہ عطا فرمائیے جو اسکے رفیق کو بوجہ شہادت کے ملا۔ حضور نے فرمایا کہ تمنے یہ کیا کہا۔ سبحان اللہ حضرات صحابہ کی بھی کیا شان تھی کہ انکو ہر وقت بارگاہ وحی سے فیضان علوم ہوتا تھا۔ اور الحمد للہ ہم بھی صاحب نصیب ہیں کہ ہم پر بھی ہر دم فیضان ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ وہاں فیضان بالمشافہہ تھا۔ یہاں بواسطہ ہے اور یہ فرق ایسا ہی جیسے ایک شخص سے محبوب سامنے ہو کر باتیں کرے اور ایک سے پردہ میں ہو کر باتیں کرے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ہمکو بھی فیضان ہو رہا ہے مگر بواسطہ کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی متجلی ہیں جیسا قرآن میں ــ اللہ تعالیٰ شانہ جلوہ فرما ہیں اسپر مجھے مخفی کا شعر یاد آتا ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

جب ایک معمولی شاعر کو یہ دعوی ہے کہ جو مجھے دیکھنا چاہے میرے کلام میں مجھے دیکھ لے حالانکہ وہ کلام کوئی عظمت نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام کی تو بڑی شان ہے وہ تو واقعی جلوہ گاہ متکلم ہے پس اب یوں کہیں گے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

اگر یہ دولت بھی نہوتی تو عشاق کی زندگی کس طرح ہوتی ہمتو اس حدیث سے زندہ ہیں۔ لا یزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لا یضرھم من خذلھم جسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمکو بشارت دی ہے کہ انشاء اللہ قرب قیامت تک قرآن و حدیث

وعلوم حقہ محفوظ رہیں گے ورنہ آج کل تو جو حالت مسلمان کو پیش آرہی ہے کہ ہر طرف مسلمان نرغہ میں ہیں اور کفار دین حق کو مٹانا چاہتے ہیں اسکو دیکھکر بعض دفعہ خطرہ ہوتا تھا کہ کہیں علوم اسلامیہ فنا نہو جائیں مگر اس حدیث نے تسلی کردی۔ غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی اس دعا کو سنکر اللھم الحقہ بصاحبہ فرمایا کہ تمنے یہ کیا کہا کہ اسکو پہلے شخص سے ملا دیا جاوے جس سے اس شخص کا ادنی ہونا معلوم ہوتا ہے آخر اس نے جو اسکے بعد عمل کئے ہیں وہ کہاں گئے بخدا ان اعمال کی وجہ سے جو اس نے اپنے ساتھی کے بعد کئے ہیں دونوں کے درجہ میں اتنا تفاوت ہے جتنا آسمان وزمین میں تفاوت ہے۔ کیونکہ اُس نے اُسکے بعد نمازیں پڑھی ہیں روزے رکھے ہیں ذکر اللہ کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کیلئے طول حیات افضل ہے جبکہ اعمال صالحہ کے ساتھ زندگی ہو۔ یہاں ایک شبہ ہوتا ہے میں اسکو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ دوسرے شخص نے گو پہلے کے بعد اعمال صالحہ بہت کچھ کئے تھے مگر پہلے کو تو شہادت حاصل ہوئی تھی جو دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی اور شہادت کو دوسرے اعمال سے ایسی نسبت ہو کہ سو سنار کی ایک لہار کی اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت کی فضیلت علی الاطلاق نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ شہید انبیاء سے بھی افضل ہو۔ دوسرے یہ کہ تمنائے شہادت بجائے شہادت ہے حدیث میں ہے انما الاعمال بالنیات۔ نیۃ المؤمن خیر من عملہ دوسری حدیث میں ہے من طلب الشھادۃ صادقا من قلبہ اعطیھا ولو لم تصبہ (رواہ مسلم) اور اگر کسی کے قلب میں تمنائے شہادت بھی نہو تو اس کا ایمان ناقص ہے حدیث میں ہے من لم یغزو ولم یحدث بہ نفسہ لقی اللہ وفی دینہ ثلمۃ اور بحمد اللہ ہر مسلمان اسکے لئے آمادہ ہے کہ اگر دین کے واسطے جان دینے کی نوبت آئے تو جان دینے کو حاضر ہیں اور جب ہم جیسے جہل بھی اسکے لئے آمادہ ہیں تو وہ صحابی اسکے طالب اور اسکے لئے آمادہ کیوں نہوں گے اور اسی بناء پر ہم کہیں گے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت خفیہ حضرت حمزہ کی شہادت جلیہ سے افضل ہے گو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ظاہری شہادت حاصل نہیں ہوئی مگر آپ کو اسکی تمنا تو بیحد تھی حدیث میں ہے وددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل الحدیث اور بعض دفعہ ذکر خفی ذکر جلی سے افضل ہوتا ہے اسلئے حضور کی شہادت

خفیہ دوسروں کی شہادت جلیہ سے افضل ہے اور اگر اس قاعدۂ شرعیہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو سخت اشکال وارد ہوگا کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض کمالات حاصل نہیں ہوئے اور یقیناً شہادت بھی کمالات میں سے ہے پس یہ اشکال اسی تقریر سے رفع ہو جائیگا جو میں نے نصوص حدیث سے بیان کی ہے تیسرے یہ بھی تو دیکھو کہ شہادت کی فضیلت کس وجہ سے ہے سو ظاہر ہے کہ شہادت کے دو جزو ہیں ایک اقدام یعنی اعداء اللہ کی طرف پیش قدمی کرنا اپر حملہ کرنا۔ دوسرے گردن کٹ جانا اور قواعد سے یہ بات معلوم ہے کہ مبنی فضیلت کا امور اختیاریہ ہیں تو اب خود سمجھ لو کہ ان دونوں میں امر اختیاری کونسا ہے ظاہر ہے کہ اقدام ہی اختیاری ہے اور گردن کٹ جانا اختیاری نہیں یہ تو دوسرے کے فعل پر موقوف ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اقدام میں سب سے بڑھے ہوئے تھے حضرات صحابہ خود فرماتے ہیں کہ ہم میں بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو معرکہ جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتا ہو کیونکہ حضور سب سے آگے دشمن کی صف میں گھسے رہتے تھے تو شہادت کا جو مبنی اختیاری ہے حضور اسمیں سب سے افضل تھے لہذا آپ کی شہادت بھی سب سے افضل ہے، چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بعض اعمال کا اجر بیحساب ہے چنانچہ ذکر اللہ کے فضائل جو احادیث میں مذکور ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر اللہ شہادت سے بھی افضل ہے جسکی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ شہادت میں تو جو کچھ ہونا ہوتا ہے ایک دفعہ ہو جاتا ہے۔ تلوار کے ایک ہاتھ میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور ذکر اللہ میں ہر دم دلیرارہ چلتا ہے۔ ذاکرین کی حالت دیکھی جائے کہ انپر کیسی کیسی حالتیں گذرتی ہیں ؎

بردلِ سالک ہزاراں غم بود | گر زباغ دل خلالے کم بود

اور اس حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کتنا زیبا ہے کہ ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را | ہر زمان از غیب جان دیگر ست

کہ ان کیلئے تو بار بار موت وحیات کا تکرار ہوتا رہتا ہے (خصوصاً ذکر نفی اثبات میں تو

ف کلام لا نظیر لہ لم ارہ لاحد سوی الشیخ اطال اللہ بقاءہ ومتعنا بفیوضہ وبرکاتہ اللھم ارضہ عنا وارضنا عنہ وامتنا علی حبہ واتباع طریقہ) اٰمین ۱۲ ظ۔

ذاکر کامل کو بار بار موت وحیات کا ہونا بہت ہی ظاہر ہے کما لا یخفی علی من لہ ذوق بالذکر مع المعرفۃ (رزقناہ اللہ تعالی دائما ابدا) پس یہ مسلم نہیں کہ شہادت کی فضیلت علی الاطلاق ہے بلکہ بعض اعمال شہادت سے بھی افضل ہیں اب وہ اشکال مرتفع ہو گیا جو اس حدیث پر وارد ہوا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شہادت سے درجات بے مشقت ملجاتے ہیں۔ دوسری طرق میں جو شہادت سے افضل ہیں مشقت ضرور ہے شہادت سے بے مشقت درجات ملنے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ لکھنؤ میں ایک خانصاحب تھے جو نہ نماز پڑھتے نہ روزہ رکھتے تھے جب کوئی اُنکو اصلاح اعمال کے لئے کہتا اور اسکا ثمرہ حصول جنت اور نجات دوزخ بتلاتا تو کہتے میاں جہاں تلوار کے دو ہاتھ ادہر دو ہاتھ اُدہر مارے تو سب کائی سی پھٹتی چلی جائیگی اور جنت میں جا پہونچیں گے وہاں پہونچنا کیا مشکل ہے۔ لوگ انکی باتوں پر ہنستے تھے پھر جسوقت مولانا امیر علی صاحب نے ہنومان گڈھی پر جہاد کیا ہے جو لکھنؤ سے قریب ہے اُسوقت یہ خانصاحب مولوی صاحب کے پاس آئے اور پوچھا کہ مولانا کیا مجھ جیسا فاسق بھی خدا کے یہاں مقبول ہو سکتا ہے اور کیا شہادت سے میری بھی مغفرت ہو جائے گی فرمایا مقبولیت سے کیا چیز مانع ہے یقیناً شہادت سے جنت ملے گی۔ یہ سنتے ہی خانصاحب نے تلوار ہاتھ میں لی اور دو ہاتھ ادہر مارے اور دو ہاتھ اُدہر بہت سے کافروں کو مار کر خود بھی شہید ہو گئے سو واقعی تلوار کے دو ہاتھ میں کائی سی پھٹ گئی اور خانصاحب نے ذرا سی دیر میں جنت لیلی بس یہ ضرور ہے کہ شہادت سے بے مشقت ذرا سی دیر میں درجات مل جاتے ہیں یہ بات دوسرے اعمال میں نہیں ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتی کہ دوسرا کوئی عمل شہادت کی برابر نہ ہو۔ یہ گفتگو اسپر چلی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ مسلمان کیلئے طول حیات مع الاعمال افضل ہے اور احوال سے اعمال افضل ہیں اور جذب کے تقدیم میں یا جان کا خطرہ ہے یا اعمال سے تعطل کا اندیشہ پس تم اعمال کی اتنی بے وقعتی نکرو کہ اگر احوال نہوں تو اعمال ہی سے ہاتھ دہو لو۔ اگر کسی کا ذکر اللہ یا نماز میں دل نہ لگے تو اسکو چاہیئے کہ ذکر و نماز کو ترک نکرے بلکہ ہمت کر کے کام میں لگا رہے کیونکہ ؎

گر مرادت را مذاق شکرست ۔۔۔ بے مرادی نے مراد دلبرست

اگر تم اعمال کے بعد اس پر بھی راضی نہو اور تمکو اتنی بات بھی حاصل نہو تو معلوم ہوتا ہے کہ تمنے نماز وغیرہ اللہ کے واسطے نہیں پڑھی بلکہ حظ نفس کی نیت سے پڑھی ہے جیسے ایک گانوں والے کی حکایت ہے کہ اُسکو ایک واعظ مولوی صاحب نے نماز کی نصیحت کی اُس نے کہا کہ کیا ملیگا مولوی صاحب نے کہا کہ اگر تو چالیس دن اس طرح نماز پڑھ لے کہ تکبیر تحریمہ فوت نہو تو میں تجھے ایک بھینس دونگا اور خیال یہ تھا کہ اس طرح پڑھنے سے خود نماز ہی سے محبت ہو جاویگی پھر بھینس بھی نہ مانگے گا۔ اُس نے کہا بہت اچھا چالیس دن پورے کر کے وہ مولوی صاحب کے پاس آیا کہ وعدہ پورا کرو مولوی صاحب نے کہا کیسا وعدہ میں نے تو اسلئے یہ بات کہدی تھی کہ چالیس دن نماز پڑھنے سے تجھے عادت ہو جائے گی اُس نے کہا اچھا یہ بات تھی تو جاؤ پھر یاروں نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی ہے اس ظالم کو جو چالیس دن کے بعد بھی نماز کا شوق نہوا تو وجہ اُسکی یہ تھی کہ اُس نے اللہ کے واسطے نماز ہی نہ پڑھی تھی۔ اسی طرح جو لوگ طالب احوال ہیں اُنکو بھی اعمال کا شوق نہیں ہوتا کیونکہ وہ رضائے حق کے طالب نہیں بلکہ اپنی مراد کے طالب ہیں اور یہ حالت صدق طلب کے خلاف ہے، صدق طلب کی تو شان یہ ہے کہ اگر ساری عمر بھی شوق و کیفیت پیدا نہو تو اسی پر راضی رہے اور یوں کہے ؎ ارید وصاله و یرید هجری + فاترک ما ارید لما یرید

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

میل من سوی وصال و میل او سوی فراق + ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

عارف نے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ عاشق کے نزدیک یہ عدم وصال بھی وصال ہی کی برابر ہے

؎ فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب + کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائی

اور فراق و وصال کی تساوی کا جو حکم کیا ہے یہ وصال و فراق مزعوم ہے یعنی فراق سے مراد قبض ہے جسمیں احوال و کیفیات نہیں ہوتے اور وصال سے مراد بسط جسمیں احوال و کیفیات کا ورود ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ تم قبض و بسط کی فکر میں کیوں پڑے بس رضائے دوست کو طلب کرو خواہ یہ رضا مضاف الی الفاعل ہو خواہ مضاف الی المفعول یعنی وہ رضا خواہ ادھر سے ہو یا ادھر سے ہو۔ اگر تم کو رضائے حق کا یقین نہیں ہو سکتا تو اپنی رضا کا تو علم ہو سکتا ہے۔ پس تم ہر حال میں اُن سے راضی رہو یہ بھی کافی ہے کیونکہ ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

رضا ہونی چاہئے خواہ کسی طرف سے ہو۔ حضرت صدیق کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے
ولسوف یرضی علماء نے اسکے مرجع ضمیر میں گفتگو کی ہے کہ حضرت صدیق ہیں یا حق تعالیٰ
مگر محققین نے کہا ہے دونوں صورتیں برابر ہیں۔ خدا تعالیٰ راضی ہوں جب بھی مراد حاصل ہے
اور صدیق راضی ہوں جب بھی کیونکہ دونوں رضاؤں میں تلازم ہے غرض محققین تو رضا کے
طالب ہیں خواہ قبض ہو خواہ وہ بسط ہو قبض کی حالت میں یوں کہتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہرو آں صلاح تست آیس دل مشو

البتہ چونکہ قبض میں احتمال تسبب عن المعصیۃ کا بھی ہوتا ہے اسلئے وہ احتیاطاً قبض میں استغفار
بھی کرتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

غم چو بینی زود استغفار کن + غم بحکم خالق آمد کار کن

پس قبض کی حالت میں بھی مقصود سے مایوس نہو بلکہ قبض اس اعتبار سے بڑی نعمت ہے کہ
قبض کے بعد جو بسط ہوتا ہے وہ بڑا ہی قوی ہوتا ہے جیسے وہ پیاس بڑی نعمت ہے جسکے بعد
برف کا ٹھنڈا پانی ملنے کی امید ہو کیونکہ برف کا لطف پیاس ہی کے بعد ہے اسی طرح بسط کا
لطف قبض کے بعد ہے عارف اسی کو فرماتے ہیں ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے ندہد لذتے حضور

یہ لفظ ہجر بفتح الہاء ہے ایک دفعہ سعادت علی خان کی مجلس میں رزیڈنٹ نے جو فارسی دانی
کا مدعی تھا اس لفظ کی تحقیق میں کہا کہ یہ لفظ ہجر بکسر الہاء ہے انشاء اللہ خاں نے کہا بیشک
بجا ہے چنانچہ شاعر اسکی شہادت بھی دیتا ہے ؎

شب قدر ست طے شدہ نامۂ ہجر سلام فیہ حتی مطلع الفجر

آپ نے فجر کو بکسر الفاء پڑھا رزیڈنٹ شرمندہ ہو کر چپ ہو گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ اسی رزیڈنٹ
نے کہا کہ سعدی کا یہ مصرع ؎ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد + غلط مشہور ہو گیا ہے۔
صحیح خفیہ ہے۔ انشاء اللہ خاں نے کہا بیشک حضور سچ ہے کیونکہ دوسرا مصرعہ

بھی اسکا موید ہے ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد ✢ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یہاں بھی رزیڈنٹ بہت شرمندہ ہوا۔ انشاء اللہ خاں بڑا مسخرہ تھا اور وقت پر اسکو بڑی دور کی سوجھتی تھی ایک دفعہ یہ سعادت علی خاں کے ساتھ ننگے سر کھانا کھا رہا تھا سعادت علیخاں نے چپکے سے ایک چپت اسکے رسید کیا تو آپ نیچے گردن کئے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ والد صاحب قبلہ کو غریق رحمت کرے یہ کہکر پھر کھانے میں مشغول ہو گیا سعادت علیخاں نے پوچھا کہ والد صاحب کی کیا بات یاد آگئی کہا کچھ نہیں اُس نے اصرار شروع کیا تو کہا والد صاحب قبلہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ ننگے سر کھانا کھانے سے شیطان چپت مارا کرتا ہے آج مجھے انکی بات یاد آگئی کہ واقعی وہ صحیح فرماتے تھے۔ اس جواب سے سعادت علی خاں پر پانی پڑ گیا مگر پہلے زمانہ کے رؤسا علم اور اہل علم کے قدردان تھے اسلئے ان سب باتوں کو گوارا کرتے تھے آجکل کے رؤسا کی طرح بد دماغ نتھے خیر یہ تو درمیان میں ایک لفظی تحقیق پر چند لطیفے یاد آگئے ایک بات یہ بھی سمجھو کہ قبض باعتبار آثار کے بسط سے زیادہ نافع ہے کیونکہ بسط میں عجب کا خطرہ ہے اسمیں اپنے کمالات پر نظر ہوتی ہے اور قبض میں اپنے اوپر نظر نہیں ہوتی بلکہ عجز و نیاز مندی کا غلبہ ہوتا ہے اسوقت انسان اپنے کو کتے اور فرعون سے بدتر سمجھتا ہے اور یہ بات اُس شخص کے سمجھ میں نہیں آسکتی جسپر یہ حال نہ گذرا ہو کیونکہ یہ ذوقی امر ہے جسپر گذرتی ہے۔ وہی اسکو جانتا ہی اور یہ نہیں کہ اسوقت یہ شخص اپنے کو مومن نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنے کو مومن اور فرعون کو کافر سمجھکر بھی اپنے کو اُس سے بدتر سمجھتا ہے میں الفاظ سے اس حالت کی حقیقت کو نہیں بتلا سکتا تم اتنا سمجھ لو کہ اُسکو اپنے مآل پر نظر ہوتی ہے کہ نمعلوم مآل کیسا ہو۔ اور اس طریق میں عجز و نیاز ہی سے کام چلتا ہے عجب و پندار سے کامیابی نہیں ہوسکتی مولانا فرماتے ہیں ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ ✢ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

اور فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ✢ ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود ✢ ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

۲۵

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش
در بہاراں کے شود سر سبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ
ناز را روی بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
ہمچو یوسف نازش و خوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتیہ کا مذاق کیسا اچھا ہے گو تمام صوفیہ کا یہی مذاق ہے مگر چشتیہ پر سب سے زیادہ اس کا غلبہ ہے کہ ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن پروانہ ز من شمع ز من گل ز من آموخت

میں نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ جس شخص کو ساری عمر کے مجاہدات و ریاضات کے بعد میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اُسکو سب کچھ حاصل ہو گیا کیونکہ اس طریق کا حاصل یہی ہے بیحاصلی۔ اور جو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ کمال حاصل ہو گیا وہ اس شعر کا مصداق ہے ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

اب قبض ایسا تو مفید مگر لوگ پھر بھی بسط ہی کے طالب ہیں اور قبض کی بیقدری کرتے ہیں اور تاویل یہ کرتے ہیں کہ بسط میں سہولت زیادہ ہے میں کہتا ہوں مگر سہولت ہی چہ ضرور جیسے کسی نے شعر میں بے موقع ایک لفظ کو مشدد کر دیا تھا جب اعتراض ہوا تو کہا ضرورت شعری سے ایسا کیا گیا استاد نے کہا شعر گفتن چہ ضرور اور یہ ظاہر ہے کہ قبض میں قدرت عمل تو سلب نہیں ہوتی پس ہمت سے کام لو اور بدون سہولت ہی کے عمل کرتے رہو سہولت کے طالب نہ ہو ورنہ ایسی مثال ہو گی جیسے ایک فقیر سلطنت کا طالب ہو اور یہی تاویل کرے کہ بادشاہ ہو جاؤنگا تو سہولت سے روٹی ملے گی تو کیا آپ اس طلب کو صحیح مانیں گے ہرگز نہیں اور اگر یہ کہو کہ یہ طلب اسلئے صحیح نہیں کہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ فقیر بادشاہ ہو جائے اور یہ تو ہو سکتا ہے کہ عمل سہل ہو جاوے جواب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ ایسا ہو نہیں سکتا غلط ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی پاگل بادشاہ مر جائے اور یہ وصیت کر جائے کہ شہر پناہ سے جو شخص سب سے پہلے داخل ہو اُسکو بادشاہ بنا دیا جائے اور ایک فقیر کو اس طرح بادشاہت مل بھی چکی ہے پھر تخت پر بیٹھنے سے پہلے تو وہ فقیر تھا اور تخت پر بیٹھتے ہی شاہی دماغ عطا ہو گیا چنانچہ دربار سے اُٹھتے وقت

اس نے وزیر کو اشارہ کیا کہ بغل میں ہاتھ دیکر اٹھائے کیونکہ سلاطین کا یہی قاعدہ تھا وزیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس بھاک منگے کو ایک دن میں یہ قواعد کیونکر معلوم ہوگئے آخر پوچھا اس نے جواب دیا کہ جس خدا نے بے مشقت مجھے بادشاہت دی ہے اسی نے دفعۃً دماغ شاہی بھی عطا کر دیا سچ ہے ع خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے۔ اسلئے یہ طلب سلطنت محال کی طلب نہیں بلکہ احتمال کی طلب ہے گو اس احتمال کا پورا ہونا ایسا ہی ہے جیسے شیخ چلی کے احتمال کا پورا ہونا جیسے آج کل سوراج کی بہت شورش ہے ہندوستانی بادشاہت کے طالب ہیں شاید تمکو ہی مل جائے احتمال تو ضرور ہے مگر بس احتمال ہی سے خوش ہولو ورنہ یہ احتمال ایسا ہے جیسے ایک صاحب نے سیاہ کتے کو جھک کر سلام کیا تھا کسی نے وجہ پوچھی تو کہا شاید جن ہو اور جنوں میں بھی بادشاہ ہو اور میرے سلام کی وجہ سے خوش ہو کر کچھ دیدے۔ بس ایسی ہی حالت آپ کی طلب کی ہے یہ مسلم ہے کہ بسط میں سہولت ہوتی ہے مگر سہولت کا منتظر رہنا ہی غلطی ہے اسکے متعلق میرا ایک وعظ التحصیل والتسہیل ہے اسمیں اس جزو کی بہت تفصیل ہے خدا کرے جلد طبع ہو جائے تو اس کا مطالعہ اس باب میں زیادہ نافع ہوگا۔ بس بسط کی طلب نکرو ہاں بلا طلب ملجائے تو شکر کرو جیسے کسی کو عالیشان مکان ٹھنڈا مل جائے تو نعمت ہے یا برف کا ٹھنڈا پانی ملجائے تو نعمت ہے۔ اور اگر نہ ملے تو کنوئیں ہی کے پانی سے راضی رہو یہ کیا ضرور ہے کہ اسٹیشن پر جاکر لاؤ چاہے گھلکر سیر بھر کا آدھ پاؤ ہی رہ جائے۔ اور جانے کی مشقت گرمی کی مصیبت جدا رہی۔ پس سلامتی اسمیں ہے کہ تم عمل کرتے رہو اگر حال مرتب ہو جائے تو شکر کرو اور نہ مرتب ہو تو مناسب تو یہی ہے کہ اس حال میں بھی شکر کرو ورنہ صبر کرو ایک عارف نے ایک سالک سے پوچھا تھا کہ کس حال میں ہو کہا مقام توکل میں ہوں اگر ملتا ہے شکر کرتا ہوں نہیں ملتا تو صبر کرتا ہوں عارف نے کہا کہ اتنا تو بغداد کے کتے بھی کرتے ہیں سالک کو تو یہ چاہیئے کہ نہ ملنے پر بھی شکر ہی کرے کہ یہ بھی نعمت ہے اسمیں بھی حکمت عظیمہ ہوگی اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

کیونکہ کیا معلوم تمکو زیادہ روٹی ملتی تو کیا حال ہوتا اسلئے نہ ملنے پر بھی شکر ہی کرنا چاہئے حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی شخص ذکر میں حال وغیرہ نہ حاصل ہونے کی شکایت کرتا اور یہ کہتا کہ کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا تو فرماتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم خدا کا نام لے رہے ہو پھر یہ شعر پڑھتے ؎

حاصل آید یا نیاید آرزوے می کنم یابم اورا یا نیابم جستجوے می کنم

واقعی ذکر اللہ کی توفیق ہو جانا ہی بڑی نعمت ہے اسکے بعد اور کیا چاہتے ہو مولانا رومی رح نے ایک حکایت لکھی ہو کہ ایک صوفی کو شیطان نے دھوکہ دیا تمکو ذکر اللہ کرتے ہوے بہت سال ہو گئے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ کچھ پیام ہے نہ جواب ہے جب وہاں شنوائی نہیں ہوتی تو خواہ مخواہ سر مارنے سے کیا فائدہ سالک اس دھوکہ سے متاثر ہو گیا آہ اس طریق میں بہت دھوکے ہیں کیونکہ شیطان سالکِ طریق کا درپے ہو جاتا ہے وہ اسکو طرح طرح سے بہکاتا ہے اسلئے بہت احتیاط واہتمام کے ساتھ چلنا چاہئے ؎

دررہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست ہشیار وگوش را بہ پیام سروش دار

پیام سروش سے مراد وحی ہے کہ شریعت کو پیش نظر رکھو اور شیطان کے ہر دھوکہ کا جواب شارع علیہ السلام کے ارشادات سے حاصل کرو اور شریعت کے خلاف ہرگز کسی بات کو دل میں جگہ نہ دو مگر بعض سالک محبوب ومراد ہوتے ہیں اُنکی دستگیری ایسے وقت میں غیب سے ہوتی ہے اُن کو احتیاط واہتمام کی بھی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ یہ سالک مراد تھا اسکو شیطان نے دھوکہ دیا اور وہ دھوکہ میں آگیا کہ رات کو سب معمولات ترک کر کے سو رہا مگر غیب سے اُسکی دستگیری ہوئی رات کو خواب میں کوئی لطیفہ غیبی آیا اور اُس نے حق تعالیٰ کی طرف سے دریافت کیا کہ کیوں میاں آج تم ہمکو بھول ہی گئے کیا بات ہے کیوں خفا ہو گئے کہا میں نے برسوں حق تعالیٰ کو یاد کیا جب اُس طرف سے کوئی پیام وجواب تک نہ آیا تو میں نے سوچا کہ وہ تو پوچھتے بھی نہیں پھر میں ہی کیوں سر ماروں لطیفہ غیبی نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکو یہ جواب دیا ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ویں نیاز وسوز و دردت پیک ماست

کہ تمھارا یہ اللہ اللہ کرنا ہی تو ہمارا جواب ہے یہی علامت قبول ہے اگر تم مردود ہوتے تو ہم زبان کو اپنے ذکر سے روک دیتے جیسا کہ بہت سی مخلوق کو اپنے ذکر سے محروم کر رکھا ہے ہمارے حاجی صاحب رح

اسی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ جب صبح کی نماز پڑھکر ظہر کی توفیق ہو جائے تو یہ نماز صبح کی قبول کی علامت ہے اگر ان کو تمھارا دربار میں آنا ناگوار ہوتا تو دوسرے وقت کیتے بھی نہ دیتے ۔ جیسے ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا وہ اسکو پکڑنے آیا موذن نے دھمکایا کہ لوگ مسجدوں میں جانور گھسا دیتے ہیں تو قصائی نے جواب دیا کہ کیوں بڑبڑ کرتا ہے جانور تھا گھس گیا کبھی ہمکو بھی مسجد میں دیکھا ہے تو حضرت یہی حال آپکا ہوتا کہ مسجد میں کبھی گھسنے کی ہی توفیق نہ ہوتی ۔ مولانا نے ایک آقا اور غلام کی حکایت لکھی ہے کہ دونوں بازار میں کسی کام کو گئے راستہ میں اذان ہوگئی تو غلام نے آقا سے نماز کیلئے اجازت مانگی وہ نمازی تھا اور آقا بے نمازی تھا اس نے اجازت دیدی غلام تو مسجد میں جا کر وضو نماز میں لگ گیا اور آقا مسجد کے باہر بیٹھ گیا غلام نماز سے فارغ ہو کر وظیفہ میں لگ گیا جب بہت دیر ہو گئی اور سب نمازی چلے گئے تو آقا نے پکارا کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں کہا آنے نہیں دیتا پوچھا کون نہیں آنے دیتا کہا جو تمکو مسجد کے اندر نہیں آنے دیتا وہ مجکو باہر نہیں آنے دیتا واقعی جسکو وہ مردود کرتے ہیں وہ خود ہی مسجد سے بھاگتا ہے جیسے گوہ پانی سے بھاگتی ہے اور مچھلی پانی کی عاشق ہے وہ ہر دم پانی ہی میں رہنا چاہتی ہے اسی لئے علماء کا قول ہے المؤمن فی المسجد کالسمک فی الماء والمنافق فی المسجد کالطیر فی القفس ۔ پس یہ بڑی دولت ہے کہ کسی کو ذکر اللہ کی توفیق ہو جائے ورنہ وہ نام تو ایسا ہے کہ اسکے لینے کی ہم جیسوں کو اجازت بھی نہ ہوتی جیسا کہا گیا ہے

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اور دیکھئے ہم آپس میں اپنے کسی بڑے کا نام بدون القاب کے نہیں لیسکتے کیونکہ لوگ صرف نام لینے سے ناخوش ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ یا اللہ کہنے سے خوش ہوتے ہیں پس تم کیا ذوق و شوق لئے پھرتے ہو کام میں لگو اور اس نعمت کی بیقدری نکرو کہیں یہ نعمت بھی سلب نہو جائے ۔ بلا بودے اگر اینہم نبودے ۔ تم اپنا کام کرو دوسروں کے کام کے پیچھے کیوں پڑے ع کار خود کن کار بیگانہ مکن ۔ ذوق و شوق عطا کرنا ان کا کام ہے یہ تمھارے اختیار سے باہر ہے تم اسکے درپے نہو جو کام تمھارے اختیار کا ہے اسمیں لگو ۔ یہ ہے مذہب اہل تحقیق کا اور راحت اسی میں ہے کہ حال و ذوق ملجائے تو عنایت نہ ملے تو عنایت تم ہر حال میں راضی رہو بعض عشاق تو یہانتک راضی

گیا

ہیں کہ ہمکو جہنم بھی بھیجدیا جائے تو اسپر بھی راضی ہیں مگر اس بات کا ہمارا منہ نہیں اسکے قابل عشاق ہی کا منہ ہے۔ اور لسان عشق معذور ہوتی ہے جیسے ایک پرندہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں ایک مادہ سے کہرہا تھا کہ اگر تو میری ساتھ مل جائے تو میں تجکو ملک سلیمان دیدوں گا یہ بات حضرت سلیمان نے سن لی اور وہ منطق الطیر کے عالم تھے فوراً اس پرندہ کو بلایا اور فرمایا نالائق یہ کیا گستاخی تھی کہ آپ میرا ملک دینے والے کون ہوتے ہیں اس نے کہا اے نبی اللہ میں عاشق ہوں اور لسان عشق معذور ہوتی ہے اسپر حضرت سلیمان نے اُس کا قصور معاف کیا اسی طرح یہ عشاق بھی وہاں معذور شمار ہونگے مگر ہر شخص کی زبان زبان عشق نہیں تم ناز سے کام نلو اور عاشق کی نقل نہ کرو وہ تو اپنے کو مٹا کر فنا کرکے ناز کر رہا ہے اسکو حق ہے ہمکو یہ حق نہیں ہے کیونکہ تم اپنے کو باقی رکھکر ناز کرتے ہو ؎

پیش یوسف نازش و خوبی مکن	جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
زشت باشد روئے نازیبا و ناز	عیب باشد چشم نابینا و باز

بخشی محمد حسن صاحب تھانوی نے بھوپال کے ولی عہد سلطنت کو ایک دفعہ سادگی سے کہدیا کہ آپ تو سمجھتے نہیں ہیں ولی عہد کو یہ بات اُن کے منہ سے ذرا ناگوار نہیں ہوئی وزیر صاحب کی کمبختی آئی کہ انھوں نے بھی ولی عہد کو یہی کلمہ کہدیا ولی عہد کا چہرہ سرخ ہوگیا اور کہا بس اپنے درجہ پر رہو تم بخشی جی کی ریس کرتے ہو۔ ارے وہ تو ہمارے باپ کی جگہ ہیں نوکر اور ملازم نہیں اور تم ملازم ہو ملازم کو گستاخی اور بدتمیزی کا کیا حق ہے۔ اگر اب سے ایسی بدتمیزی کی تو کان پکڑکے دربار سے نکلوادئے جاؤگے۔ بس تم ناز نکرو کیونکہ تم بخشی محمد حسن نہیں ہو اور معیار فرق یہ ہے کہ تم اپنے آپے میں ہو اور عشاق آپے سے باہر ہیں۔

اب ایک بات اور سمجھو کہ یہ جو میں نے کہا ہے کہ امور غیر اختیار غیر مطلوب ہیں یہ عام نہیں بلکہ احوال کے ساتھ خاص ہے کیونکہ جزاء اعمال بھی غیر اختیاری ہے مگر وہ مطلوب ہے کیونکہ وہ احوال میں سے نہیں بلکہ جزا ہے۔ ایک جواب تو یہ ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جزا بھی اختیاری ہے کیونکہ اسکے اسباب اختیاری ہیں یعنی اعمال صالحہ اور اسکی ایسی مثال ہے جیسے یوں کہا جائے کہ صحت اختیاری ہے کیونکہ اسکے اسباب اختیاری ہیں پس جنت و قرب و رضا اسی قبیل سے ہیں

کہ فی نفسہ غیر اختیاری ہیں مگر بواسطہ اسباب کے اختیاری ہیں اور اگر نظر کو غائر کرو تو معلوم ہوگا کہ تمام اختیارات ایسے ہی ہیں کہ فی نفسہ غیر اختیاری ہیں مگر اسباب کے اختیاری ہونے کی وجہ سے انکو اختیاری کہا جاتا ہے مثلاً ابصار کو اختیاری کہا جاتا ہے حالانکہ اسمیں صرف فتح العین اختیاری ہے۔ اور ادراک غیر اختیاری ہے مگر عادۃ اللہ یہ ہے کہ فتح العین پر ادراک کا ترتب ہو جاتا ہے اسی طرح شبع اور ری یعنی سیر ہونا اور سیراب ہونا یہ بھی محض اسباب کے واسطہ سے اختیاری ہیں ورنہ فی نفسہ غیر اختیاری ہیں بلکہ اور نظر کو غائر کرو تو جنت ابصار وغیرہ سے زیادہ اختیاری ہے کیونکہ فتح العین پر ترتب ادراک محض عادی ہے وعدی نہیں اور جنت کا ترتب اعمال صالحہ پر وعدی ہے اور عادات میں تخلف جائز ہے اور وعدہ میں جائز نہیں پس اب اشکال مرتفع ہو گیا کیونکہ مبنی اشکال کا یہ تھا کہ جنت غیر اختیاری ہے اور اب معلوم ہو گیا کہ جنت اختیاری ہے پس غیر مطلوب وہ ہے جو فی نفسہ بھی غیر اختیاری ہو اور اسباب کے لحاظ سے بھی غیر اختیاری ہو۔ اور جو چیز اختیاری ہو خواہ بلا واسطہ یا بواسطہ وہ غیر مطلوب نہیں۔ اور احوال من کل وجہ غیر اختیاری ہیں گو اُن کے حصول میں بھی اعمال واسطہ ہیں مگر یہ واسطہ ایسا ہے جسپر احوال کا ترتب لازم نہیں نہ آکا وعدہ ہے اسلئے ان کو بواسطہ بھی اختیاری نہیں کہسکتے پس ان کی طلب کے درپے نہو بلکہ رضائے حق کے طالب بنو اور غیر حق سے نظر قطع کرو خوب کہا ہے ؎

تو درو گم شو وصال این ست وبس　　　گم شدن گم کن کمال این ست وبس

گم شو کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کے فنا کا امر ہے اسکو گم کرو یعنی اپنے ارادہ و تجویز کو فنا کر دو یہ مطلب نہیں کہ نماز و روزہ کو بھی فنا کر دو۔ اور گم شدن گم کن کمال این ست وبس یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آئے گی مگر اشکال محض لغو ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سوتے ہوئے یہ جانتا ہو کہ میں سو رہا ہوں تو وہ سونیوالا نہیں ہے سونیوالا وہی ہے جسکو اپنے سونیکی بھی خبر نہو اسی طرح صاحب فنا وہ ہے جسکو اپنے صاحب فنا ہونیکی بھی خبر نہو یعنی اسپر التفات نہو یہ معنی نہیں کہ وہ محض بیوقوف ہوتا ہے کہ اسکو اپنے حال کی خبر ہی نہیں ہوتی خبر تو ہوتی ہے مگر التفات نہیں ہوتا تو گم شدن گم کن امر معقول ہوا اور اس فن کا کوئی مسئلہ

بھی خلاف عقل نہیں کیونکہ تصوف محض ہے اور علم صحیح موافق عقل کے ہوتا ہے۔ بس علوم تصوف میں کوئی اشکال عقلی وشرعی واقع نہیں ہو سکتا۔ اور وہ عشاق کے کلمات ہیں جنکے بیچے اور روان مختلف ہوتے ہیں سو وہ مغلوب الحال ہیں کلمات عشاق کا نام تصوف نہیں بلکہ محققین کے ارشادات کا نام ہے اور محققین کے کلام پر کسی کو انگلی رکھنے کی مجال نہیں وہ تو قرآن وحدیث و عقل سب پر منطبق ہے چنانچہ فناء الفناء کی حقیقت کو خود حکماء نے بھی تسلیم کیا ہے کیونکہ حکماء نے طے کر دیا ہے کہ علم کیلئے علم العلم کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے آپ دھوپ میں کام کرتے ہیں چلتے پھرتے ہیں مگر دھوپ میں ہونیکی طرف التفات نہیں ہوتا اسکو اہل علم زیادہ سمجھیں گے اسی لئے اہل علم کو صوفی ہونیکا زیادہ حق ہے کیونکہ جاہل مقرَّب [اسم مفعول ۱۲] تو ہو سکتا ہے مگر مقرِّب [اسم فاعل ۱۲] نہیں ہو سکتا مقرب عالم ہی ہو سکتا ہے۔ غرض فناء الفناء میں محبوب کی طرف اسقدر توجہ ہوتی ہے خواہ بواسطہ صفات کے یا بلاواسطہ صفات محض ذات کی طرف کہ اسمیں سالک کو اپنی ذات وصفات کی طرف التفات نہیں ہوتا یہ ہے گم شدن گم کن اور یہ حالت عشاق مجاز کو بھی پیش آتی ہے عاشق کو اپنے محبوب کو دیکھتے ہوئے اس طرف التفات بھی نہیں ہوتا کہ میں اسکو دیکھ رہا ہوں بس اب گم شدن گم کن کمال این ست وبس۔ پر کوئی اشکال نہیں۔ اور جو شخص اسقدر صاحب فنا ہوگا وہ شوق وذوق کی طرف کیونکر التفات کریگا۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لا الٰہ میں سبکی نفی کر دو کہ بجز ذات حق کے کسی طرف التفات نہ رہے مولانا فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما	اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت وناموس ما	اے تو افلاطون وجالینوس ما
عشق آں شعلہ ست کو چوں بر فروخت	ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند	در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ وباقی جملہ رفت	مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت

جب یہ خود ہی نہیں رہا تو دوسری چیزوں کی طرف کیونکر التفات کریگا۔ غرض احوال غیر اختیاری ہیں اسلئے وہ غیر مطلوب ہیں اور اعمال اختیاری ہیں اسلئے مطلوب ہیں اور یہ مسئلہ میں نے خود نہیں گڑھا بلکہ نص میں موجود ہے جسکی میں نے تلاوت کی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ
وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے بلکہ ثواب وعذاب کا مدار کسب واکتساب پر ہے معلوم ہوا کہ انسان
اختیاریات کا مکلف ہے۔ اور احوال اختیاری نہیں اسلئے ان کا مکلف نہیں۔ اور یہ بات اس آیت کے
شان نزول سے زیادہ واضح ہو جائے گی کیونکہ اسکا نزول احوال ہی کی تحقیق میں ہے۔ شان نزول
اس آیت کا یہ ہے کہ جب آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ نازل ہوئی
تو صحابہ اس سے ڈر گئے کیونکہ ما فی انفسکم بظاہر عام ہے وساوس غیر اختیاریہ وعزائم اختیاریہ سبکو
تو صحابہ یہ سمجھے کہ شاید ان سب پر مواخذہ ہوگا اور اس خیال کا منشا یہ صحابہ کی قلت علم نہ تھا بلکہ
اس کا منشا غلبہ عشق تھا جسکی شان یہ ہے ؎ با سایہ ترا نمی پسندم + عشق است و ہزار بدگمانی۔
عاشق کو ضعیف احتمالات پر بھی بڑی فکر رہتی ہے ورنہ صحابہ قواعد کلیہ سمعیہ وعقلیہ سے جانتے تھے کہ
اللہ تعالیٰ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ فرمائینگے کیونکہ مقتضائے رحمت کے خلاف ہے مگر عشق ومحبت کی وجہ
سے خشیت کا غلبہ تھا آیت میں عموم دیکھکر ڈر گئے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اسکو عرض کیا حضور نے
فرمایا تو کیا تم سمعنا وعصینا کہنا چاہتے ہو سمعنا واطعنا کہو کہ ہمنے سن لیا اور ہم اطاعت کریں گے
صحابہ نے ادب سے کام لیا اور سمعنا واطعنا کہا گو زبان لڑکھڑاتی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ وساوس غیر اختیاریہ
میں شاید اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکے مگر ادب کیوجہ سے اطاعت کا وعدہ کر ہی لیا اللہ تعالیٰ کو انکی یہ ادا
پسند آگئی اسپر آمن الرسول سے اخر سورۃ تک آیات نازل ہوئیں اور ادب کی برکت سے آیت کی
تفسیر کر دی گئی۔ ادب بڑی چیز ہے مولانا نے ادب کے متعلق قصہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے
لغزش ہوئی اور انپر عتاب ہوا اور حضرت آدم نے ربنا ظلمنا انفسنا کہا اور اللہ تعالیٰ نے انکی توبہ
قبول کی تو بعد میں ان سے پوچھا کہ اے آدم خالق افعال تو میں ہوں تمنے ظلمنا انفسنا کیونکر کہا
آدم علیہ السلام نے جواب دیا ؎ لیک من پاس ادب نگذاشتم + گفت من ہم پاس آنت داشتم
اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی یہاں ادب سے کام لیا کہ خود اس آیت کی تفسیر نہ کی ورنہ آپ خود بھی
تفسیر کر سکتے تھے مگر آپنے وحی کا انتظار کیا اسپر یہ آیات نازل ہوئیں جنمیں اول رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم اور حضرات صحابہ کی تعریف ہے کہ سب نے ایمان پر استقامت ظاہر کی اور سمعنا واطعنا کہا اور جس کوتاہی کا
اندیشہ تھا اس سے استغفار کیا غفرانک ربنا والیک المصیر اس تعریف کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر کیگئی

۳۳

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا میں جس کا حاصل یہ ہی کہ مدار تکلیف کا صرف اختیار ہی اور خطرات اختیاری نہیں تو عبد انکا مکلف بھی نہیں۔ اب اسپر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ غیر اختیاری پر مؤاخذہ بھی نہو گا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ غیر اختیاری کا مکلف نہیں سو ممکن ہی کہ غیر اختیاری کا مکلف تو نہو مگر اسپر مؤاخذہ ہو جاوے اس کا جواب آئندہ جملہ میں ارشاد فرمایا گیا لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت کیونکہ کسب واکتساب کے معنی عمل بالاختیار کے ہیں اور لہا وعلیہا میں لام اور علیٰ کا مدلول ثواب وعقاب ہی پھر دونوں میں مجرور کو مقدم کیا گیا ہی جو مفید حصر ہے اس حصر سے معلوم ہو گیا کہ استحقاق ثواب وعقاب صرف امور اختیاریہ ہی پر ہے پس آیت بالا کی تفسیر ہو گئی کہ مراد ما فی انفسکم سے اعمال اختیاریہ ہیں اور مسئلہ کا منصوص ہونا ثابت ہو گیا جسکا میں نے دعویٰ کیا تھا اسی مسئلہ پر اپنے مقصود کی پھر تصریح کرتا ہوں کہ جب ثواب وعقاب کا مدار اختیار پر ہی اور مقصود عبد کا صرف حصول ثواب اور نجات عن العقاب ہی پھر غیر اختیاری کے فکر میں کیوں پڑے۔ یہاں ایک اور سوال کے جواب پر بھی متنبہ کرتا ہوں وہ سوال یہ ہی کہ بعض مصائب ایسے آتے ہیں جو تحمل سے زیادہ ہوتے ہیں جواب یہ ہی کہ یہاں تکلیف سے مراد تکلیف شرعی ہی تکلیف تکوینی مراد نہیں سو اسکی یہاں نفی نہیں پس امور تکوینیہ میں فوق طاقت کا وقوع ہو سکتا ہی شاید اسپر یہ سوال ہو کہ جب تشریعیات میں رحمت کی وجہ سے یہ قاعدہ ہی لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا تو تکوینیات میں بھی رحمت کا یہ مقتضا کیوں ظاہر نہوا اس کا جواب یہ ہی کہ تکوینیات میں بوجہ زیادت اجر کے فوق طاقت کا وقوع خلاف رحمت نہیں رہا یہ سوال کہ پھر تشریعیات میں بھی زیادت اجر کیلئے ایسا کیا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تشریع سے عمل مقصود ہی اور فوق طاقت کا صدور کیونکر ہوتا اور تکوینیات میں صدور اس کا فعل نہیں ایک دوسری بات مطلوب ہے جو کہ وہ اختیاری ہے یعنی صبر کہ خدا تعالیٰ کی شکایت نکرے اور اسمیں بھی اتنی توسیع ہی کہ حقیقی شکایت نکرے گو صورت شکایت ہو جاوے تو وہ معاف ہی جیسے یعقوب علیہ السلام کا قول ہی انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ اسی طرح آنسو بہنا آہ آہ منہ سے نکلنا بھی خلاف صبر نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ اسکے مستحق تھے بلکہ رو لینے سے صبر حقیقی زیادہ آسان ہو جاتا ہی کیونکہ دل کا غبار نکل جاتا ہے تو دل میں ضبط سے شکایت پیدا نہیں ہوتی بعض لوگوں کو تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہی وہ بیماری میں آہ آہ کرنیکو خلاف صبر سمجھتے ہیں اسلئے اللہ اللہ کرتے ہیں تاکہ قوت قلب ظاہر ہو مگر یہ معرفت کے خلاف ہی اسپر والا نا

مفتی الٰہی بخش صاحب کی حکایت مجھے یاد آئی کہ ایک بار وہ بیماری میں الله الله کر رہے تھے کہ انکے بھائی آگئے وہ بھی بڑے بزرگ تھے انھوں نے فرمایا بھائی جی آہ آہ کرو کیونکہ الله الله مظہر الوہیت ہے اور آہ آہ مظہر عبدیت ہے اور اسوقت وہ عبدیت کو دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ انھوں نے آہ آہ شروع کی اور بہت جلد صحت ہو گئی کیونکہ مقصود پورا ہو گیا تھا۔ الله تعالیٰ کو عجز و نیاز اور تضرع و زاری بہت پسند ہے اور یہ بات آہ ہی میں ہے الله الله کرنے میں نہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

تا نگرید کودک حلوا فروش　　بحر بخشایش نمی آید بجوش

اور فرماتے ہیں ؎ اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست ✦ اے خوشا آن دل کہ آں بریان اوست

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست　　مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

اسی لئے ایک بار حضرت عمر سے بیماری میں جب کسی نے یہ پوچھا کہ کیسی طبیعت ہے، فرمایا اچھی نہیں سائل نے کہا کیا آپ شکایت کرتے ہیں فرمایا تو کیا میں خدا کے سامنے اپنی بہادری ظاہر کروں کہ وہ تو بیمار کریں اور میں کہوں نہیں میں تو اچھا ہوں اس سے معلوم ہو گیا کہ شکایت منافی صبر وہ ہے جو خود مقصود ہو اور جو کسی حکمت سے ہو وہ عبدیت ہے ان مقامات کو عارفین سمجھتے ہیں کہ اسوقت کیا مطلوب ہے، اور دوسرے وقت کیا مطلوب۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک اور حکایت ہے جسکو مناسبت مقام کی وجہ سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ جب حضرت عمر کے پاس کسریٰ کا خزانہ مفتوح ہو کر آیا تو سونے چاندی اور جواہرات کا بڑا انبار تھا آپنے اسکو دیکھکر الله تعالیٰ سے اس طرح دعا کی کہ خداوندا آپکا ارشاد ہے زین للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث کہ لوگوں کے دلوں میں خواہشوں کی محبت آراستہ کر دیگئی ہے جنمیں عورتیں بھی ہیں اور اولاد بھی اور سونے چاندی کے ڈھیر بھی اور گھوڑے نشان کردہ اور چوپائے اور کھیتی بھی۔ زین صیغہ مجہول ہے جس کا فاعل یہاں مذکور نہیں علماء میں اسکے فاعل کے بارہ میں اختلاف ہوا ہے بعض نے اس کا فاعل شیطان کو مانا ہے کہ شیطان نے ان چیزوں کی محبت قلوب میں آراستہ کر دی ہے اور حضرت عمر نے الله تعالیٰ کو فاعل مانا ہے۔ دونوں میں منافاۃ کچھ نہیں دونوں صحیح ہیں کیونکہ تزیین کے دو درجے ہیں ایک وہ درجہ جو معصیت کی طرف مفضی ہے اس کا فاعل تو شیطان ہے اور ایک درجہ طبعی تزیین کا ہے جو کسی حکمت سے ودیعت رکھی گئی ہے اسکے فاعل الله تعالیٰ ہیں کیونکہ طبعیات

سب خدا کی پیدا کردہ ہیں آخر آپ کو کھانے پینے کی محبت نہیں ہے؟ یقیناً ہے پھر طبعاً مال و زر کی محبت
بھی ہو تو کیا حرج ہے اور جسطرح طبیعت کے درجہ میں طعام و شراب کی محبت قبیح نہیں اسی طرح اس درجہ میں
مال و اولاد کی محبت بھی قبیح نہیں اب اللہ تعالیٰ اسکے فاعل ہوں تو کچھ اشکال نہیں ہاں جو درجہ
مفضی الی المعصیت ہے اس کا فاعل شیطان ہے غرض حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مال کی محبت آپنے ہمارے
دلوں میں مزین کی ہے اسلئے ہم یہ تو نہیں چاہتے کہ ہمکو مال سے محبت نہو اور نہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے ہمکو
خوشی نہیں ہوئی ہاں یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس محبت کو اپنی رضا کی طرف منعطف کر دیجئے اور
اس کو اپنے دین کے کام میں صرف کر دیجئے سبحان اللہ! یہ حضرات ہیں عارف کامل! یہ حکایت
میں نے اسی واسطے ذکر کی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جسطرح لوگوں نے صبر کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی
ہے کہ صورت شکایت کو بھی خلاف صبر سمجھتے ہیں اسی طرح ترک دنیا اور زہد کی حقیقت سمجھنے میں بھی غلطی
کی ہے لوگ محبت مال کو مطلقاً زہد کے خلاف سمجھتے ہیں حالانکہ طبعی محبت زہد کے خلاف نہیں بلکہ خلاف
زہد وہ درجہ ہے جو معاصی کیطرف مفضی ہو اور یہ جو صوفیہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو مال کی
محبت مطلقاً نہتھی تو انمیں طبعی محبت دوسری محبت سے مغلوب ہو جاتی ہے جو بوجہ مغلوبیت کے کالمعدوم
معلوم ہوتی ہے اور کبھی اسکے بعض آثار محسوس بھی ہوتے ہیں مگر وہ مقصود بالذات نہیں ہوتی مقصود
بالغیر ہوتی ہے تو صورت اسکی تعلق کی ہوتی ہے حقیقی تعلق نہیں ہوتا۔ اسپر مجھے حضرت مولانا جامی
کی حکایت یاد آئی کہ جب وہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رح کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں
امیرانہ ٹھاٹ دیکھا تو بہت جھلائے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جنکے پاس اسقدر دنیا بھری ہوئی ہے آپنے
اسی وقت جھلا کر یہ مصرع پڑھا ؎ نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد + اور یہ کہکر چلدیئے اور
ایک مسجد میں آکر سو رہے خواب میں دیکھا کہ قیامت قایم ہے اور ایک شخص ان کے سر ہو گیا کہ
میرے پیسے دلواؤ جو تمھارے ذمہ ہیں مولانا جامی رح بڑے پریشان ہوئے کہ یہاں اسکو کہاں سے پیسے
دوں اس نے کہا پھر نیکیاں دلواؤ۔ یہ اسی کشمکش میں تھے کہ ایک طرف سے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار
کی سواری بڑی شان سے آتی ہوئی نظر پڑی خواجہ صاحب نے مولانا جامی کو پریشان دیکھکر سواری روکی
اور قرضخواہ کو دھمکایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو جاؤ تمھارا جو کچھ مطالبہ ہو ہماری خزانہ سے وصول
کرلو جو ہمنے یہاں پہلے سے جمع کر رکھا ہے یہ کہکر مولانا جامی کو اپنے ساتھ سوار کر لیا یہ دیکھکر آنکھ کھل گئی۔

اب توانکو تنبیہ ہوا کہ خواجہ صاحب بڑے درجہ کے درویش ہیں اور میں نے سخت غلطی کی جوان پر اعتراض کیا یہ اسی سوچ میں تھے کہ اتنے میں خواجہ صاحب نماز کیلئے مسجد میں تشریف لائے یہ دوڑ کر قدموں میں گر پڑے اور خطا معاف کرائی خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ذرا وہ اپنا مصرع تو پھر سنا دو جو آتے ہی سنایا تھا مولانا جامی سے نے شرمندہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت وہ تو میری حماقت تھی فرمایا کہ ایک بار تم نے اپنی خواہش سے یہ حماقت کی تھی اب ہماری خوشی کیلئے وہ حماقت کرلو چنانچہ آپ نے پڑھا کہ ؎ نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد۔ خواجہ صاحب نے فرمایا مضمون صحیح ہے لیکن ناتمام ہے اسمیں اتنا اور ملالو کہ ؎ اگر دارد برائے دوست دارد + غرض مال کی محبت کا یہ درجہ خلاف زہد نہیں اور نہ مال کا جمع کرنا مطلقاً خلاف زہد ہے البتہ اسکو ذریعۂ معاصی بنانا یہ خلاف زہد ہے اور اگر یہ نہو تو پھر کچھ حرج نہیں بلکہ بعضوں کیلئے مالدار ہونا ہی مفید ہے اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کسکو مال سے قرب ہوگا اور کسکو افلاس سے۔ اسلئے کسی کو مال دیتے ہیں کسی کو مفلس رکھتے ہیں۔ میں نے حضرت عمر کی عبدیت ظاہر کرنیکو اُن کی حکایت بیان کی تھی + اسکے بعد بوجہ مناسبت کے دوسری حکایات ضمناً بیان ہوگئیں اس سے پہلے میں یہ کہرہا تھا کہ بیماری وغیرہ میں صورت شکایت کا حرج نہیں بس شکایت حقیقی نہونا چاہئے اور یہ امر اختیاری ہے اور تکوینیات میں انسان اسی کا مکلف ہے اسکے سوا کسی عمل وغیرہ کا مکلف نہیں پس تکوینیات میں فوق الطاقت کا وقوع جائز ہے اور تشریعیات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں تکوینیات کے بارہ میں آگے دعا کی تعلیم ہے کہ فوق الطاقت مصائب سے بچنے کی بھی دعا مانگا کرو چنانچہ ربنا ولا تحمل علینا اصراً کے بعد جو کہ تشریعیات کے باب میں ہے اسکا اضافہ بھی فرمایا گیا ربنا ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ۔ ایک نکتہ اس مقام میں قابل غور ہے یہ کہ لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت میں دو عنوان کیوں اختیار کئے گئے حالانکہ دوسری جگہ ارشاد ہے ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم اور ایک مقام پر ارشاد ہے لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم ان جگہوں میں اکتساب نہیں فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ اکتساب میں کسب سے زیادت ہے کیونکہ افتعال کی خاصیت تکلف ہے۔ اب خیر کیلئے کسب اور شر کیلئے اکتساب اختیار کرنے میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاصی کیلئے انسان کو اہتمام زیادہ کرنا پڑتا ہے گو وقوع اس کا سہولت سے ہوجائے مگر اہتمام شر کیلئے زیادہ ہوتا ہے اور خیر کیلئے اسقدر اہتمام کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان کی اصل

فطرت خیر ہے جیسا کہ حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ سے معلوم ہوتا ہے اور فطریات کیلئے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی نیز خیر سے مانع کوئی قوی قوت انسان کے اندر نہیں رکھی گئی اور شر سے مانع ایک قوی قوت اسکے اندر موجود ہے یعنی عقل عقل خود معاصی سے روکتی ہے اسی لئے بعد معصیت کے انسان کو ندامت بیحد ہوتی ہے اسلئے شر کیواسطے اکتساب فرمایا اور خیر کیلئے کسب اور یہ جو حدیث میں ہے حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشہوات وہ اس تقریر کے منافی نہیں کیونکہ شر میں فی نفسہ سہولت نہیں ہاں عادت کے غلبہ سے وہ سہل اور مرغوب ہو جاتی ہے اور خیر میں فی نفسہ دشواری نہیں ہاں عادت نہ ہونیسے اسمیں عارضی دشواری ہو جاتی ہے اور اسی درجہ کے لحاظ سے انکو مکارہ کہا گیا ہے اب کچھ اشکال نہ رہا (میں کہتا ہوں کہ یہاں کسب واکتساب میں تبدیل عنوان کی توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خیر میں مطلق کسب پر اجر ملے گا خواہ اتفاقاً خیر کا صدور ہو جائے اور شر میں مطلق کسب پر عذاب نہیں بلکہ تعمد کسب پر مواخذہ ہوتا ہے چنانچہ خطاء و نسیان عفو ہے واللہ اعلم ۱۲ ظ) ایک سوال وجواب یہاں حصر کے متعلق ہے جو لہا اور علیہا کی تقدیم سے حاصل ہوا ہے وہ یہ کہ اس حصر سے لازم آتا ہے کہ جیسے عقاب بلا کسب نہیں ہونا چاہیے گو ثواب بھی بلا کسب ہے حالانکہ ثواب کبھی بلا عمل محض فضل سے بھی مل جاتا ہے جیسا کہ نصوص میں وارد ہے جواب یہ ہے کہ یہ حصر باعتبار حصول کے نہیں بلکہ باعتبار استحقاق کے ہے یعنی استحقاق تو ثواب کا بھی بدون کسب نہیں گو عطا ہو جاوے اور اوپر میرے کلام میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔ ایک نکتہ اس مقام پر قابل حل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا کی ہمکو تعلیم فرمائی ہے اور حدیث میں ہے کہ یہ دعا قبول ہو چکی ہے چنانچہ حضور فرماتے ہیں رفع عن امتی الخطاء والنسیان اب سوال یہ ہوتا ہے کہ نسیان وخطا امر اختیاری ہے یا غیر اختیاری ظاہر یہ ہے کہ غیر اختیاری ہے اور لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا الخ سے معلوم ہو چکا ہے کہ غیر اختیاری پر مواخذہ نہیں پھر بعض دفع مواخذہ آئندہ کیلئے دعائے عدم مواخذہ کی تعلیم کے کیا معنی جبکہ مواخذہ کا احتمال ہی نہیں۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع خطا و نسیان اس امت کیساتھ مخصوص ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ دوسری امتوں پر مواخذہ تھا اور یہ عقل کے خلاف ہے کہ دوسری امتوں کو تکلیف مالا یطاق دیگئی ہو نیز نص لا یکلف اللہ

نفسا میں نفس عام ہی جس سی معلوم ہوتا ہے کہ تشریعیات میں تکلیف مالایطاق کسی کو نہیں دیگئی
اور عقل بھی عموم کو چاہتی ہی اسکے جوابات علماء نے مختلف دیئے ہیں مگر میرے ذہن میں جو جواب
آیا ہے میں اسکو عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ خطرات وساوس میں دو درجے ہیں ایک درجہ حدوث کا ہے
وہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک درجہ بقا کا ہے یہ بعض اوقات اختیاری ہوتا ہے مثلاً کسی اجنبیہ کا
دل میں بلاقصد خیال آگیا یہ تو غیر اختیاری ہوا مگر اس وسوسہ کا کچھ دیر تک باقی رہنا یہ بعض اوقات اختیاری
ہوتا ہی اور یہ بقاء کبھی قصیر ہوتا ہی کبھی طویل اور یہ بقاء اکثر ہوتا ہی ہی کیونکہ وسوسہ کا ایسا وقوع نادر ہی ہے
کہ حدوث کیساتھ ہی فنا ہو جائے زیادہ یہی ہی کہ وسوسہ کچھ دیر کو ضرور باقی رہتا ہی مگر انسان کو اکثر بقاء قصیر
کا احساس کم ہوتا ہی بقاء طویل ہی کا احساس ہوتا ہی کیونکہ ابتداء میں اُسکو اسپر التفات نہیں ہوتا کہ وسوسہ درجہ
حدوث سی تجاوز کر کے درجہ بقا حاصل کر چکا ہی جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھو کہ درجہ حدوث پر تو کسی سے
مواخذہ نہیں کیونکہ وہ تو من کل وجہ غیر اختیاری ہی۔ اور تیسرے درجہ پر سب سے مواخذہ ہی یعنی بقاء طویل پر
کیونکہ وہ من کل وجہ اختیاری ہی اب ایک درجہ بیچ کا ہی یعنی جبکہ وسوسہ کو بقاء قصیر ہو یہ امت محمدیہ سے
عفو ہی اور پہلی امتوں سی اسپر مواخذہ تھا کیونکہ یہ درجہ فی نفسہ اختیاری ہی اسلئے محل مواخذہ ہونیکے قابل ہے
مگر مشابہ غیر اختیاری کی ہے اسلئے امت محمدیہ سی اسکے متعلق مواخذہ مرتفع ہو گیا۔ رہا یہ سوال کہ جب
یہ درجہ مشابہ غیر اختیاری کے ہی تو پہلی امتیں اس سے کسطرح بچتی ہونگی اسکا جواب یہ ہی کہ جب فی نفسہ
اختیاری ہی تو وہ اہتمام مزید کر کے بچتے ہونگے اور نہ بچتی ہوں تو انپر اس سی استغفار واجب ہوگا اور امت محمدیہ
پر اس سی استغفار کا وجوب نہ ہوگا گو استحباب ضرور ہی۔ اور یہی دو درجہ خطا و نسیان میں ہیں کہ خود خطا
و نسیان تو غیر اختیاری ہی مگر اس کا منشا یعنی عدم استحضار یا مذکرہ اختیاری ہی اگر مذکر کا استحضار کامل
ہو تو پھر خطا و نسیان کا صدور نہیں ہو سکتا انکا صدور جب ہی ہوگا عدم استحضار و غفلت ہی سی ہوگا چنانچہ
اگر دن میں ہر وقت روزہ کا دھیان رہے تو نسیان طاری نہ ہوگا۔ نماز میں اگر افعال صلوٰۃ پر پوری توجہ ہو
تو سہو نہ ہوگا اور یہ امر اختیاری ہی کہ توجہ رکھو تو اسکے ترک پر مواخذہ ہو سکتا ہی اب آیت و حدیث رفع عن امتی پر
پر تو اشکال نہ رہا۔ لیکن ایک مستقل اور اشکال وارد ہوگا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو نماز میں سہو ہوا ہے
کیا اسکا منشا بھی عدم استحضار افعال صلوٰۃ تھا۔ اسکا جواب یہ ہی کہ ہاں سہو نبوی کی علت بھی یہی ہی لیکن
علت عدم استحضار افعال صلوٰۃ ہم میں اور ہی ہی اور حضور اقدس میں اور یعنی ہماری عدم توجہ الی الصلوٰۃ کا منشا تو

یہ ہے کہ ہمکو ایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی ہے جو نماز سے ادنی ہے یعنی دنیا اور حضور کی عدم توجہ الی الصلوۃ کا منشا یہ ہے
کہ ایک ایسی چیز کیطرف توجہ ہوتی تھی جو نماز سے اعلیٰ ہے یعنی ذات حق خوب سمجھ لو بحمد اللہ اب یہ مسئلہ ہر طرح منقح ہو گیا
کہ امور غیر اختیاریہ قابل اہتمام نہیں انکا اہتمام چھوڑ دینا چاہئے بلکہ اختیاری کا اہتمام کرنا چاہئے اور غیر اختیاری
سے مراد صرف احوال و کیفیات ہیں جزا مراد نہیں بلکہ وہ تو مطلوب و مقصود ہے اور احوال مقصود نہیں گو محمود ہیں
مگر اب تو ستم یہ ہے کہ لوگ نماز ہی اس لئے پڑھتے ہیں تاکہ حضور قلب ہو اس لئے اگر حضور نہ ہو تو نماز کو
بیکار سمجھتے ہیں حالانکہ حضور کی سعی اسلئے ہونا چاہئے تھی کہ نماز کامل ہو۔ ہاں احوال کیلئے دعا کرنا جائز ہے بس دعا
کرو لیکن شیخ سے ان کے عدم حصول کی شکایت نکرو البتہ اگر وہ اجازت دے اور اسکا طریقہ بتلادے تو یہ اسکا تبرع ہے
اسپر یہ بات لازم نہیں پس عدم حصول احوال کی ایسی مثال ہے جیسے اولاد نہونا کہ اسکے لئے دعا جائز ہے اور توقع کے درجہ میں
تدبیر بھی جائز ہے لیکن یہ لازم ہے کہ اگر مرتب ہو جاوے تو خوش ہو جاؤ اور مرتب نہو تو جب بھی خوش رہو پریشان نہو
بلکہ سمجھو کہ میرے لئے عدم حصول ہی مصلحت ہے گو اگر خود دعا میں یہ قید نہ لگا دیں کہ یا اللہ اگر حال محمود مجھے نافع ہو
تو عطا ہو ورنہ نہیں عقیدہ اور عزم تو یہی رکھے کہ اگر عطا نہو گا تو میں یہی سمجھونگا کہ میرے واسطے حصول میں حکمت
نتھی مگر دعا میں اس قید کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذمہ خود لیلیا ہے کہ اگر حصول مضر ہو گا تو ہم خود ہی
ندینگے چنانچہ اولاد و رزق کیواسطے یہی دعا مشروع ہے مگر احادیث میں اس قید کی تصریح نہیں ہاں دعاء استخارہ سے
شبہ نکیا جاوے کہ وہاں یہ تعلیم ہے کہ اگر یہ میرے واسطے خیر ہو تو میرے لئے آسان کردیجائے ورنہ میرے دلکو اس سے پھیر دیا جاوے
کیونکہ استخارہ کا محل ایسا امر ہے جسمیں ظاہرا بھی نفع و ضرر دونوں کا احتمال ہے اور یہاں ایسی دعا کا ذکر ہے جو بظاہر
نافع ہی ہے فائدہ بعض لوگونکو خود دعا میں ایک اشکال واقع ہو گیا ہے کہ دعا کرنا بظاہر خلاف تفویض ہے
تفویض اسی میں ہے کہ خود کچھ نہ مانگے جو وہ چاہیں گے خود ہی عطا فرمادینگے ع

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن — کہ حال خستہ دلاں را تو خوب میدانی

اسکا جواب یہ ہے کہ دعا تفویض کے خلاف جب ہے کہ داعی عدم اجابت پر راضی نہو اور جب عدم اجابت پر بھی راضی ہے
تو عین دعا کے وقت تفویض حاصل ہے بہرحال غیر اختیاریات میں دعا کی ممانعت نہیں ہاں تصدی و اہتمام کی ممانعت
ہے کہ اگر حاصل نہوں تو شکایت پیدا ہو۔ خلاصہ ہوا کہ ایک تو اعمال اختیاریہ ہیں ان کا اہتمام واجب ہے اور ثمرات
آجلہ یعنی جزا کیلئے دعا بھی جائز ہے اور اہتمام بھی واجب ہے اور ایک احوال غیر اختیاریہ ہیں یعنی ثمرات عاجلہ ان کیلئے
صرف دعا جائز ہے اسکے علاوہ کسی قسم کا اہتمام جائز نہیں اور دعا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ عدم عطا پر بھی
راضی رہے اب میں ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ہمکو فہم و عمل کی توفیق عطا فرمائیں آمین وصلی اللہ علی سیدنا
ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ۰

اشرف علی

۱۰ رجب ۱۳۴۷ ہجری

رسالہ التبلیغ نمبر ۲ جلد سوم بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۴۷ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

اُنھتروان وعظ مسمی بہ

النعم المرغوبۃ

فی

النعم المرکوبۃ

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی ومولائی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک و ناشر اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنی اہتمام سے شایع کیا

اس وعظ کے متعلق ضروری تمہید

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست　　آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

(یعنی)

افتتاح اسٹیشن تھانہ بھون ٹاؤن

ناظرین میں سے جن حضرات کو کبھی تھانہ بھون آنے کا اتفاق ہوا ہوگا انکو معلوم ہوگا کہ تھانہ بھون کا ریلوے اسٹیشن آبادی سے قریب ۲ دو میل کے فاصلہ پر واقع تھا اسلئے حضرت حکیم الامت دام مجدہم السامی کو جیسے تھانہ بھون کے قریب سے ریل کے جاری ہونیکی خوشی تھی کہ اس سے احباب کو آنے جانے میں سہولت ہوگئی ساتھ ہی یہ بھی تمنا تھی کہ اسٹیشن آبادی سے متصل بنجائے تو زیادہ سہولت و راحت ہوجائے کیونکہ رات کے وقت اور برسات کے موسم میں سفر کرنیکے لئے تو اسٹیشن کا دور ہونا بہت ہی گراں گذرتا تھا۔ الحمد للہ کہ حضرت اقدس کی یہ تمنائے دیرین پوری ہوگئی کہ حکام ریلوے نے اس تکلیف کا احساس کرکے ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو تھانہ بھون کی آبادی سے متصل عیدگاہ کے پاس جو آبادی سے پانچ منٹ کی مسافت پر ایک دوسرا اسٹیشن عارضی طور پر بنام تھانہ بھون ٹاؤن کھولدیا اور یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر امتحان میں یہ اسٹیشن کامیاب ہوگیا تو ہم جلد اسکو مستقل کردینگے۔ یہ وعظ اسی جدید اسٹیشن کے افتتاح کی خوشی میں ہوا ہے تاکہ اس نعمت کا شکر ادا کیا جائے۔

پس جن صاحبوں کو حضرت حکیم الامت دام مجدہم سے قلبی تعلق ہے ان کو چاہئے کہ وہ بھی اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ حضرت مولانا کی تمنا کو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا۔ اور اسکی ساتھ عملاً بھی اس اسٹیشن کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں جسکی صورت یہ ہے کہ جو صاحب تھانہ بھون کا قصد کریں وہ سہارنپور و شاہدرہ وغیرہ میں جب تھانہ بھون کا ٹکٹ لیں تو تھانہ بھون ٹاؤن کے نام سے ٹکٹ لیں اور اس اسٹیشن پر اتریں صرف تھانہ بھون لکھ کر ٹکٹ نہ لیں کیونکہ یہ نام قدیم اسٹیشن کا ہے جدید اسٹیشن کا نام تھانہ بھون ٹاؤن ہے فقط

ظفر احمد عفا اللہ عنہ (جامع وعظ ہذا)

ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم ۰ **امابعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس ان ربکم لرءوف رحیم ۰ والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ویخلق ما لا تعلمون ۰

نعمتیں

یہ سورۂ نحل کی آیات ہیں جنمیں حق تعالیٰ نے خاص انعامات کا ذکر فرمایا ہے، ہرچند کہ حق تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا شمار بھی نہیں ہو سکتا چنانچہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے ارشاد فرمایا ہے وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے) مگر اس کثرت و تعدد کی ساتھ وہ دو قسم پر منقسم ہیں۔ ایک قسم تو وہ نعمتیں ہیں جنسے ملابست زیادہ ہے۔ اور بعض وہ ہیں جنسے ملابست زیادہ نہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ جن نعمتوں کے ساتھ تلبس زیادہ رہتا ہے انکی طرف تو کچھ توجہ ہوتی بھی ہے اور ان کا شکر بھی کر لیتے ہیں کبھی کبھی زبان سے بھی دل کی موافقت کیساتھ یہ لفظ نکل جاتا ہے کہ اللہ تیرا شکر ہے اور جنکی ساتھ تلبس کم ہے انکی طرف التفات بھی کم ہے اور ان کا شکر بھی کم کیا جاتا ہے بلکہ غالب حالت یہ ہے کہ ان کا شکر نہیں کیا جاتا۔ ان نعمتوں میں سے جنکی ساتھ تلبس کم ہے اور اسی لئے انکی طرف التفات کم ہے مرکوبات بھی ہیں (یعنی سواری کی چیزیں) کیونکہ ظاہری نعمتیں چند ہیں ماکولات[۱]۔ مشروبات[۲]، ملبوسات[۳]۔ منکوحات[۴]، مسکونات[۵] (معلومات[۶]) اور مرکوبات میں نے قافیہ کیلئے مرکوبات کہدیا ہے ورنہ مستعمل مراکب ہے مجھے اسکی تحقیق نہیں کہ مرکوب کی جمع مرکوبات صحیح ہے یا نہیں تحقیق کر لیا جائے۔ انمیں سب سے زیادہ تلبس تو اول کی تین نعمتوں سے ہے یعنی ماکولات و مشروبات و ملبوسات سے اسی لئے عام طور پر لوگ انہی کو نعمتوں میں شمار کرتے ہیں اور اسی پر شکر کرتے ہیں چنانچہ کھانا کھا کر یا پانی پی کر عام طور سے لوگ خدا کا شکر کرتے ہیں اور نیا کپڑا پہنکر بھی بعض لوگ شکر بجا لاتے ہیں (اور معلومات سے عوام کو تلبس کم ہے اہل علم کو زیادہ ہے مگر اسکی طرف انمیں سے التفات بہت کم لوگوں کو ہے ہاں جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو اکثر التفات ہوتا ہے اور اسپر شکر بھی ادا کرتے ہیں ۱۲) اسکے بعد زیادہ تلبس منکوحات و مسکونات سے ہے کیونکہ بیوی سے ہر روز تلبس ہوتا ہے اور

ظاہری نعمتوں کی قسم

گھر سے بھی گو دن میں تلبس کم ہو مگر رات میں ضرور ہوتا ہے اسی لئے حدیث میں جو آیا ہے کہ تین چیزوں میں نحوست ہے اور حضرت عائشہ کی روایت میں یہ ہے کہ اگر نحوست کسی چیز میں ہوتی تو ان تین میں ہوتی المرأة والدار والفرس یعنی عورت میں اور مکان میں اور گھوڑے میں، یہ پہلی روایت کی تفسیر ہے تو اسکی وجہ یہی ہے کہ ان سے تلبس زیادہ ہے اور جس چیز سے زیادہ تلبس ہوتا ہے اسکے آثار پر نظر زیادہ ہوتی ہے اور اسکے عیوب سے تکلیف بھی زیادہ ہوتی ہے اور فرس ہر چند کہ مرکوبات سے ہے اور میں نے اوپر کہا تھا کہ مرکوبات سے تلبس کم ہے اور حدیث میں اسکو دار و مرأة کی ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ساتھ بھی تلبس زیادہ ہے (بناءً علی الوجہ الذی ذکرناہ) سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ فرس کے ساتھ مالک فرس کو تلبس اختلاط زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اُسکو کھلاتا پلاتا ہے اُسکی خدمت کرتا ہے خصوصاً اہل عرب کو زیادہ اختلاط تھا وہ گھوڑوں سے بہت محبت کرتے تھے حتی کہ اپنی اولاد کی طرح محبت سے اُنکو پالتے تھے اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ گھوڑوں کے انساب بھی محفوظ رکھتے تھے۔ اسی لئے عرب کے اشعار میں آپ کو گھوڑوں کی بہت تعریف ملے گی حضرت حسان بن ثابت (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے شاعر خاص ہیں ۱۲) فرماتے ہیں ؎

تظل جیادنا متمطرات یلطمھن بالخمر النساء

(ہمارے گھوڑے فتح مکہ کے دن یکے بعد دیگرے آگے بڑھتے ہونگے اور عورتیں اپنی اوڑھنیوں سے اُنکے منہ پر طمانچہ مارتی ہونگی) یا یہ مطلب ہے کہ ہماری عورتیں اپنی اوڑھنیوں سے انکے منہ صاف کرینگی یعنی جنگ میں جو غبار وغیرہ انکے منہ پر لگ گیا ہوگا میدان جنگ سے واپسی پر اسکو اپنے دوپٹوں سے دور کرینگی اختار المعنی الاول المولوی حبیب احمد فی ترجمۃ کلام الملوک والمختار عندی المعنی الثانی وھو الذی اختارہ صاحب مجمع البحار

ف حدیث میں جو آیا ہے کہ نحوست تین چیزوں میں ہے اسکی توجیہ۔

ف مرکوبات کیساتھ تلبس کم ہی ہے اور فرس سے زیادہ بھی ہے اور اسکی تفصیل

ف اہل عرب کو گھوڑوں سے بہت محبت تھی۔

؎ یعنی جب مردوں کو مقابلہ کی تاب نہ رہی گی تو عورتیں گھروں سے نکلکر مقابلہ کریں گی اور گھوڑوں کے منہ پر اوڑھنیاں ماریں گی قال ابن اسحٰق بلغنی عن الزہری انہ قال لما رأی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم النساء یلطمن الخیل بالخمر تبسم الی ابی بکر الصدیق ۱۲ ای وذکر قول حسان ہذا کذا فی السیرۃ لابن ہشام (صفحہ ۲۵۱ ج ۲) قلت قد رأیت فی موضع ولا احضرہ الآن انھن کن نساء الانصار وہذا یناسب المعنی الذی ذکرتہ ثانیاً ای کن یمسحن وجوہ الخیل بخمرہن تصدیقاً یقول حسان شاعر الانصار ۱۲ ظفر۔

صحیح ۲۵۴ ج ۲ ای مسحهن النساء بها واستعار له اللطم ای ینفضن ما علیها بخمرهن لیزلن الغبار لعزتها عندهم اھ) پس اختلاط کے اعتبار سے تو گھوڑے کیساتھ تلبس زیادہ ہے مگر رکوب کے اعتبار سے تلبس کم ہے اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مرکوبات ان نعمتوں میں سے ہیں جنکی ساتھ تلبس کم ہے یعنی رکوب کے اعتبار سے کم ہے۔ اسی لئے نکاح پر شکر کیا جاتا ہے گھر بنا کر شکر کیا جاتا ہے اور سواری کا جانور خریدتے وقت تو شاید شکر کر لیا جاتا ہو مگر سواری کے وقت بہت کم شکر کرتے ہیں اسکی یہی وجہ ہے کہ نعمت مرکوب کی طرف التفات کم ہے اسلئے میں اسوقت اس نعمت کا بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ اسپر توجہ والتفات زیادہ ہو اور اس کا بھی شکر ادا کیا جائے اور اسوقت یہ مضمون جو اختیار کیا گیا ہے حالانکہ پہلے سے بیان کا خیال نہ تھا اسکی وجہ یہ ہے کہ بعض صاحبوں نے درخواست کی ہے اور درخواست ایسے وقت کی ہے جبکہ ایک خاص نعمت ہمکو عطا ہوئی ہے کہ ایک خاص مرکوب میں ہمکو سہولت کا سامان عطا کیا گیا ہے اسوجہ سے یہ مضمون جو نعمت مرکوبات کے متعلق ہے اختیار کیا گیا ہے۔ اب سمجھئے کہ ایک بڑی نعمت تو ان مرکوبات کے متعلق یہ ہے کہ وہ باوجود اتنی قوت کے ہمارے مطیع ہیں چنانچہ حق تعالیٰ نے اس مقام پر جتنے مرکوبات کا ذکر فرمایا ہے وہ سب کے سب ہمسے زیادہ قوی ہیں اور ہم شتر کی برابر تو کیا ہوتے شترمرغ بھی نہیں بلکہ اُس سے بھی کمزور ہیں۔ شترمرغ عجیب جانور ہے صورت میں تو اونٹ کے مشابہ ہے مگر اسکے دو بازو بھی ہیں جیسے پرندے کے ہوتے ہیں مگر اُن سے وہ اُڑ نہیں سکتا ہاں بھاگتا خوب ہے اب نہ وہ بوجھ لادنیکے قابل ہے کیونکہ پرندوں میں شمار کیا جاتا ہے نہ پرندوں ہی میں داخل ہے۔ کیونکہ نام کیساتھ شتر بھی لگا ہوا ہے فرید عطار رح فرماتے ہیں کہ نفس کی حالت بھی بالکل شترمرغ جیسی ہے صوفیہ ہر جگہ سے سبق لیلیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

چوں شترمرغ شناس ایں نفس را | نے کشد بار و نہ پرد بر ہوا
گر بپر گوئیش گوید اشترم | ور نہی بارش بگوید طائرم

اگر اسپر بوجھ لادو تو کہتا ہے کہ میں تو پرندہ ہوں اور جو اڑنے کو کہو تو کہتا ہے میں تو شتر ہوں کہیں اونٹ بھی اڑا ہے۔ غرض نفس سے جو کام بھی لو تو وہ بہانہ ڈھونڈھتا ہے جیسے ہندوستان کے سود خوار کہ اگر اُن سے یہ کہو کہ سود حرام ہے اس سے توبہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ دارالحرب

ف وجہ اختیار مضمون

ف مرکوبات ایک نعمت ہیں تسخیر سے کہ قوی جانور اور سواریاں انسان کے تابع ہیں

ف نفس کی حالت شترمرغ جیسی ہے

ف ہندوستان کے سود خوار بھی شترمرغ جیسے ہیں

میں سود لینا جائز ہے بعض علماء کا اسپر فتویٰ ہے اسلئے ہم لیتے ہیں۔ اور اگر کہو کہ اسکی زکوٰۃ کیوں نہیں دیتے تو کہتے ہیں حرام مال میں بھی کہیں زکوٰۃ فرض ہے۔ اب زکوٰۃ دینے کیوقت وہ سود ہوگیا اور حرام اور لینے کیوقت حلال تھا۔ بہرحال شترمرغ تو کمزور جانور ہے گو نام میں شتر ہے مگر وہ بار برداری کے قابل نہیں۔ لیکن اونٹ گھوڑا بیل بھینسا خچر وغیرہ اسقدر قوی ہیں کہ اگر انمیں سے کوئی آدمی کے اوپر پیر رکھدے تو اس سے اٹھا بھی نہ جائے مگر خدا تعالیٰ کی کیسی نعمت ہے کہ ایسے قوی جانوروں کو ایک ذرا سا لونڈا لکڑی لئے ہوئے ہانکتا ہے اور سب کان دبائے اسکے آگے آگے ہو لیتے ہیں کیا غضب کی تسخیر ہے۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ سوار ہوتے ہوئے اس نعمت کو یاد کرو اور اس کا شکر کرو وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین۝ اور یوں کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اسکو ہمارا تابع کر دیا حالانکہ ہم قوت وطاقت سے خود اسکو قابو میں نکر سکتے تھے۔ یہاں تسخیر کے یہ معنی ہیں کہ انکو تمھارے تابع کر دیا۔ اور کسی جگہ تسخیر کے معنی کام میں لگا دینا بھی ہے جیسا کہ الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموات والارض اور وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنہار میں کیونکہ ظاہر ہے کہ سموات وارض کی تمام اشیاء ہمارے تابع نہیں نہ شمس وقمر نہ لیل ونہار بلکہ یہاں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ تمام عالم کو تمھارے کام میں لگا دیا گیا ہے بہرحال جن جانوروں کو ہم اپنا تابع دیکھتے ہیں یہ تسخیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ورنہ اگر کسی وقت اللہ تعالیٰ جانور کو مست کردیں اور وہ سرکشی پر آجائے تو انسان کی کچھ حقیقت نہیں کہ قوت سے اس کا مقابلہ کر سکے بلکہ اگر مقابلہ کریگا تو خارجی اسباب سے کریگا جیسے بندوق وغیرہ مگر جانور کے پاس گھر کے آلات موجود ہیں جیسے سینگ وغیرہ اسکو خارجی اسباب کی ضرورت نہیں اسلئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سوار ہوتے ہوئے اس نعمت تسخیر کو یاد کرکے خدا تعالیٰ کی حمد کرو اسکے بعد یہ بھی یاد کرو وانا الی ربنا لمنقلبون کہ ہم اپنے پروردگار کے پاس جلنے والے ہیں اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ نعمت معاش کو یاد

ف: تسخیر کے معنی کی تفصیل۔

ف: سواری کے وقت نعمت تسخیر کیساتھ آخرت کی یاد کو بھی جمع کیا گیا۔

پھر اور

نعمت اس موقعہ پر حافظ محمد حسن علی خانصاحب رئیس گڑھی پختہ گڑھی سے آگئے تو حضرت مولانا نے انکو دیکھکر فرمایا کہ آپنے بڑی ہمت کی کیونکہ وہ صبح کی نماز سے پہلے گھوڑی پر سوار ہو کر وعظ کی خبر سنکر آئے تھے اور جلدی ہی آگئے حضرت مولانا نے گذشتہ تقریر کا خلاصہ انکی خاطر سے دوبارہ بیان فرمایا اور فرمایا کہ بیان ابھی شروع ہوا ہے زیادہ نہیں ہوا۔ خاتمہ

کرکے معاد کو بھی یاد کرو یہ تو مشہور ربط ہے اور بعض اہل لطائف نے کہا ہے کہ اسکا ربط یہ ہے
کہ اس سواری سے دوسری سواری کو یاد کرو یعنی جنازہ کو جسکے متعلق کسی نے کہا ہے ؎

دھریں گے تجھکو جنازہ پر تخت شاہی ہے … اگر خزانۂ و لشکر ہزار ہو ویگا

عوام تو اس ربط سے خوش ہوئے ہونگے کیونکہ چٹ پٹا مضمون ہے مگر اہل علم جانتے ہیں
کہ کچیہ بات کونسی ہے (اور ایک ربط یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انا الی ربنا المنقلبون میں اس امر
کی دلیل کیطرف اشارہ ہے کہ یہ تسخیر حیوانات من جانب اللہ ہے کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آنیوالا
ہے کہ خود دوسرونکے ہاتھوں میں مردہ بدست زندہ ہوگے پس اس حالت کو یاد کرکے سمجھ لو کہ
اس حیات چند روزہ میں جو تم حیوانات کو اپنا مسخر دیکھتے ہو یہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو
تم خود تو اپنے وجود اور ذات پر بھی قابض نہیں ہو دوسروں پر تو کیا قابض ہوتے ۱۲ جامع)
اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کی تعلیم فرمائی ہے ایک وقل کروا النعمۃ ربکم سے
دوسرے وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھذا یعنی اس نعمت کو دل سے بھی یاد کرو اور زبان
بھی اس کا اقرار کرو پس ہر چند کہ دل سے استحضار بھی کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے اسکی قولاً بھی
تعلیم فرمایا ہے تاکہ اس سے استحضار بالقلب آسان ہو جائے کیونکہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ زبان
سے ذکر کرنے میں قلب آسانی کیساتھ ذاکر ہو جاتا ہے اسی واسطے فقہار نے نیت صلوٰۃ با لقول
کو مندوب فرمایا ہے جسپر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بدعت انھوں نے کہاں سے نکالی۔
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نیت باللسان کا کہیں ثبوت نہیں مگر میں کہتا ہوں کہ اگر عملاً
ثبوت نہیں تو قولاً ثبوت موجود ہے اور قول بھی حق تعالیٰ کا دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس آیت
میں ذکر بالقلب و ذکر باللسان کو جمع فرمایا ہے پس جو حکمت یہاں ذکرین کے جمع کرنے میں ہے
اسی حکمت کیوجہ سے اگر فقہار نیت صلوٰۃ میں جمع ذکرین کو افضل فرمائیں تو کونسا جرم ہے پھر ہمارے
پاس اسکی نظیر سنت سے بھی موجود ہے یعنی تلبیہ جسمیں ذکر باللسان افضل ہے بلکہ شرط احرام ہے
محض نیت سے احرام منعقد نہیں ہوتا جب تک تلبیہ کہے (پھر تلبیہ میں رفع صوت بھی مسنون ہے
جیسا کہ حدیث میں ہے افضل الحج العج والثج اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تلبیہ بالقلب کافی تھا۔
زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے تو یہی جواب دیا جائیگا کہ ذکر باللسان کو ذکر بالقلب کی

ف ذکر نعمت بلسانہٖ اقرار باللسان مع جمع کرنیکی حکمت

ف نیت صلوٰۃ باللسان کا نقلی ثبوت

بسیر میں دخل ہے بس یہی حکمت یہاں بھی موجود ہے ۱۲) یہ تو درمیان میں ایک علمی لطیفہ تھا
میں یہ کہہ رہا تھا کہ مرکوب میں ایک نعمت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے قوی قوی مخلوقات
کو انسان کا تابع کر دیا ہے اور یہ نعمت ہمکو بلا کسب واکتساب کے حاصل ہے اسمیں حق تعالیٰ
کا انعام پوری طرح ہر شخص کو محسوس ہو سکتا ہے اور جو نعمت انسان کو کسب واکتساب سے
حاصل ہوتی ہے اسمیں تو وہ کبھی دعویٰ بھی کرنے لگتا ہے جیسے قارون نے کہا تھا انما اوتیتہ
علی علم عندی جب اسکو لوگوں نے نصیحت کی کہ جیسے خدا تعالیٰ نے تجھپر احسان کیا ہے
تو دوسروں پر احسان کر تو کہنے لگا کہ یہ مال تو مجھے ایک علم کی بدولت حاصل ہوا ہے جو
میرے پاس ہے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسکو کیمیا آتی تھی لیکن تفسیر اسپر موقوف
نہیں میرے نزدیک علم سے مراد سلیقہ اور لیاقت ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی ذاتی لیاقت
اور سلیقہ سے یہ مال حاصل کیا ہے (نعوذ باللہ) خدا کا مجھ پر کیا احسان ہے خیر قارون کا
کمبخت کا یہ اعتقاد ہوگا مسلمانوں کا خدا نکرے یہ اعتقاد کیوں ہونے لگا وہ تو ہر نعمت کو عطائے
حق سمجھتے ہیں خواہ سبب سے ہو یا بلا سبب کے اور کسب سے حاصل ہو یا بلا کسب کے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جو
نعمت بلا سبب ظاہری اور بدون کسب کے حاصل ہو اس نعمت کا اثر زیادہ ہوتا ہے جیسے کوئی
ہمیں بہت سا روپیہ ہدیہ میں دے جائے اور جو روپیہ تجارت اور ملازمت یا مزدوری
سے حاصل ہو اسکے نعمت ہونے کی طرف التفات کم ہوتا ہے گو اعتقاد قارون جیسا نہو مگر
حالت ایسی ہے جس سے دیکھنے والی کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ اسکو نعمت نہیں سمجھتے بلکہ اپنے
علم وہنر کا نتیجہ سمجھتے ہیں چنانچہ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص گھوڑا خریدنے جا رہا تھا
راستہ میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو کہا بازار
جا رہا ہوں گھوڑا خریدونگا دوست نے کہا کہ انشاء اللہ بھی کہہ لو بولا اسمیں انشاء اللہ کی
کیا بات ہے گھوڑا بازار میں ہے روپے میری جیب میں ہیں اب جاکر خرید لوں گا بس روپیہ
پاس ہونیسے انسان یہ سمجھتا ہے کہ سب کام اسکے قبضہ میں ہے مگر کبھی اللہ تعالیٰ اس کا
عجز ظاہر کر دیتے ہیں اور یہ بھی رحمت ہے اگر انسان پر ابتلاء واقع نہو تو استدراج میں تو
یہ تباہ ہو جائے پس مصائب و بلاء میں بھی حکمتیں ہیں بڑی حکمت تو یہی ہے کہ اس سے

جو نعمت بلا کسب واکتساب کے حاصل ہو اسمیں انسان دعویٰ نہیں کرتا ہے جیسے قارون نے کیا تھا

۹ جو نعمت بلا سبب و کسب ہو اسمیں شکر نعمت زیادہ ہوتا ہے

ایک گھوڑا خریدنے والے کی حکایت

ابتلاء مصیبت میں بھی حکمت ہے ایک بزرگ کی حکایت

انسان کو اپنی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے اپنا عجز مشاہد ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر خدا خواہد نہ گفتند از بطر　　پس خدا بنمود شان عجز بشر

مولانا نے کنیزک کے قصہ میں فرمایا ہے کہ بادشاہ نے اسکے معالجہ کیلئے بڑے بڑے اطبا کو جمع کیا جنکو اپنے علم وفن پر ناز تھا مگر حق تعالیٰ نے اُنکو اُن کا عاجز ہونا دکھلا دیا جو دواوہ استعمال کراتے اس سے الٹا اثر ہوتا تھا ؎

از قضا سرکنگبین صفرا فزود　　روغن بادام خشکی می نمود

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت　　آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

پس دراصل ہر زخم کا مرہم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اُن کے سوا کسی کے قبضہ میں شفا نہیں میں کہتا ہوں کہ اسی طرح امراض باطنہ کا علاج بھی حق تعالیٰ ہی فرماتے ہیں۔ عارفین کو تو اس کا شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے اور غیر عارفین کو بھی کبھی حق تعالیٰ اپنی قدرت دکھلاتے رہتے ہیں مگر ان کو عارفین کی برابر مشاہدہ اسلئے نہیں ہوتا کہ یہ غور نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں رہتے اور عارفین اللہ تعالیٰ کے معاملات کو جو اُن کے ساتھ ہو رہے ہیں غور سے دیکھتے رہتے ہیں اسلئے ان کو خوب مشاہدہ ہوتا ہے کہ فلاں مصیبت سے ہمارے فلاں مرض کا علاج کیا گیا ہے۔ اور فلاں تکلیف ہماری فلاں خطا کا بدلہ ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جب مجھسے حق تعالیٰ کی کوئی نافرمانی ہو جاتی ہے تو میں اس کا اثر اپنے گھر والوں میں اور سواری کے جانور میں مشاہدہ کرتا ہوں کہ اُسدن یہ سب کے سب مجھسے نافرمان ہو جاتے ہیں گھر والے بات کا جواب نہیں دیتے اور میرا مقابلہ کرتے ہیں گھوڑا پوری طرح سواری نہیں دیتا شرارت کرنے لگتا ہے۔ یہ واقعات کم و بیش سب کو پیش آتے ہیں مگر عام لوگ اسکو اتفاقیات پر محمول کرتے ہیں یا گھر والوں کی بد خلقی پر اور گھوڑے کے عیب پر کیونکہ انکو نہ اپنے افعال پر نظر ہے نہ اُن کے نتائج پر توجہ ہے۔ مگر بعض دفعہ حق تعالیٰ ایسی دست بدست سزا دیتے ہیں جس سے ہر شخص کو محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ میرے اس فعل کی سزا ہے اور اسی کو میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ کی اسمیں بڑی رحمت ہے اگر کبھی کبھی ایسا نہ ہوا کرے تو انسان کی آنکھیں ہی نہ کھلیں چنانچہ وہ گھوڑا خرید نیوالا یہ کہکر کہ

ف عارفین کو بلاء و مصیبت کی علت کا شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے۔

انشاء اللہ کہنے کی کیا ضرورت ہے بازار میں پہونچا تو کسی جیب کٹ نے جیب میں سے
روپے نکال لئے گھوڑے کا سوداگر کے جو اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں میدان صاف
تھا شرمندہ ہوکر ناکام واپس ہوا اتفاق سے وہ دوست پھر ملا اور کہا کیا حال ہے کہنے لگا
ہم بازار گئے تھے انشاء اللہ گھوڑا خریدنے کا قصد تھا انشاء اللہ جیب کٹ نے جیب میں سے روپے
نکال لئے انشاء اللہ اب خالی ہاتھ گھر جا رہا ہوں انشاء اللہ۔ ایسا سبق ملا کہ اب موقع بے موقع
بھی انشاء اللہ کا ورد ہوگیا۔

غرض انسان کی یہ عادت ہے کہ جو چیز بلا سبب بلا کسب کے اسکو حاصل ہو اسکو تو نعمت سمجھتا ہی
اور جسکے اسباب اسکے قبضہ میں ہوں اور اسکے کسب کو اسمیں دخل ہو اسکو نعمت نہیں سمجھتا اور
اگر اعتقاداً سمجھے بھی تو شان نعمت کا زیادہ اثر اسکے اوپر ظاہر نہیں ہوتا۔ اسلئے ایسی نعمتوں کے
نعمت ہونے پر متوجہ کرنے کیلئے حق تعالیٰ مرکوب کی نعمت کو بیان فرماتے ہیں اور اسمیں بھی
یہاں رکوب کو نہیں بیان فرمایا کیونکہ رکوب سے جو نفع حاصل ہوتا ہے یعنی طی طریق اسکو
بعض لوگ پیادہ چلکر بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسی بات بیان فرمائی ہے جو کھلی نعمت ہے جو ظاہراً انسان کی
قدرت سے باہر ہے یعنی وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس کہ
مرکب تمھارے بوجھ لاد کر ایسے مقام تک پہونچاتے ہیں جہاں تم اس بوجھ کو تو کیا پہونچاتے خود
بھی نہ پہونچ سکتے تھے مگر سخت مشقت اور مصیبت کیساتھ یا یہ ترجمہ ہو کہ مع بوجھ کے اس جگہ نہ پہونچ
سکتے تھے مگر مشقت کی ساتھ۔ سواری کی چیزوں میں یہ نعمت کھلی نعمت ہے اسمیں کسی کو یہ وہم
نہیں ہوسکتا کہ ہمکو سواری کی ضرورت نہیں بلکہ سب اپنے کو اس کام میں سواری کا محتاج سمجھتے
ہیں مگر سبحان اللہ۔ حق تعالیٰ کا کلام کیسا جچا تلا ہے کہ اس نعمت میں بھی صرف یہ نہیں فرمایا
لم تکونوا بالغیہ بلکہ اسکی ساتھ الا بشق الانفس بھی بڑھا دیا کہ ہاں سخت مصیبت کیساتھ
پہونچنا پہونچانا ممکن تھا۔ اسمیں ہمکو احتیاط فی الکلام کی تعلیم کیگئی ہے کہ بات ایسی کہو جو ہر حال
میں صحیح ہو کوئی اسپر نقض وارد نہ کر سکے پس ہر چند کہ یہاں بظاہر یہ دعوی بالکل تام ہی کہ تم بوجھ لاد کر
ایک شہر سے دوسرے شہر میں بدون سواری کے نہیں پہونچ سکتے تھے مگر کوئی معقولی اسپر یہ کہہ سکتا تھا

ف سواری میں دوسری نعمت یہ ہے کہ انکے ذریعہ سے دور دراز پہنچا بدون انکے دشوار تھا۔

ف الا بشق الانفس سے یہ مستنبط ہوا کہ احتیاط فی الکلام کی تعلیم ہے

کہ ایک صورت سے پہونچ سکتے ہیں وہ یہ کہ سارا سامان ایک دم سے نہ اٹھایا جاتا بلکہ اسکے مختلف عدد بنا کر ایک عدد کو تھوڑی دور پر رکھدیں پھر دوسرے کو لیجائیں پھر تیسرے کو اسطرح ایک ایک کر کے سبکو ایک جگہ پہونچا دیں پھر وہاں سے ایک ایک کر کے سبکو قریب کی دوسری جگہ پہونچا دیں تو اسطرح بدون سواری کے بوجھ کو لیجا سکتے ہیں اور یہ احتمال عقلی ایک معقولی مولوی نے ہمکو بتلایا انھوں نے اس عقلی احتمال کو واقع کر کے دکھلا دیا ہمارے ایک دوست ہیں مولوی وہ شاملی کے اسٹیشن پر بہت سا بوجھ لیکر اترے اور قلیوں سے کہا کہ اسکو باہر ٹمٹم کے پاس پہونچا دو اور مزدوری طے کر لو قلیوں نے بہت مزدوری مانگی آپنے انکار کر دیا اور کہا ہم خود لیجائیں گے۔ قلی ہنسنے لگے کہ یہ اکیلا آدمی اتنا سامان کیونکر لیجائیگا۔ مگر انھوں نے قلیوں کو پہنچا دکھا دیا۔ آپنے یہی کیا کہ سارے سامان کو جو ایک دو عدد کی صورت میں تھا کھولا اور اُسکے متفرق عدد ہلکے ہلکے بنائے۔ پھر قلیوں کے سامنے ہی ایک عدد کو اٹھا کر دور رکھ آئے مگر اتنی دور کہ بقیہ سامان بھی زیر نظر رہے پھر دوسرا عدد اٹھا کر لیگئے پھر تیسرا یہ حکمت دیکھکر قلی ڈھیلے ہوگئے اور سمجھ گئے کہ یہ تنہا سارے سامان کو باہر لیجا سکتے ہیں تو اب وہ خود ہی تھوڑی مزدوری پر راضی ہوگئے۔ واقعی یہ صورت ہمارے ذہن میں تو نہ آتی۔ مگر وہ معقولی آدمی تھے انھوں نے یہاں بھی معقول ہی کام لیا تو اگر آیت میں الا بشق الانفس نہوتا تو کوئی معقولی یہ احتمال نکالکر آیت پر اعتراض کر سکتا تھا اسلئے حق تعالیٰ نے یہ جملہ بڑھا کر کلام کو مضبوط کر دیا کہ اگر پہونچاتے بھی تو بڑی مصیبت سے پہونچاتے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مصیبت بہت ہے، (دن بھر میں اسطرح دو تین کوس بھی طے نہیں ہو سکتے بڑی منزل تو کسی طرح طے ہی نہیں ہو سکتی) اور گو یہ احتمال بہت بعید ہے کہ اس صورت سے کوئی شخص بوجھ کو پہونچائے مگر حق تعالیٰ نے اس بعید احتمال کا بھی لحاظ فرمایا جسمیں ہمکو تعلیم ہے کہ کلام میں بہت احتیاط کرنا چاہئے۔ دیکھو ہماری کیسی شان ہے کہ لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون ہمسے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا مگر پھر بھی ہم اپنے کلام میں کسقدر احتیاط کرتے ہیں۔ پس تمکو بھی احتیاط فی الکلام کا عادی ہونا چاہئے۔ قرآن میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر کا قصہ مذکور ہے اسکی بنا بھی اسی مسئلہ کی تعلیم پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام میں ایک بے احتیاطی ہوگئی تھی کہ وعظ میں کسی نے آپ سے سوال کیا ای الناس اعلم کہ اسوقت

ایک معقولی مولوی کی عجیب حکایت

آیت

احتیاط فی الکلام حضرت موسیٰ و خضر کا واقعہ بھی اسی غرض سے ہے

آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اطلاق کیساتھ جواب دیا انا کہ میں سب سے زیادہ عالم ہوں مطلب یہ تھا کہ علوم شرائع اور علوم نبوت میں سب سے بڑا عالم میں ہوں اور اسی مراد کے اعتبار سے کلام صحیح تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انبیاء اولوالعزم سے ہیں ہزاروں انبیاء انکی شریعت کے متبع ہوئے ہیں اور خود اُن کے زمانہ میں بھی حضرت ہارون علیہ السلام نبی تھے مگر وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے اور موسیٰ علیہ السلام کسی نبی کے تابع نہیں بلکہ مستقل صاحب شریعت تھے پس علوم شرائع و نبوت میں اُسوقت اُن سے زیادہ عالم کوئی نہ تھا مگر آپ نے جواب میں لفظاً یہ قید بیان نہ فرمائی تھی بلکہ اطلاق کیساتھ جواب دیدیا اسپر عتاب ہوا اور وحی نازل ہوئی بلی عبدنا خضر ھو اعلم منک کہ کوئی آپ سے زیادہ عالم کیوں نہیں ہمارا بندہ خضر آپ سے زیادہ عالم ہے یعنی بعض علوم میں وہ زیادہ عالم ہیں گو وہ علوم شرائع اور علوم نبوت سے افضل نہوں مگر آپ کے اطلاق کلام پر تو علم خضر سے نقض وارد ہوسکتا ہے کیونکہ علم میں تو وہ بھی داخل ہے میں اس مقام پر علم موسیٰ اور علم خضر کا فرق تفصیل کیساتھ بیان کرنا نہیں چاہتا کیونکہ دوسرے مقامات پر اس کا بیان مفصّل ہوچکا ہے مگر اجمالاً اتنا کہے دیتا ہوں کہ خضر علیہ السلام کا علم کشف کونی تھا اور اس علم کو علوم نبوت اور کشف الٰہی سے جو کہ موسیٰ علیہ السلام کا علم تھا کوئی نسبت نہیں مگر فی نفسہٖ وہ بھی ایک علم ہے اور علم لدنی ہے جسمیں وہ موسیٰ علیہ السلام سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے محض تنبیہ قولی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عملی اصلاح فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جاؤ خضر سے ملو اور اسکے علوم کو دیکھو اسکو مشائخ صوفیہ سمجھتے ہیں علماء ظاہر عملی اصلاح کو کچھ نہیں جانتے (الا الاسمر والسمر ۱۲) علماء تو اگر کسی کے اندر تکبر دیکھیں گے تو اسکی اصلاح میں صرف تکبر کی مذمت اور وعیدیں بیان کردینگے اور بس اور شیخ اس طرح اصلاح کرتا ہے کہ جاؤ فلاں مسافر کے پیر دباؤ جو خراب خستہ حالت میں پڑا ہے جسکی رال بھی چل رہی ہے اب مرید چونکہ شیخ کے سامنے چوں نہیں کرسکتا اسلیے جھک مار کر جاتا ہے اور پیر دباتا ہے گو دل دل میں شیخ کو کوستا بھی ہے کہ بڑے متشدد ہیں مگر ایسا کو سنا ہزار کوس پر بھاگ جاتا ہے وہ شیخ کو نہیں لگتا پھر اس غریب مسافر پر غصہ آتا ہے کہ یہ کمبخت کہاں سے آمرا تھا جو میرے سر داسکی خدمت ہوئی مگر یہ غصہ فضول ہے اگر

وہ نہ آتا تو شیخ کسی اور تدبیر سے علاج کرتا مثلاً نمازیوں کے جوتے سیدھے کراتا۔ شروع میں تو یہ علاج پہاڑ کی برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ گراں معلوم ہوتا ہے مگر چند روز میں نفس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ ایسے ایسے کام کرتے کرتے نفس کو تواضع کی عادت ہو جاتی ہے پھر نفس درست ہو جاتا ہے۔

ف تواضع کی عادت سے تکبر زائل ہو جاتا ہے

عادت پر ایک حکایت

ف عادت کے اوپر ایک اور حکایت یاد آئی مولوی صدیق احمد صاحب گنگوہی جو گڑھی میں بھی مدرس رہے ہیں اپنی حکایت بیان فرماتے تھے کہ جب میں نیا نیا دیوبند کے مدرسہ میں گیا تو ایک رئیس کے یہاں میرا کھانا مقرر ہوا۔ اس زمانہ میں دیوبند کے لوگ طلبہ کی بہت عزت کرتے تھے اب کی خبر نہیں مگر جہانتک میرا خیال ہے دیوبند کے لوگ اب بھی دوسری جگہ کے لوگوں سے زیادہ طلبہ کی عزت کرتے ہیں اور جو زمانہ ہمنے دیکھا ہے اسوقت تو بہت ہی عزت کرتے تھے کہ طلبہ کو دیکھکر رؤسا اپنی کرسی چھوڑکر کھڑے ہو جاتے اور طلبہ کو عزت کے ساتھ بٹھلاتے تھے اس زمانہ میں چونکہ عوام متواضع تھے اسلئے طلبہ کو گھروں سے کھانا لانا معیوب نہ تھا اور شاید پہلے بزرگوں نے اسی واسطے طلبہ کیلئے یہ صورت اختیار کی ہو تاکہ ان کا تکبر زائل ہو مگر اب ف میری رائے نہیں ہے کہ طلبہ گھروں پر کھانا لینے جائیں کیونکہ اب اہل دنیا طلبہ کو ذلیل وحقیر سمجھنے لگے عہ اگر طلبہ انکے گھروں پر روٹی کے واسطے جائیں گے تو وہ اور زیادہ انکو ذلیل سمجھیں گے۔ ہاں ف مؤذن اس سے مستثنٰی ہے کیونکہ وہ اہل محلہ سے اپنا حق وصول کرتا ہے وہ انکی مسجد کی خدمت کرتا ہے اور اپنی خدمت کا معاوضہ طلب کرتا ہے تو یہ ایسا ہی جیسے کوئی درزی کسی رئیس کے یہاں اپنے پیسے مانگنے جائے اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ اور گو طلبہ کا بھی حق مسلمانوں کے ذمہ ہے مگر لوگ عام طور پر اس حق کو اپنے اوپر نہیں سمجھتے اور جو شخص اپنے ذمہ حق نہ سمجھتا ہو اس سے جبراً حق وصول کرنا ذلت ہے ہمکو اسکی ضرورت نہیں قیامت کے دن انکو خود معلوم ہو جائیگا کہ انھوں نے دین اور اہل دین کی کسقدر

ف آجکل طلبہ کو گھروں سے کھانا لانا مناسب نہیں

ف مؤذن اس قاعدہ سے مستثنٰی ہے

عہ اور یہ تعلیم انگریزی کے شائع ہونیکا نتیجہ ہے کیونکہ علم دین کے حاصل کرنیوالوں کو ایسے ہی رؤسا حقیر سمجھتے ہیں جنپر انگریزی تعلیم کا اثر آگیا ہے اور دین سے بے تعلقی ہوگئی ہے اور جو رؤسا اس اثر سے محفوظ ہیں وہ اب بھی طلبہ و علماء کی عزت کرتے ہیں واللہ المستعان ۱۲ ظ۔

حق تلفی کی ہے۔ تو مولوی صدیق احمد صاحب کہتے تھے کہ اول وقت جو میں روٹی لینے گھر گیا
تو قدم نہ اٹھتا تھا پھر گھر پر پہونچکر آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی کہ روٹی بھیجدو شرم کے مارے دیوار
سے لگ کر خاموش کھڑا ہو گیا تھوڑی دیر میں صاحب خانہ جو ایک رئیس تھے خود ہی باہر آئے
اور مجھے کھڑا دیکھا تو کہنے لگے کہ آپکا ہی کھانا میرے غریب خانہ پر مقرر ہوا ہے میں نے کہا جی
ہاں یہ سنکر انھوں نے فوراً چارپائی منگائی اور مجھے عزت سے بٹھلایا اور پوچھا آپ کھانا
یہاں ہی کھائیں گے یا مدرسہ لیجائیں گے میں نے شرم کی وجہ سے کہدیا کہ یہیں کھاؤں گا
انھوں نے فوراً ملازم سے کہا کہ آپ کے ہاتھ دھلاؤ اور گھر میں سے کھانا لاکر آپکو کھلادو
جب کھانے سے فارغ ہو کر مدرسہ میں آیا تو ساتھیوں نے کہا کہ تم کھانا نہیں لائے میں نے
کہا کہ مجھکو تو گھر تک جانا ہی محال تھا اور میں سب کے سامنے ہاتھ پر رکھکر روٹیاں یہاں تک
بھی لاتا میں نے تو وہیں کھالیا۔ ساتھیوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارے اندر
بعضے ایسے بھی ہیں جنکا کھانا کہیں مقرر نہیں تو جنکا مقرر ہے وہ سب ملکر انکو بھی اپنے ساتھ
شامل کر لیتے ہیں تو سب کا کام چل جاتا ہے شام سے تم کھانا یہیں لانا۔ میں نے کہا بہت اچھا
لاؤنگا۔ کہتے تھے کہ شام کو جو میں کھانا لایا تو بار بار دل میں یہ آتا تھا کہ زمین پھٹ جائے
تو میں اسمیں سما جاؤں مگر دو تین وقت لانیکے بعد پھر دل کھل گیا اور اب تو یہ حالت ہے کہ
اگر تم کہو تو بھنگی کے گھر سے میں کھانا لے آؤں۔ سو واقعی چند روز تک ایسا کام کرنے سے جسمیں
نفس کی ذلت ہو نفس ذلت کا عادی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے مشائخ تکبر وغیرہ کی عملی اصلاح
کرتے ہیں چنانچہ حضرت شیخ عبد القدوس کے پوتے مولانا ابو سعید صاحب جب سلطان
نظام الدین بلخی رح کے پاس دولت باطنیہ کی طلب میں پہونچے ہیں تو آپ نے سنا ہو گا کہ
انھوں نے کیسی کیسی تکبر شکن خدمتیں اُن سے لی ہیں تاکہ امراض نفس کا عملی علاج ہو پھر جیسی
انکی اصلاح ہوئی ہے سبکو معلوم ہے۔ غرض اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قولی اصلاح پر اکتفا نہیں فرمایا
بلکہ عملی اصلاح بھی فرمائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر کے پاس جانیکا حکم ہوا پھر حالانکہ
حق تعالیٰ تمام جغرافیہ عالم سے موسیٰ علیہ السلام کو واقف فرما سکتے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام کو
حضرت خضر کا موقع و مکان تعیین کیساتھ نہیں بتلایا بلکہ اجمالاً اتنا بتلایا کہ وہ مجمع البحرین پر

ف: موسیٰ علیہ السلام کو بتعیین خضر موقع بتانے سے ساتھ نہ بتلایا بجنسہ

ملیں گے۔ اور حکم ہوا کہ ایک مچھلی تلکر ساتھ لیلو جب وہ زندہ ہو کر توشہ دان سے نکل بھاگے تو سمجھ لینا کہ خضر علیہ السلام اسی جگہ ہیں۔ اس اجمال کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام سالہا سال کے سفر کیلئے تیار ہو کر چلے کہ معلوم کب اور کتنی مدت میں پہونچنا ہوگا چنانچہ نص میں ہے واذ قال موسیٰ لفتٰہ لا ابرح حتی ابلغ مجمع البحرین او امضی حقبا۔ اس اجمال میں بھی موسیٰ علیہ السلام کی اصلاح تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی طلب دیکھئے کہ سالہا سال تک چلنے پر مستعد ہو گئے۔ سبحان اللہ۔ پھر حق تعالیٰ کی امداد یہ ہوئی کہ مجمع بحرین تک جانے میں تو انکو ذرا تکان نہیں ہوئی ہاں جب موقع سے تجاوز ہو گیا تو اب تکان محسوس ہوا‌ؑ (اللہ تعالیٰ طالبین کی اسی طرح امداد فرمایا کرتے ہیں کہ طریق کو انکے لئے آسان کر دیتے ہیں ۱۲) چنانچہ آپنے خادم سے فرمایا کہ آج کے سفر سے تکان معلوم ہوا ہے لاؤ ناشتہ لاؤ اسپر خادم نے عرض کیا کہ میں آپ سے کہنا بھول گیا وہ مچھلی تو کل ہی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی ہے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم تو اسی کے منتظر تھے واپس لوٹو مقصود اسی جگہ ہے جہاں سے ہم آگے بڑھ گئے۔

پھر اسکے بعد موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے درخواست کی ھل اتبعك علی ان تعلمن مما علمت رشدا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ جو علم آپ کو حاصل ہے وہ آپ مجھے بھی سکھلا دیں۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تھے انکو استیذان کی ضرورت نہتھی مگر ادب یہی ہے کہ استاد سے اجازت لے اور اپنی طلب کو ظاہر کرے اور علماء تو صرف الفاظ ظاہرہ کے درپے ہوتے ہیں مگر صوفیہ نے اس سے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ چلنا ہو تو بلا اجازت کے ساتھ نہ چلے بلکہ اجازت لیکر ساتھ چلنا چاہئے کیونکہ ساتھ چلنے سے بعض دفعہ دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے اسکی آزادی میں خلل پڑتا ہے چنانچہ ایکدفعہ برسات کے زمانہ میں ایک مولوی صاحب رات کے وقت میرے ساتھ ہو لئے میں نے انکی وجہ سے اچھا راستہ انکے لئے چھوڑ دیا اور خراب راستہ خود اختیار کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اندھیرے میں ایک گڑھے کے اندر میرا پیر گرا جس سے تمام کپڑے خراب ہو گئے اگر وہ میری ساتھ نہوتے

ف موسیٰ علیہ السلام نے شاگردی کی درخواست کی۔

ف بدون اجازت کسی کیساتھ چلنا چاہئے۔

ساتھ چلنے میں دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے ایسا بھی نہ کیجئے

ع‌ؔ قلت وفیہ تنبیہ لسیدنا موسیٰ علیہ السلام علی نقصان علمہ حیث لم یشعر بتجاوزہ عن المقصود وفیہ کان تنبیہا ایضا علی ان العلم الذی اوتیہ خضر من جنس ہذا العلم الذی لحفک النصب بعدمہ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ۔

تو میں خراب راستہ کیوں اختیار کرتا۔ ایک دفعہ ایک وکیل صاحب ایک مجلس نکاح سے گھر تک میرے ساتھ ہولئے حالانکہ اُسوقت آنت اُتر جانے کے سبب تقاضے کے ساتھ گھر جا رہا تھا اُنکی وجہ سے مجھے باتوں میں مشغول ہونا پڑا اور آہستہ آہستہ چلا تنہا ہوتا تو تیزی کے ساتھ جاتا مگر وہ ظالم گھر پر پہونچنے کے بعد بھی واپس نہوے بلکہ دروازہ پر جمکر کھڑے ہوگئے اور باتوں کا سلسلہ قائم رکھا آخر مجبور ہو کر مجھے بیمروتی سے کہنا پڑا کہ اب مجھے جانے دیجئے مگر وہ پھر بھی نہ ٹلے تو میں منہ موڑ کر خود ہی چلدیا۔ آجکل لوگوں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ دوسرے کو ان کے فعل سے تکلیف ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپ حضرت عائشہ کے پاس سے بھی اگر رات کو اُٹھتے تو اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ انکی نیند خراب نہو ان کو تکلیف نہو حالانکہ وہ محبوبہ ہونیکے ساتھ خود محب وجان نثار بھی تھیں اور ایسی جان نثار تھیں کہ حضور کی شان میں فرماتی ہیں ؎

لواحی زلیخا لو راین جبینہ لآثرن بالقطع القلوب علی الید

زلیخا کو ملامت کرنیوالیاں اگر حضور کا چہرہ مبارک دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھ کاٹنے کے دل کے ٹکڑے کر ڈالتیں۔

ایشیائی مذاق کے اعتبار سے جو کہ عرب کا سادہ مذاق تھا یہ کلام غایت عشق کو ظاہر کر رہا ہے اور زلیخا کے جس قصہ کیطرف اس شعر میں اشارہ ہے اُس کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ جب زلیخا کا عشق مصر میں مشہور ہوا تو وہاں کی عورتوں نے اُسکو ملامت کی کہ غلام پر فریفتہ ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام اُسوقت غلاموں ہی کی طرح فروخت ہو کر اُسکے ہاتھ میں آئے تھے۔ یہ باتیں سُنکر زلیخا نے اُنکے اعتراض کا عملی جواب دینا چاہا زبان سے کچھ نہیں کہا تدبیر یہ کی کہ اُنکو دعوت کے بہانہ سے اپنے گھر بلایا اور یوسف علیہ السلام کو پردہ میں کر دیا پھر سب عورتوں کے سامنے چاقو سے کاٹ کر کھانیکے پھل اور میوے رکھدیئے اور ہر ایک کے سامنے ایک ایک تیز چاقو رکھدیا جب عورتوں نے چاقو ہاتھ میں لیلیا اور پھل تراشنے کا قصد کیا تو عین اس موقعہ پر زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو بلایا کہ ذرا یہاں تو آؤ (وہ سمجھے کسی کام سے بلاتی ہوگی چونکہ وہ ظاہر میں آقا تھی اسلئے خدمت کے ارادہ سے تشریف لے آئے ۱۲) اب جو وہ سامنے آئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ صدیقہ سے برتاؤ

اور عورتوں کی نظر اُن کے حسن وجمال پر پڑی تو سبکے ہوش اڑ گئے بدحواسی میں چاقو سے پھل کی جگہ اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔
اب تو زلیخا کو موقعہ ملا کہ کیوں تمھارے حواس کہاں گئے ہوش تو ٹھکانے کرو میں تو ایک دن بھی ایسی بدحواس نہیں ہوئی سب نے شرمندہ ہوکر کہا حاش للہ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم۔ کہ بخدا یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ زلیخا نے کہا فذلکن الذی لمتنننی فیہ کہ دیکھو یہی ہے جسکی محبت پر تمنے مجھے ملامت کی تھی اس قول کا ترجمہ کسی نے شعر میں خوب کیا ہے ؎

این ست کہ خون خوردہ و دل بردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

تو حضرت عائشہ ان عورتوں کے بارہ میں فرماتی ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا جمال دیکھکر تو انھوں نے ہاتھ ہی کاٹے تھے اگر ہمارے حضور کا جمال جہاں آرا دیکھ لیتیں تو دل وجگر کے ٹکڑے کاٹ ڈالتیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ کو حضور سے کسقدر جیہ کا عشق تھا۔ تو کیا اُنکو حضور کے کسی فعل سے کلفت ہو سکتی تھی ہرگز نہیں مگر باایں ہمہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور آدھی رات کو اٹھے فقام رویدا وانتعل رویدا وفتح الباب رویدا وخرج من الباب رویدا آہستہ سے اُٹھے آہستہ سے نعلین پہنے آہستہ سے دروازہ کھولا آہستہ سے باہر نکلے۔ آپنے اسقدر احتیاط کی مگر حضرت عائشہ کے تو دل کو آپ سے تعلق تھا آپ کا جدا ہونا تھا کہ دل پر اس کا اثر ہوا اور فوراً آنکھ کھل گئی جب آپکو بستر پر نہ پایا تو آپکے وساوس عاشقانہ آنا شروع ہوئے ؎

عشق ست وہزار بدگمانی
باسایہ ترا نمی پسندم

یہ خیال ہوا کہ شاید کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف لیگئے ہیں اور جب عاشق کی یہ حالت ہے کہ باسایہ ترا نمی پسندم۔ تو باضرہ ترا نمی پسندم تو بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ حضرت عائشہ سے رہا نگیا اور فوراً اوڑھنی اوڑھکر آپ کے نشانات قدم کو دیکھتی ہوئی پیچھے پیچھے چلیں دیکھا کہ آپ بقیع الغرقد میں (جو مدینہ کا قبرستان ہے) مُردوں کیلئے دعا کر رہے ہیں

اسکے بعد کا قصہ سامعین کو غالباً معلوم ہوگا کیونکہ مواعظ میں بیان ہو چکا ہے۔
مقصود اس سے یہ تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کی راحت کا اسقدر اہتمام تھا مگر آج کل لوگوں کو اس کا مطلق اہتمام نہیں اسی لئے بدون اجازت لئے کسی کے ساتھ ہو لیتے ہیں خواہ اُسپر گرانی ہی ہو صوفیہ نے اس سے منع کیا ہے اور قصۂ موسی و خضر سے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ ساتھ چلنے کیلئے بھی اجازت لینا چاہئے۔ جیساکہ حضرت موسی علیہ السلام نے خضر سے ساتھ رہنے کی اجازت لی اسکے جواب میں خضر علیہ السلام نے استادانہ ناز سے کام لیا کہ تم میری ساتھ رہکر تحمل نہیں کر سکتے ممکن ہے اُنکو کشف سے معلوم ہو گیا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انکو ایک خطا پر متنبہ کرنے کیلئے بھیجا ہے اسلئے انکی ساتھ ناز استادانہ برتنا مناسب ہے کہ اس سے اصلاح کامل ہوگی۔ موسی علیہ السلام نے فرمایا ستجدنی انشاء اللہ صابرا و لا اعصی لك امرا کہ تمہیں انشاء اللہ آپ مجھے صابر و متحمل پائیں گے اور میں کوئی بات آپ کے خلاف نکروں گا۔ سبحان اللہ! کیسی شان ہے کہ ابھی تو تمام عالم کے پیشوا اور مقتدا بنے ہوئے تھے اور آج دوسرے کی شاگردی اور اطاعت پر آمادہ ہیں۔ اسپر حضرت خضر نے فرمایا فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیء حتی احدث لك منه ذکرا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو چپ چاپ ساتھ ہو لیں کسی معاملہ میں خود سوال کی ابتدا نکریں جب تک میں خود نہ بتلاؤں۔
اسمیں خاموشی کی تعلیم تھی۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ سالک طالب کو سکوت لازم ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ہر درویشے کہ چون و چرا کند و ہر طالب کہ چون و چرا کند ہر دو را در چراگاہ باید فرستاد۔ اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس واقعہ میں موسی علیہ السلام کو خضر نے طریقت کی یعنی طریق باطنی کی تعلیم دی تھی ہرگز نہیں کیونکہ طریقت شریعت سے جدا نہیں شریعت ہی کی تکمیل ظاہر و باطن کا نام طریقت ہے اور اسمیں موسی علیہ السلام سے حضرت خضر زیادہ عالم نتھے اور جو واقعات ملاقات خضر کے بعد ظاہر ہوئے

ع ۵ لکون ما اصاب موسی ع من جهة الکلام و سرعة القول و بداهة الجواب و علاجه التانی فی الکلام والتدبر والتامل فیه قبل ان یتلفظ به واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ۔

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسی علیہ السلام کیساتھ ناز استادانہ برتا۔

سالک کو سکوت لازم ہے

واقعات خضر سے تعلیم سلوک یا تعلیم علم باطن دینا مقصود نہ تھا

ہیں جنمیں حضرت خضر نے اپنا علم ظاہر کیا تھا اُنکو طریقت سے کچھ بھی علاقہ نہیں بلکہ وہ تو محض کسب تکوینی سے تعلق رکھتے ہیں اور کشف کوئی نہ کمال ہے نہ مقصود ہے ہاں بلا طلب کے کسی کو حاصل ہوجائے تو نعمت ہے کیونکہ وہ بھی ایک علم ہے

اور میں نے جو خضر کے اقوال سے مسائل سلوک مثلاً سکوت سالک وغیرہ کا استنباط کیا ہے سو نہ اسوجہ سے کہ یہاں سلوک کی تعلیم تھی بلکہ اسوجہ سے کہ خضر فی نفسہ شیخ طریقت تھے اُن کا مذاق یہی تھا۔ تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم عملاً کس طرح دی کہ انکو خضر کا شاگرد بنایا گیا جو اُن سے کسی طرح بھی درجۂ قرب میں زیادہ نتھے نہ علوم شرائع و نبوت میں افضل تھے۔

اسی کی طرف یہاں الا بشق الانفس بڑھا کر ہمکو متوجہ کیا گیا ہے کہ دیکھو ہمنے کلام میں کسقدر احتیاط کی ہے پس تمکو بھی احتیاط کرنا چاہئے

اب سمجھو کہ میں نے لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس کے ترجمہ میں یہ کہا ہے کہ تم اُس شہر میں مع اسباب و اثقال کے نہ پہونچ سکتے تھے حالانکہ نص میں صرف بالغیہ وارد ہے بالغیہ بہا نہیں ہے مگر قرینۂ مقام سے یہ بات معلوم ہے کہ مراد یہی ہے کہ تم مع اسباب و اثقال کے وہاں نہ پہونچ سکتے تھے کیونکہ اگر بلوغ مع الاثقال مراد نہوتا تو لم تکونوا بالغیہ کو تحمل اثقالکم سے ربط[ع] نہوگا پس ربط اس بات کو چاہتا ہے کہ لم تکونوا بالغیہ سے مراد لم تکونوا بالغیہ بہا ہے۔ اور جب یہ مراد ہے تو مقام مبلغیہ کو مقتضی ہے اب یہ سوال ہوگا کہ اسکی جگہ بالغیہ کیوں فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ مبالغہ کیلئے[ع] بالغیہ اختیار فرمایا کہ تم مع اسباب کے تو کیا جریدہ بھی وہاں نہ پہونچ سکتے تھے اور مبالغہ خلاف[ف] احتیاط نہیں کیونکہ مخاطب پر مبالغہ کا مبالغہ ہونا مخفی نہیں رہتا۔

ف مبالغہ خلاف احتیاط نہیں۔

ع قلت ولایخفی ما فیہ فان الربط حاصل بدون ذلک ایضا والمعنی تحمل اثقالکم الی بلاد بعیدة لم تکونوا واصلین الیہا مشاة خفافا متجردین ایضا ای ومع الاثقال بالاولی ۱۲ ظ۔ ع قلت وعندی لا مبالغة فیہ فان بعض البلاد لا یتیسر الوصول الیہا ماشیا متجردا الا بشق الانفس فی نفس الامر وقولہ الی بلد عام لکونہ نکرة فیصدق الکلام بالبلاد البعیدة غایة البعد التی لا یقدر الانسان الماشی علی وصولہا الا فی شہر وسنین مع التعب الشدید واللہ تعالی اعلم ففیہ دلالة علی نعمة المرکوب ایضا قلت وہذا من باب اختلاف الذوق فان بعض الربط قریب عند واحد و بعید عند آخر ۱۲۔

اسکے بعد ارشاد ہے والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ط یعنی خدا تعالیٰ نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے سواری اور زینت کیلئے۔ یہاں حق تعالیٰ نے دو نعمتیں بیان فرمائی ہیں ایک رکوب (سوار ہونا) دوسرے زینت چونکہ یہ مجموعہ سب انعام میں نہیں ہے۔ اسلئے اسکو خیل و بغال و حمیر کے ساتھ ذکر فرمایا۔ کیونکہ اونٹ کی سواری میں کوئی زینت نہیں ہاں گھوڑے کی سواری میں بڑی زینت ہے اور خچر میں بھی زینت ہے کیونکہ وہ گھوڑے کے قریب ہی ہے ہمنے دیکھا ہے کہ بعض رؤسا رفٹن میں خچر کو بھی جوڑتے ہیں مگر گدھے میں شاید کلام ہو کہ اسمیں کونسی زینت ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ گدھے بھی سب گدھے نہیں ہوتے بلکہ بعضے گدھے خچر کے قریب ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ جیسے خچر گھوڑے کے قریب ہے اسی طرح خر خچر کے قریب ہے اور قریب کا قریب قریب ہے مگر اسپر معقولی طلبہ کو یہ اعتراض ہوگا کہ اسطرح تو کلکتہ بھی قریب ہے کیونکہ ہمارے سے دہلی قریب ہے اور دہلی سے علیگڈہ اس سے ٹونڈلہ اس سے کانپور اس سے الہ آباد اسی طرح قریب ہے قریب کو ملاتے جاؤ اور اخیر میں کہدینا کہ قریب کا قریب قریب ہے۔ مگر انھوں نے غور نہیں کیا کیونکہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قریب کا قریب قریب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جسکے درمیان وسائط زیادہ نہوں اور عرفاً ایک دو واسطہ سے بعد نہیں ہوتا اس سے زیادہ سے بعد ہو جاتا ہے اور قرآن میں کلام محاورات کے موافق ہے اسکو عرف سے سمجھنا چاہیئے۔ سو عرف میں ایک دو واسطہ بعید نہیں سمجھا جاتا مثلاً کوئی اپنے کو فاروقی صدیقی کہے تو اسمیں بعد نہیں اور کوئی اپنے کو نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرے تو اسمیں بعد ہوگا جیسے ایک بھنگی ڈوبنے لگا تھا اس نے چلا کر کہا ارے میں ڈوبا مجھے بچاؤ تو کسی نے اسکے حال پر توجہ نکی تو اس نے یوں کہنا شروع کیا کہ نبی زادہ ڈوبا جاتا ہے جلدی بچاؤ یہ سنکر لوگ دوڑ پڑے اور اسکو نکال لیا دیکھا تو بھنگی ہے کہا تو نبی زادہ کدھر سے ہو گیا تو وہ جواب دیتا ہے کہ آدم علیہ السلام نبی تھے یا نہیں کہا ہاں کہا میں آدم کی اولاد میں ہوں یا نہیں تو میں بھی نبی زادہ ہوا۔ تیسرے یہ کہ گدھا غریب تو خواہ مخواہ ہی ذلیل اور بدنام ہے ورنہ عقلاً اسمیں ذلت کی کیا چیز ہے مشہور یہ ہے کہ گدھا بیوقوف ہوتا ہے مگر ایک گدھے والے جو شہزادہ تھے اور نیز داد کا کام

زینت کی سواری میں
زینت نہیں۔

خچر کی سواری میں
بھی زینت ہے اور
اس کا ثبوت۔

ایک بھنگی کا لطیفہ

گدھا بیوقوف نہیں
ہے۔

ف: ہاں گدھے کی آواز بری ہے مگر ذلت کا سبب نہیں

حدیث اذا سمعتم نہیق الحمار پر ملاحدہ کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

کرتے تھے مجھ سے کہتے تھے کہ گدھا بڑا عاقل ہوتا ہے اسے ہیں تحقیق کی ضرورت نہیں بس تقلید ہی کافی ہے
ہاں اسکی آواز البتہ منکر ہے مگر یہ ذلت کا سبب نہیں ہو سکتا آخر توپ کی آواز ہی کونسی اچھی ہے
کان کے پردے پھاڑ ڈالتی ہے مگر ذلیل نہیں پس یہ مسلم کہ گدھے کی آواز بری ہے خصوصاً جبکہ
سب ملکر بولیں ہمیں اس کا زیادہ تجربہ ہے کیونکہ ہم گدھوں کے محلہ میں رہتے ہیں اسلیے سب مجھے اسپر
اتفاق ہے اور نص میں بھی تو اسکی آواز کو انکر الاصوات کہا گیا ہے مگر صوت کے منکر ہونیسے
اسکی ذات میں ذلت نہیں آئی اور ایک عجیب بات ہے کہ گرمیوں کی موسم میں خصوصیت کیساتھ
گدھے زیادہ بولتے ہیں اسی کی بنا پر بعض ملحدین نے اس حدیث پر اعتراض کیا اذا سمعتم
نہیق الحمار فتعوذوا باللہ فانہ رأی شیطانا (کہ جب گدھے کی آواز سنو تو اللہ کی پناہ
مانگو کیونکہ اس نے شیطان کو دیکھا ہے (اور اسکو دیکھکر بولا ہے) کہ اگر وہ شیطان کو دیکھکر بولتا ہے
تو اسکی کیا وجہ کہ گرمیوں میں زیادہ بولتا ہے کیا گرمیوں میں شیطان کو زیادہ دیکھتا ہے اس کا ایک
جواب تو یہ ہے کہ ہاں یہ بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ شیاطین نار سے پیدا ہوئے ہیں ممکن ہے انکو حرارت
سے خوشی ہوتی ہو اسلیے گرمیوں میں زیادہ پھیلتے ہوں اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں
انہ رأی شیطانا قضیہ مطلقہ ہے جو بعض ازمنہ میں وقوع سے بھی صادق ہو سکتا ہے لہذا
نہیق حمار کے بعض افراد بھی اگر رویت شیطان سے ناشی ہوں یہ قضیہ صادق ہو جائیگا یہ ضرور
نہیں کہ ہر نہیق کا سبب رویت شیطان ہی ہو اور یہ وہ بات ہے جو میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں
ایک عالم کے جواب میں بیان کی تھی اور یہ وہ وقت تھا جبکہ یونان نے ٹرکی حکومت کو شکست
دیکر ادر یانوپل وغیرہ فتح کر لئے تھے جس سے بعض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب
اور تزلزل آگیا تھا اور ملاحدہ تو برملا کہنے لگے تھے کہ خدا بھی نصرانیت کا حامی ہے اسلام اور
مسلمانوں کا حامی نہیں اسپر دہلی کے بعض مخلصین نے مجھے بلایا کہ یہاں بیان کی سخت ضرورت ہے
تا کہ اس قسم کے شبہات کا ازالہ کیا جائے چنانچہ میں گیا اور اسی موضوع پر بیان ہوا جسمیں اس قسم کے
شکوک و شبہات کا بہت خوبی کیساتھ بحمد اللہ ازالہ کر دیا گیا اور خاتمہ بیان پر بطور اتمام حجت کے
میں نے یہ بھی کہدیا کہ اگر اب بھی کسی کے ذہن میں کچھ شبہ اور وسوسہ ہو تو ظاہر کر دے ایسا نہو کہ
میرے جانیکے بعد یوں کہا جائے کہ یہ شک رہ گیا اور وہ شبہ رہ گیا اور یہ بات میں نے بحمد اللہ اتمام حجت

کیلئے میری زبان سے نکل گئی تھی ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس طرح تحدی کیساتھ اعلان کرتا اس پر ایک پنجابی عالم کھڑے ہوئے اور کہا اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصالحون (اور ہمنے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھدیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک ہیشہ نیک بندے ہوں گے) پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ اسکے مالک کفار ہوگئے میں نے کہا مولانا آپ تو عالم ہیں ذرا یہ تو دیکھئے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے یا مطلقہ ہے چونکہ وہ عالم تھے اتنی ہی بات سے سمجھ گئے اور کہا بس بس میں سمجھ گیا اب کچھ شبہ نہیں رہا (حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہوں گے کفار کبھی مالک نہوں گے بلکہ اسمیں اطلاق کیساتھ یہ وعدہ ہے کہ نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے اور اطلاق کے صدق کیلئے ایکبار وقوع کافی ہے چنانچہ بحمد اللہ حضرات صحابہ روئے زمین کے مالک بن چکے ہیں زمانہ عروج اسلام میں کوئی سلطنت مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتی تھی۔ اور یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آیت میں ان الارض سے مراد یہی دنیا کی زمین ہے ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق وسباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارض جنت ہے[ع] کہ جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہوں گے اسپر کچھ بھی اشکال نہیں خوب سمجھ لو ۱۲) بہر حال حدیث پر کچھ اشکال نہیں ہم دعوی کرتے ہیں کہ نہیق حمار کا سبب رویت شیطان ہے مگر یہ دائمی سبب نہیں ممکن ہے کبھی وہ اپنی طبیعت سے ہی چیختا ہو اور قضیہ کے مطلقہ یا دائمہ ہونے پر نظر کرنے سے بہت سے اشکال دفع ہو جاتے ہیں مگر اہل علم اسپر نظر نہیں کرتے اسلئے بعض اشکالات کے جواب میں پریشان ہو جاتے ہیں انکو چاہئے کہ جب کسی آیت یا حدیث پر اشکال وارد کیا جائے کہ یہ حکم فلاں مادہ میں متخلف ہے فوراً اسپر اول نظر کی جائے کہ آیت یا حدیث میں حکم دائمی ہے یا مطلق تو انشاء اللہ معلوم ہوگا کہ زیادہ اشکالات کا منشا یہ ہے کہ لوگوں نے مطلقہ کو دائمہ سمجھ لیا ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ گدھے کی آواز کا منکر ہونا مسلم ہے مگر اس سے زینت پر کیا کلام ہے آواز کو زینت میں کچھ دخل نہیں بلکہ جس فن کی زینت عام طور پر آواز ہی سے سمجھی جاتی ہے یعنی فن موسیقی اسمیں بھی اہل کمال آواز کی عمدگی کو کمال نہیں سمجھتے بلکہ کمال

ع وہذا ہو الذی اختارہ الشیخ فی تفسیرہ بیان القرآن وظنی ان اکثر المفسرین علی ذلک واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ۔

ان الارض یرثہا عبادی الصالحون پر اعتراض اور جواب

زیادہ تر اشکال کا منشا اطلاق کو دائمی سمجھنا ہے

آواز کی عمدگی کمال نہیں

دوسری شے کو سمجھتے ہیں چنانچہ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب کو ایک زمانہ میں جبکہ مولانا گورنمنٹ کے مدارس کے ممتحن مقرر تھے اور اجمیر میں ملازم تھے فن موسیقی سیکھنے کا شوق ہوا اور اس شوق کا منشا صرف یہ تھا کہ مولانا کو جامعیت کا شوق تھا ہر علم کو حاصل کرنا چاہتے تھے اسکے سوا اور کچھ منشا نہ تھا کیونکہ مولانا کے ہمعمروں میں سے ایک ثقہ نے (جنکا نام مولوی رعایت الحق تھا) مجھسے بیان کیا ہے کہ مولانا بچپن اور جوانی میں بھی ویسے ہی نیک تھے جیسے بڑے ہو کر نیک تھے مولانا نے جوانی میں بھی کبھی معصیت کا ارتکاب نہیں کیا۔

غرض مولانا نے ایک میر صاحب سے جو فن موسیقی کے ماہر تھے اس فن کو حاصل کیا پھر مولانا کو تو اس شغل سے خدا تعالیٰ نے اس طرح نکالا کہ ایک دن آپ اپنے حجرہ میں بیٹھے ہوئے جو لب سڑک بالاخانہ پر تھا موسیقی کی مشق کر رہے تھے کہ ایک مجذوب نیچے سے گذرا اور اس نے پکار کر کہا ارے مولوی تجھے خدا نے اس کام کیواسطے پیدا نہیں کیا دوسرے کام کے واسطے پیدا کیا ہے مولانا کے دل میں تو اسی وقت سے نفرت پڑ گئی اور اس شغل کو چھوڑ دیا اور مولانا کے استاد کو اسطرح نفرت ہوئی کہ ایک دفعہ کوئی راجہ اجمیر آیا وہ اس فن کا شائق تھا اس نے سب اہل کمال کو جمع کیا انمیں وہ میر صاحب بھی تھے اُنھوں نے جب گانا شروع کیا تو راجہ کے ہمراہ جو ایک استاد تھا اس نے اُن کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہدیا کہ سبحان اللہ کیا گلا پایا ہے بس اس پر انھوں نے ستار وغیرہ پھینکدیا اور کہا لعنت ہے اس کام پر جسمیں کمال حاصل کر کے بھی داد وہ ملتی ہے جو ایک ڈوم کو دیجاتی ہے کہ کیا گلا پایا ہے۔ کیا موسیقی اس کا نام ہے کہ آواز اچھی ہو آواز تو ایک رنڈی کی اور ایک بچہ کی مجھسے اچھی ہو سکتی ہے اگر میرے فن کی یہی قدر ہے تو میں اسپر لعنت بھیجتا ہوں اس واقعہ سے انکو گانے بجانے سے نفرت ہو گئی اور دونوں استاد شاگرد اس کام سے تائب ہو گئے یہ بظاہر مولانا کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے مولانا کے استاد کو بھی آپ کی صحبت کی برکت سے توبہ نصیب کی۔ تو دیکھیے حالانکہ گانے بجانے کی خوبی اور زینت آواز ہی سے ہے مگر اہل کمال کی نظر میں اسکی کچھ وقعت نہیں بلکہ وہ کمال کسی اور چیز کو سمجھتے ہیں بس آواز کی خرابی سے گدھے کی زینت میں خرابی نہیں ہو سکتی اگر اسکو زیور اور عمدہ زین لگام پہنایا جاوے تو گھوڑے کی طرح یہ بھی اچھا لگے گا۔ بمبئی میں دو سیٹھ بے اولاد تھے انھوں نے

مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک میر صاحب سے موسیقی سیکھنا پھر دونوں کو اس سے نفرت ہونا ۲۴

[illegible]

اپنا حوصلہ نکالنے اور شوق پورا کرنیکے لئے ایک گدھے اور گدھی کی شادی کی تھی اولاد والے
تو اپنے بیٹا بیٹی کی شادی میں دل کے حوصلے نکالتے ہیں اور نام و نمود کیلئے بیدریغ روپیہ
خرچ کرتے ہیں بے اولادوں کو یہ خبط سوجھتا ہے کہ لاؤ جانوروں ہی کو بیٹا بیٹی بنا کر ان کا
بیاہ کرو چنانچہ ایک سیٹھ کا گدھا تھا ایک کی گدھی تھی ایک گدھے کا باپ بنا ایک گدھی کا
اور دونوں کو خوب عمدہ لباس پہنایا گیا گدھی کو زیوروں سے آراستہ کیا گیا تو یقیناً وہ گدھی
زینت میں گھوڑے سے کچھ کم نہ ہی ہوگی۔ ہندوستان کے گدھے اسواسطے بھی اچھے نہیں
لگتے کہ انکی خدمت نہیں کیجاتی جسکی وجہ یہ ہے کہ یہاں گدھے کی سواری کو معیوب سمجھا جاتا ہے
اگر یہاں گھوڑے کی طرح گدھے کی بھی سواری کا رواج ہو جاتا اور گھوڑے کی طرح اسکی خدمت
کیجاتی تو اتنا برا نہ لگتا چنانچہ عرب کے گدھے یہاں کے گدھوں سے اچھے ہوتے ہیں (خصوصاً
نجد کے ۱۲) انمیں زینت بھی ہے اور سواری کا کام بھی گھوڑے کی برابر دیتا ہے۔ اگر کوئی یہ
شبہ کرے کہ لباس اور زیور وغیرہ سے اونٹ میں بھی زینت آجائے گی وہ بھی اچھا لگنے
لگیگا تو میں کہتا ہوں ہاں لیکن اُسکی بیہ ڈھنگی رفتار ساری زینت کو کھو دیتی ہے ف

طاؤس را بنقش ونگارے کہ ہست خلق　　تحسین کنند واو خجل از زشت پائے خویش

اور یہاں ایک اور نکتہ قابل غور ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لترکبوھا پر لام
غایت داخل کیا ہے اور زینۃ پر لام داخل نہیں کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ رکوب تو ایسی
غرض ہے جو قابل قصد ہے جو شان غایت کی ہوتی ہے اور زینت قابل قصد نہیں بلکہ امور
زائدہ میں سے ہے اسلئے اسکو بصورت غایت ذکر نہیں فرمایا گو معنیً غایت ہی ہے لیکن
یہ امر مقصوداً قابل تحقیق ہے کہ اگر کوئی شخص زینت ہی کیلئے اور اسی قصد سے کسی چیز کا
استعمال کرے مثلاً عمدہ لباس پہنے تو یہ جائز ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جائز ہی

۲۵

زینت قابل قصد نہیں اور قصد زینت کے احکام

ف میں کہتا ہوں کہ لباس کی زینت قابل اعتنا نہیں تو محض عارضی ہے لباس و زیور تو ایک بیجان تصویر میں بھی
زینت پیدا کر دیتا ہے اور اوپر اس کا ذکر محض تبرعاً ہوا ہے۔ اور بظاہر آیت میں اونٹ کیلئے رکوب و زینت کا بیان
نہ کرنا اسپر مبنی ہے کہ اصل خلقت ابل رکوب و زینت کیلئے نہیں ہے بلکہ حمل اثقال الی بلاد بعیدہ کیلئے ہے گو اُس سے رکوب
و زینت کا کام بھی لیلیا جاوے اور اصل خلقت خیل و بغال و حمیر رکوب و زینت کیلئے ہے گو ان سے بھی حمل اثقال کا
کام لیلیا جائے فلا یلزم نفی الرکوب والزینۃ عن الابل واللہ اعلم ۱۲ ظ

مگر اطلاق کی ساتھ نہیں جس سے اہل تفاخر کو گنجایش مل سکے بلکہ اسمیں تفصیل ہے جسکو میں
موارد سے سمجھا ہوں وہ تفصیل یہ ہے کہ عمدہ لباس اپنا جی خوش کرنیکے لئے یا اپنے
کو ذلت سے بچانیکے لئے یا دوسرے شخص کی اکرام کیلئے پہنے تو جائز ہے مثلاً اگر ہمکو یہ معلوم
ہو جائے کہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فلاں جگہ تشریف فرما ہیں تو ہم یقیناً عمدہ
لباس پہنکر جائیں گے اور اسوقت مقصود حضور کی تعظیم ہوگی۔ انسان اپنے معظم کے سامنے
اچھے ہی لباس میں جایا کرتا ہے تاکہ اس کی عظمت ظاہر ہو ہاں عمدہ لباس اس نیت سے
پہننا حرام ہے کہ اپنی عظمت ظاہر کیجائے اور دوسرونکی نظر میں اپنی بڑائی ثابت کیجائے۔
خلاصہ یہ ہوا کہ لباس میں چار درجے ہیں ایک تو ضرورت کا درجہ ہے دوسرا آسائش کا تیسرا
آرایش یعنی زینت کا یہ تین درجے تو مباح ہیں بلکہ پہلا درجہ واجب ہے۔ اور چوتھا درجہ نمایش
کا ہے یہ حرام ہے اور یہ لباس ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر چیز میں یہی چار درجے ہیں
ایک ضرورت دوسرے آسائش تیسرے آرائش چوتھے نمائش۔ ضرورت کا قافیہ بھی اگر ملجا
تو اچھا ہو تاکہ کلام میں زینت ہو جاتی اور زینت جائز ہے۔ غرض دوسروں کی نظر میں اپنی
وقعت بڑھانیکو زینت کرنا حرام ہے باقی نفس زینت حرام نہیں دیکھئے شریعت کی کیسے
پاکیزہ حدود ہیں اور اسمیں کسقدر وسعت ہے کہ چار درجوں میں سے صرف ایک درجہ کو حرام
کیا گیا ہے باقی سب کی اجازت ہے مگر افسوس ملحدین آنکھیں بند کرکے شریعت پر تنگی
کا الزام لگاتے ہیں واللہ ان لوگوں نے شریعت کو دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں
اسکے بعد ارشاد ہے ویخلق مالا تعلمون اور اللہ تعالیٰ وہ وہ چیزیں پیدا کرتے ہیں جنکو
تم نہیں جانتے مطلب یہ ہے کہ مخلوقات الٰہیہ کا تمھاری معلومات ہی میں انحصار نہیں بلکہ
اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتے رہتے ہیں جنکی تمکو خبر نہیں مثلاً زمین کے اندر بعض
جراثیم ایسے پیدا ہوتے ہیں جو انسان وحیوان کیلئے قاتل ہیں اور بعض مواد ایسے پیدا ہوتے
ہیں جو موذیات کے فنا کرنیوالے ہیں ہمکو اسکی کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کونسا مادہ کب پیدا ہوا
اور کب فنا ہو گیا یہ تو آیت کی تفسیر تھی اب میں اسکے متعلق چند فوائد ذکر کرنا چاہتا ہوں۔
ایک فائدہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ایک سواری ریل ایجاد ہوئی ہے بعض ذہینونکو

ریل کا ذکر قرآن میں ہے یا نہیں

اسکے متعلق اسکی تلاش ہے کہ ریل کا ذکر بھی قرآن میں کہیں ہے یا نہیں ہر چند کہ اسکی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ قرآن حرفت وصنائع اور ایجادات کے بیان کرنیکو نازل نہیں ہوا جیسا کہ بارہا میں نے اسپر متنبہ کیا ہے اور قرآن کو جو تبیانا لکل شیٔ کہا گیا ہے تو وہاں کل شیٔ سے مراد کل شیٔ من امور الدین ہے نہ کہ کل شیٔ ولو من امور الدنیا اسلئے یہ تحقیق مذکور محض ایک امر زائد ہے لیکن تبرعًا میں اسکو بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ اسوقت یہ بیان ایک ایسی ہی نعمت کے شکریہ میں ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریل کے متعلق ہمکو عطا فرمائی ہے اور جسکو دوسرے مرکوبات کی ساتھ وصف مرکوبیت میں مشارکت بھی ہے سو بعض ذہینوں نے اسکو سورۂ یٰسٓ کی اس آیت وآیۃ لھم انا حملنا ذریتھم فی الفلک المشحون وخلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون ۝ میں داخل کیا ہے کہ اسمیں ریل کا ذکر بھی آگیا ہے (کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ لوگوں کیلئے اس بات میں بھی قدرت کی دلیل موجود ہے کہ ہمنے ان کی اولادؑ کو بھری کشتیوں میں سوار کیا اور ہمنے ان کیلئے کشتی کے مثل اور چیزیں بھی پیدا کی ہیں جنپر وہ سوار ہوتے ہیں) اور ریل سب سے زیادہ کشتی اور جہاز کے مشابہ ہے کہ جیسے جہاز میں انسان اپنی تمام ضروریات کو ساتھ لیکر سفر کرتا ہے ایسے ہی ریل میں کر سکتا ہے۔ مگر یہ قرآن کی تحریف ہے کیونکہ یہاں خلقنا لھم صیغہ ماضی کا ہے تو لازم آئیگا کہ ریل کا وجود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ہوا اور اس کا بطلان ظاہر ہے بلکہ اس سے مراد بعض کے نزدیک تو اونٹ ہے اور اس کا لطف عربیت کے جاننے سے زیادہ آئیگا کیونکہ اہل عرب اونٹ کو سفائن البر یعنی خشکی کا جہاز کہتے تھے۔ چنانچہ یہ مصرعہ مشہور ہے سفائن برو السراب بحارھا اور میرے نزدیک اس سے مطلق انعام مراد ہیں کیونکہ سورۂ زخرف میں ہے۔ وجعل لکم من الفلک والانعام ما ترکبون یہاں فلک وانعام دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انعام وکشتی باہم متناسب ہیں مگر مماثلت کی صورت جب ذہن میں آئے گی کہ کشتی تو چھوٹی لو اور جانور بڑا یہ نہیں کہ جانور چھوٹا لو

ع‍ تجار عمومًا اپنی اولاد ہی کو سفر میں بھیجتے تھے اور خود اپنی دکان پر رہتے تھے اسلئے یہاں اولاد کا سوار کرنا مذکور ہوا۔ ۱۲ ظ۔

اور جہاز سے اس کا موازنہ کرو جیسے بیربل اور اکبر شاہ کا قصہ ہے کہ اکبر نے بیربل سے کہا تھا کہ مثل مشہور ہے راج ہٹ تریا ہٹ بالک ہٹ سوا ول کی دو ضدیں تو واقعی سخت ہیں باقی تیسری کیا مشکل ہے بیربل نے کہا حضور سب سے سخت تو یہی ہے البتہ اگر عقل ہو تو پھر مشکل نہیں اکبر شاہ نے کہا ہمیں عقل کی کون ضرورت ہے بیربل نے کہا بہت اچھا میں بچہ بنتا ہوں آپ میری ضد پوری کیجیے بادشاہ نے کہا اچھا تم بچہ بنو اور ضد کرو ہم ہر ضد کو پورا کریں گے بیربل نے بچوں کی طرح رونا شروع کیا اور کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اکبر نے فیلخانہ سے ہاتھی منگوا دیا اس نے پھر رونا شروع کیا اور کہا ہم تو کلھیا لیں گے اکبر نے کلھیا بھی منگوا دی وہ پھر رونے لگا اور کہا ہاتھی کو کلھیا میں رکھو یہاں اکبر عاجز ہو گیا اور کہا اچھا تم جو کہتے تھے کہ اگر انسان عاقل ہو تو بچوں کی ضد پوری کر سکتا ہے یہاں عقل کیا کام دے گی بیربل نے کہا حضور عقل کے ساتھ بچہ کی ضد ضرور پوری کی جا سکتی ہے اکبر نے کہا اچھا لو ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو چنانچہ آپ نے اسی سبق کو دوہرایا کہ ہم تو ہاتھی لینگے بیربل نے بازار سے مٹی کا ننھا سا ہاتھی منگا دیا پھر کہا ہم تو کلھیا لیں گے اس نے بڑی سی کلھیا منگا دی پھر کہا ہاتھی کو اس میں بند کرو بیربل نے ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دیا اور کہا حضور نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی ضد پر فیلخانہ سے ہاتھی منگایا آپ کو بچہ ہی کے مناسب ہاتھی منگانا چاہیے تھا اسی طرح یہاں فلک والانعام میں مناسبت کا لحاظ کر کے کشتی چھوٹی اور جانور بڑا لینا چاہیے۔ اور بعض حضرات نے ریل کو سورۂ نحل کی اس آیت ویخلق ما لا تعلمون میں داخل کیا ہے (کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی چیزیں پیدا کریگا جنکو تم نہیں جانتے) گو یہ تحریف تو نہیں ہے مگر بعید ضرور ہے کیونکہ یخلق بظاہر صیغۂ حال ہے اور ظاہر ہے کہ ان سواریوں میں جو آجکل ایجاد ہوئی ہیں صحابہ کے زمانہ میں کوئی بھی پیدا نہیں ہوئی اور اگر اسکو مستقبل لیا جائے تو صحابہ کچھ بھی نہ سمجھے ہوں گے پھر یہ ایجادات خلق کے بعد تو معلوم ہو گئیں اور اس آیت کے تحت میں وہی اشیاء داخل ہو سکتی ہیں جو بعد خلق کے بھی معلوم نہوں اسلئے اسکی تفسیر میں

عہ کوئی کہسکتا ہے کہ اجمالا اتنا سمجھ گئے ہوں گے کہ آئندہ زمانہ میں سواری کیلئے کچھ اور اشیاء بھی پیدا ہونگی تفصیل جاننے کی کیا ضرورت تھی جبکہ نص میں ما لا تعلمون موجود ہے ۱۲ منہ عہ اگر یخلق کو استقبال اور لا تعلمون کو حال پر محمول کیا جائے تو اشکال وارد نہوگا ای یخلق فی المستقبل ما لا تعلمونہ ایہا المخاطبون بالقرآن لا فی ہذا الوقت ولا بعد فی ذلک تکون بعض الخطابات مخصوصًا بالصحابۃ کقولہ وارضا لم تطئوہا ۱۲ قلت ہو بعید فی ذوقی والمنع کلہا للحال والخطاب عام للقرائن تخصیص الخطاب صرفی لم تطئوہا القرینۃ تخصیص فکیف القیاس ۱۲ اشرف

سہل بات وہی ہے جو اوپر بیان کیگئی ہے کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کیلئے مثل نعم مذکورہ کے نافع ہیں اور تمکو انکی خبر بھی نہیں جیسے مواد ارضیہ جو موذیات کو فنا کرتے رہتے ہیں اور نافع ہونے کی قید باقتضار مقام ہے کہ اشیار نافعہ کا ذکر ہو رہا ہے پس حاصل مقام کا یہ ہوا کہ ہم ایسے نفع رساں ہیں کہ بعض چیزوں کی تمکو خبر بھی نہیں اور ہم ان سے تمکو نفع پہونچاتے ہیں یہ نہ سمجھو کہ بس وہی چیزیں تمہارے نفع کی پیدا کی ہیں جو تمکو معلوم ہیں جیسے نعم مذکورہ اور اس تقریر پر یخلق ما لا تعلمون کا ربط بھی نعم مذکورہ سے ظاہر ہو گیا یعنی ربط تقابل۔

اور بعض حضرات نے ما یفتح اللہ من رحمۃٍ فلا ممسک لہا میں ریل کو داخل کیا ہے کیونکہ بعض سلف نے فرمایا ہے کہ من رحمۃ میں ہر وہ نعمت داخل ہے جو بندوں کی راحت آسانی کیلئے ایجاد ہوئی ہے چنانچہ شغدف وغیرہ کو بھی انھوں نے اسمیں داخل کیا ہے اسمیں البتہ زیادہ بعد نہیں اسی واسطے میں نے بھی اپنی تفسیر کے حاشیہ میں اس مقام پر لکھدیا ہے کہ من رحمۃ کے عموم میں ریل بھی داخل ہے اور اتفاق عجیب یہ ہوا کہ جسدن میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا تھا اُسی دن پہلے پہل ہمارے قصبہ کے سامنے سے ریل گذری ہے اس لئے میں نے تفسیر کے حاشیہ میں یہ بھی لکھدیا کہ بحمد اللہ آج ہماری بستی کے سامنے سے عیدگاہ کے قریب ریل گذری ہے اور اسکی ساتھ ریل کے جاری ہونیکا سنہ و تاریخ بھی لکھدی تاکہ محفوظ رہے[ع] غرض اس آیت میں ریل کا داخل کرنا بعید نہیں اور خود میں نے بھی ابھی میں اسکو داخل کیا تھا لیکن اسوقت میرے ذہن میں ایک بات اس سے بھی زیادہ قریب آئی ہے وہ یہ کہ اگر ذکر کو حقیقی اور حکمی کیلئے عام لیا جائے تو میرے نزدیک ریل کا ذکر وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس میں سب سے اقرب طرق کی ساتھ ہو جاویگا کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں مراکب میں وجہ نعمت اس غایت کو بیان فرمایا ہے کہ وہ تمھارا بوجھ ایسے بلاد تک پہونچاتے ہیں جہاں تم بدون مشقت کے نہیں پہونچ سکتے تھے تو جس سواری میں بھی یہ غایت موجود ہوگی وہ حکما اس نعمت میں داخل ہو کر مثل انعام کے نعمت کی ایک فرد ہوگی اور ریل میں یہ غایت سب سے زیادہ موجود ہے تو وہ بھی حکما اس نعمت میں داخل ہے۔ اور جب

[ع] اس ریل کے تھانہ بھون میں جاری ہونیکا وقت جو تفسیر کے حاشیہ میں لکھا ہے ۲۲ ماہ صفر ۱۳۲۵ہجری ہے

ف ریل بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اسمیں مولانا شیخ محمد صاحب کی حکایت

نعمت میں داخل ہے تو جسطرح نعمت انعام پر ہمکو شکر کی تعلیم دی گئی ہے اسی طرح نعمت ریل
پر بھی شکر ادا کرنا چاہیئے مگر اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔
میں نے بچپن میں مولانا شیخ محمد صاحبؒ کا (جو تھانہ بھون کے بڑے علماء میں سے تھے ۱۲)
ایک وعظ سنا تھا اسوقت میری عمر زیادہ نہ تھی مگر مولانا سے مجھے محبت تھی اور مولانا کو مجھسے محبت
تھی اسلئے میں کوشش کرکے وعظ میں شرکت کیا کرتا تھا اسلئے مجھے مولانا کے مواعظ کی
کچھ کچھ باتیں ابتک یاد ہیں چنانچہ ایکبار مولانا نے وعظ میں فرمایا کہ مجھے ریل کا نعمت ہونا
ابھی تک محسوس ہوا تھا یعنی اس طرف التفات ہوا تھا مگر ایک دن جو ریل میں بیٹھا اور
جلدی سے منزل پر پہونچ گیا تو اسوقت اس نعمت کی بڑی قدر ہوئی اور معلوم ہوا کہ ریل
بھی حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو ہم لوگوں کو عطا ہوئی ہے بس میں آپ صاحبوں کو بھی
مطلع کرتا ہوں کہ اسکو نعمت سمجھو اور اس کا شکر ادا کرو۔ تو جب بڑے بڑے علماء کو اس کا نعمت
ہونا جلدی معلوم نہیں ہوا تو عوام کو اگر اس کا نعمت ہونا معلوم نہو تو زیادہ شکایت نہیں مگر
تنبیہ کے بعد تو احساس ہونا چاہیئے اسلئے میں بھی مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی طرح کہتا ہوں

ف ریل پر سوار ہوتے وقت کیا پڑھنا چاہئے

کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھو اور اس پر شکر کرو اور شکر مراکب کے دو صیغے قرآن میں وارد
ہیں ایک سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون جو رکوب
انعام کے وقت اللہ تعالیٰ نے ہمکو تعلیم فرمایا ہے اور دوسرے بسم اللہ مجریہا ومرسہا ان ربی
لغفور رحیم جو رکوب سفینہ کے وقت نوح علیہ السلام نے اختیار فرمایا تھا اور چونکہ ریل کو حمل
اثقال میں انعام کیساتھ بھی مشابہت ہے اور سرعت سیر وغیرہ میں کشتی کیساتھ اسلئے بہتر یہ ہے
کہ دونوں کو جمع کرلیا جائے۔

ف ریل سے جہنم کی یاد تازہ ہوتی ہے

ایک فائدہ یہ ہے جو مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا تھا کہ ریل کو دیکھکر مجھے جہنم یاد آتا ہے
کیونکہ اس کا انجن جہنم کی اس صفت کا مصداق ہے وھی تفور تکاد تمیز من الغیظ کہ اسقدر
جوش کھاتا ہے گویا غصہ اور قہر سے ابھی پھٹ پڑے گا۔ اور ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے
کہ ریل کے تیسرے درجہ جہنم کی اس صفت کا مذکر ہو جاتا ہے کلما دخلت امۃ لعنت اختہا
کہ جیسے جہنم میں ایک جماعت دوسری جماعت پر لعنت کرے گی ایسے ہی ریل میں تیسرے

درجہ والے آپس میں خوب لڑتے ہیں جب کسی اسٹیشن پر نئے نئے مسافر تھرڈ میں بھرتے ہیں تو جو پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں وہ انہیں کوستے برا بھلا کہتے ہیں کہ سارے اسی گاڑی میں آجاؤ تمہارے واسطے اور کہیں جگہ نہیں رہی منہ پر آنکھیں نہیں کہ یہ تو پہلے ہی سے بھر رہی ہے بس تمہاری سزا یہ ہے کہ کھڑے رہو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ جگہ تو بہت ہے سیدھے ہوکر بیٹھو کیا تم ہی نے کرایہ دیا ہے تم ریل کے مالک ہو پھر خوب گالم گلوچ اور جھگڑا فساد ہوتا ہے اسوقت بالکل یہی منظر ہوتا ہے کلما دخلت امۃ لعنت اختہا۔ اور جب کہتے ہیں کہ ہم نے بھی تو ٹکٹ لیا ہے اسوقت اسکا نمونہ ہوتا ہے لکل ضعف اور جب کہتے ہیں کہ تمکو ہمپر کیا ترجیح ہے اسوقت اسکا نمونہ ہوتا ہے فما کان لکم علینا من فضل۔

ف ریل میں جنت کی بھی شان ہے

اور ایک شان اسمیں جنت کی بھی ہے وہ یہ کہ جنت میں جس چیز کو دل چاہیگا جلدی ملجائیگی اس بات میں ریل جنت کے مشابہ ہے کہ جس چیز کو دل چاہتا ہے ریل کے ذریعہ سے جلدی حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ کلکتہ اور پشاور کے میوے یہاں دوسرے دن پہونچ جاتے ہیں بڑے شہروں میں ہر ملک کی چیزیں ہر وقت ملتی ہیں نیز جیسے جنت میں جہاں جانے کو دل چاہا فوراً پہونچ گئے اوسی کا نمونہ گو ادنی ہی نمونہ ہو اسمیں بھی ہے چنانچہ ظاہر ہے اور اسکے متعلق اسٹیشنوں کا انداز سے تقارب اور ہر اسٹیشن پر ضرورت کی چیزیں ملنا بالکل بلاد سبا کو یاد دلاتا ہے جسکا ذکر اس آیت میں ہے وجعلنا بینہم وبین القری التی بارکنا فیہا قری ظاہرۃ وقدرنا فیہا السیر سیروا فیہا لیالی وایاما آمنین اور گو یہ نعمت دنیوی تھی مگر اسپر ناشکری کی مذمت اسطرح فرمائی گئی فقالوا ربنا باعد بین اسفارنا وظلموا انفسہم فجعلناہم احادیث ومزقناہم کل ممزق الایہ پس اسی طرح یہ ریل بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس کا شکر کرنا چاہئے اور اسکے اندر جو مشابہتیں جنت دوزخ کی مذکور ہوئیں انپر اگر نظر کیجائے تو نعمت ظاہرہ کی ساتھ اس سے نعمت باطنہ یعنی تذکر آخرت بھی حاصل ہوگی

ف ایک دنیوی نعمت کا بیان جو خاص تھانہ بھون والوں کو ریل میں حاصل ہوئی۔

اور ریل میں یہ نعمت عامہ تو سبلوگوں کیلئے تھی جس کا یہانتک ذکر ہوا اور ایک نعمت خاص ہماری بستی کو یہ حاصل ہوئی ہے کہ ہمارا اسٹیشن پہلے بہت دور تھا اب خدا کے فضل سے بہت قریب ہو گیا جس سے قصبہ والوں کو اور باہر سے یہاں آنیوالوں کو بہت ہی راحت اور آسانی

ہوگئی اس کا بھی ہم لوگوں کو شکر کرنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لئن شکرتم لازیدنکم (اگر شکر کروگے تو میں نعمت کو ترقی دونگا) اسلیئے انشاء اللہ امید ہے کہ یہ نعمت جس حال میں اس وقت ہے اس سے ترقی پا جائیگی (مثلاً یہ کہ یہ اسٹیشن جو قریب بنا ہے عارضی سے مستقل ہو جاوے گا [۱۲] اور چونکہ شریعت کی ہمکو یہ بھی تعلیم ہے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ کہ نعمت جن لوگوں کے واسطہ سے تمکو ملے ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے اسلیئے جو لوگ اس امر میں ساعی ہوئے ہیں ہمکو ان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ یہ بھی شکر نعمت کا تتمہ ہے اور ان کے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ زبان سے انکی تعریف کیجائے۔ انکو دعا دیجائے اور انکے اس احسان کو لوگوں میں ظاہر کیا جائے۔
مع رعایۃ الحدود فیہ ۱۲

(اور سب سے زیادہ منعم حقیقی اللہ جل جلالہ کا شکریہ ادا کیا جائے کہ بدون انکی مشیت وحکم کے کچھ ہو سکتا تھا حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی نے اس قصبہ پر یہ انعام فرمایا ورنہ بظاہر اسکی کچھ امید نہ تھی اللھم ما اصبح بنا من نعمۃ اوباحد من خلقک فمنک وحدک لا شریک لک فلک الحمد ولک الشکر حاجۃ ابن احمد الابریلی قائلہ الا رضاک ۱۲ جامع) اور اس نعمت الٰہیہ کا شکریہ بہت دنوں تک کرنا چاہیئے بھول نہ جائیں اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمکو اپنی نعمتوں کے شکریہ کی توفیق دے۔ اور اداے شکر بالعمل کی بھی توفیق دے اور دخول جنت کیساتھ اتمام نعمت فرمائیں آمین وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ٥

نوٹ - اس بیان کے بعد حضرت حکیم الامۃ نے فرمایا کہ ایک فائدہ اس آیت کے متعلق اور ذہن میں تھا جو بیان ہو سکا وقت پر ذہن سے نکل گیا اگر بعد ظہر کے طبیعت اچھی رہی تو بیان کردونگا۔

---

[۱] اس امر میں عمائدین قصبہ تھانہ بھون میں سے عالیجناب منشی محمد اکبر علی صاحب پنشنر منیجر کورٹ آف وارڈس گورکھپور۔ اور جناب منشی محمد مظہر علی صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور جناب منشی انصار احمد صاحب انسپکٹر اور مولوی شبیر علی صاحب مالک اشرف المطابع تھانہ بھون خصوصیت کے ساتھ مستحق شکریہ ہیں۔
یہ حضرات عرصہ دراز سے اسمیں ساعی تھے اور ابتک بھی اسمیں برابر حصہ لے رہے ہیں۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

ستروان وعظ مسمی بہ

الترا حم فی التراجم

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی مولانی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

التراحم فی التراجم

این	متی	کم	کیف	لِم	ماذا	من بیّن	من ضبط	السامعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس ہیئت سے ہوا	کیوں بیان ہوا	کیا مضمون بیان ہوا	کس نے بیان فرمایا	کس نے ضبط کیا	تخمیناً کس قدر آدمی تھے	متفرقات
خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۱۱ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ بعد ظہر	۲ ۱/۴ گھنٹہ	جالساً علی الکرسی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۳۰ تخمیناً	[illegible]

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من
شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ
ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ
ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم **اما بعد** فقد قال
النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی دعائہ اللھم بعلمک الغیب وقدرتک علی الخلق احینی
ما علمت الحیوٰۃ خیرا لی وتوفنی اذا علمت الوفاۃ خیرا لی رواہ الترمذی وایضا قال
اللھم اذا اردت بقوم فتنۃ فتوفنی غیر مفتون ط رواہ النسائی یہ دو حدیثوں کے ٹکڑے
ہیں جنکا حاصل دعا ہی ترجمہ پہلے جزو کا یہ ہے کہ اے اللہ آپ کے علم غیب اور قدرت بر مخلوقات
کا واسطہ دیکر میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اسوقت تک زندہ رکھیے جبتک آپ کے

علم میں زندگی میرے واسطے بہتر ہو اور اُسوقت مجھے اٹھا لیجئے جب وفات میرے واسطے آپکے
علم میں بہتر ہو - اسکو ترمذی نے روایت کیا ہے اور دوسرے جزو کا ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ جب
آپ کسی جماعت کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہیں تو مجھے ایسی حالت میں اٹھا لیجئے کہ میں فتنہ سے بامن
رہوں - اسکو نسائی نے روایت کیا ہے یہ تو ترجمہ ہوا - اب مجھے اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا
مقصود ہے اور وہ مسئلہ ان احادیث کی تلاوت کے وقت ذہن میں آیا تھا کیونکہ مناجات
مقبول میں (جسکے ورد کا معمول ہے) یہ دونوں دعائیں ایک ہی حزب میں قدرے فصل سے
آئی ہیں - یہ مسئلہ پہلے بھی ذہن میں آیا تھا مگر اُس عنوان سے نہیں جس عنوان سے ان دعاؤں کی
تلاوت کے وقت آیا - اور جی چاہا کرتا ہے کہ جو مسئلہ نیا ذہن میں آئے اسکو احباب کے سامنے
بیان کر دیا جائے اور اُس کا ماخذ بھی برکت کیلئے پڑھ دیا جائے اور اسمیں اس کا تو انتظار نہیں
ہوتا کہ اُس کا فہم ماخذ سے قریب ہو ہاں اس کا انتظار ہوتا ہے کہ ماخذ کی دلالت قریب ہو - سو میرے
نزدیک اس ماخذ کی دلالت مقصود پر قریب ہے گو کسی اور کے نزدیک دوسرا ماخذ دلالت میں
قریب ہو - اور یہ مسئلہ دوسری نصوص سے بھی مستنبط ہو سکتا ہے مگر مجھے جس ماخذ سے اسکی
طرف انتقالِ ذہن ہوا ہے میں نے اُسی کو اسوقت پڑھ دیا ہے - حاصل اُس مسئلہ کا یہ ہے کہ ایک
مرض پر اسوقت متنبہ کرنا مقصود ہے کیونکہ امراض قلب پر لوگوں کو بہت کم توجہ ہے تو ان پر
تنبیہ کی ضرورت ہے خصوصاً جبکہ اسکو مرض ہی نہ سمجھا جاوے کیونکہ بعض امراض ایسے بھی ہیں جنکو
لوگ مرض نہیں سمجھتے امراض تین قسم کے ہیں ایک وہ جنکو مرض سمجھا جاوے دوسرے وہ جنکو مرض
نہ سمجھا جاوے یہ سب سے اشد ہے اور جس مرض پر میں اسوقت متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ تیسری ہی قسم
کا ہے کہ لوگ اسکو عین صحت سمجھتے ہیں اور اسمیں خواص زیادہ مبتلا ہیں - میں نے ایک بیان میں
پہلے بھی کہا ہے کہ ان امراضِ قلب میں عوام کم مبتلا ہیں خواص زیادہ مبتلا ہیں اور خواص میں بھی
سب سے زیادہ مشائخ مبتلا ہیں اسلئے مناسب یہ تھا کہ یہ بیان عوام کے مجمع میں نہ ہوتا کیونکہ اُن کے
سامنے اس کا بیان ایک امر زائد سا معلوم ہوتا ہے - مگر عوام کے سامنے اس خیال سے بیان
کر رہا ہوں کہ اول تو خواص کا خالص مجمع کہاں سے لائیں جب بیان کی اطلاع ہوتی ہے تو سبھی
لوگ جمع ہو جاتے ہیں - دوسرے عوام ہی کبھی خواص ہو سکتے ہیں بلکہ ہو جاتے ہیں پس عوام کے

ف: تعیین مقصود

ف: تقسیم امراض

ف: امراض قلب میں عوام کم مبتلا ہیں

سامنے ایسے مسائل کو بیان نکرنا ایک قسم کا کبر ہے کہ گویا اپنے کو خواص سمجھتے ہیں اور ان کو اپنے سے کم سمجھتے ہیں کسی کو کیا خبر کہ عند اللہ کون خاص ہے کون عام ہے پھر عوام کے سامنے یہ مسائل تصوف کیسے نہ بیان کئے جائیں اُنکو اللہ تعالیٰ کی عطا سے کیوں مایوس کیا جائے کہ تم خواص نہیں بن سکتے حضرت فاقہ زدہ لوگوں کو رئیس اور امیر بنتے ہوئے ہمنے خود دیکھا ہے اور ایک دفعہ میں نے ایک مجمع میں یہ کہا کہ بعض دفعہ فاقہ زدہ آدمی بادشاہ ہو گئے ہیں تو ایک صاحب نے اسکی تائید میں کہا کہ آج کل ایران کا بادشاہ ایک سائیس ہے[ف] تیمور لنگ ایک معمولی آدمی تھا مگر رفتہ رفتہ بادشاہ ہو گیا یہ تو دنیوی عروج کا حال ہے اور دینی عروج کی بھی یہ حالت ہے کہ بہت سے عامی چند روز میں بڑے ولی اور عالم بنگئے ہیں حضرت مولانا گنگوہی کے یہاں ایک شخص مسلمان ہوئے اور مسلمان ہونے کے بعد اُنکو پڑھنے کا شوق ہوا تو جسوقت وہ قاعدہ پڑھنے بیٹھے اُسوقت الف کو الیپ کہتے تھے کون سمجھتا تھا کہ یہ الف کو الیپ کہنے والا کسی وقت عالم بھی ہو جائے گا مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ بعد میں وہ ایسے کامل ہوئے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ کے سامنے حدیث کا دورہ پڑھاتے تھے۔ خیر جاہل کا عالم ہو جانا تو نادر ہے مگر جاہل کا ولی ہو جانا کثیر الوقوع ہے اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اول تو خواص کا مجمع کرنا دشوار ہے دوسرا اسکی ضرورت ہی نہیں کہ عوام سے ان مسائل کو مخفی رکھا جائے کیونکہ اُن کا خواص بنجانا کیا دشوار ہے تو اسوقت یہ مسائل اُن کے کام آئیں گے ہاں دقیق مسائل کو مخفی رکھا جائیگا کیونکہ وہ اُنکی سمجھ سے باہر ہیں مگر یہ مسئلہ دقیق نہیں ہے۔ اور اگر اسکے ضمن میں کوئی بات دقیق آجائے تو عوام اُسمیں غور نکریں کیونکہ بعض دفعہ سہل بات کے بیان کرنے میں بھی کسی مناسبت سے دقیق مضمون آجاتا ہے تو ایسے مضمون میں جو سمجھ میں نہ آئے۔ عوام خود ہی غور نکریں اور اسکی ضرورت اُنکو ہے جو سمجھنے اور غور کرنے کیلئے بیان میں شریک ہوتے ہیں اور بعض عوام تو سننے کیلئے آتے بھی نہیں ویسے ہی دل بہلانے کو بیٹھ جاتے ہیں اُنہیں نہ دقیق مضمون سے بحث ہے نہ سہل سے مگر محروم یہ بھی نہیں بلکہ انکو بھی مجمع صلحاء کی برکت حاصل ہو جاتی ہے جب حق تعالیٰ کے پاس

[ف] اور اس بیان کے بعد اخبارات سے معلوم ہوا کہ تخت کابل پر آج کل بچہ سقہ بادشاہ بنا ہوا ہے جو نہایت معمولی درجہ کا آدمی ہے ۱۲ ظ۔

ف: فاقہ زدہ بعض دفعہ بادشاہ ہو گئے ہیں

ف: ایک راجپوت نو مسلم کی حکایت

۳۴

ف: بعض عوام وعظ میں اسلئے آتے ہیں کہ ان کو وعظ سے محبت ہے

فرشتے جاکر اس مجمع ذکر کا تذکرہ کرینگے کہ الٰہی آپ کے بندے ایک جگہ جمع ہوکر آپکا اور آپکے احکام کا تذکرہ کر رہے ہیں تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں اشھدکم انی قد غفرت لھم گواہ رہو میں نے سبکو بخشدیا اسپر بعض ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ الٰہی فلاں شخص تو ذکر کی نیت سے نہ آیا تھا ویسے ہی آکر بیٹھ گیا تھا۔ ارشاد ہوگا میں نے اسکو بھی بخشدیا اولئک قوم لا یشقی جلیسھم یہ ایسے لوگ ہیں کہ اُن کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں جاتا۔

ف: افراط شفقت بھی مرض ہے

اب اس مسئلہ کو سننا چاہئے۔ سو وہ مسئلہ یہ ہے کہ آجکل مشائخ میں ایک مرض افراط شفقت ہے آپ کو سنتے ہی معلوم ہوگیا ہوگا کہ اسکو کون مرض سمجھتا ہے شفقت کی کمی کو تو مرض سمجھا جاتا ہے اور یہ تفریط شفقت عوام میں زیادہ ہے کیونکہ عوام میں خود غرضی زیادہ ہے اُن کو اپنی غرض مطلوب ہوتی ہے اسلئے دوسروں پر شفقت نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص سو رہا ہے اور نماز کا وقت ہے تو عوام اسکو جگاتے نہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نماز پڑھے گا تو اپنے واسطے نہیں پڑھے گا تو اپنا نقصان کریگا اور خواص میں شفقت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے جو صفت محمودہ ہے۔ مگر بعض کی شفقت افراط کے درجہ کو پہونچ جاتی ہے اور یہ مرض ہے مگر عام طور پر اسکو مرض نہیں سمجھا جاتا بلکہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ صفات محمودہ میں جسقدر بھی زیادت ہو محمود ہی ہے حالانکہ یہ غلط ہے شریعت نے صفات محمودہ کیلئے بھی حدود مقرر کی ہیں اُن حدود سے تجاوز محمود نہیں بلکہ مذموم ہے چنانچہ افراط شفقت کا مذموم ہونا آپ کو ایک واقعہ سے معلوم ہوگا

ف: صفات محمودہ کیلئے بھی حدود ہیں جن سے تجاوز مذموم ہے

ف: افراط شفقت کے مذموم ہونیکی تائید واقعہ سے

کانپور میں ایک مولوی صاحب ایک رئیس کے یہاں مہمان ہوئے وہ رئیس نماز ایسی ہی گنڈے دار پڑھتے تھے اور جماعت و وقت کے تو بہت کم پابند تھے صبح کی نماز اکثر طلوع شمس کے قریب یا اسکے بعد پڑھتے تھے۔ اُن مہمان مولوی صاحب نے یہ حالت دیکھکر انکو نصیحت اور تنبیہ شروع کی ہر وقت نماز کیلئے انکو ٹوکتے اور صبح کی نماز کیلئے اول ہی وقت سے جگا دیتے اور جب وہ اُٹھنے میں سستی کرتے تو سخت سخت الفاظ کہتے کہ گدھے سے پڑے سو رہے ہیں اتنی لمبی رات میں بھی نیند نہیں بھرتی بس کھا لیا ہگ لیا اور سو رہے اسکے سوا کچھ کام نہیں ایک دو روز تو رئیس نے صبر کیا کیونکہ نماز کیلئے نصیحت کرنا ہر مسلمان کو گوارا ہے جس سے نماز کیلئے کہو گے کبھی انکار نکریگا مگر سختی بعض دفعہ گراں گذرتی ہے چنانچہ ایک دن جو مولوی صاحب نے سخت الفاظ

استعمال کئے تو رئیس کو غصہ آگیا اور کہا جاؤ ہم نماز نہیں پڑھتے تمھاری نماز تمکو بخشوا ئے گی ہماری ہمکو بخشوائے گی چلو ہم جہنمی ہی سہی اور اسکے بعد نوکروں سے کہا کہ اس مولوی کو باہر نکالدو (گو اس رئیس نے بہت سخت الفاظ کہے مگر وہ اس سے کافر نہیں ہوا کیونکہ مقصود فرضیت صلوٰۃ سے انکار نہ تھا بلکہ مطلب یہ تھا کہ تمھارے کہنے سے نماز نہیں پڑہونگا اور یہ سخت الفاظ انکی زبان سے مولوی صاحب کی سخت کلامی کیوجہ سے نکلے تو جیسے رئیس کو گناہ ہوا اسی طرح مولوی صاحب کو بھی گناہ ہوا کہ انھوں نے امر بالمعروف میں سیاست وتدبر کا لحاظ نہیں کیا حالانکہ امر بالمعروف میں اسکی بہت ضرورت ہی یونہی ڈھیلا سا ماردینا جائز نہیں اور اُس شخص کو بھی امر بالمعروف زیبا نہیں جو نصیحت کے وقت اپنے کو مخاطب سے افضل سمجھتا ہو اور ایسے ہی شخص کی نصیحت مخاطب پر گراں ہوتی ہے اور جو ناصح اپنے کو سب سے کمتر سمجھتا ہو اُسکی نصیحت ناگوار نہیں ہوتی کیونکہ وہ سختی کے ساتھ نصیحت نہیں کرتا اور اگر سختی کرتا بھی ہے تو موقع اور حال کا لحاظ کرکے سختی کرتا ہے) بعد میں وہ رئیس اپنے احباب سے کہتے تھے کہ اس منحوس کلمہ کا (کہ جاؤ ہم نماز نہیں پڑھتے) یہ اثر ہوا کہ اسکے بعد سے اب تک مجھے نماز کی توفیق نہیں ہوئی حالانکہ اس سے پہلے ادا یا قضا جماعت سے یا بے جماعت پڑھ لیا کرتا تھا۔ تو ان مولوی صاحب میں یہی مرض تھا یعنی افراط شفقت جسکا یہ انجام ہوا کہ کتنے سال تک دوسرے شخص کو نماز سے محروم کردیا۔ اسلئے میں کہتا ہوں کہ افراط شفقت بھی مرض ہے۔ اور یہ مرض بعض مشائخ میں زیادہ ہی کیونکہ مشائخ تین قسم کے ہیں ایک وہ جنکی طبیعت میں اعتدال ہے نہ افراط شفقت ہے نہ آزادی ہے یہ تو اعلیٰ درجہ ہے اور بہت محمود ہے۔ دوسرے وہ جنمیں آزادی غالب ہے تیسرے وہ جنمیں شفقت غالب ہی۔ یہ دونوں درجے بھی محمود ہیں اگر غلبہ حد سے متجاوز نہو مثلاً آزادی کا غلبہ اسدرجہ نہو کہ دوسروں کے نقصان کا سبب بنجائے اسی طرح شفقت کا غلبہ اسقدر نہو کہ اپنا نقصان کرلے اگر غلبہ شفقت سے اپنا نقصان نہو تو مضر نہیں اور نہ یہ مرض ہے۔ ہاں اگر اپنا نقصان ہونے لگے تو مضر ہے اور اب اسکو مرض کہا جائیگا میں اسوقت اسی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں بعض مشائخ وعلماء کی حالت یہ ہی کہ غلبہ شفقت میں ہر شخص کے کام میں گھس جاتے ہیں ہر معاملہ میں مشورہ بھی دیتے ہیں اور ہر شخص کی خدمت کو تیار ہوجاتے ہیں اور اس سے وہ اپنا نقصان کرلیتے ہیں کہ نہ معمولات کا انضباط رہتا ہے نہ کسی وقت یکسوئی حاصل ہوتی

یہ مرض افراط شفقت مشائخ میں زیادہ ہے۔

نہ کوئی وقت تنہائی کا انکو ملتا ہے ہر وقت مجلس جمائے بیٹھے رہتے ہیں اور دوسروں کی دنیا سنوارنے میں اپنا دین برباد کر دیتے ہیں یہ حالت قابل اصلاح ہے مگر آج کل مشائخ اسکو عین طاعت سمجھتے ہیں ہمارے ماموں صاحب جنپر آزادی غالب تھی مگر باتیں حکیمانہ فرماتے تھے تو انکی کوئی بات حکمت کی ہو تو اسکے بیان کرنے میں کیا حرج ہے وہ مجھسے فرماتے تھے کہ دوسروں کی جوتیوں کی حفاظت میں اپنی پونجی کو برباد نکر دینا جیسے بنارس کی حکایت سنی ہے کہ وہاں نہان کے موقع پر ایک رئیس نے اپنے ملازم کو سامان کے پاس بٹھلا دیا اور خود نہانے چلا گیا سامان بہت قیمتی تھا اور نقد روپیہ بھی ساتھ تھا چوروں نے دیکھ لیا اور کوشش کی کہ کسی طرح ملازم یہاں سے اٹھے تو سامان پر قبضہ کریں تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ پیتل کی اشرفیاں جیب میں بھر کر اس ملازم کے سامنے سے زمین پر گراتے ہوئے گذرے ملازم یہ سمجھا کہ سونے کی اشرفیاں ہیں اور بیخبری میں جیب کے پھٹ جانیسے گر رہی ہیں وہ حرص میں سامان کے پاس سے اٹھا کر قریب ہوں ہی آور اشرفیاں جمع کرنے لگا چوروں کی ایک جماعت جو اسی انتظار میں لگی ہوئی تھی آئی اور رئیس کا سامان اٹھا کر چلتی ہوئی تو جیسے اس شخص نے پیتل کی اشرفیوں کیلئے قیمتی سامان کو برباد کیا اسی طرح بعض مشائخ غلطی کرتے ہیں۔ بہرحال ہمارے ماموں صاحب کا یہ ارشاد تھا اور واقعی سچی بات تھی مگر مشائخ آجکل اس مرض میں زیادہ مبتلا ہیں اور اس کا نام ایثار رکھا ہے اور ایثار کی اسلام میں بہت تعلیم کیگئی ہے اور اسکی صفت محمودہ ہونے میں کچھ شک نہیں مگر گفتگو تو اسی میں ہے کہ آپکا یہ فعل ایثار میں داخل ہے یا نہیں اور داخل ہے تو حدود سے تو باہر نہیں۔ **ایثار** کے متعلق علماء ظاہر کا قول تو یہ ہے کہ قربات میں ایثار جائز نہیں مگر صوفیہ نے ایثار فی القرب کو بھی جائز کہا ہے جیسے صف اول میں کسی عالم یا شیخ کو اپنی جگہ بڑھا دینا اور خود پیچھے ہٹ آنا صوفیہ کے نزدیک جائز ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اسمیں ترک قربت نہیں ہے بلکہ قربت ادنیٰ کو قربت اعلیٰ کے طلب میں ترک کرنا ہے۔ کیونکہ احترام مسلم متقی تقدم فی الصف

ف: دوسروں کی جوتیوں کی حفاظت میں اپنی پونجی برباد کرنا، اسکی ایک حکایت،

ف: ایثار محمود ہے بشرطیکہ حدود شرعی سے تجاوز نہ ہو،

ف: ایثار فی القرب کی تحقیق ×

عہ قلت بل التقدم فی الصف الاول حق الاتقیاء واہل الورع لقولہ صلے اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولو الاحلام والنہی (وہم العلماء الاتقیاء ورثۃ الانبیاء) ولذا کان آخر بعض الصحابۃ عن الصف الاول رجلا وقام مکانہ والاثر مذکور فی الاعلاء ثم قال لہ لا تجد علی فی تلک فان النبی صلے اللہ علیہ وسلم امرنا ان تکون فی الصف الاول اقلیس فی کل تاخر العامی عن الصف الاول لاقامۃ العالم المتقی فیہ ایثار بل فیہ عمل بامرہ الشارع بہ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ

الاول سے اعلیٰ قربت ہے اور در اصل یہ ایثار نہیں کیونکہ اس نے دوسرے کیلئے اپنے نفع کو فوت نہیں کیا بلکہ اپنے نفع کو حاصل کیا۔ اور منشا اس مرض کا جو آجکل مشائخ میں پایا جاتا ہے ایک مسئلہ ہے جو علماء و مشائخ میں مشہور ہے کہ نفع متعدی مطلقاً نفع لازمی سے افضل ہے یہ مسئلہ ہی علی الاطلاق غلط ہے یعنی لوگوں نے اسکی حقیقت غلط سمجھی ہے در اصل نفع لازمی ہی افضل ہے۔ اور نفع متعدی میں فضیلت اسلئے ہے کہ اسمیں نفع لازمی بھی ہے اور متعدی بھی دونوں کا مجموعہ ملکر نفع لازم مجرد سے افضل ہو گیا جیسا ایک چیستان فقہی ہے کہ ای سنۃ افضل من الواجب کہ وہ سنت کونسی ہے جو واجب سے افضل ہے اسکے جواب میں چند صورتیں بیان کیجاتی ہیں منجملہ اُن کے بداءۃ بالسلام ہے کہ ابتداء سلام کرنا سنت ہے اور سلام کا جواب دینا فرض ہے مگر بدارت بالسلام افضل ہے تو اُسکی بھی یہی وجہ ہے کہ واجب میں یعنی جواب سلام میں تو ایک ہی عبادت ہے یعنی تطییب قلب مسلم (اور جواب فرض اسلئے ہے کہ جواب نہ دینے میں مسلمان کی دلشکنی ہے اور عداوت پیدا ہونیکا اندیشہ ہے) اور بدارت بالسلام میں دو عبادتیں ہیں تطییب قلب مسلم بھی اور تقدم فی الخیر بھی ہے اس مجموعہ کی وجہ سے وہ افضل ہو گیا دوسرے یہ کہ نفع متعدی کی فضیلت جو کچھ ہے وہ اعمال لازمہ ہی کی بدولت تو ہے کہ دوسرے لوگ اسکے کہنے سے عمل نیک کرینگے، اگر دوسرے کیلئے وہ عمل نیک نہو تو کچھ فضیلت نہیں ہاں اگر وہ عمل اس کے لئے نیک ہو تو فضیلت ہے۔ دوسرے نفع متعدی اسوقت کامل نافع ہے جبکہ یہ خود بھی اسکے مقتضی پر عمل کرے۔ پس واعظ خود عامل ہوا تو وہاں دو امر مجتمع ہوئے ایک وعظ ایک نفع لازم اور اگر واعظ خود عامل نہو تو اسکی فضیلت سامعین عاملین پر کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ حدیث میں ایسے واعظ پر وعید ہے حدیث میں ہے کہ ایک شخص جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتا ہوا گھومے گا اور اسکی بدبو سے جہنم والے تنگ آجائیں گے تو وہ کہیں گے ارے فلانے تیرا یہ کیا حال ہے تو تو ہمکو امر و نہی کیا کرتا تھا وہ کہے گا ہاں لیکن میں تمکو نیک کام کا امر کرتا تھا اور خود عمل نہیں کرتا تھا اور تمکو گناہوں سے منع کرتا تھا اور خود نہیں بچتا تھا پس معلوم ہوا کہ نفع لازم ہی اصل ہے۔ ورنہ اگر کوئی شخص نماز کی ترغیب دیتا ہوا اور خود نہ پڑھتا ہو اسکی فضیلت کافی نہیں بلکہ محل وعید ہے یوں خلافِ قاعدہ مغفرت ہو جائے تو اور بات ہے باقی قانون

ف: نفع متعدی نفع لازمی سے افضل نہیں جبکہ نفع متعدی نفع لازم سے خالی ہو اور اگر مقارن ہو تو مجموعہ افضل ہوا نہ صرف نفع متعدی۔

ف: بعض سنن کو جو واجب سے افضل کہا گیا ہے تو اسکی وجہ یہی ہے کہ سنت واجب پر مشتمل ہے تو مجموعہ افضل ہوا۔

ف: دوسرے کیلئے امر بالمعروف ... عمل نیک نہو تو نفع متعدی لازم سے افضل نہو گا۔

ف: اگر واعظ خود بھی عامل ہے تو نفع لازم و متعدی مجتمع ہیں اسلئے فضیلت ہے اور عامل نہیں تو وہ فضیلت نہیں۔

ف: عالم بے عمل محل وعید ہے۔

نہیں ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ علماء ظاہر نے ایثار فی القرب کو منع کیا ہے مگر صوفیہ نے اسکو جائز کیا ہے اور انھوں نے اسکی حقیقت سمجھی ہے کہ اسمیں ترک قربت نہیں بلکہ ایک اعلیٰ قربت حاصل کرنے کیلئے ادنیٰ کو ترک کیا جاتا ہے مگر علماء ظاہر نے حقیقت تو سمجھی نہیں خواہ مخواہ صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں بات یہ ہے کہ حضرات صوفیہ حقائق کو اہل ظاہر سے زیادہ سمجھتے ہیں چنانچہ ایک حدیث میں ہے ان احدکم فی الصلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ کہ جو شخص ایک نماز پڑھکر دوسری نماز کے انتظار میں مصلے پر بیٹھا رہے یا مسجد میں سویرے سے نماز کیلئے آجائے تو وہ جب تک بیٹھا رہیگا اسوقت تک اسکے نامہ اعمال میں نماز کا ثواب لکھا جائیگا۔ اب اگر کوئی شیخ اسکو دوسرے کام میں لگادے اور یہ کہے کہ تم نماز کے بعد بجائے مصلے پر بیٹھنے کے گوشہ میں جاکر ذکر و شغل کیا کرو تو وہ محل ملامت نہیں گو اہل ظاہر اعتراض کرینگے کہ شیخ نے افضل کو چھڑا کر مفضول میں لگایا اور سنت کے خلاف عمل بتلایا مگر صوفیہ کہتے ہیں کہ اس شخص کو عمل افضل کا ثواب تو جب ہی حاصل ہوگا جبکہ اسکو انتظار صلوٰۃ بھی حاصل ہو اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسکو انتظار صلوٰۃ کی حقیقت حاصل نہیں بلکہ اسپر ایک جگہ بیٹھا رہنا گراں ہے اور یہ اس حالت میں یا تو دنیا کی باتیں کرتا ہے یا گندے وساوس میں مبتلا رہتا ہے تو اسکے لئے اسوقت انتظار صلوٰۃ افضل نہیں بلکہ اسکو پہلے انتظار صلوٰۃ کی حقیقت حاصل کرنا چاہئے۔ اسی طرح ایک شخص نماز کی کثرت کرتا ہے اسکو شیخ نے بجائے تکثیر صلوٰۃ کے تکثیر ذکر میں مشغول کردیا وہ بھی محل ملامت نہیں گو نماز سے افضل کوئی عبادت نہیں اسپر اگر کوئی عامی اعتراض کرے تو جو کامل پر اعتراض کرے وہ عامی ہی ہے تو یہ اسکی غلطی ہے کیونکہ جسکے لئے تکثیر ذکر شیخ نے تجویز کیا ہے وہ ابھی تکثیر صلوٰۃ کے قابل نہیں اور اگر پڑھے گا بھی تو اسکی نماز ناقص ہوگی کیونکہ نماز بدون یکسوئی کے کامل نہیں ہوتی اور یکسوئی تکثیر نوافل سے آجکل حاصل نہیں ہوتی کیونکہ نماز میں متفرق افعال ہیں جن سے مبتدی کو تشتت ہوتا ہے اور ذکر میں ایک ہی چیز ہے اسمیں مبتدی کو جلدی یکسوئی حاصل ہوجاتی ہے پھر بعد میں خود اسکے لئے بھی تکثیر نوافل ہی بجائے تکثیر ذکر تجویز کیا جائیگا ؎

(ایک مصرع یاد نہیں آتا) خلوت و چلہ بر و لازم نماند

پس صوفیہ تکثیر ذکر کی تعلیم کرکے اس شخص کو تکثیر صلوٰۃ کے قابل بنانا چاہتے ہیں۔ مگر تکثیر

صوفیہ حقائق کو اہل ظاہر سے زیادہ سمجھتے ہیں اور اسکی مثال کی توضیح

ذکر کچھ عرصہ تک کہ خود اپنی رائے سے تکثیر نوافل اختیار نکر لینا بلکہ اسکو بھی شیخ سے پوچھو گو تم کیسے
ہی یکسوئی والے اور کیسے ہی صاحب نسبت ہو گئے ہو کیونکہ جس کا باپ زندہ ہو اُسے اپنے کو بیٹا
ہی سمجھنا چاہئے گو وہ دوسروں کا باپ بھی ہو جائے سعادتمند ہے وہ شخص جو ڈاڑھی مونچھ والا
ہو کر بھی عید کے دن باپ سے عیدی مانگتا ہے خصوصاً طریق باطن میں اسکی ضرورت زیادہ ہے
کیونکہ اس طریق میں اگر کوئی شیخ سے مستغنی بنجائے تو یہ اسیوقت سے چھوٹا ہونا شروع ہو جائیگا
ظاہری باپ سے اگر کوئی مستغنی اور بے نیاز ہو جائے تو اسکی عمر گھٹنا شروع نہیں ہوتی کہ وہ بجائے
چالیس سال کے بیس سال کا ہو جائے بلکہ جتنی عمر ہوگی وہی رہے گی اور طریق باطن میں جسدن
مرید نے اپنے کو شیخ سے مستغنی سمجھنا شروع کیا اُسی وقت سے گھٹنا شروع ہو جاتا ہے غرض تمکو
اگر تکثیر ذکر بتلایا گیا ہو تو یکسوئی حاصل ہو جانیکے بعد خود تکثیر صلوٰۃ اپنے لئے تجویز نکرو بلکہ شیخ سے
پوچھو مگر مسئلہ یہی ہے کہ انتہا میں بجائے ذکر و شغل کے تکثیر نوافل و کثرتِ تلاوت ہی رہ جاتا ہے
جبکہ یہ شخص کامل نماز کا اہل ہو جائے اور کمالِ نماز کا مدار جمعیت قلب پر ہے صوفیہ کرام اصل
میں اسی کو دیکھتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں ؎ چو ہر ساعت از تو بجای رود دل + بہ تنہائی اندر
صفائی نہ بینی + ورت مال و زر ہست و زرع و تجارت + چو دل با خدا ایست خلوت نشینی +
صاحب جب دل میں تشتت ہے تو خلوت و اجتماعِ وقت کافی نہیں اور اگر ظاہر میں باغ
اور کھیت میں لگا ہوا ہے مگر دل خدا سے لگا ہوا ہے تو یہ شخص ہر کام میں صاحب خلوت ہے ؎

گر با ہمہ چو بے منی بے ہمہ　　　ور بے ہمہ چو با منی با ہمہ

حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کو جمعیت قلب کا بڑا اہتمام تھا بعض لوگ حضرت سے
بارہ تسبیح کی نشست دریافت کرتے کیونکہ اسمیں ایک خاص نشست بزرگوں نے لکھی ہے
مگر نسخہ کتابی اور ہے اور عملدرآمد اور ہے تو حضرت فرماتے کہ جس طرح یکسوئی حاصل ہو اُسی طرح بیٹھ
جایا کرو اور کوئی ذکر خفی و ذکر جہر کو پوچھتا تو فرماتے جسمیں زیادہ جی لگے وہ اختیار کرو۔ صاحبو آپ
صوفیہ پر کیا اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ یکسوئی کی قید کہاں سے نکالی کبھی آپنے اطباء پر
اعتراض نکیا کہ وہ مسہل میں صحبت نیک اور اچھی باتیں کرنیسے بھی منع کرتے ہیں اور دستوں کے تصور
کو لازم کہتے ہیں جب دست بدون یکسوئی کے نہیں ہوتا تو پا یعنی قدم الی الطریق بدون اسکے

ف تکثیر ذکر کے بعد شیخ سے مشورہ کرو کہ اب تکثیر صلوٰۃ شروع کرو یا نہیں۔

ف جس کا باپ زندہ ہو وہ اپنے کو بیٹا ہی سمجھے

ف جو اپنے کو شیخ سے مستغنی سمجھنے لگتا ہے اسیوقت سے گھٹتا ہے۔

ف صوفیہ کرام جمعیت قلب کو دیکھتے ہیں اسی کا اہتمام کرتے ہیں۔

ف حضرت حاجی صاحب کا اہتمام جمعیت قلب

ف یکسوئی کی ضرورت ہر مسہل میں ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔

ایسے حاصل ہوگا۔ جیسے اطباء نے تجربہ کیا ہے کہ مسہل بدون یکسوئی کے مؤثر نہیں ہوتا ایسے ہی حضرات صوفیہ نے بھی تجربہ کیا ہے کہ اصلاح قلب بدون تمام علائق قطع کرنے کے نہیں ہوسکتی اور قطع تعلقات سے مراد تعلقات کی تقلیل ہے اور وہ بھی غیر ضروری تعلقات کی ضروری تعلقات کی تقلیل مراد نہیں۔ اور ضروری وہ ہے جسکے ترک سے ضرر ہو خواہ دین میں یا دنیا میں یہ رحمت ہے حق تعالیٰ کی کہ ضروریات میں تقلیل نہیں کی گئی اور اس سے بڑھکر رحمت یہ ہے کہ ضروریات کی تکثیر مضر بھی نہیں اسکو صوفیہ نے سمجھا ہے اور مشاہدہ بھی کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک کنجڑا صبح سے شام تک لیلوا مرود کی صدا لگاتا پھرے تو رائی برابر بھی ضرر نہ ہوگا نہ نور قلب میں کمی آئیگی کیونکہ یہ ضرورت کی وجہ سے ہی اور اگر ایک دفعہ بھی بے ضرورت کلام کیا تو سارا نور قلب برباد ہوجائیگا چنانچہ ایک بزرگ اپنے دوست کے مکان پر گئے اور آواز دی تو اندر سے جواب آیا کہ ہیں نہیں اسپر ان بزرگ کی زبان سے یہ نکل گیا کہ کہاں ہیں معلوم ہوا پھر تیس برس تک اسپر روئے کہ میں نے یہ سوال کیوں کیا مولانا فرماتے ہیں ؎ [1]

بر دلِ سالک ہزاران غم بود　　گر ز باغ دل خلالے کم بود

پس معلوم ہوا کہ غیر ضروری تعلقات مضر ہیں ضروری تعلقات مضر نہیں رہا یہ کہ پھر یوں کیوں کہا جاتا ہے کہ تمام علائق کو قطع کرو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر ضروری میں تقلیل سے مجموعہ میں تقلیل ہوجاتی ہے تو گویا تمام ہی تعلقات میں تقلیل ہوگئی اور یہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ قطع اور ترک تعلقات سے مراد تقلیل ہے حقیقی قطع مراد نہیں۔ اب میں مقصود کو بیان کرتا ہوں کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ اس طریق میں بڑی دولت یکسوئی ہے۔ اور یکسوئی بدون تقلیل تعلقات کے حاصل نہیں ہوتی بلکہ تکثیر تعلقات سے یکسوئی برباد ہوجاتی ہے تو اب جو لوگ غلبۂ شفقت کی وجہ سے مخلوق کے ہر کام میں گھس جاتے ہیں اور اپنی یکسوئی اور جمعیت قلب کو برباد کرتے ہیں وہ مریض ہیں انکو اپنی اصلاح کرنا چاہیئے اور یہ تو وہ لوگ ہیں جو غلبۂ شفقت کی وجہ سے دوسروں کے کاموں میں

[حاشیہ:] ف قطع علائق سے مراد علائق غیر ضروریہ کی تقلیل ہے۔ ف تعلقات ضروریہ کی کثرت مضر نہیں۔ ف بے ضرورت ایک کلمہ بھی مضر ہے اسپر ایک حکایت۔

[1] قلت ولی فی صحۃ ہذہ الحکایۃ نظر وان صحت فھی داخلۃ فی مثل التعریف بالحخطۃ فان مثل ہذا السوال وان کان نادرا فلیس بمعصیۃ بل من المباحات وغایۃ ان یکون خلاف ماینبغی وخلاف الاولی والبکاء الی مثل تلک المدۃ الطویلۃ علی مثل ہذا الامر لعلہ من الغلو والافراط فی التقوی واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظفر ویقال ان یحملھا علی غلبۃ الحال فلا اشکال ۱۲

گھستے ہیں مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ حالت تو یہ ہے کہ بعض لوگ تعلقات غیر ضروریہ کو اسلئے اختیار کرتے ہیں کہ انکو اس میں حظ آتا ہے اُن کا جی چاہتا ہے کہ یہ کام بھی کرلیں وہ بھی کرلیں مگر اس کا نام ایثار و خدمت خلق رکھ لیا ہے اُن کے نفس نے یہ عنوان تجویز کر کے اپنی خواہش پورا کرنیکے لیئے ایک بہانہ ڈھونڈھ لیا ہے (میں نے پہلے بھی ایک بیان میں کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ بعض لوگ عمل تو اختیار کرتے ہیں اپنی ہوائے نفس سے پھر اُسکی تائید میں کوئی حدیث یا قرآن کی آیت تلاش کر لیتے ہیں سو اس کا نام اتباع سنت نہیں۔ بلکہ اتباع سنت اس کا نام ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل غالب کا اتباع کیا جائے پھر عمل غالب کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو دو قوعاً کثیر ہو دوسرا وہ جو مقصوداً اکثیر ہو گو عملاً قلیل ہو جیسے تراویح کی نماز کہ گو عملاً سوائے چند راتوں کے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنا ثابت نہیں مگر احادیث کے اندر غور کرنیسے یہ بات ثابت ہے کہ آپنے عذر کی وجہ سے اسپر مواظبت نہیں فرمائی لیکن مواظبت آپکو مطلوب ضرور تھی چنانچہ صحابہ نے آپ کے مطلوب کو سمجھا اور بعد میں سب نے اسپر مواظبت کی۔ اور اس بات کو فقیہ سمجھ سکتا ہے کہ کہاں وقوعاً عمل غالب ہے اور کہاں مقصوداً اور صوفیہ بھی فقیہ ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ صوفیہ ہی فقیہ ہیں بشرطیکہ علوم باطنہ کے ساتھ علوم ظاہرہ کے بھی جامع ہوں۔ مگر آجکل عام طور سے علماء و مشائخ نے یہ طرز اختیار کیا ہے کہ عمل تو اختیار کرتے ہیں اپنی طبیعت کے تقاضے سے اور نفس کی خواہش سے پھر اپنے فعل کے استحسان کیلیئے کوئی حدیث کتابوں میں سے تلاش کر کے یاد کر لیتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے متعلق سعدی فرماتے ہیں ؎

زسنت نہ بینی درایشان اثر	مگر خواب پیشیں و نان سحر

کہ یہ لوگ سحری تو کھاتے ہیں جی چاہنے کی وجہ سے اور فضیلت سحور کی حدیث یاد کر کے اسکو بہانہ بنا لیا ہے۔ اس اتباع سنت کی ایسی مثال ہے جیسے مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کی حکایت بیان فرمائی تھی کہ اُس نے کسی عورت سے زنا کیا اور اُسکو حمل رہ گیا تو کسی نے ملامت کے طور پر کہا کہ کمبخت تو نے عزل ہی کر لیا ہوتا جو یہ بدنامی تو نہوتی کہا ہاں خیال تو ہوا تھا کہ عزل کر لوں مگر میں نے فقہاء سے سنا تھا کہ عزل کرنا مکروہ ہے اسلئے نہ کیا +

ف بعض لوگ تعلقات غیر ضروریہ محض حظ نفس کیلئے اختیار کرتے ہیں

ف اتباع سنت یہ نہیں کہ عمل خود تجویز کیا ہوائے نفس سے اور دلیل میں ایک حدیث یا آیت پڑھ دی بلکہ حضور کی عادت غالبہ کا نام اتباع سنت ہے

ف مواظبت کبھی عملی ہوتی ہے کبھی قصدی

ف صوفیہ ہی فقیہ ہیں اگر جامع ہوں۔

کوئی اس سے پوچھے کہ کیا فقہا نے زنا کو تیرے واسطے جائز کر دیا تھا؟ حرام کا ارتکاب اور مکروہ سے اجتناب یہ تو وہی مثل ہوئی گڑ کھاویں اور گلگلوں سے پرہیز غرض تعلقات غیر ضروریہ کی تقلیل لازم ہے بدون اسکے اس طریق میں نفع نہیں ہوتا۔ مبتدی کو تو اسکی ضرورت ہے ہی منتہی کو بھی ضرورت ہے کہ اس کا کوئی وقت خلوت و یکسوئی کا ضرور ہو اور دل تعلقات سے خالی ہو۔ مگر بعض لوگ تعلقات غیر ضروریہ کو خواہ وہ اپنے ہوں یا دوسروں کے اسلئے اختیار کرتے ہیں کہ انمیں انکو حظ نفس ہے خود انمیں مزا آتا ہے مگر ایثار و خدمت خلق کا بہانہ ڈھونڈھ لیا ہے کہ انمیں دوسروں کو نفع پہونچانا ہے ایثار ہے اور خدمت خلق ہے وغیرہ وغیرہ اور اسکے متعلق کچھ واقعات نبویہ اور کچھ واقعات صحابہ اور واقعات اولیا بھی یاد کر لئے ہیں اور دل میں خوش ہیں کہ ہم بھی اتباع سنت و اتباع سلف کر رہے ہیں مگر اسکو بصر شیخ ہی ادراک کرتا ہے کہ تمھارے اس فعل کا منشا کیا ہے۔ وہ تمھاری صورت سے پہچان لیتا ہے کہ تم جلسوں میں اسلئے شریک ہوتے ہو کہ حظ نفس ہے وعظ اسلئے کہتے ہو کہ اس سے دل خوش ہوتا ہے تمھارا دل تعلقات ماسوی اللہ میں پھنسا ہوا ہے یکسوئی سے کورا ہے۔ خدا کے ساتھ تعلق بہت کم ہے اسی لئے ایسے شخص کو نماز پڑھنے میں حظ نہیں آتا ہاں وعظ جتنا چاہو کہلوا لو انمیں بہت حظ آتا ہے جلسوں میں جتنا چاہو بلا لو فوراً تیار ہو جائیں گے اور اسکے متعلق کچھ احادیث یاد کرکے اپنے جی میں خوش ہیں اور وعظ کہتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ میرے سامنے سب جاہل ہیں اور دل ہی دل میں کہ رہے ہیں کہ آج بڑا اچھا بیان ہوا یہ حالت دل کے تباہ ہونے کی علامت ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

منصب تعلیم نوع شہوتیست ... ہر خیالے شہوتے در رہ بتے است

پھر بعض دفعہ یہ لوگ اپنی تعظیم سے بھی منع کرتے ہیں مگر انمیں بھی نفس کا ایک کید ہوتا ہے جسکا کبھی مجھے اپنے اوپر بھی شبہ ہو جاتا ہے مگر میں اپنے کو متہم نہیں کرتا صرف شبہ ہی ہوتا ہے کہ یہ انکار عن الخدمت آیا اسلئے ہو کہ اپنے کو ناقابل خدمت سمجھتے ہیں یا اسلئے ہو کہ دوسرے کو اتنا حقیر سمجھا جاتا ہے کہ اسکو اپنی خدمت کے قابل نہیں سمجھتے۔ اور جس کام میں حظ نفس ہو وہ خلاص سے خالی ہے اور بجائے ثواب کے اسمیں گناہ کا اندیشہ ہے۔ بزرگوں نے اس حظ نفس کا معالجہ

مجاہدات سے کیا ہے چنانچہ ایک بزرگ کسی شہر میں وارد ہوئے اور وہاں انکی بہت تعظیم ہوئی تو دیکھا کہ نفس میں کچھ عجب کے آثار آنے لگے ہیں انھوں نے اس کا یوں علاج کیا کہ ایک روز نا شناسا حمام میں گئے اور ایک شاہزادے کا قبا چرالیا اور چرا کر وہیں ایک طرف کھڑے ہو گئے (کیونکہ سرقہ کا تو قصد تھا ہی نہیں بلکہ نفس کی بڑائی توڑنیکا قصد تھا) جب شاہزادے نے قبا کو غائب پایا تلاش کرنیکا حکم دیا ان بزرگ کے پاس سے ملا تو انکی خوب درگت ہوئی۔ اسی طرح مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری نے ایک بار وعظ فرمایا وعظ کے بعد یہ اندیشہ ہوا کہ لوگ ہاتھ چومیں گے تو آپنے فوراً ہی ایک ساتھی سے کہا کہ بھائی اسوقت فلانی جگہ مجرا ہے آؤ وہاں چلیں سب لوگ یہ کلمہ سنکر لاحول پڑھتے ہوئے چلدیئے کسی نے ان کے ہاتھ نہیں چومے۔ مگر آپ بزرگوں کے ان افعال کی تقلید نہ کرنے لگیں کیونکہ تمھارے اس فعل میں بھی حظ نفس ہوگا ؎

تو صاحب غرضی ای غافل میان خاک و خوں میخور
کہ صاحبدل اگر زہری خورد آں انگبیں باشد

مولانا فرماتے ہیں ؎

لقمہ و نکتہ است کامل را حلال
تو نہ کامل مخور می باش لال

اسی لئے مشائخ نے مبتدی کو وعظ کہنے سے منع کیا ہے کیونکہ وہ حظ نفس کیلئے وعظ کہے گا اس کا نفس پابندی معمولات اور تنہائی سے بھاگتا ہے مجمع میں باتیں بنانیکو دل چاہتا ہی اسلئے وعظ میں اسکو مزا آتا ہے دوسرا ایک وجہ میرے نزدیک اور بھی ہے وہ یہ کہ ابتدا میں احوال کا طریان زیادہ ہوتا ہے اسوقت اگر یہ شخص وعظ کہے گا تو اپنے حالات ہی کا بیان کریگا کیونکہ ایسا ضبط مبتدی میں کہاں کہ دلبر آرہ چلے اور زبان پر نہ آئے یہ ظرف کاملین کو عطا ہوتا ہے چنانچہ شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ "منصور بچہ بود کہ از یکقطرہ

حاشیہ: بزرگوں نے مجاہدات سے حظ نفس کا علاج کیا ہے۔

حاشیہ: مشائخ نے مبتدی کو وعظ سے منع کیا ہے۔

ع؎ مولانا محب الدین صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ احقر سے فرماتے تھے کہ میں نے مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا نہیں مگر مجھے بتلایا گیا ہی کہ وہ قطب ارشاد تھے اور انکے خلفاء کو دیکھکر میں سمجھتا ہوں کہ واقعی وہ قطب ارشاد تھے کہ ایسے ایسے کامل بنا گئے پھر فرمایا کہ خبر بھی ہی مولانا قطب ارشاد کس بات سے بنے انمیں یہ صفت تھی کہ جس مقام پر پہونچے قفل لگا دیا اھ (غالباً مراد یہی تھی کہ مولانا میں شان اخفاء اسرار بہت زیادہ تھی) ۱۲ ظ

بفریاد آمد اینجا مرد انند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند" پھر جب وہ احوال بیان کرتا ہے تو سامعین پر اُس کا اثر ہوتا ہے کیونکہ احوال صادقہ ہیں گو کمزور ہیں پھر عوام اسکے معتقد ہوتے ہیں اور اعتقاد عوام میں مبتدی کی ہلاکت ہے غرض اس طریق میں بعض امور ایسے ہیں جنکو مبتدی نہیں سمجھ سکتا بلکہ منتہی سمجھتا ہے مبتدی جس بات کو ایثار اور خدمت خلق سمجھتا ہے بصر شیخ اسکو حظ نفس اور حب شہرت سمجھتا ہے اور بعض امور ایسے دقیق ہوتے ہیں جنمیں کامل بھی متردد ہو جاتا ہے اور بعض امور میں اسکو چھوٹوں سے مشورہ کرنا پڑتا ہے گو وہ اسکے اشکال کو رفع نکر سکیں مگر مشورہ میں خاصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ مدد فرماتے ہیں (ید اللہ علی الجماعۃ وما خاب من استخار وما ندم من استشار او کما قال صلے اللہ علیہ وسلم ۱۲) حق تعالیٰ مشورہ کے وقت چھوٹوں کے منہ سے بلا فہم کے ایسی بات نکلوا دیتے ہیں جس سے کامل اپنا مطلب نکال لیتا ہے گویا اس کا حق وہاں ودیعت ہے جسکو وہ اضطراراً ادا کر دیتے ہیں گو انکو خبر بھی نہو بہر حال آجکل یہ مرض بہت عام ہے کہ دوسروں کے کاموں میں اور فضول قصوں میں پڑ جاتے ہیں اور اسکو ثواب سمجھتے ہیں میں اسکو مطلقاً مذموم نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ وہ ان تعلقات میں شرکت کرتے ہوئے یہ دیکھیں کہ ان کے دین پر تو اس کا اثر نہیں ہوتا اگر ذرہ برابر بھی ضرر نہو تو مضائقہ نہیں اور اگر ضرر ہو تو ہرگز انمیں شرکت نکریں بلکہ اپنے کام میں لگیں اور خدمت خلق کو الگ کریں اور نفع وضرر کی تشخیص میں اپنی رائے سے کام نہ لیں بلکہ شیخ محقق سے دریافت کریں اور محض قواعد کلیہ دریافت کرنا کافی نہیں کیونکہ قواعد کلیہ تو میں نے اسی وقت بیان کر دیئے مگر اسکے بعد بھی میں شیخ سے دریافت کرنے کی ضرورت بتلا رہا ہوں پس مطلب یہ ہے کہ اپنی حالت کی تفصیل اور کچا چٹھا لکھکر احکام جزئیہ معلوم کریں۔ ہمارے ایک دوست ہیں انکو اس کا بہت شوق ہے کہ ہر کام میں حصہ لیں ہر جلسہ میں شرکت کریں اور اسکے ساتھ ہی انکو طریق باطن میں مشغول ہونیکا بھی شوق ہے میں نے ان سے صاف کہدیا کہ تمکو یہ طریق حاصل نہوگا کیونکہ اسمیں یکسوئی کی ضرورت ہے اور تمکو ان تعلقات کیساتھ یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی کہنے لگے کہ میں یہ صورت اختیار کرونگا کہ ہر تین چار مہینے کے بعد پندرہ بیس دن یہاں (خانقاہ میں) قیام کر لیا کرونگا یہ ایام یکسوئی سے گذرینگے میں نے کہا کہ اس سے بھی یکسوئی حاصل نہو گی کیونکہ ان ایام میں بھی

ف بعض امور میں کامل کو بھی چھوٹوں سے مشورہ کا محتاج ہونا پڑتا ہے

ف شیخ سے قواعد کلیہ نہ پوچھو بلکہ احکام جزئیہ پوچھو

ف ایک دوست کی حکایت

یہ عزم تو ہوگا کہ بیس دن کے بعد پھر قومی خدمات میں مشغول ہوں گا اور عزم تعلق مع الغیر بھی اس طریق میں مضر ہے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک بزرگ نے ایک مرید کو ذکر و شغل تعلیم فرمایا وہ کام کرتا رہا مگر طریق مفتوح نہوا اُسنے شیخ سے کئی دفعہ اسکی شکایت کی شیخ نے بہت تدبیریں بتلائیں مگر اُسکو نفع نہوا چونکہ شیخ مبصر تھا سمجھ گیا کہ اسکی نیت میں فتور ہے۔ پوچھا میاں یہ تو بتلاؤ کہ تمھاری نیت ذکر و شغل میں کیا ہے۔ کہا حضور یہ نیت ہے کہ اللہ تعالیٰ میری اصلاح فرماویں تو پھر میں دوسروں کی اصلاح کرونگا فرمایا توبہ کرو توبہ کرو شرک ہے شرک ہی ابھی سے۔ بڑا بننے کی فکر ہے اس خیال کو دل سے نکالو۔ بس مرید کا اس خیال سے توبہ کرنا تھا کہ طریق مفتوح ہوگیا۔

بندہ کو عزم تعلق مع الغیر بھی مضر ہے (ایک حکایت)

اسپر وہ دوست کہنے لگے کہ پھر میں کیا کروں اب تو ان کاموں سے چھٹکارا مشکل ہے میں بُری طرح پھنس گیا ہوں۔ میں نے کہا طریق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق کہ اصل مقصود تو رضای حق ہے اور اُس کا حصول طریق صوفیہ ہی میں منحصر نہیں اُسکی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ذوقیات و کیفیات و نسبت ذوقیہ کی طلب نکرو صرف مقصود کو مضبوطی سے پکڑے رہو کہ کوئی کام خلاف شریعت و خلاف سنت صادر نہو۔ اسپر وہ خاموش ہوگئے۔ ظاہر میں تو میں نے اُنکو سہل طریقہ بتلادیا مگر حقیقت میں آجکل یہ بہت دشوار ہے۔ محال تو نہیں مگر ایسا ہے جیسے بدون باپ کے بیٹا ہوجانا کیونکہ تعلقات غیر میں پھنسکر کوئی کام خلاف شریعت نہو قدم ذرا آگے نہ بڑھے بہت مشکل ہے۔ ہر شخص میں وہ قوت کہاں جو حضرت صدیق اکبر و حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما میں تھی کہ ہفت اقلیم کا انتظام ہاتھ میں ہے اور اپنے کام سے بھی ذرہ برابر غافل نہیں قدم قدم پر دین ملحوظ ہے اور ہر ساعت میں قلب کی حالت پر نظر ہے۔ اور تو اور صحابہ میں بھی سب میں یہ قوت نہ تھی آخر کچھ تو وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرات شیخین کیلئے خلافت تجویز فرمائی اور حضرت ابوذر رضہ غفاری کیلئے ان قصوں سے علیحدگی تجویز فرمائی چنانچہ حدیث میں ہے یا ابا ذر انی اراک ضعیفا وانی احب لنفسک ما احب لنفسی لا تقضین بین اثنین ولا تلین مال یتیم (او کما قال) کہ اے ابوذر میں تمکو کمزور دیکھتا ہوں اور میں تمھارے لئے وہی بات پسند کرتا

ہر شخص میں وہ قوت کہاں جو حضرت ابوبکر و عمر میں تھی

کوئی تو وجہ ہے کہ حضور نے حضرات شیخین کیلئے خلافت و سلطنت تجویز فرمائی اور ابوذر کو قضاء سے بالکل منع فرمادیا

ہوں جو اپنے واسطے پسند کرتا ہوں دیکھو دو آدمیوں کے درمیان کبھی حکم یا ثالث بنکر فیصلہ نکرنا اور نہ یتیم کے مال کے متولی بننا (یعنی اگر میں بھی تم جیسا ضعیف ہوتا تو اپنے لئے اس حالت میں یہی تجویز کرتا یا یہ کہ مجھے طبعاً تو علیحدگی اور یکسوئی ہی محبوب ہے مگر ضرورت کی وجہ سے تعلقات میں مشغول ہوں اور خدا نے مجھے قوت بھی دی ہے عصمت سے بھی ممتاز فرمایا ہے اسلئے ان تعلقات کو گوارا کرتا ہوں ۱۲) غرض صحابہ میں بھی سب یکساں نتھے بلکہ کوئی تعلقات کا متحمل تھا کوئی متحمل نتھا مگر اس تفصیل کو انبیاء علیہم السلام میں جاری نکرنا انبیاء علیہم السلام سب کامل ہیں ان میں ضعیف کوئی نہیں۔ چنانچہ حضرت سیدنا عیسی علیہ السلام بعد میں محمدی بنکر بادشاہت کرینگے (یعنی زمام خلافت اپنے ہاتھ میں لیں گے اور شریعت کی اصطلاح میں خلافت سے مراد سلطنت ہی ہے جبکہ شریعت کے اصول و قواعد کے موافق ہو اور اس سے مقصود بھی دین کی ترویج ہو ۱۲) اور پہلے جو حضرت عیسی علیہ السلام نے بادشاہت نہیں کی تو اسکی وجہ یہ تھی کہ اسوقت آپ کو اس سے دلچسپی نتھی دوسرے ضرورت بھی داعی نتھی کیونکہ آپ پر ایمان لانے والی مختصر جماعت حواریین کی تھی اور حواریین کی تبلیغ سے دیگر ممالک میں آپکا مذہب بعد میں رائج ہوا آپکے سامنے ایمان لانے والوں کی جماعت زیادہ نتھی جنکے لئے مستقل سلطنت قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ۱۲) ورنہ قابلیت و اہلیت و استعداد آپ میں اسوقت بھی موجود تھی اور اب بھی موجود ہے حضرات انبیا کسی قوت میں ناقص نہیں ہوتے (پس جس شخص نے یہ کہا ہے کہ نعوذ باللہ عیسی علیہ السلام میں سیاست و سلطنت کی استعداد نتھی اس نے سخت گستاخی کی ہے ۱۲) غرض سب کے سب ایک شان کے نہیں ہوتے ورنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذر کو منصب قضا و تولیت سے منع نفرماتے۔ مگر آج کل کی حماقت دیکھئے کہ عوام یوں کہتے ہیں کہ سب علماء کو چاہئے کہ حجروں اور خانقاہوں سے نکل کر اکھاڑے میں آئیں اور سیاسی کام کریں یہ انکی جہالت ہے کیونکہ سب اکھاڑے کے واسطے نہیں ہیں اور جو اسکے اہل ہیں وہ پہلے ہی سے اکھاڑے میں اترے ہوئے ہیں (دوسرے ابھی آپنے ایک ہی اکھاڑے کو دیکھا ہے اس لئے حجروں اور خانقاہوں والوں کو اکھاڑے سے باہر سمجھتے ہیں حالانکہ اکھاڑے مختلف ہیں ایک سیاست کا اکھاڑا ہے ایک معرفت کا اکھاڑا ہے ایک اکھاڑے میں بندوق چلتی ہے ایک میں

ف: انبیا میں ہر کام کی قوت و استعداد ہے

ف: عیسی علیہ السلام کے بادشاہت نہ کرنیکا سبب

ف: آجکل یہ کہنا جاہلانہ ہے کہ سب علماء کو اکھاڑے میں کودنا چاہئے یہ حماقت ہے

بارود بنتی ہے اگر بارود بنانیوالے بھی کارخانے بند کرکے بندوق چلانیوالوں کیساتھ ہوجائیں تو یقیناً سب بیکار ہوجائیں گے ۱۲) ایک سیاسی اکھاڑے والے مولوی یہاں تشریف لائے اور اپنے ساتھ دو پہلوانوں کو بھی لائے وہ اُن دونوں کو میرے سر چپکانا چاہتے تھے کہ تو ان کو بیعت کرلے میں نے اُنکے سر چپکا دیا وہ اپنے کو ناقابل کہتے تھے میں اپنے کو نا اہل بتلاتا تھا کچھ دیر تو تواضع میں نزاع ہوتا رہا پھر میں نے کہا کہ آپ بھی غلطی کرتے ہیں کہ سب کمالات کی نفی کرتے ہیں اور میں بھی غلطی پر ہوں کہ اپنے سے اہلیت کی مطلقاً نفی کررہا ہوں کہ اسمیں ناشکری ہے بات یہ ہے کہ جتنی اہلیت کی ان صاحبوں کی خدمت کیلئے ضرورت ہے وہ آپ میں بھی ہے اور مجھ میں بھی ہے مگر اسمیں ضرورت اسکی ہے کہ مرید و شیخ میں مناسبت ہو اسکا لحاظ بہت ضروری ہے آجکل بہت مشائخ اسکی پروا نہیں کرتے مگر بعد میں اس کا وہ حشر ہوتا ہے جو ایک دفعہ دیوبند میں کتابوں کا حشر ہوا قصہ یہ ہوا کہ دیوبند میں علوم فلسفیہ وریاضیہ کے لئے مولانا سید احمد صاحب دہلوی منتخب تھے اور علوم حدیث و تفسیر کیلئے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مشہور تھے ایک سال مولانا سید احمد صاحب فرمانے لگے کہ ان خرافات کیلئے میں رہ گیا میرے پاس حدیث و قرآن کبھی نہیں آتا میں شمس بازغہ نہ پڑھاؤنگا مولانا محمد یعقوب صاحب کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ لاؤ شمس بازغہ ہمارے یہاں بھیجدو ترمذی تم لیلو اب انجام یہ ہوا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے یہاں شمس بازغہ کی بری درگت ہوئی بس عبارت کا ترجمہ ہوا اور مولانا نے اُس کا رد شروع کیا کہ غلط بکتا ہے جھک مارتا ہے اس دلیل کا جواب یہ ہے اور دوسری دلیل کا جواب یہ ہے۔ کتاب کا حل تو کچھ نہوتا اس کی تردید خوب ہوتی اُدھر ترمذی کی مولانا سید احمد صاحب کے یہاں گت ہوئی کہ تمام شروح ولغات واسماء الرجال فرماتے تھے جس سے طلبہ کو تنگی ہوتی تھی غرض دونوں کی جماعت بددل تھی بالآخر مولانا سید احمد صاحب نے خود ہی ترمذی مولانا کے یہاں بھیجدی اور شمس بازغہ خود لیلیا تو طلبہ خوش ہوئے یہی حال اُس مرید کا ہوتا ہے جسکو شیخ سے مناسبت نہو پہلے مشائخ کو اس کا بہت اہتمام تھا بعض تو شروع ہی سے کہدیتے تھے کہ ہمارے یہاں تمہارا حصہ نہیں فلاں بزرگ کے پاس جاؤ (یہ اہل کشف تھے) اور بعض حضرات بعد میں تجربہ کرکے فرمادیتے تھے کہ ہم تمکو فلاں بزرگ کے یہاں بھیجے دیتے ہیں تم کو اُن سے فیض جلدی ہوگا نمعلوم آجکل مشائخ

ف ایک سیاسی اکھاڑے والے مولانا کی حکایت

ف مرید و شیخ میں مناسبت شرط ہے مگر آجکل مشائخ کو اس کی پروا نہیں

ف عدم مناسبت کے ضرر کا ایک واقعہ بیان۔

ف پہلے مشائخ کبھی تو شروع ہی سے کہدیتے تھے کہ تمہارا حصہ ہمارے یہاں نہیں کبھی بعد تجربہ کے دوسرے کے یہاں بھیجدیتے۔

نے یہ طرز کہاں سے سیکھا ہے کہ سبکو اپنے ہی سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں تو میں نے اُن بزرگ سے عرض کیا کہ آپ انکو میرے حوالہ کر کے ان کا راہ کیوں مارتے ہیں انکو آپ سے زیادہ مناسبت ہے آپ ہی ان کو بیعت کر لیں اور اسکی میرے پاس ایک دلیل ہے وہ یہ کہ یہ حضرات بھی خادم قوم ہیں اور آپ بھی خدمت قومی میں لگے ہوئے ہیں اور میں اس خدمت سے محروم ہوں اسلئے بجائے خادم قوم ہونے کے نادمِ قوم ہوں نیز میرے یہاں ترک تعلقات کی ضرورت ہے بلکہ تعلقات کو آگ لگا دینے کی ضرورت ہے اور یہ ان صاحبوں سے نہو سکے گا۔ اس دلیل کو سنکر ایک صاحب تو خاموش رہے جو انگریزی کے عالم تھے کیونکہ یہ انگریزی کے علماء عربی کے علماء کے سامنے چل نہیں سکتے وہ ان کے سامنے بالکل عوام ہیں بلکہ کالعدم ہیں مولوی خواہ مخواہ اُن سے ڈرتے ہیں تمکو اپنی قوت کا اندازہ نہیں تم تو حقیقت میں شیر ہو مگر ایک بار جنگی کی ضرورت ہے پھر انگریزی کے علماء ذراسی دیر میں چاروں شانے چت ہیں (بات یہ ہے کہ اہلِ علم انگریزی دانوں سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے علم سے کام نہیں لیتے بلکہ انکو عامی سمجھکر عامیانہ گفتگو کرتے ہیں اسلئے وہ ان کے سر چڑھتے ہیں اور اگر علمی گفتگو کریں تو پھر وہ بول نہیں سکتے کیونکہ آدمی اسی بات میں بول سکتا ہے جسکے سب پہلو اسکے سامنے ہوں اور انکے ایک پہلو بھی سامنے نہیں ۱۲) دوسرے صاحب عربی کے مولوی تھے وہ کچھ بولے میری تقریر سنکر کہنے لگے کہ حضرت ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم کچھ دن آپ کی خدمت میں رہیں اور اس عرصہ میں خدمت قوم کو ترک کر دیں گے پھر یہاں سے فارغ ہو کر دوسرے مولانا کی طرح خدمت قوم میں مشغول ہو جائیں گے میں نے کہا کہ جب تک آپ یہاں رہیں گے اسوقت ظاہر میں تو آپ خدمت قوم ترک کر دیں گے مگر عزم تو یہ رہے گا کہ یہاں سے فارغ ہو کر خدمت قوم میں مشغول ہوں گے سو میرے طریق میں یہ عزم بھی مضر ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ تعلقات کو آگ لگانیکی ضرورت ہے کہ دل سے حال و مستقبل سب کے متعلق پوری یکسوئی ہو اور اپنے کو اسطرح سپرد کر دیجئے کہ بعد میں جو کچھ میں چاہوں تجویز کروں خواہ خدمت یا ترک خدمت آپکو تجویز کا کوئی حق نہو گا اسکے بعد وہ بھی خاموش تھے (کیونکہ علماء باطن کے سامنے عربی کے علماء ظاہر بھی نہیں چل سکتے ۱۲ ظ) عرض آجکل یہ بڑی غلطی ہے کہ لوگ سبکو ایک ہی اکھاڑے میں اُتارنا چاہتے ہیں حالانکہ سب ایک

کام کے نہیں ہیں فقہاء نے یہانتک تصریح کی ہے کہ جہاد کیوقت اُس فقیہ کو شرکت جہاد جائز نہیں جسکی بستی میں اُسکے سوا کوئی دین کا راستہ بتلانیوالا نہیں ہے ۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ شریعت اسکو گوارا نہیں کرتی کہ سب ایک ہی کام کو لپٹ جائیں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی سبکو ایک کام میں نہ لگاتے تھے بلکہ بعض کو تو درس و تدریس میں مشغول رہنے کا امر فرمایا (جیسے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) بعض کیلئے وعظ و تبلیغ کو پسند کیا (جیسے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) اور بعض کو ترک تدریس کا امر کیا جیسا کہ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کو فرمایا کہ سب مشاغل درس و تدریس ترک کرکے یہاں آجاؤ۔ اسی طرح حضرت نے اپنے خلفاء میں ہر کام کیلئے ایک ایک کو مقرر فرمایا تھا چنانچہ ایک دفعہ فرمایا کہ جسکو تعویذ گنڈے لینے ہوں وہ حاجی عابد حسین صاحب کے پاس جائے اور جسکو پڑھنا لکھنا ہو وہ مولوی قاسم صاحب اور مولوی یعقوب صاحب کے پاس جائے اور جسکو فتویٰ لینا ہو وہ گنگوہ مولانا رشید احمد صاحب کے پاس جائے اور جسکو نامراد بننا ہو وہ میرے پاس آئے مجمع میں تو شاید کسی نے بھی اس کا مطلب نہ سمجھا ہوگا جب مجمع منتشر ہوگیا تو حضرت نے فرمایا کہ میاں سمجھے بھی نامرادی کا کیا مطلب ہے نامرادی سے مراد عشق ہے .... کیونکہ عاشق ہر وقت نامراد ہے (کیونکہ اُسکی طلب کم نہیں ہوتی وہ ہر درجہ پر پہونچکر اُس سے آگے کا طالب ہے اسلیئے وہ ہمیشہ نامراد رہتا ہے ۱۲) مگر جنت میں پہونچکر البتہ مراد حاصل ہوجائیگی اور آمین بعض صوفیہ نے کہدیا ہے کہ جنت میں بھی طلب ختم نہوگی اُنکو دھوکہ ہوا ہے کشف میں کچھ غلطی ہوئی ہے (معلوم ہوتا ہے کہ دخول جنت سے پہلی حالت منکشف ہوئی اور خلط و اشتباہ کی وجہ سے اسکو حالت بعد الدخول سمجھ لیا گیا ۱۲) ورنہ یہ نص صریح کے خلاف ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وقالوا الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور اگر دخول جنت کے بعد بھی مراد حاصل نہوئی تو حزن باقی رہے گا۔ یہ تو مسئلہ مقصودہ کا بیان تھا اب میں اسکو حدیث سے مستنبط کرتا ہوں وجہ استنباط اس حدیث سے یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی ہے کہ اے اللہ جب آپ کسی قوم کو فتنہ میں ڈالنا چاہیں تو مجھے ایسی حالت میں اٹھا لیجئے کہ میں فتنہ میں مبتلا نہوں بلکہ اُس سے بچا رہوں آپنے یہ دعا نہیں فرمائی کہ مجھے اس فتنہ کے رفع کرنے کی ہمت دیجئے اس سے معلوم ہوا کہ

ف فقہاء نے تصریح کی ہے کہ شرکت جہاد ہر ایک کو جائز نہیں

ف حاجی صاحب ہر ایک کو ایک ہی کام میں نہ لگاتے تھے

ف حضرت نے اپنے خلفاء کیلئے الگ الگ کام مقرر کردیئے تھے اسپر حضرت کا ایک ارشاد لطیف ۱۶

ف عاشق نامراد ہوتا ہے

ف جنت میں سب بامراد ہوجائیں گے

ف حدیث سے مقصود کا استنباط۔ ع

ع غالباً اسوقت ذہن میں ایک حدیث ہوگی ۱۲

ہدایت غیر کا حد سے زیادہ اہتمام مطلوب نہیں ہے بلکہ اپنا بچاؤ مقدم ہے اپنے بچنے کا سامان کرنا چاہئے کیونکہ بعضے فتنے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا رفع کرنا قدرت سے باہر ہوتا ہے اسوقت طلب مدافعت مناسب نہیں بلکہ اپنا بچاؤ کرنا چاہئے۔ رہا یہ کہ اس حدیث سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ مراد ایسا فتنہ ہے جسکا رفع قدرت سے باہر ہو حدیث میں اس قید پر کیا قرینہ ہے سو قرینہ اس کا اذا اردت بقوم فتنۃً ہے کہ جب آپ کسی قوم کو فتنہ میں مبتلا کرنیکا قصہ کر چکیں اور ظاہر ہے کہ ارادہ کا تخلف محال ہے تو اس فتنہ کا رفع بھی محال ہے اسلئے ایسے وقت کے متعلق حضور نے یہ دعا کی کہ مجھے ہی اس سے پہلے اٹھا لیجئے اور مجھے ہی فتنہ سے بچا لیجئے پھر یہ بات معلوم کرنا کہ فتنہ کا رفع دفع کرنا قدرت سے باہر ہے یا نہیں۔ یا تو دلیل قطعی سے معلوم ہو گا جیسا کہ حضرات انبیاء کو وحی سے معلوم ہو جاتا ہے یا دلیل ظنی سے اسطرح معلوم ہو کہ اسکے ظن غالب میں اسکا رفع قدرت سے باہر ہو جیسا کہ آجکل فتن کی حالت ہے کہ فتنوں کی گھٹائیں آرہی ہیں ایک فتنہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا فتنہ نکل کھڑا ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اخیر زمانہ میں فتنے ایسے پے در پے آئیں گے جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ جائے کہ ایک کے بعد دوسرا گرتا چلا جاتا ہے آجکل واقعی یہی حالت ہے جسکو دیکھکر اہل درد یوں کہتے ہیں ؎

یک تن وخیل آرزو دل بچہ مدعا نہم	تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اور یہ بیان آجکل ہی کے واسطے کر رہا ہوں تو صاحبو! اسوقت جنکی اصلاح کی تمکو فکر ہے اور اسکے لئے تم جلسوں میں مارے مارے پھرتے ہو مجھے اندیشہ ہے کہیں تم بھی ویسے ہی نہ ہو جاؤ دہلی میں ایک شخص عیسائیوں سے مناظرہ کرتا تھا پھر خود عیسائی ہو گیا مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک بدعتی پیر فدا حسین نامی جو نہایت ہی بد دین تھا شراب وغیرہ کو حلال کہتا تھا مولانا نے اس سے مناظرہ کرنے کو ایک ولایتی عالم کو بھیجا فدا حسین کو معلوم ہوا تو اس نے مولوی صاحب کا استقبال کیا اور بہت خاطر مدارات کی اور یہ کہا کہ مولانا آپ گرمی میں تشریف لائے ہیں ذرا آرام فرمائیے لیٹ جائیے ظہر کے بعد مناظرہ کریں گے دو چار خادموں کو حکم دیا کہ مولوی صاحب کے پیر دباؤ مولوی صاحب لیٹ گئے اور سو گئے۔ انکا سونا تھا کہ خبیث نے ان کے متخیلہ پر تصرف کرنا شروع کیا جس سے معلوم خواب میں انکو کیا

ف: جن فتنوں کا رفع قدرت سے باہر ہو ان میں طلب مدافعت مناسب نہیں بلکہ اپنا بچاؤ کرے

ف: آجکل فتنوں کی گھٹائیں آرہی ہیں جنکا رفع آدمی کی قدرت سے خارج ہے

۱۷

ف: جنکی تم اصلاح کر رہے ہو اندیشہ ہے کہیں تم بھی ویسے ہی نہ ہو جاؤ

ف: ایک مناظر کی حکایت

ف: شاہ عبدالعزیز صاحب کے ایک شاگرد کا واقعہ

کیا نظر آیا ہوگا انجام یہ ہوا کہ فدا حسین نے اُنکے جاگنے سے پہلے کہدیا کہ حلوا مانڈا تیار کرو (یہ مرید کرنے کی اصطلاح تھی ۱۲) کسی نے کہا کہ کون مرید ہونے آیا ہے کہا یہ مولوی صاحب! خادم نے کہا یہ تو تمسے لڑنے آئے ہیں۔ کہا بس یہ ہمکو شکار کرنے آئے تھے خود ہی شکار ہوگئے اب یہ جاگتے ہی مرید ہوں گے۔ چنانچہ جاگتے ہی جو پہلی بات مولوی صاحب کی زبان سے نکلی وہ یہ تھی کہ میں ابتک گمراہ تھا اب مجھے حق واضح ہوا مجھے بیعت کر لیجیے خبیث نے اُسکو بیعت کیا اور حلوا تقسیم کیا پھر ان سے پوچھا کہ کچھ حلوا بچ گیا ہے اتنی ہمت ہے کہ اپنے استاد کو (یعنی شاہ عبد العزیز صاحب رح کو) دے آؤ کہا ہاں جہاں چاہو بھیجدو شوق سے جاؤنگا۔ چنانچہ ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر کے حلوا سر پر رکھے ہوئے شاہ صاحب کے پاس آیا اور کہا مجھے تو حق نصیب ہوگیا تم بھی گمراہی سے توبہ کر لو یہ حلوا لایا ہوں شاہ صاحب نے کہا جا مردود نکل یہاں سے۔ اور اب شاہ صاحب بڑے پچھتائے کہ اس شخص کا کام فدا حسین کے پاس جانیکا نتھا۔ ہاں یہ کام مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کا تھا۔ امیر شاہ خانصاحب نے ایک حکایت لکھوائی ہے کہ دہلی میں ایک مجذوب تھا بڑا مضبوط قوی اور بہت فوں فاں کیا کرتا تھا کسی کو اُسکے سامنے جانے کی ہمت نتھی لوگ کہنے لگے کہ شاہ اسمٰعیل صاحب سبکو نمازی بناتے ہیں اس مجذوب کو نمازی بنائیں تو ہم جانیں ایک دفعہ شاہ صاحب کا اُس کا سامنا ہوگیا تو شاہ صاحب نے اُسکو نماز کیلئے للکارا اُس نے بڑی فوں فاں کی شاہ صاحب اُسکے حجرہ میں گھس گئے اور دونوں میں کشتی ہونے لگی اور تھوڑی دیر میں مجذوب کی فوں فاں سب ختم ہوگئی اور شاہ صاحب کیساتھ سیدھا سیدھا نماز کو آگیا پھر سب جذب ختم ہوگیا۔ فدا حسین مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب سے بہت ڈرتا تھا اُسکے مریدوں نے ایک دفعہ کہا کہ آپ سب پر اثر ڈالتے ہیں تصرف کرتے ہیں مولوی اسمٰعیل پر کچھ تصرف نہیں کرتے یہ تو ہماری جماعت کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار کرتے ہیں تو اُس نے یہ بات بنائی کہ بات یہ ہے کہ مولوی اسمٰعیل صاحب خدائی کوتوال ہیں جو کام یہ کر رہے ہیں وہ انکا منصبی کام ہے اور ہم گو شاہزادے ہیں مقبول بارگاہ ہیں لیکن شاہزادے پر لازم ہے کہ اگر شاہی کوتوال اُسپر کوئی دخل قائم کر کے اُسکو حوالات میں بھیجدے تو اُسوقت اُس سے مزاحمت نکرے بلکہ حوالات میں چلا جائے جب مقدمہ بادشاہ کے سامنے جائیگا یہ بوجہ مقبولیت و محبوبیت کے فوراً رہا ہو جائیگا لیکن اگر اُس نے

ف اصلاح کا کام شاہ اسمٰعیل صاحب جیسوں کا ہے امیر شاہ صاحب کی حکایت

ف فدا حسین شاہ صاحب سے ڈرتا تھا

کو توال سے مزاحمت کی تو پھر معتوب شاہی ہو جائیگا۔ یہ اُس نے بات بنائی ورنہ وہ جانتا تھا کہ شاہ اسمٰعیل صاحب کے سامنے میر التصرف سب ملیامیٹ ہو جائیگا (کیونکہ شاہ صاحب نرے ملا نہ تھے بلکہ صاحب تصرف بھی تھے وہ ان ملحدوں کا تصرف سب سلب کر سکتے تھے ۱۲) ان کا کام تھا بددینوں کی اصلاح کرنا ان کا کام تھا طوائفوں کی اصلاح کرنا اس کا قصہ بھی امیر شاہ خاں صاحب نے لکھوایا ہے جو امیر الحکایات میں قابل دید ہے۔ اور ہر ایک کا کام نہیں یہ وہی کر سکتا ہے جو فنا ہو چکا ہو نفس کو مار چکا ہو ورنہ طوائفوں کی تو کیا اصلاح کریگا خود اُن کا طواف کرنے لگیگا۔

صاحبو! حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم دیا ہے۔ وہاں یہ بھی فرمایا ہے من سمع منکم بالدجال فلینأ عنہ (او کما قال) کہ جو شخص دجال کے ظاہر ہونے کی خبر سنے اُسکو چاہئے کہ اُس سے دور بھاگے یہ نہیں فرمایا کہ اُس سے مناظرہ کرو معلوم ہوا کہ ہر فتنہ کی مدافعت کے درپے نہونا چاہئے جو فتنہ اپنی قدرت سے باہر ہو اُس سے دوری ہی اچھی اُس سے الگ ہی رہو۔ اب مولانا! جو اکھاڑے میں کودتے ہیں دیکھ لیں کہ ان میں قوت ہے یا نہیں اول تو باطنی قوت دیکھو کہ تمھارا ایمان کتنا قوی ہے نفس پر کتنا قابو ہے پھر ظاہری قوت کو دیکھو کہ تمھارا اثر کتنا ہے ظاہری قوت کو اتنا بڑا دخل ہے کہ عوام میں مشہور ہے کہ سلاطین وحکام پر سحر نہیں چلتا مراد یہ کہ جو صرف حاکم ہی ہو اور جو سلطان ہونے کی ساتھ نبی بھی ہو اُس پر سحر چلسکتا ہے چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر سحر کا اثر ہوا ہے (اگر اثر نہوتا تو عوام کو شبہ ہوتا کہ آپ نرے بادشاہ ہی ہیں ۱۲) مگر آپ پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا سحر تو قتل کے واسطے کیا گیا تھا اور آپ پر صرف اتنا اثر ہوا کہ حضور کو بھول ہو جاتی تھی غرض ظاہری قوت کو بھی بڑا دخل ہے علماء اسکو بھی اول دیکھ لیں کہ کتنے آدمی اُنکے ساتھ ہیں اور کتنا مال اُنکے پاس ہے اس کے بعد کام شروع کریں۔ اگر بدون مال کے مولانا نے کام شروع کر دیا اور پانچسو روپے قرض ہو گئے تو اب مولانا مجبور ہو کر چندہ کرینگے جسمیں ایسے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے جنکی جبہ سائی بھی اپنے دروازہ پر گوارا نتھی اب اگر یہ قرض ادا ہو گیا اور اسکے بعد ہمت کا وضو ٹوٹ گیا تو خیر ورنہ ساری عمر ایسی گھس گھس میں رہے گا کہ آج قرض کر لیا کل چندہ کر لیا پھر قرض کر لیا۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ تو رفع فتنہ کی دعا فرمائی نعوذ باللہ من الفتن ما ظہر منہا وما بطن اور اسجگہ صرف حفظ عن الفتنہ کی

فرقہ بیلوا ننگ کی اصلاح بھی مولانا ہی کا کام تھا۔

حضور نے دجال سے بھاگنے کا امر فرمایا ہے

فرمایا علماء سیاسی اکھاڑے میں کودنے سے پہلے وہ اپنی باطنی قوت دیکھ لیں

ظاہری قوت کو بھی بڑا دخل ہے

حضور نے کہیں تو دفع فتنہ کی دعا فرمائی اور کہیں صرف حفظ کی

دعا فرمائی ہے کہ اے اللہ مجھے فتنہ سے بچائیے دونوں میں تطبیق یہی ہے کہ پہلی دعا اس مقام کیلئے ہے جہاں فتنہ واقع ہونیکا یقین نہوا ہو اور دوسری دعا ایسے موقعہ کیلئے جہاں فتنہ واقع ہونیکا یقین ہوچکا ہو اور جب یقین ہو جائے اس کے خلاف دعا بھی جائز نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ابوجہل کیلئے کسی وقت دعا کی ہے وہ نزول نص اور حصول یقین سے پہلے دعا فرمائی ہے ہاں جہاں یقین نہو وہاں دعا جائز ہے پس تمکو آجکل ان فتنوں کے دفعیہ کیلئے دعا جائز ہے کیونکہ تمکو یقین حاصل نہیں اور اہل اللہ کو جو کسی واقعہ کے متعلق کشف سے معلوم ہو جاتا ہی کہ فلاں وقت فلاں قوم یا فلاں شخص پر عذاب نازل ہونیوالا ہے اسمیں اہل اللہ کا مذاق مختلف ہے بعض تو کشف کو (صاحب کشف پر) حجت سمجھتے ہیں اور کشف کے خلاف دعا کو ناجائز سمجھتے ہیں انہی کی نسبت مولانا کا ارشاد ہے ؎

کفر باشد نزد شان کردن دعا — کاے خدا از ما بگردان این قضا

اور حجیت کشف کا قول شیخ ابن عربی رح کی طرف منسوب ہے مگر میں نے شیخ کا اصل قول دیکھا ہے اس سے استدلال صحیح نہیں التنبیہ الطربی میں اسکی پوری تحقیق موجود ہے۔ اُن کا قول صرف اسقدر ہے کہ کبھی کشف بھی تلبیس سے محفوظ ہوتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ قطعی ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ کشف غیر محفوظ سے کشف محفوظ اقرب الی الصحت ہے سو اتنی بات کی صحت میں کسکو کلام ہے مگر اس سے کشف کا شرعی حجت ہونا لازم نہیں آتا نہ صاحب کشف پر نہ دوسروں پر اور بعض اسکے متعلق بھی دعا کو جائز کہتے ہیں اور یہی حق ہے وہ یوں کہتے ہیں کہ ؎

چوں خدا از خود سوال و گد کند — پس سوال خویشتن چوں رد کند

؎ ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو — ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

وہ کہتے ہیں کہ جب ہمارے دل میں بعد کشف کے بھی دعا کا تقاضا ہوا ہے تو یہ دعا بھی اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور قبول بھی وہی فرمائیں گے پس دعا تو کرو مگر عجز کیوقت تدبیر کے درپے نہو اور تدبیر ہی کرو تو اپنی اصلاح کو مقدم کرو کہ تمھاری اصلاح میں ان تدابیر سے خلل نہ آئے ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دجال سے بھاگنے کا امر نفرماتے حالانکہ اسی دجال کے متعلق حضور نے یہ بھی فرمایا ہی کہ ایک شخص اس سے مناظرہ بھی کرے گا جسمیں بتلا دیا گیا کہ اس سے مناظرہ فی نفسہ مذموم نہیں

ف جب کوئی بات کشف سے معلوم ہو اور کشف بلا تلبیس ہو یعنی بروزت تلبیس سے تو محفوظ ہو مگر شرعی حجت نہیں حتی کہ خود دیکھنے والے کو بھی انتظار و جائز نہیں ۱۲

اہل اللہ کشف واقعہ کے بعد اسکے لیے دعا کرنے میں مختلف ہیں۔

ف حجیت کشف کا قول شیخ اکبر کی طرف منسوب ہے مگر انکا کلام اسمیں دال نہیں۔

ف فتنہ کے رفع کیلئے دعا کو کرو مگر تدبیر بھی کرو جبکہ رفع قدرت سے باہر ہو۔

مگر تمکو اسواسطے منع کیا جاتا ہے کہ تم اس کے متحمل نہیں تمھارے دین کے ضائع ہونیکا خطرہ ہے
پس دوسروں کی اصلاح کے درپے اُسوقت ہو جبکہ اپنی حفاظت کا پورا سامان ہو اسکے متعلق
میرا وعظ التصدی للغیر بہت مفصل ہے اُس کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ جسکی
اصلاح اپنے قبضہ میں ہو وہاں تو دعا بھی کرو تدبیر بھی کرو اور جہاں اصلاح قبضہ میں نہو وہاں
دعا تو مطلقاً جائز ہے مگر تدبیر اس شرط سے جائز ہے کہ اپنا ضرر نہو بس اب میں ختم کرتا ہوں
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین۔

والحمد للہ رب العلمین ٥

بعد بیان کے فرمایا کہ ایک حدیث اور یاد آئی جس سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ دوسروں
کی نفع رسانی کا اُسوقت اہتمام کیا جائے جبکہ اپنا ضرر نہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے
سوال کیا یا رسول اللہ میرے پاس ایک دینار ہے اسکو کیا کروں قال انفقہ علی نفسک
فرمایا اسکو اپنی ذات پر خرچ کرو قال واٰخر قال انفقہ علی اھلک اُس نے کہا میرے پاس ایک
دینار اور بھی ہے فرمایا اُسکو اپنے گھر والوں پر خرچ کرو قال واٰخر قال انفقہ علی ولدک
اُس نے کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا اُسکو اپنی اولاد پر خرچ کرو (المراد بہ البالغون
من الولد فان الصغار قد دخلوا فی الاھل لکونھم فی عیالہ واھل الرجل اہل بیتہ الذین یعولہم ۱۲)
قال واٰخر قال انفقہ علی خادمک کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا اُسکو اپنے
خادم پر خرچ کرو۔ قال واٰخر قال فانت اعلم کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا آپ
تمکو اختیار ہے جہاں چاہو خرچ کرو۔ صوفیہ کا مذاق تو یہ ہے کہ خود بھوکے رہو اور دوسروں کو

[حاشیہ: نکتۂ صحبت بیان ضائع ...]

[حاشیہ: ایک حدیث و روایت سے فرق نہیں تائید]

ف شروع بیان میں دو حدیثیں پڑھی گئی ہیں مگر دوسری حدیث کی متعلق مسودہ وعظ میں کچھ مضمون مذکور نہیں غالباً ضبط سے رہ گیا جہاں تک یاد کام دیتی ہے دوسری حدیث کے متعلق یہ ارشاد فرمایا تھا کہ فتنہ کے وقت کیلئے ایک دعا تو یہ ہے کہ اے اللہ جب آپ کسی قوم کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہیں تو مجھے فتنہ سے بچا کر اٹھا لیجئے اس دعا میں تو فتنہ سے بچنے کیلئے تمنائے موت کیگئی ہے مگر جسکو اس تمنا کی ہمت نہو وہ دوسری دعا کرلیا کرے جسمیں حیات کی بھی طلب ہے کہ اے اللہ مجھے اُسوقت تک زندہ رکھئے جب تک حیات میرے لئے بہتر ہو اور اُسوقت وفات دیجئے جبکہ وفات میرے لئے بہتر ہو اس دعا میں بھی اپنی ہی حفاظت کی طلب ہے یہ نہیں فرمایا کہ اُسوقت تک زندہ رکھئے جب تک میری حیات مسلمانوں کو نافع ہو معلوم ہوا کہ نفع لازم نفع متعدی سے مقدم ہے ۱۲ ظ +

دیدو اور اسی کا نام **ایثار** ہے مگر حضور نے اول اپنے اوپر پھر اپنے متعلقین پر اتفاق کا امر فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ نفع لازمی نفع متعدی سے مقدم ہے۔ اسی طرح ایک آیت یاد آئی ولا تجعل یدك مغلولۃ الی عنقك ولا تبسطها کل البسط فتقعد ملوما محسورا حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں شفقت بیحد تھی۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں اسکی تعدیل فرمائی ہے کہ آپ نہ تو اپنے ہاتھ کو بالکل بند کریں نہ پوری طرح کھولدیں جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ملامت زدہ اور عاجز ہو کر بیٹھ جائیں گے (کیونکہ جب آدمی دوسروں پر سخاوت کر کے خود پریشان ہوتا ہے تو لوگ اسی کو ملامت کرتے ہیں کہ ایسی سخاوت سے کیا نفع کہ خود بھیک مانگنے کے قابل ہو گئے ۱۲) یہ تو امر ہوا آگے حضور کے جذبات کا جواب ہے کہ آپ تو ہر ایک کو دینا ہی چاہتے تھے اور کسی کی پریشانی کو دیکھ نہ سکتے تھے تو فرماتے ہیں ان ربك یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر کہ رزق کا فراخ و تنگ کرنا خدا کا قبضہ میں ہے وہ جسپر چاہتے ہیں رزق کو فراخ کر دیتے ہیں اور جسپر چاہتے ہیں تنگ کر دیتے ہیں آپ کی سخاوت سے دوسروں کی تنگی رفع نہیں ہو سکتی اگر خدا کو اسکی تنگی کا رفع کرنا منظور نہیں ہے (کیونکہ ممکن ہے کہ جسکو آپ نے ہزار روپے دیئے ہیں رات ہی کو اسکے پاس سے چوری ہو جائیں مثلاً) اسکے بعد کسی کے دل میں یہ بات آسکتی ہے کہ بیشک ہم کسی کا افلاس رفع نہیں کر سکتے مگر اللہ تعالیٰ تو رفع کر سکتے ہیں۔ پھر وہی مفلسوں کا افلاس رفع فرما دیں تا کہ انکی پریشانی سے ہمارا دل نہ دکھے اس کا جواب آگے دیتے ہیں انہ کان بعبادہ خبیرا بصیرا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ کون دینے کے قابل ہے اور کون نہیں۔ آپ ہمکو مشورہ نہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہی کو یہ بات معلوم ہے کہ کس کیلئے غنا مناسب ہے اور کسکے لئے افلاس اس تعلیم سے شفقت کی تعدیل کر دی گئی۔ وعظ آداب التبلیغ بھی اس مضمون میں قابل مطالعہ ہے اسمیں بھی تعدیل شفقت کے متعلق مفید مضامین ملیں گے شاید وہ اس بیان کیلئے مکمل ہو جائیں۔ اب میں ختم کر چکا البتہ ایک بات پر تنبیہ کرتا ہوں وہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تخفیف شفقت کیلئے ارشادات ہوئے ہیں اس کا منشا یہ نہ تھا کہ نعوذ باللہ حضور میں افراط کا درجہ تھا جسکی تقسیم کی گئی ہے کہ اپنے دین کو ضرر ہونے لگے بلکہ ان ارشادات کا منشا یہ ہے کہ زیادہ شفقت

ف اس آیت میں حضور کی شفقت کی تعدیل ہے ۱۲

ف حضور کے جذبات کا جواب

ف اس شبہ کا جواب کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو مفلس ہی کیوں بنایا۔ حضور کو جو تخفیف شفقت کا امر ہوا اس کا منشا نعوذ باللہ یہ نہیں کہ آپ میں افراط شفقت یعنی دنیوی بلکہ جسمانی امراض کا خطرہ تھا۔

وجہ سے بوجہ حزن وغم کے آپ کے جسم پر مرض وغیرہ کا اثر ہونے کا مظنہ تھا چنانچہ لعلک باخع نفسک وما انزلنا علیک القرآن لتشقی سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ آپ کو شفقت کی وجہ سے جسمانی امراض کا اندیشہ تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعدیل فرمائی کیونکہ امراض جسمانی بھی بعض دفعہ خلل دین کی طرف مفضی ہو جاتے ہیں۔ باقی اس کا ہرگز احتمال نہ تھا کہ شفقت کی وجہ سے آپ اپنے دین کا نقصان کر لیتے ہوں۔ انبیاء علیہم السلام اس سے معصوم ہیں اور حضور تو سب سے اکمل ہیں (اب ایک شبہ اور رہا وہ یہ کہ نص میں ہے ویؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ جس میں صحابہ کی مدح فرمائی گئی ہے کہ وہ دوسروں کو ایثار کرتے ہیں انکو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود اپنے کو بھی احتیاج ہو اور مدح فعل محمود ہی پر ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ اپنی ذاتی احتیاج پر دوسروں کے نفع کو مقدم کرنا محمود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں محمود ہے بشرطیکہ اپنے دین میں نقصان نہ آئے اور اپنا دین ضرر سے محفوظ رہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کرنے کی اجازت تھی اور ان کا یہ فعل محمود تھا کیونکہ اس کسے انکے دین کو ضرر پہونچنے کا احتمال نہ تھا جسکی دلیل خود وہی اوصاف ہیں جو اسی آیت میں اس جملہ سے پہلے مذکور ہیں والذین تبوؤا الدار والایمان من قبلہم یحبون من ھاجر الیہم ولا یجدون فی صدورہم حاجۃ مما اوتوا یعنی ان کے دل میں ایمان راسخ وثابت تھا اور ان کے قلوب حرص سے پاک تھے اور محبت اسلام ومسلمین سے لبریز تھے اور اس حالت میں ایثار سے میں نے منع نہیں کیا بلکہ میں نے بار بار یہ کہا ہے کہ پہلے اپنی ظاہری وباطنی قوت کو دیکھ لو اسکے بعد ایثار کرو اور دوسروں کے کاموں میں پڑو مگر اپنا نقصان کر کے اور دین کو برباد کر کے دوسروں کے کاموں میں لگنا اور اصلاح غیر کے درپے ہونا یہ حضرات صحابہ سے کہاں ثابت ہے اور اسپر کہاں مدح کی گئی ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ کی اول تعریف اسپر کی ہے کہ وہ اپنے نفس کی تکمیل کر چکے ہیں اور ایمان کو اپنے دلوں میں جما چکے اور نفس کو حرص وغیرہ سے پاک کر چکے ہیں اسکے بعد ایثار پر مدح کی گئی ہے اس سے خود میرے بیان کی تائید ہو رہی ہے کہ اصلاح نفس اصلاح غیر سے مقدم ہے اور یہ کہ ایثار کی اسی کو اجازت ہے جو اپنی

ایثار کا جواب

اصلاح سے فراغت کرچکا ہو۔
اے مولانا صاحبان غور کریں جو اصلاح غیر کے درپے ہیں کیا وہ اپنی اصلاح وتکمیل سے فارغ ہوگئے ہیں۔ اگر وہ سچ بولیں گے تو ضرور یہ کہیں گے کہ فراغت تو کہاں ابھی تو اپنی اصلاح کی ابتدا بھی نہیں ہوئی میں اسی حالت کو مرض کہہ رہا ہوں اور اسی سے منع کر رہا ہوں
اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمکو حفظ حدود کی توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ و صلے اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

ممبر سے اترتے ہوئے فرمایا کہ اس بیان کا نام **التراحم فی التراحم** رکھدیا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ باہم رحمت علی النفس ورحمت علی الغیر میں جو تزاحم ہو تو کسکو مقدم کیا جائے جب شفقت کا غلبہ ہوتا ہے تو مزاحمت ضرور پیش آتی ہے طبیعت کا تقاضا اپنے نفس کو مقدم کرنیکا ہوتا ہے اور شفقت کا تقاضا دوسروں کی تقدیم کا ہوتا ہے۔ اس بیان میں اس کا معیار بتلا دیا گیا ہے کہ کسوقت کسکو مقدم کیا جائے فقط۔

صحت نامہ وعظ التراحم فی التراحم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۱۲	الترمذی	النسائی
۲	۱۳	النسائی	الترمذی
۳	۲	ترمذی	نسائی
۳	۴	نسائی	ترمذی
۴	۱۸	جو سمجھ	جوکہ سمجھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

تہتروان وعظ مسمّٰی بہ ۷۳

(الاجر النبیل)

علی

الصبر الجلیل

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی و مولائی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنی اہتمام سی شائع کیا

۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الاجر النبیل علی الصبر الجلیل

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس ہیئت سے ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس خاص شخص کی بابت	کس نے ضبط کیا	سامعین کتنے تھے	متفرقات
[illegible]	۲۳ شعبان [illegible] بوقت صبح [illegible] بجے	[illegible]	جالسا علی الکرسی	[illegible]	تصحیح عقیدہ [illegible]	[illegible]	احقر ظفر احمد عثمانی [illegible]	[illegible]	[illegible]

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم **اما بعد** فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ ان اللہ لہ ملک السمٰوٰت والارض وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر ۝ حضرت خطبہ پڑھکر فارغ ہی ہوئے تھے کہ آنیوالے لوگ اندر ونی

ہ میں آنے لگے حالانکہ وہاں جگہ مطلق نہ تھی اسپر فرمایا کہ تم لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ اندر جگہ نہیں
ہی آنکھیں بند کئے ہوئے ہر شخص چلا آرہا ہے یہ نہیں ہوتا کہ باہر جہاں جگہ ملے بیٹھ جا
فرش پر جگہ نہ ملے تو اپنا ہی کپڑا بچھالیں یا زمین پر بیٹھ جائیں کپڑے میلے ہو جائیں تو دھلوا لیں
لوگوں کی تمام حرکات بے اصول و بے ربط ہیں اسکے بعد کچھ بیان شروع فرمانا چاہا تھا
ایک صاحب پنسل کاغذ سنبھالکر وعظ لکھنے بیٹھے حضرت نے فرمایا کہ کیا آپ بھی بیان
ببند کرینگے تو آپ میرے سامنے نہ بیٹھیں بلکہ آڑ میں بیٹھیں جہاں میری نظر آپ پر نہ پڑے
یونکہ اس طرح میری طبیعت منتشر ہوتی ہے کہ کئی کئی آدمی لکھنے بیٹھ گئے جن میں کوئی تو
جازت سے لکھ رہا ہے کوئی بلا اجازت کسی کو مشق ہے کسی کو نہیں اسپر وہ صاحب کاغذ پنسل
چھوڑالکر سامنے ہی بیٹھے رہے حضرت نے فرمایا کہ کیا اب ضبط کرنے کی نیت نہیں رہی کہا نہیں
فرمایا تو پھر شروع ہی کیوں کیا تھا کیا وہ لغو حرکت تھی اسپر وہ خاموش ہوئے تو فرمایا کہ میں نے
تو تمکو طریقہ بتلا دیا ہے کہ آڑ میں بیٹھ جاؤ اور ضبط کرتے رہو اور اگر اب ضبط کی نیت نہ رہی
تب بھی آڑ میں بیٹھ جاؤ کیونکہ اس صورت میں بھی تمکو دیکھ دیکھکر مجھے وحشت ہوگی کہ یہ وہ
ہے جس نے لغو حرکت شروع کی تھی اسپر وہ اٹھکر آڑ میں بیٹھے اور حضرت نے فرمایا کہ طلبہ
میں آزادی بہت ہی آگئی ہر شخص خود مختار ہو گیا کہ جو چاہتا ہے کر لیتا ہے یہی وہ مرض ہے
جو دیوبند کے طلبہ میں بڑھکر اُن واقعات کا سبب بنگیا جو آجکل ظاہر ہو رہے ہیں اسکے بعد
بیان شروع فرمایا ۱۲) یہ ایک آیت ہے سورۂ توبہ کی جس کا حاصل یہ ہے کہ اسمیں اللہ تعالیٰ نے اپنا
مالک الملک و ملک الملک ہونا ظاہر فرمایا ہے۔

اسوقت کے بیان سے مقصود و غرض یہ ہے کہ ہمارے بعض احباب کو بعض واقعات حزن
پیش آئے ہیں جسکا اثر اُن کے قلب پر معمول سے زیادہ ہوا کچھ تو شدتِ واقعہ کی وجہ سے
کچھ ضعفِ قلب کیوجہ سے۔ اور وہ اسوقت اسی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں تاکہ دین کی
باتیں سنکر کچھ دلکو تقویت ہو انکے آنیکی ساتھ ہی میرے قلب میں یہ بات آئی تھی کہ اس کا
سب سے بڑا علاج تصحیح عقائد و تبلیغ احکام ہے اور تصحیح عقائد سے مراد یہ ہے کہ عقائد صحیحہ کی یاد
دہانی کیجائے کیونکہ بحمد اللہ سامعین اور صاحب واقعہ سب کے عقائد صحیح ہیں مگر واقعات حزن

میں اُنکی طرف التفات نہیں ہوتا اور نہ اُنکو بالقصد ذہن میں حاضر کیا جاتا ہے کیونکہ لوگ اس سے بیخبر ہیں کہ ان عقائد کو ازالۂ غم میں دخل ہے۔ اسوقت میں اسی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں اور تصحیح عقائد و تبلیغ احکام ہی سے اس حزن و غم کا علاج کرنا چاہتا ہوں اس مسئلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر بیان فرمایا ہے ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھیگا اللہ تعالیٰ اُسکے دلکو ہدایت کر دیتے ہیں یہ تو ترجمہ ہے مگر اصطلاحی لفظوں میں اسکا حاصل یہی ہے کہ تصحیح عقائد سے ہدایت ہو جاتی ہے کیونکہ ایمان کے یہی معنی ہیں۔ اب رہا یہ کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تصحیح عقائد سے غم زائل ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں ازالۂ غم کا کوئی ذکر نہیں صرف ہدایت کا ذکر ہے اسکا جواب یہ ہے کہ اس جگہ بیشک صرف ہدایت کا ذکر ہے مگر ہدایت کیلئے مفعول کی ضرورت ہے جو اس جملہ میں مذکور نہیں تو سیاق و سباق میں تامل کرکے مفعول مقدر کرنا چاہیئے سو اس سے پہلے ارشاد ہے ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ کہ کوئی مصیبت بدون اذن خداوندی کے نہیں پہونچتی اسکے بعد ہے ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ کہ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اُسکے دلکو ہدایت ہو جاتی ہے یعنی اسی مضمون سابق کی کہ وہ مسئلہ قدر ہے اُسکو ہدایت ہو جاتی ہے اسطرح سے اُسکو مسئلہ تقدیر پر جزم و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے یا یوں کہو کہ اُسکو ازالۂ غم کی ہدایت ہو جاتی ہے کیونکہ ما اصابکم من مصیبۃ الا باذن اللہ کا مضمون ہی ایسا ہے جسکے استحضار سے مصیبت و غم زائل ہو جاتا ہے تو مضمون مذکور اور ازالۂ غم کی ہدایت گویا دونوں مترادف ہیں اور اسکی بڑی دلیل مشاہدہ ہے جو لوگ اس مضمون پر جازم و مطمئن ہیں اُنکی حالت کو دیکھ لیا جائے کہ وہ مصائب و حوادث میں کیسے مستقل و صابر و شاکر رہتے ہیں غرض تصحیح عقیدہ کو ازالۂ غم میں بڑا دخل ہے مگر ازالہ سے مراد تسہیل و تخفیف ہے اور یہی مطلوب ہے زوال کلی مراد نہیں کیونکہ طبعی غم کا زوال مقصود نہیں بلکہ اُسکی خفت مطلوب ہے ہاں اس خفت کیلئے لازم یا مثل لازم کے زوال ہے اور مثل لازم اسلئے کہا کہ بعض ضعیف طبائع کو عمر بھر بھی خفیف سا غم یا کلفت رہتی ہے مگر اُسکا ازالہ خود مطلوب ہی نہیں کیونکہ اس سے زیادہ اذیت نہیں ہوتی اور تھوڑی بہت

کلفت تو کھانے میں بھی ہوتی ہے چنانچہ ظاہر ہے خصوص آرام طلب لوگوں کو تو منہ میں لقمہ لیجانا ہی بارگراں ہے چنانچہ واجد علی شاہ کے زمانہ کے احدیوں کو چھاتی پر رکھا ہوا بیر بھی منہ میں ڈالنا دشوار تھا وہ اس کام کیلئے راستہ چلتے ہوئے سواروں کو پکارتے تھے کہ ذرا یہ بیر سینہ پر سے اٹھا کر ہمارے منہ میں ڈالدو مگر کیا ان احمقوں کی رائے کو کوئی معتبر کہیگا اور کھانے پینے کو مصیبت یا دشوار کہیگا ہرگز نہیں چنانچہ قرآن میں بھی جوع کو تو مصائب میں شمار کیا گیا ہے اکل کو مصیبت نہیں کہا گیا۔ یہ تقریر تو اس تقدیر پر تھی کہ یھد قلبہ کیلئے مفعول مقدر کیا جائے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ مقطوع عن المفعول ہو اور معنی یہ ہوں من یؤمن باللہ یحصل لہ الہدایۃ ای الوصول الی المطلوب۔ کہ جس شخص کے عقائد صحیح ہوں اسکے دلکو ہدایت ہوجاتی ہے یعنی وہ ان مصائب و حوادث کی حکم واسرار سے باخبر ہوتا ہے اسلئے اسکو مصیبت مصیبت نہیں رہتی کیونکہ کوئی مصیبت اپنی ذات سے مصیبت نہیں بلکہ محل کے اعتبار سے مصیبت ہے ممکن ہے کہ جو چیز ایک محل میں مصیبت ہو دوسرے محل میں مصیبت نہو چنانچہ قطع جلد تندرست کیلئے مصیبت ہے مگر مریض محتاج اپریشن کیلئے صحت ہے فاقہ تندرست کو مصیبت ہے اور مریض بدہضمی کیلئے راحت و صحت ہے وعلی ہذا اسی طرح یہ حوادث انفس و اموال و اولاد غیر عارف کیلئے مصائب ہیں مگر عارف کیلئے جو حکم تکوینیہ کو سمجھتا ہے مصائب نہیں۔ بہرحال تصحیح عقائد و اعمال کو تخفیف و ازالہ غم میں بڑا دخل ہے اسلئے میرا ارادہ ہوا کہ اسی کا بیان کروں اور اسکے بعد بھی اگر کچھ غم رہے تو یہ نہ کہا جائے کہ علاج سے شفا کو تخلف ہوا ہرگز نہیں غم میں خفت ضرور ہوگی اور یہی مطلوب ہے زوال مطلوب نہیں۔ اور یہاں سے میں تصوف کا بھی ایک مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اخلاق رذیلہ کا جو مجاہدہ سے علاج کیا جاتا ہے اس سے بھی تخفیف ہی مقصود ہے یعنی انکا ایسا تقاضا نہیں رہتا جو مفضی الی المعصیت ہوجاوے۔ زوال مقصود نہیں کہ مطلق داعیہ و اثر بھی نہ رہے پس مجاہدہ کے بعد اگر رذیلہ کا اثر خفیف باقی رہے تو اس سے بددل نہوں اور اسکو مجاہدہ کی ناکامی نہ سمجھیں کیونکہ تمام رذائل طبعی ہیں اور ان میں فی نفسہ مذموم کوئی نہیں بلکہ بوجہ افضاء الی المعصیت کے مذموم تغیرہ ہوجاوے ہیں اور

اگر کسی میں خلق رذیل موجود ہو مگر اس سے معصیت صادر نہو تو وہ خلق رذیل ہی نہیں نہ اسکے بقا سے غم ہونا چاہئے - یہ بات تصوف کے متعلق درمیان میں یاد آگئی تھی اسلئے اسکو حل کر دیا گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ خفیف غم کا عمر بھر باقی رہنا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ غم مطلقًا مضر نہیں ہے اگر غم فی نفسہ مذموم یا مضر ہوتا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کیلئے غم تجویز نہوتا حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کیلئے غم تجویز ہوا حضرت ایوب علیہ السلام کیلئے غم تجویز ہوا پس غم کو فی نفسہ مضر کوئی نہیں کہسکتا بلکہ افضاء الی اخلال الدین کیوجہ سے مضر ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ غم سے دنیا کا ضرر بہت ہوتا ہے جیسے ضعف یا مرض وغیرہ تو میں اسی لئے ازالہ غم کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں اور میں اسی آیت سے یہ بھی ثابت کروں گا کہ غم فی نفسہ مضر نہیں ہاں اسکا التزام ضروری ہے کہ انسان خود اپنے لئے غم کو تجویز نکرے ۔ صاحبو! عقائد اسلامیہ میں سے ہر عقیدہ کو ازالہ غم میں بڑا دخل ہے اور اسکی لم اور وجہ بیان کرنے کی مجھے ضرورت نہیں بلکہ اسلام کا بالخاصہ یہی اثر ہے کہ اس سے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے ۔

اطبا رجانتے ہیں کہ بعض اشیاء مفید بالکیفیت ہیں اور ان کے افادہ کی لم بیان ہو سکتی ہے اور بعض مفید بالخاصہ ہیں جنکی افادہ کی لم بیان نہیں ہو سکتی مثلاً مقناطیس وقوت کہربائیہ میں جو فوائد ہیں وہ سب بالخاصہ ہیں آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور زلزلہ آنے سے کچھ پہلے مقناطیس کی یہ قوت کیوں زائل ہو جاتی ہے آخر اسکی کیا لم ہے ۔ نیز اسکی کیا وجہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے گدگدی کیوں نہیں اٹھتی دوسرے ہی کے ہاتھ سے اٹھتی ہے ۔ عربی میں گدگدی کو دغدغہ کہتے ہیں شاید اسی کو بگاڑ کر گدگدی بنایا گیا ہو غرض ثابت ہوا کہ بعض اشیاء موثر بالخاصہ ہیں اسلئے انکی لم اور وجہ بیان نہیں ہو سکتی اور میرا خیال تو یہ ہے کہ ہر دوا موثر بالخاصہ ہی ہے کیفیت کا نام ہی نام ہے کیونکہ مثلاً بنفشہ کے مزاج کی جو کیفیت ہے یعنی جس درجہ میں اسکی حرارت و یبوست ہے اسی درجہ کی حار و یابس دوائیں بہت ہیں مگر وہ زکام میں گل بنفشہ کی طرح نفع نہیں کرتیں اور ہم جیسے طالبعلموں کو طب میں مہارت نہیں تو خدا نے عقل تو دی ہے اسلئے وہ طب کے

بعض مسائل میں عقلی گفتگو کر سکتے ہیں اور خیر طب کے متعلق کوئی میرا قول مانے یا نمانے لیکن عقائد و اعمال شرعیہ کے متعلق تو میں یہی کہونگا کہ سب مفید بالخاصہ ہیں اور میں اسپر قسم کھا سکتا ہوں اور کیوں نہ قسم کھاؤں اول تو مجھے اس کا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بھی نہو تا تو حق تعالیٰ کا ارشاد کافی ہے الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب ومن یؤمن باللّٰہ یھد قلبہ۔ میں نے ایک اخبار میں ابھی ایک حکایت دیکھی ہے کہ امریکہ میں یا اور کہیں ایک بہت بڑا انگریز مسلمان ہوا ہے جو بڑے درجہ کا اور بڑا مالدار آدمی ہے وہ سینما کے کمپنی میں افسر تھا جسمیں بائسکوپ اور فونوگراف کو ملا کر تماشا کیا جاتا ہے اس نے اپنے اسلام کا قصہ یہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ہمکو یہ خیال ہوا کہ مسلمانوں کی اذان کا تماشا کیا جائے اور اذان کی آواز کو بند کر کے مؤذن کا فوٹو لیا جائے چنانچہ اس غرض کیلئے ہمنے ایک عربی مؤذن کو بلایا اور ہم آلات لیکر بیٹھے اس نے اذان دینا شروع کی بس یا تو ہمنے تماشے کیلئے مؤذن کو بلایا تھا یا خود ہی تماشا بنگئے یعنی کلمات اذان سے دلپر ایک چوٹ لگی اور میری حالت ہی بدلگئی جب مؤذن اذان دے چکا تو میں نے اسکو اپنے خاص کمرے میں بلایا اور تنہائی میں اسلام کی تعلیم کو پوچھنا شروع کیا اور اس طرح اسلام قبول کر لیا۔ دیکھئے حالانکہ اس شخص نے اذان کے کلمات کو سمجھا بھی نہوگا کیونکہ اذان تو انگریزی میں نہیں ہوتی جیسے ایک سرحدی نے کہا تھا کہ اذان پشتو میں ہوتی ہے وہ بیچارہ ہندوستان آیا تھا اردو سمجھتا نہ تھا اور پشتو کوئی بولتا نہ تھا اسلئے بڑا پریشان ہوا ایک مدت کے بعد تنگ ہو کر کہنے لگا کہ یہاں کوئی پشتو نہیں جانتا البتہ صرف دو چیزیں پشتو میں ہوتی ہیں ایک تو اذان پشتو میں ہوتی ہے دوسرے کتے پشتو میں بھونکتے ہیں (کیونکہ سرحد اور ہندوستان کی اذان یکساں تھی اور دونوں جگہ کے کتے بھی ایک ہی طرح بھونکتے ہیں ۱۲) تو کوئی ایسا عقلمند ہو تو اسکے نزدیک اذان انگریزی اور پشتو میں ہو سکتی ہے ورنہ اذان تو سب جگہ عربی میں ہوتی ہے اور عربی کو انگریز کیا سمجھے خاصکر تماشا کمپنی کا ملازم۔ اور اگر سمجھا بھی ہو تو اذان ایک مختصر کلام ہے جو محض اعلان نماز کیلئے اسلام میں مقرر کیا گیا ہے نہ اسمیں دلائل و براہین ہیں نہ کوئی طویل مسئلہ ہے ہاں اللہ تعالیٰ

کی عظمت و کبریائی کیساتھ اسلام کے اصل الاصول توحید و رسالت کا اعلان ہے مگر اسی کا دیکھئے کیسا اثر ہوا۔ پھر جو مؤذن سینما کمپنی میں اجرت پر اذان دینے آیا ہوگا اس کی معلومات کا حال بھی معلوم ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکے معلومات کیا ہوں گے پھر اس اذان میں اخلاص بھی نہ تھا چند پیسوں کیلئے بے محل اذان تھی مگر ایک کافر کو ہدایت کرنیکے لئے اسلام کا اس شان کا ادنیٰ مؤذن بھی کافی ہے بشرطیکہ مخاطب کی طبیعت میں سلامتی اور انصاف ہو اور اس سے اندازہ کیجئے کہ زیادہ اور خالص علوم اسلامیہ کی تو کیا شان ہوگی ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

سو وہ نومسلم انگریز لکھتا ہے کہ مجھے اس مؤذن سے تعلیمات اسلام کا جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اسی سے مجھے اسلام کی طرف میلان شروع ہوا اور بالآخر میں نے اسلام قبول کر لیا اب اسلام کے بعد اس کا کیا حال ہوا وہ لکھتا ہے کہ میں اسلام کی اور برکات کو تو بیان کرنا طویل ہے ایک ظاہر اور کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ جو سکون و راحت میرے قلب کو اسلام کے بعد حاصل ہوا ہے یہ کبھی حاصل نہ تھا مجھے اس سکون و راحت کی خواب میں بھی زیارت نہوئی تھی وہ لکھتا ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد اب میری یہ حالت ہے کہ تمام دن اکیلا کمرہ میں پڑا رہتا ہوں اور اسلام کی حلاوت کے مزے لیتا ہوں بس میں ہوں اور خدا کی یاد ہے نہ کسی سے ملنے کی خواہش رہی نہ سیر و تفریح کی نہ مال کی محبت رہی نہ مکانات و جائداد کی۔ ہائے! جو شخص عمر بھر لہو و لعب میں مشغول رہا اب دفعۃً اسکی وہ حالت ہوگئی کہ ؎

خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجت ست　　چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت ست

صاحبو! دل صاف ہو جائے تو اسی کے اندر ایسی بہار نظر آتی ہے کہ کسی باغ اور تفریح گاہ کی طرف التفات نہیں ہوتا مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر عقل یکدم با خود آر　　دمبدم در تو خزاں ست و بہار

اور ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

ستم اگر بدست کشد کہ بسیر سرو سمن در آ　　تو ز غنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا بچمن در آ

۳۲

اور جس کو یہ دولت حاصل ہوا اُسکو کسی تکلیف اور مصیبت کی پرواہ نہیں رہتی بلکہ وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے کیونکہ اسکو ایک بڑی دولت حاصل ہے جسکے یہ خواص ہیں ؂

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ	جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں	فوق گردون ست نے قعر زمیں
با تو دوزخ جنت ست اے جاں فزا	بے تو جنت دوزخ ست اے دلربا

غرض اسلام سے یہ دولت حاصل ہوتی ہے کہ بندہ کو خدا مل جاتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؂

اتصالے بے تکیف بے قیاس	ہست رب الناس را با جان ناس

اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جاہل صوفیہ کی طرح یوں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھارے دل میں سما جائیگا اور نعوذ باللہ وہ انسان کے دل میں اتر آئیگا اور جہلاء صوفیہ نے اس دعوی پر آیت وفی انفسکم افلا تبصرون سے استدلال کیا ہے جس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ خدا تمھارے اندر ہے پھر کیا دیکھتے نہیں ہو مگر یہ استدلال و ترجمہ غلط محض ہے کیونکہ وفی انفسکم معطوف ہے وفی الارض پر جو آیت سابقہ میں ہے وفی الارض ایات للموقنین اور معنی یہ ہوئے کہ زمین میں اہل یقین کیواسطے نشانیاں ہیں اور تمھاری ذات میں بھی نشانیاں ہیں پھر کیا دیکھتے نہیں ہو۔ غرض میرا وہ مطلب نہیں جو ان جاہلوں کا ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بندہ کو خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کو بندہ سے خاص تعلق قرب و رضا کا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت اور حالت ہم بیان نہیں کر سکتے اور قرب کا ثبوت نصوص میں موجود ہے ونحن اقرب الیہ من حبل الورید ونحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون ہ (اور یہ محض قرب علمی نہیں ہے کیونکہ وہ قرب مبصر نہیں جسکی مخاطب سے نفی کیگئی معلوم ہوا کہ یہ کوئی دوسرا قرب ہے جو ابصار کا متعلق ہو سکتا ہے ۱۲) غرض محققین عارفین کو جو اثر اسلام کا مشاہد ہوتا ہے وہ اثر اس نومسلم کو ابھی سے حاصل ہو گیا اور یوں دیکھا گیا ہے کہ نو مسلموں کو اسلام کا اثر زیادہ مشاہد ہوتا ہے گو نعمت ہمارے اوپر زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پشتہا پشت سے ہمکو مسلمان کیا ہے کیونکہ اسلام سے زیادہ مناسبت ہمکو ہی ہے نومسلم کو مناسبت دیر میں حاصل ہوگی مگر اُس کے اثر کا مشاہدہ

۳۴

نومسلم کو ہمسے زیادہ ہوگا بھائی کے یہاں ایک کارندہ تھے حاجی عبدالرحیم جنکا اب انتقال
ہوگیا ہے وہ کہتے تھے کہ ہم جب شروع شروع اسلام لائے ہوئے تھے کہ ابھی تک اس کا اظہار
بھی کسی پر نکیا تھا اور اسوقت چھپکر نماز پڑھا کرتے تھے اسوقت کی نماز میں جو لطف
آتا تھا وہ لطف پھر نہیں آیا بات یہ ہے کہ اسوقت دولت نئی نئی ملی تھی اسلئے زیادہ
لطف تھا جیسے ذاکرین کو ابتدائے سلوک وابتدائے ذکر میں بہت ذوق وشوق ولذت
وکیفیت حاصل ہوتی ہے بعد میں یہ بات نہیں رہتی مگر ذکر سے مناسبت بڑھ جاتی ہے
اسی طرح نکاح میں اول اول بڑی لذت آتی ہے جو بعد میں نہیں آتی مگر مناسبت بعد ہی میں
بڑھتی ہے اور ابتدا میں گونہ اجنبیت ہوتی ہے ۱۲ع پس وہ انگریز لکھتا ہے کہ حقانیت اسلام
کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس سے اطمینان کامل وسکون وراحت دل حاصل ہوتی ہے اسلام
کی برابر کسی چیز میں دل کی راحت اور سکون وچین نہیں۔ میرا مقصود تو اس حکایت
ہی سے حاصل ہوگیا کیونکہ مجھے اسوقت یہی بیان کرنا تھا کہ ازالۂ غم کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام
کو کامل کرو اسطرح کہ عقائد شرعیہ کو مستحضر رکھو اور احکام شرعیہ کی پابندی کرو۔ کرکے
دیکھو انشاء اللہ راحت سے رہوگے لیکن باوجود مقصود حاصل ہوجانیکے اسوقت میں ذرا تفصیل
سے اس مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہوں جسکی وجہ اور غرض اوپر معلوم ہوچکی ہے۔ پہلے میں
آیت کا ترجمہ کردوں پھر مقصود کی تقریر کرونگا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ کیلئے ہی سلطنت
آسمان وزمین کی وہی زندہ کرتے ہیں وہی مارتے ہیں اور تمھارے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست
اور مددگار نہیں یہ تو ترجمہ ہوا رہا یہ کہ اسکو ماقبل سے ربط وتعلق کیا ہے۔ سو بظاہر اس کا ربط
ماقبل سے غامض ہے کیونکہ اسکے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ مذکور ہے
وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ
عدو للہ تبرأ منہ ان ابراھیم لاواہ حلیم۝ کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کیلئے استغفار
کرنا صرف ایک وعدہ کی بناء پر تھا جو اس سے کرلیا تھا پھر جب یہ معلوم ہوگیا کہ وہ خدا کا
دشمن ہے (اور کفر ہی پر خاتمہ ہوا ہے ۱۲) تو حضرت ابراہیم نے اس سے بیزاری ظاہر کی

ع اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے لذت نفسانی کا مدار ہی اجنبیت پر ہے ۱۲ جامع۔

اور اس سے پہلے حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مشرکین کیلئے استغفار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان حضرات انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کو رحمت و شفقت اسقدر تھی کہ اپنے ستانیوالوں سے بھی شفقت ہی کا برتاؤ کرنا چاہتے تھے کہ اُن کیلئے استغفار کرنیکو تیار ہو گئے تھے اور اس کا منشا یہ تھا کہ اسوقت صرف رحمت پر نظر تھی اور اللہ تعالےٰ کی سب حکمتوں پر اسقدر نظر نہ تھی جتنی بعد نزول آیات و احکام کے ہوئی اور اسمیں کچھ نقص نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علوم بھی وحی سے تدریجاً بڑھتے تھے اور قبل وحی اُن کے علوم کی وہ شان نہ تھی جو بعد وحی کے ہوئی چنانچہ خود نص میں ہے وعلمک مالم تکن تعلم اور ایک مقام پر ارشاد ہے وقل رب زدنی علما اور ایک جگہ تو ایسا ارشاد ہے کہ اسکو تو ہم لوگ زبان سے کبھی نہ کہہ سکتے تھے ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان کہ آپ کو وحی سے پہلے کچھ خبر نہ تھی کہ کتاب کیسی ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔ اس سے یہ شبہ نکیا جائے کہ نعوذ باللہ قبل از وحی حضور کا خلو عن الایمان لازم آتا ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ آیت میں صرف علم و خبر کی نفی کیگئی ہے وجود ایمان کی نفی نہیں کیگئی اور عدم علم مستلزم عدم وجود کو نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک چیز ہو مگر اسکو اسکی خبر نہو کہ میرے پاس یہ چیز ہے جیسے ایک شخص کو جس نے جواہرات کبھی نہیں دیکھے تھے ہیرا یا قوت کہیں سے ملجائے تو یہ بات صادق ہے کہ اسکے پاس ہیرا یاقوت ہے مگر اسکو خبر نہیں۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام میں وہ کیفیت نبوت سے پہلے بھی موجود ہوتی ہے جسکو ایمان کہا جاتا ہے مگر نبوت سے پہلے یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس کیفیت کا نام ایمان ہے بعد نبوت کے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت تو بہت بڑی نعمت ہے اسی کا نام ایمان ہے۔ غرض نبوت و وحی سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بعض امور کا علم نہونا پھر وحی سے علم حاصل ہونا نقص نہیں بلکہ عین کمال ہے کیونکہ اس سے بڑھکر کیا کمال ہوگا کہ آپ کے علوم بلا واسطہ حق تعالیٰ کی وحی سے ماخوذ ہیں عقل و قیاس یا تعلیم بشر پر انکی بنیاد نہیں مگر جو لوگ حضور کو نعوذ باللہ الٰہ بنانا چاہتے ہیں وہ اس بات کے ملنے کو تیار نہونگے لیکن میں اُن سے کہتا ہوں کہ تم اگر آپ کو الٰہ بناؤ گے تو الٰہ ناقص

بناؤ گے اور ہم آپکو انسان کہتے ہیں مگر انسان کامل کہ حضور بشر تو ہیں مگر ایسے جیسے ایک بزرگ نے کہا ہے بشر لا کالبشر بل ھو کالیاقوت بین الحجر یعنی آپ بشر تو ہیں مگر اور آدمیوں کی طرح نہیں بلکہ ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یاقوت پتھر تو ہے مگر ایسا پتھر جسکو دیکھکر کوئی یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ پتھر ہے اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انسانوں کیساتھ نوع یا جنس ہیں تو اشتراک ہے مگر صنف ایسی ممتاز ہے کہ کسی کو دھوکہ ہو سکتا ہے کہ آپ بشر نہیں کچھ اور ہیں اسی لئے بعض مغلوب العشق ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو شانِ بشریت سے ارفع ہیں چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

بمقامیکہ نشانِ کفِ پائے تو بود ۔۔۔ سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

مگر ایک بات سمجھ لینا چاہیئے کہ سجدہ علی القدم اور سجدہ للقدم میں فرق ہے یعنی کسی جگہ ہم اسلئے نماز پڑھنا کہ حضور نے یہاں نماز پڑھی ہے یہ سجدہ علی القدم ہے یہ حرام نہیں بلکہ اتباع سنت ہے اور سجدہ للقدم یہ ہے کہ آپ کا قدم یہاں پڑا ہے اسلئے اس جگہ کو سجدہ کرو یہ حرام ہے مگر یہ شاعر غلبۂ عشق میں کہہ رہا ہے اسلئے تکفیر نکیجائے (نیز چونکہ اسکے کلام میں سجدہ علی القدم کے مراد ہونیکا بھی احتمال ہے گو بعید سہی اسلئے تکفیر سے احتیاط لازم ہے ۱۲) اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دوسروں کی مثل نہ ہونا نصوص میں مصرح ہے حضور نے تو فرمایا ہی ہے ایکم مثلی مگر قرآن میں بھی اس مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے حق تعالےٰ فرماتے ہیں یانساء النبی لستن کاحد من النساء کہ اے ازواج رسول تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو یہ حضور کی ازواج کے متعلق ارشاد ہے اور ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات کی یہ شان محض اسوجہ سے ہے کہ وہ حضور کی ازواج ہیں تو اس سے یہ بات لازم آگئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مثل کوئی بشر نہیں حضور کی اسی شان امتیازی سے بعض لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے اور وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور آیت یانساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن پر یہ اشکال نکیا جائے کہ آیت عسیٰ ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجا خیرا منکن مسلمات مؤمنات قانتات الآیۃ اسکے معارض ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کی مثل بلکہ ان سے

بہتر دوسری عورتیں ہو سکتی ہیں جبھی تو یہ ارشاد فرمایا گیا اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
تو طلاق دیدیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو تمھارے بدلہ میں تم سے بہتر عورتیں دیدیں گے جواب
اس کا یہ ہے کہ ازواج مطہرات کی فضیلت تو حضور کے نکاح میں رہنے ہی کی وجہ سے
ہے اب ظاہر ہے کہ اگر حضور ان کو طلاق دیدیتے اور دوسری بیبیوں سے نکاح کر لیتے
وہ آپ کے نکاح کی وجہ سے اب وہ ان سے افضل ہو جاتیں بہرحال رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم کا بےنظیر و بےمثال ہونا حدیث و قرآن دونوں سے ثابت ہے مگر اسمیں اتنا
غلو نکرو کہ حضور کو اللہ کہو بلکہ عبد کامل کہو اور یہاں سے میں اس مسئلہ پر بھی تنبیہ کرتا ہوں
کہ عشق کی تمنا نکرو ہاں محبت کی تمنا کرو کیونکہ عشق میں حدود کی رعایت فوت ہو جاتی ہے عاشق
کی زبان بیقابو ہو جاتی ہے جن لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں غلو
کیا ہے وہ اہل عشق ہی تھے عاشق کی زبان کے بیقابو ہو جانے پر ایک حکایت یاد آئی کہ
حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ایک پرندہ نے مادہ سے کہا کہ اگر تو میرا جوڑہ بنجائے
تو میں تجھے سلطنت سلیمان دیدونگا حضرت سلیمان نے سن لیا اور وہ منطق الطیر کے عالم تھے
اسلئے مطلب بھی سمجھ لیا فوراً بلایا اور فرمایا او گستاخ یہ کیا بدتمیزی تھی؟ اُس نے کہا حضور
میں عاشق ہوں اور عاشق کی زبان بیقابو ہوتی ہے وہ عشق میں جو چاہے بکتا ہے حضرت
سلیمان عم اس جواب پر ہنس پڑے اور اُسکو چھوڑ دیا اسی طرح امید ہے کہ عشاق کو رب سلیمان
بھی چھوڑ دیگا اسلئے تم اُنکو برا نکہو ہاں اُنکی تقلید بھی نکرو نہ اُن کی حالت کی تمنا کرو۔ یہ گفتگو
اسپر چلی تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علوم میں وحی سے ترقی ہوئی ہے اسلئے بعض
اوقات صرف ایک پہلو پر نظر ہوئی جو داعی ہو گیا استغفار للمشرکین کی طرف اور وحی نازل ہونے سے
دوسرے پہلو کی خبر ہوئی۔ اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کے علوم
کو تدریجاً کیوں کامل کیا ایک دم ہی سے کامل کیوں نکر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اسپر بھی قادر ہیں
کہ سب علوم ایک دم سے عطا فرما دیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی استعداد بھی کامل
تھی پھر تاخیر کیوں ہوئی اسکے چند جواب ہیں ایک یہ کہ کوئی حکمت ہوگی جو ہمکو معلوم نہیں دوسرا
جواب اپنے ایک واقعہ کو بیان کر کے دوں گا ایک دفعہ مجھے طریق کے متعلق کچھ پریشانی پیش

آئی اور اُسوقت یہ خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو اسپر بھی قادر ہیں کہ ہمکو اسیوقت وصال عطا فرمادیں
ایک مقدمہ اثبات قدرت ہوا۔ اور اُنکو ہماری طلب کا حال بھی معلوم ہے خواہ ناقص ہو
یا کامل مگر طلب تو ہمارے اندر ہے ہی یہ دوسرا تیسرا مقدمہ ہوا اثبات علم اثبات طلب
پھر وصال میں تاخیر کیوں ہے اس خیال کے بعد میں نے مثنوی بطور فال کے کھولی (میرا یہ
عقیدہ نہیں کہ مولانا آکر ورق کھول جاتے ہیں بلکہ محض برکت و تسلی کیلئے اس سے فال لینے لگا
اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ کوئی تسلی بخش جواب ظاہر فرمادیں) تو سرورق ہی پر یہ اشعار نکلے جنمیں
بعینہ میرا سوال بھی مذکور تھا اور اُس کا جواب بھی مسطور تھا فرماتے ہیں ؎

چارہ می جویدپئے من درد تو ٭ می شنودم دوش آہ سرد تو

یہ گویا حق تعالیٰ کیطرف سے خطاب ہے کہ ہم تمہاری آہ سرد سن رہے ہیں اور مجھے تمہارے
درد و طلب کی بھی خبر ہے اسمیں اپنے علم کو اور ہماری طلب کو تسلیم کرکے دو مقدموں کو مان لیا
گیا کہ یہ مقدمات صحیح ہیں ؎

می توانم من کہ بے ایں انتظار ٭ رہ نمایم وادہم راہ گذار

اسمیں تیسرے مقدمہ کو تسلیم کرلیا گیا کہ یہ بھی صحیح ہے میں اسپر قادر ہوں کہ بدون تاخیر کے
اسی وقت تمکو وصال سے سرفراز کردوں ؎

تاازیں طوفان دوراں وارہی ٭ برسر گنج وصالم پانہی

اسکے بعد فرماتے ہیں کہ یہ سب مقدمات تو صحیح ہیں لیکن ایک مقدمہ اور بھی اسکے ساتھ ملاؤ
جو تمہاری نظر سے مخفی رہ گیا ہے وہ کیا ؎

لیک شیرینی و لذات مقر ٭ ہست بر اندازۂ رنج سفر

آنگہ از فرزند و خویشاں برخوری ٭ کز غریبی رنج و زحمتہا بری

اُس مقدمہ کا حاصل اثبات حکمت ہے یعنی حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ مقصود جلدی عطا
نکیا جائے کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ مستقر پر پہونچنے کی قدر زیادہ اُسکو ہوتی ہے جسکو سفر میں
تکلیف زیادہ ہوتی ہو اُسی کو گھر پہونچنے کی لذت کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اور جس کو
سفر میں کلفت ہی نہ ہوئی ہو اسکو گھر اور باہر دونوں یکساں ہونگے تو وہ وصول الی المستقر کی

قدر نکرے گا کیونکہ ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد   گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

ہمنے سنا ہے کہ بعض عورتیں اولاد سے گھبرا کر کہتی ہیں کہ اے اللہ کیا سارے بچے
میرے ہی واسطے پھٹ پڑے ای اللہ بس اب بند کر دے اور جسکے اولاد نہیں ہوئی وہ
کہتی ہے کہ چاہے چوہے کا بچہ ہی ہوجائے یا ہو کر فوراً ہی مرجائے مگر میرا نام ہوجائے کہ
ہاں اسکے بھی اولاد ہوئی تھی جسکے اولاد نہوتی ہو اُسکو تمنا کے بعد بچہ مل جائے تو اسکی
بڑی قدر کرتی ہے چاہے کیسا ہی برا ہو۔ کانپور میں ایک عورت کا بچہ ایسا کالا تھا جیسے
حبشی مگر اُس سے اسقدر محبت تھی کہ کھلاتے ہوئے یوں کہتی تھی کہ ماشاء اللہ ایسا ہے
جیسا چیونٹا اُسکی سیاہی ایسی محبوب تھی کہ اُسکو نظر لگ جانیکے ڈر سے ماشاء اللہ کہا کرتی
تھی۔ ایک شاعر اپنے محبوب کی تعریف میں جسکے بدن پر پھٹا ہوا کرتہ تھا کہتا ہے ؎

لا تعجبوا من بلی غلالته   قد زر ازراره علی القمر

اسی طرح ایک شاعر کے معشوق کے چہرہ پر چیچک کے سیاہ سیاہ داغ تھے لوگوں نے ملامت
کی کہ اس سے محبت کیسی؟ تو وہ اُسکی تعریف میں لکھتا ہے ؎

شربت قندست درو ی تخم ریحاں ریختہ

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ قدر اُسی نعمت کی ہوتی ہے جو مشقت سے ملے تو حکمت اسی میں
ہے کہ سب علوم و حکم ایک دم سے عطا نہوں بلکہ تدریجاً عطا کئے جائیں یہ جواب تھا میرے
سوال کا جو مثنوی سے نکلا اور گو یہ جواب پہلے جواب کے قریب ہی ہے مگر اتنا فرق ہے کہ پہلے
جواب میں کسی حکمت کا علی التعیین ذکر نہ تھا اسمیں حکمت معینہ کا ذکر بھی ہے اب چاہے یہی حکمت
ہو یا اور حکمتیں ہوں حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ علوم میں شیئاً فشیئاً تزاید ہوا کرے بہرحال
صحابہ کی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر اول رحمت پر تھی حکمت پر نظر نتھی اسلئے آپنے
اور صحابہ نے مشرکین کیلئے استغفار کیا جب اس سے ممانعت نازل ہوئی تو حکمت پر نظر ہوئی
اور تزائد علوم تدریجاً میں ایک اور حکمت میری سمجھ میں ابھی آئی ہے وہ یہ کہ اگر آپ کے علوم
تدریجاً متزاید نہوتے بلکہ شروع ہی سے رحمت و حکمت دونوں پر نظر ہوتی تو آپ کی شفقت

ورحمت کا اس درجہ ظہور نہوتا جیسا کہ اب ہوا کیونکہ اُس حالت میں آپ کفار کیساتھ رحمت وشفقت اسدرجہ نفرماتے کہ اُن کیلئے دعا کرنے لگتے اور اُنکی بدحالی پر رنج وافسوس کرتے حالانکہ اسمیں بھی حکمت تھی کہ آپ کی اس شفقت ورحمت بے انتہا کا ظہور ہو کیونکہ اس سے بہت سے کفار پر تو یہ اثر ہوا کہ وہ اسکو دیکھکر حضور کی نبوت کے قائل ہوگئے۔ اور ہمارے اوپر یہ اثر ہوا کہ ہمکو آپ سے بہت کچھ امیدیں ہوگئیں کہ ؎

دوستانرا کجا کنی محروم ٭ توکہ با دشمنان نظر داری

ان حکمتوں کا ظہور جبھی تو ہوا کہ آپ کے علوم میں تزاید تدریجی ہوا ورنہ واقعات شفقت ورحمت کا اس شان سے ظہور نہوتا جس شان سے اب ہوا۔ اسی لئے ملا دوپیازہ نے اپنے ال نامہ میں کہا ہے۔ الرسول خیرخواہ دشمنان واقعی سچ کہا رسول کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں سے بھی خیرخواہی کرتے ہیں۔ اور یہی راز ہے زلات انبیاء کا کہ اسمیں بھی حکمتیں ہوتی ہیں جنمیں بڑی حکمت وہی ہے کہ اُن سے تزاید علوم تدریجا ہوتا ہی سو حضرات انبیاء علیہم السلام کیلئے زلات موجب تنزل نہیں ہوتیں بلکہ ترقی کا سبب ہوتی ہیں ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زلت میں ترقی معرفت تھی کیونکہ ابتک آپنے بعض صفات جمال ہی کا مشاہدہ کیا تھا صفت جلال کا جیسے منتقم اور بعض صفات جمال کا جیسے تواب کا مشاہدہ اس زلت کے بعد ہی ہوا اور یہی ترقی ہی کہ جن صفات الٰہیہ کا مشاہدہ پہلے نہ تھا اب ہو گیا۔ غرض حکمتوں کا احاطہ کون کر سکتا ہے بطور نمونہ کے اسوقت چند باتیں بتلادی ہیں لیکن یہاں ایک اور سوال ہوتا ہی وہ یہ کہ یہ تو مسلم کہ حضور کے علوم میں تزاید تدریجی ہوا اور ابتدا میں آپ کی نظر رحمت پر تھی لیکن رحمت کا ظہور اس صورت سے کیوں ہوا کہ اقربا مشرکین کیلئے آپنے دعا فرمائی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال بیجا ہے کیونکہ جس صورت سے بھی ظہور ہوتا اسمیں یہی سوال ہو سکتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسی صورت سے ظہور ہونا چاہیے تھا جس میں ممانعت نہوتی تو ہم کہتے ہیں کہ اس صورت ہی میں کیا حرج ہوا یہ فعل بعد ممانعت ہی کے تو ممنوع ہوا اس سے پہلے تو مباح تھا پھر فعل مباح میں کیا حرج ہوا۔ بس یہ سوال گو بیجا ہے مگر میں تبرعاً اسکی حکمت بھی بتلائے دیتا ہوں وہ یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت ملتی جلتی ہے

اسی لئے درود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کما صلیت علی ابراہیم و علی
آل ابراہیم جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء سابقین میں درجہ صلوٰۃ حضرت ابراہیم
علیہ السلام ہی کیلئے عطا ہوا ہے ورنہ سلام تو سب انبیاء پر ہوا ہے سلام علی موسیٰ
وھرون ۔ سلام علی نوح فی العلمین ۔ سلام علی الیاسین ۔ اور اسی مشابہت
شانین کی وجہ سے حضور کی شریعت کو ملت ابراہیمیہ سے بہت مشابہت ہو اسی لئے
اتباع ملت ابراہیم کا آپکو امر ہوا ۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے مشرک باپ کیلئے استغفار
کیا تھا حضور نے بھی انکی اس سنت کا اتباع فرمایا رہا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے پھر تو تبری
فرمادی تھی جواب اسکا یہ ہے کہ آپ کو اس تبری کی اطلاع وقت استغفار کے نہ تھی اس
اطلاع کے بعد پھر آپ نے استغفار نہیں فرمایا ۔ اور قبل اس اطلاع کے آپنے بعض اقرباء مشرکین
کیلئے اقتداءً بابراہیم علیہ السلام استغفار فرمایا ۔ اسلئے حق تعالیٰ نے درمیان میں اس شبہ کو
دفع دخل کے طور پر رفع فرمادیا وما کان استغفار ابراہیم لابیہ الا عن موعدۃ
وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرأ منہ ان ابراہیم لاواہ حلیم ۝
کہ حضرت ابراہیم کا اپنے باپ کیلئے استغفار فرمانا بوجہ وعدہ کے تھا کہ وہ باپ سے وعدہ کر چکے
تھے دوسرے وہ رقیق القلب بہت تھے ۔ اسکے بعد ارشاد ہے وما کان اللہ لیضل قوما
بعد اذ ھدٰھم حتی یبین لھم ما یتقون کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں کہ کسی قوم
کو ہدایت کے بعد گمراہ کردے جب تک کہ ان کیلئے ما یتقون کو بیان نکردے ۔ اسپر یہ
شبہ نہو کہ حنفیہ کے یہاں تو توحید بدون ارسال رسول کے بھی واجب ہے اور اسکے ترک
سے ضلال و عذاب کا وقوع ہوگا جواب یہ ہے کہ یہاں پر یبین فرمایا ہے یوحی تو
نہیں فرمایا اور بیان ارسال رسول پر موقوف نہیں عقل سے بھی ہو سکتا ہے پھر اسکے متعلق
بعض فروع ہیں مثلاً یہ کہ کسی شخص کی عقل کامل نہو اور وہ مجنون و معتوہ بھی نہیں لیکن اسکی
عقل تنہا بدون رسول کے توحید کے پہچاننے کو کافی نہیں اسکو عذاب ہوگا یا نہیں اسمیں اختلاف ہے
بعض اسطرف گئے ہیں کہ ایسے شخص کو عذاب نہوگا گو وہ عاقل ہے مگر قلت عقل کی وجہ سے
معذور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ عذاب ہوگا ۔ اور یہ مسئلہ وما کنا معذبین حتی نبعث

رسولا کے معارض نہیں کیونکہ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اسمیں عذاب دنیا مراد ہے
اور گفتگو عذاب آخرت میں ہے مگر یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ نفی عذاب دنیا بدرجہ اولی
مستلزم ہے نفی عذاب آخرت کو کیونکہ عذاب دنیا اہون ہے جب بدون بعث رسل
کے عذاب دنیا نہیں ہوتا تو عذاب آخرت بدرجہ اولی نہ ہوگا اور جواب ثانی یہ ہے کہ یہاں
رسول عام ہے عقل کو بھی اور پیغمبر کو بھی۔ یہ اس مسئلہ کے چند فروع ہیں ان کے علاوہ اور
بھی فروع ہیں مگر میں نے اجمالاً اشارہ کر دیا ہے اب قابل غور یہ امر ہے کہ اس آیت کو پہلی
آیت سے کیا ربط ہے بظاہر کچھ ربط نہیں معلوم ہوتا اور میں نے دیر تک غور کیا کچھ سمجھ میں
نہ آیا تو اپنی تفسیر دیکھی اسمیں عجیب ربط بیان کیا ہے تفسیر لکھتے کے وقت اللہ تعالیٰ نے
کچھ ایسی امداد فرمائی تھی کہ عجیب عجیب علوم قلب پر فائض ہوئے تھے تو وہاں یہ ربط لکھا ہے
کہ اوپر کی آیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر ایک خطرہ وارد ہو سکتا تھا کہ شاید
استغفار سابق کی وجہ سے ہمسے معصیت کا صدور ہو گیا ہو ہر چند کہ اس سے پہلے استغفار
للمشرک نہی عنہ نہ تھا مگر بعد نزول نہی کے یہ وسوسہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ پہلے ہی سے قبیح
وغیرہ ہو اور صدور قبیح سے خطرہ لازم ہے مگر اسکو ہم اور آپ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ہمپر خوف و
خشیت کا غلبہ نہیں ہے جنپر خشیت کا غلبہ ہے اُن کی یہ حالت ہے کہ ہمارے ایک دوست
مولوی صادق الیقین صاحب مرحوم کہتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہیں اللہ تعالیٰ مجھسے یوں
نہ فرمائیں کہ تو اتنا زیادہ متقی کیوں تھا اور لوگ تو قلت تقوی سے ڈرتے ہیں اُنکو زیادت تقوی
سے خطرہ تھا اسکو ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر بات فی نفسہٖ صحیح ہے کیونکہ شریعت میں ہر شے کی حد ہے
تقویٰ کی بھی ایک حد ہے۔ اطاعت کی بھی ایک حد ہے۔ خاطر و مدارات کی بھی ایک حد ہے،
چنانچہ ایک شخص نے اپنے مہمان سے پوچھا کہ آپکو کوئی تکلیف تو نہیں ہے کہا نہیں اُس نے
پھر پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے کہا نہیں اُس نے بار بار اسی بات کی رٹ لگائی کہ کوئی تکلیف
تو نہیں ہے۔ مہمان نے کہا کہ ابتک تو کوئی تکلیف نہ تھی مگر اب ہے۔ واقعی کسی سے ایک ہی بات

ع قلت وہذا ایضا ضعیف فان بعث الرسول لا یطلق علی اعطاء العقل فلفظ البعث آب عنہ اشد الاباء ۱۲ منہ
والجواب ان الآیۃ لبیان العادۃ الالٰہیۃ انہ تعالیٰ لا یعذب قوما قبل بعث الرسول و لا کلام فیہ وانما الکلام فی جواز التعذیب قبلہ

دس دفعہ کہی جائے تو وہ گھبرا جائیگا جیسا کہ غدر کے قبل ہمارے قصبہ میں ایک مجلس بٹرارہ کے نام سے قصبہ کے لڑکوں اور شہدوں نے قائم کی تھی جس کا ایک مقصود یہ بھی تھا کہ بستی میں جو واقعات و معاملات پیش آئیں اُن کا انتظام کیا جائے چنانچہ اس مجلس میں بہت سے معاملات کا فیصلہ بھی ہوا کرتا تھا اس مجلس کے بعض عہدہ داروں کو میں نے بھی دیکھا ہے کوئی لفٹنٹ گورنر تھا کوئی کلکٹر کوئی ڈپٹی کلکٹر کوئی جج کوئی صدر اعلیٰ۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں قصبہ کے اندر باہر سے کوئی میانجی آگئے جو فارسی اچھی جانتے تھے بستی کے میانجی کو اُن سے خطرہ پیدا ہوا کہ شاید میری جگہ انکو نہ مل جائے اسلئے اُس نے اس مجلس میں باضابطہ درخواست دی کہ بستی میں ایک نیا میانجی آگیا ہے جسکی وجہ سے مجھے اپنی روزی کا خطرہ ہے اسکے لئے مناسب انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یہ مسئلہ کمیٹی میں پیش ہوا اور فیصلہ کر دیا گیا کہ اس نو وارد کو شہر سے نکالدیا جائے۔ اور ایک لڑکے کو متعین کیا گیا کہ اس کام کو تم انجام دو۔ چنانچہ اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ آج صبح کو سویرے کھانا پکا دینا میں ایک کام کو جاؤں گا پھر صبح ہی کھانا ساتھ لیکر اُس مسجد میں جا پہونچا جہاں وہ میانجی نماز پڑھتے تھے جب وہ مسجد سے باہر آنے لگے اُنکو سلام کیا انھوں نے جواب دیا تھوڑی دیر میں سامنے جاکر پھر سلام کیا انھوں نے پھر جواب دیا تھوڑی دیر کے بعد پھر سلام کیا پھر جواب دیدیا اسکے بعد پھر سلام کیا تو میانجی جھلا گئے کہ یہ کیا لغو حرکت ہے اب یہ دل میں خوش ہوئے کہ ہاں بس اب کام مار لیا۔ اس نے کہا حضور میں سلام ہی تو کر رہا ہوں گالیاں تو نہیں دیتا پھر آپ جھلاتے کیوں ہیں میرے سلام کا جواب دیجئے انھوں نے پھر جواب دیا اور اس نے پھر سلام کیا آخر میانجی گھبرا کر اپنے جائے قیام میں جلنے لگے اُس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو میرے سلام کا جواب دو۔ حافظ صاحب بولے میاں مجھے اپنے کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ کہا اس سے بےفکر رہئے میرے پاس کھانا بہت ہے دونوں کھالیں گے بس آپ یہیں تشریف رکھیں اور میرے سلام کا جواب دیتے رہیں دونوں نیک کام میں مشغول رہیں گے۔ غرض سلام ہی سے اُنکو پریشان کر دیا اب اُنکو سوا اسکے کچھ نہ سوجھا کہ اپنا بستر سمیٹ کر قصبہ سے چلدیئے تو دیکھئے سلام اچھی چیز ہے اور راحت و خوشی کی چیز ہے مگر جب حد سے بڑھ جائے تو عذاب و کلفت

کا سبب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص نے ہمزاد کو تابع کیا تھا اُس نے اول ہی حاضری میں پوچھا کہ بتلاؤ کیا کام ہے اس نے ایک کام بتلادیا اُسکو پورا کر کے پھر آموجود ہوا کہ اور کیا کام ہے اس نے دوسرا کام بتلادیا اُسکو ختم کر کے پھر پوچھا بتلاؤ کیا کام ہے اگر یہ سوتا ہوا تو جگا کر پوچھتا بتلاؤ کیا کام ہے۔ یہ بڑا پریشان ہوا کہ کیا بلا پیچھے لگی مگر تھا ہوشیار آدمی اس نے اپنے مکان کے صحن میں ایک بلی گاڑدی جب کوئی کام نہ ہوتا اور وہ پوچھتا کہ بتلاؤ کیا کام ہے تو کہدیتا کہ اس بانس پر چڑھو اور اترو یہی کام کرتے رہو جب تک کہ ہم دوسرا کام بتلائیں۔ تو اطاعت کی بھی ایک حد ہے جب اُس سے تجاوز ہو جائے تو وہ اطاعت باقی نہیں رہتی۔ اسی کو مولوی صادق الیقین صاحب سمجھے صوفیہ اور فقہاء نے بھی اسکو سمجھا ہے اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص گیہوں کے ایک دانہ کی تعریف و تشہیر کرے اُسکو تعزیر کیجائے (یعنی سزادی جائے) اس کا منشا وہی ہے کہ یہ شخص ورع و تقویٰ میں غلو کرتا ہے۔ اور غلو فی التقویٰ اسلئے منہی عنہ ہے کہ یہ شخص دین میں اضافہ کرتا ہے کہ تقوی کیلئے ان امور کی بھی ضرورت ہے جنکی میں رعایت کرتا ہوں حالانکہ شریعت نے انکی رعایت نہیں کی اور دین میں اضافہ کرنا بدعت ہے اور بدعت سخت جرم ہے کیونکہ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص تعزیرات ہند میں ایک قانون کا اضافہ کردے گو وہ قانون سلطنت کی اغراض کیلئے مفید ہی ہو مثلاً کوئی یہ قانون بڑہادے کہ روزانہ کلکٹر کو سلام کرنا ضروری ہے ورنہ دس روپئے جرمانہ ہوگا تو یہ قانون کوئی باغیانہ نہیں بلکہ اس کا منشا تعظیم حکام ہے جو ظاہر میں مستحسن ہے مگر کوئی تعزیرات ہند میں اس قانون کا اضافہ کر کے تو دیکھے فوراً جرم قائم ہو کر سزا ہو جائیگی اور اس کا راز یہی ہے کہ یہ شخص اپنے کو امور سلطنت میں دخیل سمجھتا ہے کہ میں بھی جماعت قانون ساز کا ایک فرد ہوں اسی طرح جو شخص احداث فی الدین کرتا ہے وہ درپردہ مدعی نبوت کا ہے کہ مجھے بھی شریعت میں اضافہ کرنیکا اختیار ہے نیز درپردہ شریعت پر نقص کا الزام لگاتا ہے کہ ابھی شریعت مکمل نہیں بلکہ میرے اضافہ کی ضرورت ہے اور اس کا سخت جرم ہونا ظاہر ہے۔ اب لوگ اس راز کو تو سمجھتے نہیں خواہ مخواہ علماء سے جھگڑتے ہیں کہ فاتحہ اور مولود میں کیا خرابی ہے یہ تو اچھا کام ہے پھر اس سے کیوں منع کرتے ہو۔ اس کا حقیقی جواب یہی ہے کہ جن قیود کے ساتھ تم ان افعال میں

ثواب کے قائل ہو شریعت نے ان قیود پر ثواب نہیں بیان کیا مگر عوام اسکو کیا سمجھیں اسلئے
میں ان لوگوں سے الزامی گفتگو کیا کرتا ہوں چنانچہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ گانوں میں جمعہ
کیوں نہیں ہوتا میں نے کہا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ بمبئی میں حج کیوں نہیں ہوتا بس خاموش ہو گئے
اسی طرح ایک گانوں والے نے مجھ سے پوچھا کہ فاتحہ دینا کیسا ہے میں نے کہا میاں تم نے کبھی لکڑیاں
بھی اللہ واسطے دی ہیں کہا جی ہاں میں نے کہا تم نے کپڑا بھی کبھی دیا ہے کہا ہاں میں نے کہا
پھر اسپر بھی فاتحہ پڑھی تھی کہا نہیں میں نے کہا پھر کھانے ہی پر فاتحہ کیوں پڑھتے ہو۔ تو وہ
گانوں والا کہنے لگا کہ جی ہاں بس یہ تو فضول سی بات ہے میں نے کہا ہاں خود سمجھ لو۔ اگر ثواب
ہی پہونچانا ہے تو فاتحہ الگ پڑھ دو کھانا الگ دیدو۔ دونوں میں جوڑ لگانے کی کیا ضرورت ہے
گانوں والے سمجھنے کے بعد حجتیں نہیں نکالتے کیونکہ انکی طبائع میں سلامتی ہوتی ہے۔ اسی طرح
ایک صاحب نے فاتحہ کے متعلق مجھ سے سوال کیا تو میں نے کہا کہ آپ پوری دیگ پر فاتحہ کیوں
نہیں پڑھتے پلاؤ کی دیگ میں صرف ایک طباق میں کھانا رکھکر اسی پر کیوں پڑھتے ہو کیا اللہ
تعالیٰ کو نمونہ دکھلاتے ہو۔ اور ایک شخص کو میں نے یہ جواب دیا کہ بتلاؤ ثواب پہونچتا ہے پکانیکا
یا کھلانیکا کہا ثواب تو کھلانیکا ہوتا ہے میں نے کہا پھر کھلانیکے بعد فاتحہ پڑھدینا اور ثواب
پہونچا دینا یہ چند نمونے میں نے بتلا دیئے ہیں کہ اہل بدعت کو الزامی جواب اس طرح دینا چاہئیں
کیونکہ وہ حقیقت کو سمجھنا نہیں چاہتے یا سمجھ نہیں سکتے ہاں اگر کوئی فہیم ہو تو اسکو حقیقت
بھی بتلا دیجائے ایک بات اور سمجھ لینا چاہئے وہ یہ کہ احداث فی الدین اور شے ہے
اور احداث للدین اور شے ہے یعنی ایک تو یہ صورت ہے کہ نئی بات کو دین ہی میں داخل
کیا جائے، یہ تو بدعت محرمہ ہے ایک یہ صورت ہے کہ نئی بات دین کی حفاظت وغیرہ
کیلئے ایجاد کیجائے جیسے ہر زمانہ میں اسلحہ نئے نئے ایجاد ہوتے رہتے ہیں کیونکہ پرانے اسلحہ
آجکل کارآمد نہیں یا دین کی حفاظت کیلئے مدارس وغیرہ قائم کئے جاتے ہیں یہ بدعت نہیں
کیونکہ انکو دین میں داخل کر کے جزو دین نہیں بنایا گیا بخلاف مولود و فاتحہ وغیرہ کے کہ انکو
دین میں داخل کیا جاتا اور دین کا جزو سمجھا جاتا ہے یہ سب بدعات ہیں خوب سمجھ لو بہر حال
جب یہ مقدمہ سمجھ میں آگیا کہ شدید الخوف کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید فعل حسن بھی قابل گرفت

ہو جائے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نہی عن الاستغفار کا حکم سنکر یہ وسوسہ ہوتا کہ شاید یہ ہمارا استغفار نزول نص سے پہلے ہی قبیح ہوا اور ہمسے معصیت کا صدور ہوا ہو قبیح لنفسہ ہونیکا تو احتمال نتھا کیونکہ آپ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کا صدور ہو چکا ہے ہاں قبیح لغیرہ ہونیکا احتمال ہو سکتا تھا اسلئے حق تعالی نے درمیان میں اس شبہ کو رفع فرما دیا خواہ یہ شبہ واقع ہوا ہو یا نہوا ہو کیونکہ قرآن ان شبہات کو بھی رفع کر دیتا ہے جن کا وقوع محتمل ومظنون ہے اور اس قسم کا شبہ تحویل قبلہ اور تحریم خمر کیوقت واقع بھی ہو چکا ہے جسوقت تحویل قبلہ کا حکم وارد ہوا تو بعض صحابہ کو احتمال ہوا کہ شاید ہماری وہ نمازیں ناقص ہوئیں جو بیت المقدس کا استقبال کر کے پڑھی گئیں اسپر آیت وما کان اللہ لیضیع ایمانکم نازل ہوئی اور تحریم خمر کے وقت صحابہ کو شبہ ہوا کہ ہمارے جو بھائی اس سے پہلے شراب پیتے ہوئے مر گئے ہیں شاید انکی حالت ناقص رہی اسپر یہ آیت نازل ہوئی لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصلحت جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا وآمنوا وعملوا الصلحت ثم اتقوا وآمنوا ثم اتقوا واحسنوا واللہ یحب المحسنین ٥ تو کچھ بعید نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یا صحابہ کو استغفار للمشرکین کے متعلق بھی یہ خلجان ہوتا کہ شاید ہمارا استغفار قبل النہی قبیح لغیرہ ہو گیا ہو کسی عارض کی وجہ سے اور منجملہ عوارض کی تعدی عن المحدود بھی ہے کیونکہ ہر شے کیلئے ایک حد ہے افعال مباحہ کیلئے بھی ایک حد ہے اعمال مستحبہ کی بھی ایک حد ہے اور یہاں سے ایک اور اشکال مرتفع ہوا وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایکمرتبہ عید کے دن دو نابالغ لڑکیاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے گا رہی تھیں حدیث میں اسکی ساتھ ہی یہ بھی آتا ہے ولیستا بمغنیتین کہ وہ گانیوالی نتھیں یعنی انکو باقاعدہ گانا نہیں آتا تھا یوں ہی بیقاعدہ محض خوشی کے طور پر گا رہی تھیں پس اس سے مطلق غنا کے جواز پر استدلال نہیں ہو سکتا غرض حدیث میں آتا ہے کہ وہ لڑکیاں گا رہی تھیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ آئے جب بھی وہ گاتی رہیں پھر حضرت عمرؓ آئے تو انکو دیکھکر وہ خاموش ہو گئیں اور گانا بند کر دیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسپر تبسم فرمایا اور فرمایا اے عمرؓ شیطان تمسے بھاگتا ہے خدا کی قسم اگر تم ایک راستہ کو چلوگے تو شیطان اس راستہ

کا چلنا چھوڑ دیگا۔ اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ غنا حرام تھا تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ منع فرمایا اور جائز تھا تو آپ نے ان کے قطع غنا پر یہ کیوں فرمایا کہ شیطان عمر رضی سے بھاگتا ہے اس کا بھی جواب اسی قاعدہ سے نکلتا ہے کہ ہر شے کی حد ہے مباح کی بھی ایک حد ہے اور یہ غنا حد مباح کے اندر تھا مگر اسوقت مباح کی حد ختم ہو چکی تھی کہ حضرت عمر اتفاقاً تشریف لے آئے اور ان کو دیکھتے ہی گانیوالیاں خاموش ہو گئیں اگر وہ خاموش نہ ہوتیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود منع فرما دیتے مگر حضور کو تعجب و تبسم اسپر ہوا کہ حضرت عمر کی صورت دیکھتے ہی بدون انکے کچھ کہے گانیوالیاں خود ہی چپ ہو گئیں اسپر حضور نے حضرت عمر رضی کو بشارت دی کہ شیطان تمسے بھاگتا ہے (اور یہ بھی کہسکتے ہیں کہ غنا اسوقت بھی حد مباح پر تھا مگر یہ ایسا مباح ہے جسکو شیطان اپنی کامیابی کا وسیلہ بنایا کرتا ہے کما فی الحدیث والشعر من مزامیر ابلیس اور حضرت عمر کا رعب ایسا تھا کہ انکے سامنے ایسا مباح بھی واقع نہ ہو سکتا تھا جسمیں شیطان کا کچھ بھی حصہ ہو و یجوز مثل ہذا المباح بحضرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم لکونہ شارعاً محدداً الحدود المباح والحرام ونحوہما ۱۲) اسکے بعد ارشاد ہے ان اللہ لہ ملک السموات والارض بیشک اللہ ہی کیلئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ اس جگہ یہ سوال ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو استغفار للمشرکین سے کیوں منع فرمایا بلکہ یوں ہوتا کہ وہ استغفار کرتے رہتے پھر اللہ تعالی چاہے اسکو قبول کرتے یا نکرتے اور مشرکین کو بخشتے یا نہ بخشتے اس سوال کا جواب ان اللہ لہ ملک السموات والارض میں دیا گیا ہے اور جواب حاکمانہ ہے کہ ہماری سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمینوں میں اسلئے ہمکو حق ہے کہ تمکو استغفار سے روکدیں۔ قرآن میں زیادہ تر حاکمانہ ہی جواب دیئے گئے ہیں چنانچہ شیطان سے جب انکار سجدہ کی وجہ پوچھی گئی اور اس نے جواب دیا انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین تو اسکی اس دلیل کا حاکمانہ ہی جواب دیا گیا فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝

اسی طرح مقبولین کو بھی حاکمانہ جواب دیا گیا ہے

یعنی فرشتوں کو جبکہ انھوں نے آدم علیہ السلام کی خلافت پر سوال کیا تو فرمایا انی اعلم مالا تعلمون کہ تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں اور یہی تو قرآن کی خاص بات ہے جس سے اُس کا کلام الٰہی اور شاہانہ کلام ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ہر سوال کا حکیمانہ ہی جواب دیا جاتا تو شاہانہ کلام معلوم ہوتا بلکہ فلسفی کا کلام معلوم ہوتا اسلئے حکیمانہ جوابات کم دیئے گئے ہیں اور اگر دیئے بھی ہیں تو حاکمانہ جواب کیساتھ دیئے ہیں مگر افسوس طلبہ مصنفین کی کتابیں پڑھنے کے بعد قرآن کو پڑھتے ہیں اور اسمیں بھی وہی طرز ڈھونڈتے ہیں اسلئے اُنکو قرآن کا پورا لطف نہیں آتا ورنہ عجیب پر لطف کلام ہے پس ان اللہ لہ ملک السموات والارض میں اس شبہ کا حاکمانہ جواب دیا گیا ہے اور حکیمانہ جواب تبرعاً میں بیان کرتا ہوں گو ہمارے ذمہ تو نہیں وہ یہ کہ کفار سے بغض و عداوت رکھنے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ محبت الٰہیہ کا حق یہ ہے کہ اعداء اللہ سے عداوت و بغض رکھا جائے دوسرا اسلام کی اشاعت بھی زیادہ تر بغض فی اللہ ہی سے ہوئی ہے سو اگر مشرکین کیلئے استغفار جائز ہوتا تو اس بغض میں کمی ہو جاتی کفار پر جوش و غضب نرہتا اس حکیمانہ جواب کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ہے چنانچہ عنقریب[ع] معلوم ہوگا۔ اسکے بعد ارشاد ہے وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر میرے خیال میں اس کا ربط وما کان اللہ لیضل قوما بعد اذ ھدٰھم سے بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ جملہ آیت سابقہ کے مضمون کی دلیل ہے کہ تم کو قبل نہی کے استغفار کر نیسے گناہ اسلئے نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمھارا کوئی دوست و مددگار نہیں ہے اور یہ بات محبت و ولایت کے خلاف ہے کہ نہی سے پہلے کسی فعل کے ارتکاب پر عذاب کیا جائے یا گناہ کی فرد جرم قایم کیجائے نیز اسمیں ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو کسی کے گھمنڈ پر مناہی کا ارتکاب کریں کہ ہم فلاں کی شفاعت یا استغفار سے بچ جائیں گے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ خدا کے سوا تمھارا کوئی مددگار اور دوست نہیں اسلئے کسی دوسرے کے بھروسہ اور گھمنڈ پر گناہوں کا ارتکاب نکرنا مگر اس سے شفاعت کی نفی لازم نہیں آتی کیونکہ شفاعت تو خدا تعالیٰ کے اذن سے ہوگی من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ تو اجازت اُسی شخص کے متعلق ہوگی جسکو

[ع] چند سطروں کے بعد اس عبارت میں نیز اس آیت میں الخ ۱۲۔

اللہ تعالیٰ خود بخشنا چاہیں گے اور جسکی ولایت و نصرت وہ نچاہیں گے اسکے لئے اذنِ شفاعت ہی کیوں دینگے۔ نیز اس آیت میں اس شبہ کا حکیمانہ جواب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو اور مسلمانوں کو استغفار للمشرکین سے کیوں منع فرمایا بلکہ انکو استغفار کرنے دیتے اور خود استغفار کو قبول کرتے یا نکرتے اس کا حکیمانہ جواب اس طرح دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمھارا کوئی دوست و مددگار نہیں پس تم بھی دوستی اسی سے کرو جو خدا کا دوست ہو اور جو خدا کا دشمن ہو اس سے دشمنی کرو پس کفار سے دوستی نکرو اور استغفار بھی اسی کی فرد ہے اسلئے کفار کیواسطے استغفار ہرگز نکرو کیونکہ وہ اعداء اللہ ہیں تم بھی ان سے عداوت ظاہر کرو۔ غرض یہاں تین مضمون تھے یعنی نہی عن الاستغفار بحیثیت حاکمیت و نہی عن الاستغفار بحیثیت حکمت و عدم تاثیم قبل النہی۔ تینوں پر اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔ اب میں مقصود کو شروع کرتا ہوں ان اللہ لہ ملک السموات والارض سے یہ ثابت ہوا کہ احکام تشریعیہ کے مقرر کرنیکا حق تعالیٰ کو پورا اختیار ہے کیونکہ وہ صاحب سلطنت ہیں اور اسی سے دوسرا مقدمہ یہ مفہوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو احکام تکوینیہ کے مقرر کرنیکا بھی پورا اختیار ہے کیونکہ ان اللہ لہ ملک السموات والارض ہر قسم کے احکام کو عام ہے تشریعیہ کو بھی اور تکوینیہ کو بھی مگر شاید کوئی عموم کو تسلیم نکرے کیونکہ عموم و خصوص کا سمجھنا مجتہد ہی کا کام ہے مگر اس آیت میں ایک جملہ ایسا موجود ہے جس سے آیت کا عموم واضح ہو گیا اور وہ یحیی و یمیت ہے کیونکہ احیاء و اماتت تو احکام تکوینیہ ہی سے ہیں ترجمہ آیت کا یہ ہوا کہ اللہ ہی کیلئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے۔ تو یحیی و یمیت میں ان تصرفات کا ذکر ہے جو سلطنت کیوجہ سے عالم میں نافذ کئے جاتے ہیں اور یہ تصرف احکام تکوینیہ سے ہے اسلئے آیت دونوں قسم کے احکام کو عام ہو گئی سباق میں احکام تشریعیہ کا ذکر تھا سیاق میں تکوینیہ کا ذکر ہو گیا تو ہر طرف سے جکڑ بند کر دیا گیا اب خصوص کا احتمال نہیں رہا[بالموحدۃ ۱۲] یہ تو آیت کی تفسیر تھی[بالتحتانیۃ ۱۲]۔ ابھی میں نے مقصود کو شروع نہیں کیا تمہید بہت لمبی ہو گئی مگر مقصود مختصر ہو گا کیونکہ تمہید تو عموماً لمبی ہی ہوتی ہے دیکھئے کھیت میں گیہوں ڈالنا ہل جوتنا پانی دینا کاٹنا یہ کتنا لمبا کام ہے اور اسکے بعد آٹا پیسنا گوندھنا آگ جلانا روٹی پکانا یہ بھی تمہید ہی ہے۔ اور لقمہ بنا کر کھا لینا کتنا

مختصر کام ہے اور یہ مختصر محض لفظوں ہی میں نہیں کہ میں نے تلفظ میں اسکو مختصر کردیا ہو جیسے
یہاں ایک شاعر تھے جنکے اشعار میں ایک مصرع لمبا اور ایک چھوٹا ہوتا تھا کسی نے اُن پر
اعتراض کیا تو آپ نے دعوی کیا کہ مولانا جامی کے کلام میں بھی تو ایسا ہی واقع ہے پوچھا
کہاں تو آپ نے یہ شعر پڑھا ؎ الٰہی غنچۂ امید بکشا + اس مصرع کو تو خوب کھینچ تان کر
پڑھا پھر جلدی سے کہدیا ؎ گلے از روضۂ جاوید بنما + تو جیسے اس شخص نے تلفظ میں
دوسرے مصرع کو مختصر کردیا تھا میں کھانیکو اس طرح مختصر نہیں کہتا بلکہ وہ واقع میں مختصر
ہی ہے سب سے زیادہ دیر کھانے میں انگریز کرتے ہیں کہ بہت آہستہ آہستہ کھاتے ہیں
اور دنیا بھر کی باتیں اسیوقت کرتے ہیں مگر پھر بھی بہت سے بہت ایک دو گھنٹہ میں
کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں سو یہ بھی تمہید کے سامنے تو مختصر ہی ہے۔ اور دیکھئے انگریز
وقت کی قدر کے بھی مدعی ہیں مگر کھانے میں اتنا وقت صرف کرتے ہیں کہ جسکی حد نہیں
بعض لوگ اسمیں یہ تاویل کرتے ہیں کہ انسان کے لئے تفریح اور جی بہلانیکے لئے بھی تو کچھ
وقت چاہیئے انھوں نے اسکے لئے کھانیکا وقت رکھا ہے تاکہ ایک وقت میں دو کام ہو جاویں
؎ چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار + مگر اسمیں خرابی یہ ہے کہ جی بہلانے میں بعض
دفعہ ہنسی بھی آجاتی ہے اور کھانیکے وقت ہنسی آنیسے بعض دفعہ گلے میں پھندا لگ جاتا ہے
ہمارے فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ کھانا کھاتے ہوئے کسی کو سلام کرنا
مکروہ ہے کیونکہ فطری بات یہ ہے کہ سلام کو سنکر سننے والے کے دل پر جواب کا تقاضہ
ہوتا ہے (کیونکہ جواب سلام فرض ہے) اور ممکن ہے کہ اُسوقت لقمہ گلے کے بیچ ہی میں ہو
تو تقاضائے جواب سے پھندا لگ جانیکا خطرہ ہے یہ علت میری سمجھ میں بھی بہت دنوں کے
بعد آئی پہلے میں بھی سوچتا تھا کہ فقہاء نے اسوقت سلام کو کیوں مکروہ کہا عرصہ کے بعد
یہ علت سمجھ میں آئی اور اُسوقت فقہاء کی قدر ہوئی کہ واقعی یہ حضرات امت کیلئے رحمت
ہیں غرض کھانیکے وقت میں تقاضے کا کام نکیا جائے۔ اب میں مقصود عرض کرتا ہوں
کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تمام غموم و افکار کا علاج بتلایا ہے کیونکہ فرماتے ہیں ان اللہ
لہ ملک السموات والارض کہ اللہ تعالیٰ کیلئے سلطنت ہے تمام آسمانوں کی اور زمینوں کی

یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر طرح تصرف کا حق ہے تمکو کسی تجویز کا کوئی حق نہیں تو اس آیت میں ہمکو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمکو تشریعیات وتکوینیات کے متعلق کوئی تجویز اپنی طرف سے نکرنا چاہئے اور غور کر کے دیکھا جائے تو تمام غموم کا مدار تجویز پر ہے کہ ہملوگ اپنی طرف سے اپنے معاملات کے متعلق ایک تجویز قائم کر لیتے ہیں کہ یہ معاملہ اس طرح ہونا چاہئے جیسے شیخ چلی کا واقعہ ہے کہ وہ دو پیسہ کی مزدوری پر ایک شخص کا تیل کا گھڑا لیکر چلا اور راستہ میں سوچنا شروع کیا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے لونگا انکو کسی کی مرغی کے نیچے رکھونگا اُنمیں سے ایک مرغی نکلے گی اور ایک مرغا پھر دونوں کے بہت سے بچے ہوں گے ان سبکو بیچکر بکریاں لونگا پھر اُن کے بہت بچے ہوں گے کہ جنگل بھر جائیگا ان سبکو بیچکر گائے بھینس خریدوں گا اُن کے بہت سے بچے ہوں گے ان سبکو بیچکر اونٹوں کی پھر ہاتی کی تجارت کرونگا پھر میں بڑا تاجر اور مالدار ہو جاؤنگا پھر بڑا سا مکان بناؤں گا اور وزیر زادی یا بادشاہزادی کو نکاح کا پیغام دوں گا وہ فوراً میرے مال و دولت کو دیکھکر پیغام منظور کر لیں گے اور نکاح ہو جائیگا پھر اولاد ہو گی اور بچہ بڑا ہو گا تو مجھسے پیسے مانگے گا میں کہونگا ہشت اس کہنے کی ساتھ آپکا سر ہلا گھڑا گر کر ٹوٹ گیا تیل والے نے کہا ابے یہ کیا کیا۔ کہا میاں جاؤ تمھارا تو دو روپیہ کا تیل ہی گیا میرا تو سارا خاندان برباد ہو گیا تو دیکھئے اس تجویز کی کوئی حد ہے ہملوگ اس قصہ پر تو ہنستے ہیں مگر افسوس اپنے حال پر نہیں ہنستے کہ ہم سب ایسی حماقت میں گرفتار ہیں کہ ہر وقت خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں جنمیں اکثر تو ناکامی ہی ہوتی ہے اور یہی جڑ ہے رنج کی اور اگر کامیابی بھی ہو جاوے تو وہ کامیابی بھی ہزاروں ناکامیوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوتی ہے چنانچہ اگر اس شخص کی تجویز کا وقوع ہو جاتا تو انجام یہ ہوتا کہ یہ ایک شخص تو امیر ہو جاتا مگر اسی کے ساتھ بہت سے غریب برباد ہی ہو جاتے چنانچہ شب و روز یہی حالت دیکھی جاتی ہے کہ ایک شخص امیر ہوتا ہے تو اسکی وجہ سے دس غریب ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے آدمیوں کے غریب ہونیکے بعد ایک آدمی امیر بنتا ہے اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص گانوں کا رہنے والا کہیں پردیس میں جاکر پانچسو روپیے کا نوکر ہو گیا اُس نے اپنی ترقی کی اطلاع گھر پر بھیجی تو ساری گانوں میں خط کا پڑھنے والا صرف ایک میانجی تھا جو اس شخص کے مکان پر بچوں کو پڑھاتا تھا گھر پر خط

پڑھنے کیلئے اسکو بلایا گیا تو وہ خط دیکھکر رونے لگا۔ بیوی نے کہا میانجی خیر تو ہے کیا لکھا ہے
کہا بتلاؤں گا مگر پہلے تو بھی رو۔ وہ رونے لگی اس شور وغل کو سنکر محلہ والے جمع ہو گئے سب نے
پوچھا کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو میانجی نے کہا بتلاؤں گا تم بھی روؤ وہ سب بھی رونے لگی
آخر کہا گیا میاں خط تو سناؤ یہ تو معلوم ہو کہ اسمیں کیا لکھا ہے۔ کہا اسمیں یہ لکھا ہے کہ میری
ترقی ہو گئی اور میں پانچسو روپئے کا ملازم ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کمبخت پھر یہ بات رونیکی ہے
یا خوشی کی۔ میانجی نے کہا یہ بات رونے ہی کی ہے میرے لئے تو اسواسطے کہ اب وہ اپنے
بچونکو اعلیٰ تعلیم دلائیگا جسکے لئے میں کافی نہیں اسلئے مجکو ملازمت سے جدا کر دیگا کوئی انگریزی
داں ماسٹر بچوں کے واسطے بلایا جائیگا اور بیوی کیلئے اسواسطے کہ اب وہ اتنے بڑے عہدہ پر
ہو نچکر اس گاؤں کی دیہاتن پر کیوں کفایت کریگا۔ اب وہ کسی تعلیم یافتہ عورت سے نکاح کریگا
اور تمھارے لئے اسواسطے کہ اب وہ ہزاروں روپئے کما کر لائیگا اور اپنا مکان عالیشان بنانیکی
فکر کریگا اور محلہ کے غریب آدمیوں کے مکانات خرید کر کسی کے مکان کو اصطبل بنائیگا کسی کو
بیٹھک کسی کو کچھ کسی کو کچھ۔ ممکن ہے یہ حکایت کسی نے گھڑی ہو مگر دنیا کی حالت یہی ہے جو
اس حکایت میں ظاہر کی گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمام کلفتوں کا مدار تجویز پر ہے اگر اسکو قطع
کر دیا جائے تو پھر کوئی کلفت نہیں کسی رنجدہ واقعہ کے پیش آنیسے کلفت اسلئے ہوتی ہے
کہ ہمنے اس کا خلاف ذہن میں تجویز کر رکھا تھا اور اگر انسان پہلے سے اسکے لئے آمادہ رہے بلکہ
اس سے زائد کیلئے بھی آمادہ رہے تو پھر کچھ بھی کلفت نہیں جیسے ایک شخص کی حکایت ہے جس کا
لقب عز الیمو تھا کیونکہ اسکا معمول یہ تھا کہ ایک لیموں ساتھ لیکر سرائے میں چلا جاتا اور جب کسی
متمول مسافر کو دیکھتا کہ کھانا کھانے بیٹھا ہے تو جیب سے لیموں نکالکر سالن میں ذرا سا نچوڑ دیتا
کہ لیجئے اس سے کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔ پھر اکثر تو ایسا ہوتا کہ کھانیوالا خود ہی اسکی تواضع
کرتا کہ آپ بھی کھا لیجئے اور اگر وہ تواضع نکرتا تو یہ خود کھانے میں شریک ہو جاتے۔ پھر دسترخوان
پر سے کسی کو اٹھانا عرفاً معیوب ہے اسلئے کوئی کچھ نہ کہتا اور یہ اسی طرح اپنا پیٹ بھر لیتے مگر سب
آدمی یکساں نہیں ہیں ایک شخص کے ساتھ اس نے ایسی ہی حرکت کی کہ بدون کہے کھانے میں
شریک ہو گئے تو اس نے کان پکڑ کر اسکو باہر نکلوا دیا تو آپنے بہت جھک کر اسے فرشی سلام کیا

اُس نے کہا یہ سلام کیسا۔ کہا میں حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ مجھے تو ایسے موقعہ پر جوتہ کھانے کی عادت ہے آپنے بڑا کرم کیا کہ کان پکڑ کر نکلوا دیتے ہیں یہ کفایت کی خیر یہ حکایت تو کسی ذلیل نامعقول مسخرہ کی ہے مگر اسمیں اتنا سبق قابل اخذ ہے کہ جو شخص بڑی مصیبت کیلئے آمادہ ہوا اُسکو چھوٹی مصیبت غنیمت معلوم ہوگی پس تمامتر کلفت کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے لئے ایک خاص تجویز کر لیتے ہیں مثلاً اپنے متعلقین سے کچھ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور اگر پہلے ہی سے اُس توقع کو قطع کر دیا جائے تو پھر زیادہ کلفت نہو۔ اور یہی وہ بات ہے جو اہل اللہ کو حاصل ہے وہ کسی مخلوق سے توقع نہیں رکھتے نہ کوئی تجویز اپنے لئے قایم کرتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اپنے خدام کو اسی بات کی وصیت کی کہ اگر راحت چاہتے ہو تو مخلوق سے توقع کو قطع کر دو۔ پھر فرمایا کہ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو۔ خدام نے عرض کیا کہ ہم آپکو اپنی ذات سے زیادہ اپنے حال پر مہربان سمجھتے ہیں وغیرہ وغیرہ فرمایا کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی امید نرکھو تاکہ تمکو کلفت نہو۔ اگر نفع یا ارشاد میں کچھ کوتاہی اور کمی ہو تو تمکو رنج نہو غالب نے اسی مضمون کو خوب بیان کیا ہے۔

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ ‏ ‏ ‏ پھر کسی سے کوئی گلہ ترہا

مگر آجکل حالت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے ایک خاص تجویز قائم کئے ہوئے ہے جسمیں بعض کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جہلاء دین موت کے متعلق بھی مفتی بننا چاہتے ہیں کہ ملک الموت اول اُن سے فتویٰ حاصل کرکے کہ چہ فرمایند جہلاء دین دریں مسئلہ کہ بر شما کدامی وقت موت آوردہ شود پھر جان قبض کرنے کو آیا کرے چنانچہ جسکے دو چار بچے ہوں وہ یوں چاہتا ہے کہ انکی شادی وغیرہ سے فراغت ہو جائے تب موت آئے اس سے پہلے نہ آئے۔ صاحبو! ان تجویزوں کو قطع کرو۔ کیونکہ تمکو تجویز کا کوئی حق نہیں بلکہ ان اللہ لہ ملک السموات والارض یحیی ویمیت آسمان و زمین کی سلطنت اللہ ہی کیلئے زندہ کرنا مارنا اُن ہی کے اختیار میں ہے وہ جب چاہیں جس حالت میں چاہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں تمکو اسمیں دخل دینا معقول کا کوئی حق نہیں۔ یہی تعلیم ہے جو اس آیت میں دیگئی ہے۔ اسپر عمل کرنے سے غم کی جڑ کٹ جائیگی ہاں طبعی غم ہوگا مگر وہ دیرپا نہیں ہوتا اور طبعی غم بھی اسلئے ہوتا ہے کہ اُس میں حکمتیں ہیں ہمارے

لئے بڑی حکمت یہ ہے کہ غم سے شکستگی کی شان پیدا ہوتی ہے جس سے تکبر وغرور وغیرہ کا علاج ہو جاتا ہے اسکے علاوہ اور بھی بہت حکمتیں ہیں یہ میں نے اسلئے کہدیا تاکہ آپ کو دھوکہ نہو کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ اس تعلیم پر عمل کر نیسے غم بالکل نہو گا۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ میں طبعی غم کی نفی نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر قرآن پر عمل کر نیوالا کون ہو گا مگر طبعی غم حضور کو بھی ہوا چنانچہ اپنے صاحبزادہ کے انتقال پر آپنے فرمایا انا بفراقك یا ابراھیم لمحزونون کہ اے ابراہیم ہمکو تمھاری جدائی کا غم ہے۔ اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و حقانیت کی بڑی دلیل ہے کہ حضور نے اپنے غم کو ظاہر فرمادیا بناہوا صوفی ایسے موقعہ پر کبھی یہ نہ کہیگا کہ مجھے غم ہوا بلکہ تکلف و تصنع کر کے غم کو چھپائے گا۔ مگر صادقین کی یہ شان نہیں۔ وہ تو حضور کا اتباع کریگا چنانچہ مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب نے ایک بار فرمایا کہ ایک دفعہ ہم بیمار ہوئے ہم بڑے گھبرائے ہمکو موت سے بہت ڈر لگتا ہے (اسکو بے تکلف ظاہر کہدیا کہ ہمکو موت سے ڈر لگتا ہے کیونکہ طبعًا تو ہر شخص کو موت سے خوف ہے ہی ۱۲) حالانکہ مولانا مرحوم صاحب جذب تھے اور اہل جذب و استغراق کو موت سے ڈر نہیں لگتا مگر مولانا کو خوف تھا تو بے تکلف اسکو بھی ظاہر کر دیا پھر فرمایا کہ ہمنے حضرت فاطمہ کو خواب میں دیکھا انھوں نے ہمکو اپنے سینہ سے لگالیا بس صبح کو ہم اچھے ہو گئے۔ اس واقعہ سے تو یہ معلوم ہوا کہ مولانا کو موت سے ڈر تھا مگر اسکی ساتھ اُن کے کمالات سُنئے کہ مولانا نے خود مجھسے ہی فرمایا کہ جب حوریں جنت میں ہمارے پاس آئیں گی (اسی طرح کہا کہ جیسے یقین ہو کہ جنت میں تو جائیں ہی گے ۱۲) تو ہم اُن سے صاف کہدیں گے کہ بی اگر ہمکو قرآن سناؤ تو بیٹھو ورنہ ملبی بنو۔ قرآن سے مولانا کو بڑا عشق تھا ایک بار فرمایا کہ سجدہ میں ایسا مزا آتا ہے کہ جیسے خدا تعالی نے پیار کر لیا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ہمنے ایک جذامی کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا تھا کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا کیا ہے پھر فرمایا کہ اس اتباع سنت کی برکت یہ ہوئی کہ وہ جذامی اچھا ہو گیا۔ سبحان اللہ! اسکو اپنی کرامت نہیں سمجھا بلکہ اتباع سنت کی برکت سمجھے کوئی ناقص ہوتا تو اسکو اپنی کرامت سمجھتا۔ تو یہ کمالات تھے مولانا کے اب ان کمالات کے ہوتے ہوئے مولانا کا یہ فرمانا کہ ہمیں موت سے بہت ڈر لگتا ہے نقص کیوجہ سے نتھا بلکہ اس کا منشا صدق و خلوص تھا

کہ جو حالت تھی صاف صاف ظاہر کر دی بنا ہوا صوفی بڑے بڑے دعوے کرتا ہے صافیں دعاوی سے بری ہوتے ہیں۔ کانپور میں ایک صوفی میرے پاس آئے اور اپنی حاجت ظاہر کی کہ مجھے دس روپئے کی حاجت ہے اس کا انتظام کر دو پھر ادہر ادہر کی باتیں کر کے کہنے لگے کہ مجھے کیا پرواہ ہے جنت کی کیا پرواہ ہے دوزخ کی میں نے کہا صوفی جی بس بیٹھو تم سے دس روپیہ سے تو استغنا ہو نہ سکا جنت سے تو تم کیا استغنار کروگے جنت کو دیکھا نہیں ہے اسلئے یہ باتیں بناتے ہو۔ بہر حال تجویز کو قطع کر دو کیونکہ تجویز سے کلفت ہوتی ہے۔ اور یہ کلفت اور چیز ہے اور طبعی غم اور چیز ہے۔ تجویز کے قطع کرنیسے یہ کلفت اور پریشانی قطع ہو جاتی ہے گو طبعی غم باقی رہے۔ مگر قطع تجویز کے بعد جو طبعی غم ہوگا اس سے کلفت و پریشانی نہ ہوگی۔ اہل دنیا کو مصائب میں اسی لئے کلفت زیادہ ہوتی ہے کہ وہ تجویزیں قائم کر لیتے ہیں۔ اور اہل اللہ کی تو یہ حالت ہے کہ وہ تو موت تک کے مشتاق ہوتے ہیں جو اکبر المصائب ہے چنانچہ عارف فرماتے ہیں ؎

خرم آن روز کزیں منزل ویراں بروم | راحتِ جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے | تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

ایک بزرگ نزع کی حالت میں تھے سب لوگ رو رہے تھے اور وہ خوش ہو کر یہ شعر پڑھ رہے تھے

؎ وقت آں آمد کہ من عریاں شوم | جسم بگذارم سراسر جاں شوم

اور یہ فرما رہے تھے ؎

چیست توحید آنکہ از غیر خدا | فرد آئی در خلا و در ملا

اس توحید کا پورا ظہور موت کے وقت ہوتا ہے کیونکہ توحید خالص تو یہی ہے کہ غیر حق سے تعلقات منقطع ہو جائیں اور تعلقات ماسویٰ اللہ کا انقطاع کلی موت سے ہوتا ہے اسلئے اہل اللہ جو توحید خالص کے عاشق ہیں وہ تو موت کے مشتاق ہیں کوئی طبعاً مشتاق کوئی عقلاً مشتاق مگر اہل اللہ اسی کیساتھ دعا اور دوا بھی کرتے ہیں انھوں نے جمع بین الاضداد کر کے دکھلا دیا ہے وہ تجویز کو بھی قطع کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ہی دعا بھی الحاح سے کرتے ہیں کیونکہ حدیث میں حکم ہے لیعزم المسئلۃ وان اللہ یحب الملحین فی الدعاء اور دوا

کے ساتھ پرہیز بھی کرتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو پرہیز کا حکم دیا تھا اور خود حضور نے دوا کی ہے۔ تو ظاہر میں تفویض وقطع تجویز کے ساتھ اس کا جمع ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے خصوصاً دعا بالالحاح کا کیونکہ دعا میں تو طلب ہے اور طلب تجویز ہے۔ مگر محقق کی نظر وسیع ہے وہ سبکو جمع کر لیتا ہے اسطرح کہ دعا الحاح سے کرتا ہے۔ مگر دل سے ہر شق پر راضی رہتا ہے کہ جو کچھ ہوگا ہم اسپر راضی ہیں اسکو یہ فکر اور سوچ بچار نہیں ہوتا کہ اب کیا ہوگا اس کے بعد کیا ہو جائیگا وہ دل سے ہر شق پر راضی رہتا ہے کہ جو چاہے ہو جاؤ جو کچھ ہوگا عین حکمت ہوگا پس اس فکر اور سوچ ہی کا قطع کرنا مطلوب ہے، اور یہی قطع فکر مدلول ہے اس آیت کا واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی اسمیں حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم دیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالکر بیفکر ہو جانا خوف وحزن نکرنا۔

اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ کیا **عدم خوف و عدم حزن** اختیاری ہے ظاہر میں تو غیر اختیاری معلوم ہوتا ہے۔ پھر غیر اختیاری کیساتھ امر ونہی کا تعلق کیسا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو خوف وحزن کا ابتدائی درجہ ہے وہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک وہ درجہ ہے جو اس سوچ بچار سے پیدا ہوتا ہے کہ ہائے وہ بچہ میرے پاس کھیلتا تھا مجھے لپٹتا تھا اب میری گود سے الگ ہو گیا معلوم کس حال میں ہوگا، معلوم کسی نے پکڑا ہوگا یہ درجہ اختیاری ہے اس ہی سے انکو ممانعت کیگئی کہ بس دریا میں ڈالکر بیفکر ہو جاؤ ہمارے سپرد کر کے پھر کچھ نہ سوچو کہ اب کیا ہوگا۔ اور اسی سے سمجھ لو کہ بعض لوگوں کو جو خوف خدا نہونیکی شکایت ہے اسمیں یہ لوگ غلطی کرتے ہیں کیونکہ جو خوف مامور بہ ہے وہ اختیاری ہے جو فکر اور سوچ سے پیدا ہوتا ہے اور جسکے فقدان کے شکایت ہے وہ غیر اختیاری ہے اور وہ مامور بہ نہیں پس غیر مامور بہ کے فقدان سے غم کیوں ہو۔ ہاں میں یہ کہرہا تھا کہ یہ سوچ اور فکر قطع کرو کہ ہائے وہ بچہ ایسا تھا ویسا تھا۔ اسکے قطع کر دینے سے انشاء اللہ غم کو ترقی نہ ہوگی۔ اسپر شاید یہ شبہ ہو کہ بعض لوگ کچھ سوچتے بھی نہیں پھر بھی ان کا غم کم نہیں ہوتا۔ اسکی وجہ بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ مگر میرے دل میں ابھی اسکی وجہ آئی ہے وہ یہ کہ لوگ جسطرح اس واقعہ کو نہیں سوچتے جس سے غم بڑھتا اسی طرح اسباب تسلی کو بھی

۱۶

نہیں سوچتے جس سے کم ہوتا اسوجہ سے غم میں کمی نہیں ہوتی اور بحالہ رہتا ہے۔ انکو چاہیئے کہ اسبابِ تسلی کو سوچا کریں۔ مثلاً یہی کہ حق تعالیٰ کے افعال حکمت سے خالی نہیں ہوتے اسمیں ضرور حکمت ہے اور یہ کہ موت مسلمان کیلئے باعث راحت ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو جو لا تخافی ولا تحزنی میں قطع خوف وحزن کا امر فرمایا ہے اُس کا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ خود مت سوچنا کہ ہائے اب کیا ہوگا اب بچہ کس حال میں ہوگا بلکہ انکو دریا میں ڈالکر بیفکر ہو جانا چاہئے اُن کا کیسا کلیجہ تھا کہ اپنے ہاتھ سے بچہ کو دریا میں ڈالکر بیفکر ہوگئیں اور کچھ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا۔ اور اس سے عجیب تر حضرت ہاجرہ کا واقعہ ہے کہ جب اُن کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور حضرت ابراہیمؑ کی توجہ حضرت ہاجرہ پر پہلے سے زیادہ ہوگئی تو حضرت سارہ کو یہ امر ناگوار ہوا اور انھوں نے کہا کہ ہاجرہ کو میری نگاہ سے غائب کردو مجھ سے اس رقابت کا تحمل نہیں ہوسکتا اسپر وحی نازل ہوگئی کہ اے ابراہیم اللہ تعالیٰ کو علاوہ سارہ کی خاطر منظور ہونیکے ہاجرہ کی مہاجرت میں کچھ حکمتیں بھی منظور ہیں پس تم ہاجرہ کو مع اسمٰعیل کے زمین مکہ میں چھوڑ آؤ جہاں ہمارا گھر ہے جسکو تم اور اسمٰعیل بناؤ گے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل علیہما السلام کو سواری پر سوار کیا اور زمین مکہ میں لاکر انکو اتار دیا اور ایک تھیلی کھجوروں کی اور ایک مشکیزہ پانی کا ان کے پاس چھوڑ کر ملک شام کیطرف متوجہ ہوگئے۔ اسوقت زمین مکہ میں کسی قسم کی کچھ آبادی نتھی لق ودق میدان تھا جہاں آدمی تو آدمی پرند وچرند کا بھی نام ونشان نتھا کیونکہ یہاں نہ کھانے کی کوئی چیز تھی نہ پینے کیلئے پانی تھا جسوقت حضرت ابراہیم ان کو چھوڑ کر واپس جانے لگے تو حضرت ہاجرہ نے ان سے پوچھا کہ اے ابراہیم ہمکو یہاں چھوڑ کر جو چلے کیا یہ آپکی رائے ہے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے فرمایا ہاں حکم دیا ہے بس یہ سنکر حضرت ہاجرہ کو اطمینان ہوگیا اور فرمایا اذا لا یضیعنا کہ اگر خدا کا حکم ہے تو وہ ہمکو ضایع نکرینگے ہائے کیسا کلیجہ تھا؟ کیسا خدا پر بھروسہ تھا کہ حضرت ہاجرہ نے یہ سُنا کہ خدا کی مرضی یوں ہی ہے کچھ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا؟ صاحبو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کمال ایمان تو اس

واقعہ سے ظاہر ہوتا ہی ہے مگر حضرت ہاجرہ کا ایمان گو ان سے اکمل نہو مگر عجیب تر ضرور تھا
کیونکہ حضرت ابراہیم تو مرد تھے پھر مرد بھی کامل کیونکہ نبی تھے اور نبی بھی بڑے درجہ کے کہ
ہزاروں انبیاء اُن کے متبع تھے۔ اُن کا ایمان گو اکمل ہو مگر ایسا عجیب نہیں جیسا حضرت
ہاجرہ کا ایمان عجیب تھا کہ انکو باوجود عورت ہونے اور نبی نہونیکے ذرا بھی تشویش نہیں
ہوئی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ہاجرہ کا ایمان حضرت ابراہیم کے ایمان سے بڑھا
ہوا تھا کیونکہ عجیب ہونیسے افضل واقوی ہونا لازم نہیں آتا پس ہر چند کہ حضرت ہاجرہ کا
ایمان اعجب تھا مگر اقوی واکمل وافضل حضرت ابراہیم کا ایمان تھا اور یہی جواب ہے اُس
حدیث کا جسمیں وارد ہے کہ حضور نے صحابہ سے پوچھا بتلاؤ کس کا ایمان عجیب تر ہے صحابہ
نے عرض کیا ملائکہ کا ایمان۔ فرمایا ملائکہ کو کیا ہوا کہ وہ ملکوت سموات وارض کا مشاہدہ کرکے
بھی ایمان نہ لاتے۔ صحابہ نے کہا پھر حضرات انبیاء کا ایمان عجیب ہے فرمایا انکو کیا ہوا کہ وحی
کے نزول اور معجزات کے عطا ہونیکے بعد بھی ایمان نہ لائیں صحابہ نے عرض کیا پھر ہمارا ایمان
اعجب ہے فرمایا تمھیں کیا ہوا کہ میں تمھارے سامنے ہوں رات دن تم میرے معجزات دیکھتے
ہو نزول وحی کا مشاہدہ کرتے ہو پھر بھی ایمان نہ لاؤ۔ صحابہ نے عرض کیا پھر حضور ہی بتلائیں
کس کا ایمان اعجب ہے فرمایا عجیب تر ایمان ان لوگوں کا ہے جو میرے بعد آئیں گے جو صرف
چند اوراق قرآنیہ کو دیکھکر مجھپر ایمان لائیں گے اور یہ تمنا کرینگے کہ کاش اُن کا سب مال
ومتاع لیلیا جائے اور ایک نگاہ سے مجھکو دیکھ لیں۔ تو ان لوگوں کے ایمان کے اعجب
ہونیسے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا ایمان انبیاء ملائکہ وصحابہ کے ایمان سے اکمل واقوی ہے
ہرگز نہیں عجیب ہونا اور بات ہے کامل وقوی ہونا اور بات ہے۔ میں یہ کہرہا تھا کہ طبعی
غم اور چیز ہے۔ اور فکر کرنا سوچنا اور چیز ہے اول غیر اختیاری ہے اور دوسرا درجہ اختیاری
ہے اسی کے قطع کرنیکا حکم ہے کہ تم یہ نہ سوچو کہ ہائے اب کیا ہوگا جیسا کہ حضرت موسیٰ
علیہ السلام کی والدہ نے اور حضرت ہاجرہ نے نہیں سوچا ؎

حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

شاید اسپر یہ سوال ہو کہ کیا عذاب آخرت کا سوچنا بھی برا ہے کہ ہائے میرا کیا انجام ہو

اس کا جواب یہ ہے کہ عذاب آخرت کا سوچنا دوسری خاصیت رکھتا ہے وہ تو نتیجی ہے
کہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے اس سے کلفت و کدورت نہیں ہوتی۔ بلکہ
اس فکر سے قلب میں نورانیت و انشراح ہوتا ہے جس کا راز یہ ہے کہ اس فکر سے قلب کو
اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور تعلق ہو جاتا ہے اور تعلق مع اللہ تمام پریشانیوں سے نجات
دینے والا ہے حدیث میں ہے من جعل الهموم هما واحدا هم الآخرة كفى الله هموم
ومن تشعبت همومه في الدنيا لم يبال الله به باى واد هلك (او كما قال) یعنی
جس نے اپنے سب فکروں کو ایک فکر میں مدغم کر دیا یعنی آخرت کے فکر میں اللہ تعالیٰ اس کے
سارے افکار کو دور کر دیتے ہیں اور جس نے دنیا کے اندر افکار کو منتشر کر رکھا ہے خدا کو اس کی
پروا نہیں کہ وہ کہیں جا کر ہلاک ہو اسی لئے شریعت نے فکر آخرت کی تعلیم تاکید کے ساتھ
کی ہے کیونکہ یہ فکر تمام مضر افکار کو قطع کرنیوالا ہے حدیث میں ہے یا عبد اللہ عد نفسك
من اهل القبور اذا اصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء واذا امسيت فلا تحدث
نفسك بالصباح (او کما قال) اے عبداللہ بن عمرو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو جب
صبح ہو تو شام کی امید نہ کرو جب شام ہو تو صبح کی امید نہ کرو۔ بتلایئے جس شخص کی یہ حالت
ہوگی وہ کیونکر مشوش و پریشان ہو سکتا ہے وہ تو یہ سمجھیگا کہ کوئی مصیبت باقی رہنے
والی نہیں کیا خبر صبح سے شام اور شام سے صبح بھی ہوگی یا نہیں۔ اب سب اشکالات
رفع ہو گئے اور ثابت ہو گیا کہ پریشانی کی جڑ تجویز ہے اور طبعی غم اس سے بڑھتا ہے کہ لوگ
اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ہائے اب کیا ہوگا کیونکر ہوگا کبھی مستقبل کو سوچتے ہیں کبھی
ماضی کو سوچتے ہیں کہ ہائے وہ بچہ جو مر گیا وہ یوں کھیلتا تھا اس طرح باتیں کرتا تھا یوں
لپٹتا تھا بس تم دنیا کے مصائب کو از خود سوچ سوچ کر نہ بڑھاؤ نہ کسی تجویز کو طے کرو بلکہ
خدا کی تجویز میں اپنی تجویز کو فنا کر دو۔ ابتداء میں تو اہل اللہ کو یہ حالت تکلف کیساتھ حاصل
ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی حکمت و قدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادہ اور تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے
پھر یہ حالت ان کے لئے امر طبعی بنجاتی ہے چنانچہ حضرت بہلول نے کسی عارف سے پوچھا
مزاج کیسا ہے فرمایا اس شخص کا مزاج کیا پوچھتے ہو کہ عالم میں کوئی فعل اسکی خواہش کے

خلاف نہیں ہوتا۔ کہا یہ کیونکر؟ فرمایا کہ میں نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہے اور خدا کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ بھی نہیں ہوتا تو میری خواہش کے خلاف بھی کچھ نہیں ہوتا صاحبو! یہ کچھ مشکل کام نہیں کہ اپنے ارادہ کو دوسرے کے ارادہ کا تابع کر دیا جائے ایک بچہ بھی ایسا کر سکتا ہے چنانچہ ایک لڑکا کانپور میں زبردستی ایک شخص کا امام بنگیا اس نے یہ کیا کہ اسکے آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا اور گوشۂ چشم سے دیکھتا رہا کہ وہ کیا کرتا ہے جب وہ رکوع میں جانیکا ہوتا یہ اس سے پہلے رکوع کر دیتا جب وہ سجدہ کرنا چاہتا یہ اس سے پہلے سجدہ میں چلا جاتا غرض ساری نماز میں اس کا امام بنا رہا تو جب ایک بچہ نے اپنے ارادہ کو دوسرے کا تابع کر کے دکھلادیا تو کیا آپ خدا کیساتھ ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنے ارادہ کو اسکے ارادہ کا تابع کر دیں کہ جو کچھ ہوگا ہم اسپر راضی ہیں اسپر عمل شروع کر دیجئے اور برابر کرتے رہیئے انشاء اللہ ایک دن ملکہ راسخہ پیدا ہو جائیگا اور اسی سے راحت حاصل ہوگی بدون اسکے راحت نہیں مل سکتی۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ کثرت تکرار سے سب کام آسان ہو جاتے ہیں دیکھئے آجکل جو لوگ پختہ حافظ ہیں وہ پہلے ہی دن سے پختہ نہیں ہوئے بلکہ کثرت تکرار سے پختہ بنے ہیں آج جو خوشنویس ہے وہ کثرت مشق ہی سے خوشنویس ہوا ہے۔ اسی طرح آپ بھی کثرت تکرار سے تفویض کو حاصل کریں گے اور یہ کوئی بزرگی نہیں کہ عوام اپنے کو اسکا اہل نہ سمجھیں بلکہ یہ تو عبدیت اور بندگی ہے غلام کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ کیساتھ یہ تعلق کیونکر نہ پیدا کیا جائے حالانکہ شیخ کیساتھ بھی جو ایک مخلوق ہے اسی معاملہ کی ضرورت ہی شیخ سے جس کام کیلئے تعلق پیدا کیا جاتا ہے وہ بدون تفویض کے نہیں ہو سکتا کہ جو حالت پیش آئے اسکو شیخ سے عرض کر کے بیفکر ہو جاؤ اسکے بدون کام نہیں چل سکتا کیونکہ تسلی کی یہی صورت ہے کہ ایک شخص پر اعتماد کر کے جو وہ کہے اس کے موافق کام کرتے جاؤ اور بیفکر ہو جاؤ اور یہی حکمت ہے تقلید شخصی میں۔ واللہ بدون تقلید غیر مجتہد کو بشرطیکہ خدا کا خوف اسکے دل میں ہو کبھی چین نہیں مل سکتا جب جاہو تجربہ کر کے دیکھ لو۔ پس اگر شیخ تمھاری تسلی کرے تو تم تسلی رکھو اور فکر میں نہ پڑو یہاں تھانہ بھون میں ایک حافظ صاحب تھے وہ مولانا گنگوہی رح سے بیعت تھے ایکمرتبہ انھوں نے اپنے کچھ

حالات تجھ سے بیان کئے میں نے تسلی کی کہ یہ حالت بری نہیں بفکر رہو کہنے لگے کہ میں نے حضرت مولانا گنگوہی سے بھی عرض کیا تھا انھوں نے بھی تسلی کی تھی میں یوں سمجھا کہ ویسے ہی میرا دل بہلانیکو تسلی کر رہے ہیں۔ میں نے کہا حافظ صاحب توبہ کیجئے مولانا کو جھوٹی تسلی کی کیا ضرورت تھی وہ کسی کے نوکر تھے انکی جوتی کو کیا غرض پڑی تھی جو بلا وجہ آپکی تسلی کریں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حضرت پر اعتماد نہیں اب انکی آنکھیں کھلیں اور چین سے بیٹھے۔ اور میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر شیخ کی تسلی غلط بھی ہو جب بھی تمکو وہی نافع ہے ۔ اگر تم اسکو غلط سمجھو گے تمکو نقصان ہوگا۔ تو جب شیخ کیساتھ بھی اسی معاملہ کی ضرورت ہے تو حیرت ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تفویض کا تعلق نہو۔ اسی کو اللہ تعالیٰ اس مقام پر بیان فرماتے ہیں ان اللہ لہٗ ملک السموات والارض کہ خدا ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں پس ہر قسم کے تصرف کا حق اسی کو ہے دوسروں کو کسی تجویز کا حق نہیں گو اسمیں یہ احتمال تھا کہ تصرفات تشریعیہ کا حصر مراد ہو مگر آگے یحیی ویمیت بھی مذکور ہے جو میرے مقصود کے مناسب ہے بلکہ اسمیں تصریح ہے کہ مراد تمام تصرفات تکوینیہ کو بھی عام ہے کیونکہ احیاء و اماتت امور تکوینیہ سے ہے۔ اور یہ بات توکل ہی سمجھ میں آئی ہے کہ یحیی ویمیت سے کوئی تصرف خارج نہیں بلکہ تمام تصرفات کا حاصل احیاء و اماتت ہی ہے شاید تم کہو کہ کیا کھیتی کا اگانا اور پکانا بھی اسمیں داخل ہے تو میں کہونگا ہاں وہ بھی احیاء کا ایک فرد ہے اسی لئے ارشاد ہے اعلموا ان اللہ یحیی الارض بعد موتہا محاورات میں احیاء نفخ روح کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ عام ہے اور ہر شئے کا احیاء الگ ہے۔ دوسرے میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ہر چیز میں روح بھی ہے صوفیہ کو تو اس کا کشف ہوا ہے اور فلاسفہ دلائل سے اسکے قائل ہوئے ہیں۔ اور میری رائے تو یہ ہے کہ حیوانات میں علاوہ روح کے عقل بھی ہے کیونکہ بعض حیوانات کے افعال اسپر مجبور کرتے ہیں کہ انکو ذی عقل مانا جائے لیکن اس سے ان کا مکلف ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ عقل کا ہر درجہ تکلیف کیلئے کافی نہیں دیکھئے صبی مراہق میں بھی عقل کا ایک درجہ موجود ہے مگر مراہق مکلف نہیں تو اگر ایسا ہی درجہ حیوانات میں تسلیم کر لیا جائے تو اسپر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ اور یہیں سے سمجھ لیا جائے کہ بعض مجذوبین کے متعلق جنمیں

بظاہر کچھ عقل بھی معلوم ہوتی ہے شبہ نکیا جائے کہ عقل کیساتھ ان سے افعال واقوال غیر مشروعہ کا صدور کیونکر ہوتا ہے تم انکو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے وہ صبی کے مثل ہوں کہ باوجود کسیقدر عاقل ہونیکے مکلف نہوں بلکہ حیوانات سے تجاوز کرکے ممکن ہے کہ نباتات میں بھی عقل کا ایک درجہ موجود ہو جو عقل حیوانی سے کم ہو آپکو حیرت ہوگی کہ آج کل بعضے اسکے قائل ہیں کہ نباتات میں روح ہے اور قدما رفلاسفہ میں بھی بعض اسکے قائل ہوئے ہیں سوہمکو اس کے انکار کی ضرورت نہیں بلکہ ممکن ہے کہ جمادات میں بھی عقل وروح موجود ہو اور انکی عقل نباتات سے بھی کم ہو اسی لئے جمادات کا نطق ممکن ہے اور جن احادیث میں حجرو شجر کی شہادت کا ذکر ہے وہ اسکی مؤید ہیں۔ اور جب ہر چیز میں روح ہے تو احیار و اماتت سے کوئی تصرف خالی نہوا۔ شاید تم کہو کہ ابراد مار میں احیار و اماتت کہاں ہے تو میں کہتا ہوں کہ اسمیں ایجاد برودت ہے اور ایجاد ہی کا نام احیار ہے اب اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ کام تو بندہ بھی کرسکتا ہے چنانچہ پنکھا کرکے یا شورہ ملاکر پانی کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ بندہ صرف اسباب کو اختیار کرتا ہے جنپر برودت کے وجود کو اللہ تعالیٰ مرتب فرمادیتے ہیں اگر تمکو ایجاد برد پر قدرت ہے تو ذرا ان اسباب کو اختیار کرکے پھر تو برودت کو روکدو۔ جب یہ نہیں کرسکتے معلوم ہوا کہ تم برد کو ایجاد نہیں کرتے ورنہ اسکے روکنے پر بھی قادر ہوتے کیونکہ قدرت کا تعلق ضدین سے ہوا کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ابراد حقیقی اسباب برد اختیار کرنیکا نام نہیں بلکہ ایجاد برد کا نام ہے اور تمھارا کام نہیں کیونکہ تم اسباب یا مسببات کے ایجاد پر قادر نہیں صرف انکو اختیار کرتے ہو اور اختیار کے بعد ان کے اثر کو نہیں روک سکتے۔ اور یہی وہ بات ہے جو نمرود لوندن مردود گدھے نے نہیں سمجھی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ربی الذی یحیی ویمیت کہ میرا خدا احیار و اماتت کرتا ہے تو اس نے کہا یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں اسکے بعد قیدخانہ سے دو قیدیوں کو بلاکر ایک کو مارڈالا ایک کو رہا کردیا حضرت ابراہیم نے سمجھا کہ یہ تو محض گدہا ہے اس پر گھوڑے کا پالان کیوں لادا تو آپ نے دوسری دلیل بیان فرمائی کہ میرا خدا تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسکو مغرب سے نکالدے اس پر

وہ مبہوت ہو گیا اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اسپر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ نمرود اسکے جواب کہسکتا تھا کہ مشرق سے تو میں نکالتا ہوں اگر خدا کوئی ہے تو اُس سے کہو کہ مغرب سے نکالے۔ اس کا جواب ہمارے بعض اساتذہ نے یہ دیا ہے کہ ہاں اُسکو اس کہنے کی گنجائش تھی مگر خدا تعالیٰ نے یہ جواب اُسکے دل میں نہیں ڈالا کیونکہ اگر وہ یہ جواب دیتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ سے دعا کرتے اور آفتاب مغرب سے طلوع ہو جاتا اور یہ علامات قیامت سے ہے تو اُسی وقت قیامت قائم ہو جاتی مگر اللہ تعالیٰ کو ابھی عالم کا بقار مقصود تھا اسلئے نمرود کے دل میں یہ سوال نہیں ڈالا اور خارق رد شمس کو طلوع الشمس من المغرب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ رد شمس ایک ساعت کیلئے اس طرح ہو اکہ کسی کو معلوم ہوا کسی کو معلوم نہیں ہوا اور طلوع من المغرب مثل طلوع من المشرق کے تمام آفاق کو عام ہو گا پس آیت کے عظیم ہونیکے سبب اُسکا اشراط ساعت سے ہونا مناسب ہے۔ وہی میرے استاذ یہ بھی فرماتے تھے کہ بھت الذی کفر میں بُہت بصیغہ مجہول اسی لئے لایا گیا کہ اُس کافر مجہول کو حیران بنادیا گیا اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اُسکو سوال کی گنجائش تھی مگر اُس کو حیران بنادیا گیا۔ مگر یہ نکتہ اُسوقت صحیح ہو سکتاہے جبکہ بَہت معروف بھی متعدی حیرت میں ڈالنے کے معنی میں مستعمل ہو میرا خیال یہ[a] ہے کہ بُہت مجہول ہی تحیر کے معنی میں ہے اور اس کا معروف متعدی مستعمل نہیں۔ اس مقام پر ایک علمی اشکال ہے میں اسکو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ علم مناظرہ میں طے ہو چکاہے کہ مناظر کو ایک دلیل سے دوسری دلیل کیطرف انتقال جائز نہیں ورنہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہو گا تو حضرت ابراہیم نے دوسری دلیل کی طرف کیوں انتقال کیا اس کا جواب یہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال اپنی مصلحت سے ممنوع ہے اور مخاطب کی مصلحت سے جائز ہے جبکہ وہ بلادت فہم کی وجہ سے دلیل اوّل کو نہ سمجھ سکے نمرود احمق تھا وہ سمجھا نہیں کہ احیاء و اماتت کے معنی ایجاد حیات و ایقاع موت کے ہیں اور ابقاء حی کو احیاء

---

[a] ثم رأیت تائیدہ من القاموس ۱۲

نہیں کہتے نہ قتل کو اماتت کہتے ہیں کیونکہ قتل عین موت نہیں بلکہ سبب موت ہے اور بعض دفعہ قتل سے موت کا تخلف بھی ہو جاتا ہے چنانچہ ایک معتبر شخص نے مجھسے بیان کیا کہ ایک پادری پر کچھ تہمت لگ گئی تھی اُس نے غلبۂ حیا میں کمرہ میں بند ہو کر خودکشی کی اس طرح کہ آئینہ سامنے رکھکر استرے سے گلا کاٹ دیا اور گلا کٹکر کمر کی طرف لٹک گیا صرف تھوڑی سی کھال الجھی رہگئی۔ نوکروں کو جو کمرہ سے خون بہتا ہوا نظر آیا اُنھوں نے فوراً ڈاکٹر اور پولیس کو اطلاع دی۔ ڈاکٹر آیا اُس نے دیکھا کہ ابھی نبض و جسم میں حرارت موجود ہے اُس نے فوراً سر کو اپنی جگہ رکھکر ٹانکے لگا دیئے اور دوا لگا دی چند گھنٹوں کے بعد اُسے ہوش آگیا اور بچیا اچھا خاصہ ہو کر بہت عرصہ تک زندہ رہا البتہ آواز ذرا گنگنی ہو گئی تھی۔ پس ایسے واقعات اسکی دلیل ہیں کہ قتل اور قطع حلقوم عین موت نہیں بلکہ محض اسباب میں سے ہے جیسے سنکھیا کھانا اسباب میں سے ہے عین موت نہیں اسی لئے بہت سے سنکھیا کھا کر بچ بھی جاتے ہیں پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اُس نے قتل کو اماتت سمجھا اور ایک مجرم کے رہا کر دینے کو احیاء۔ اسلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دقیق دلیل کو چھوڑ کر ظاہر دلیل اختیار کی یہ گفتگو اسپر چلی تھی کہ اسباب برد اختیار کرنیکا نام ابراد نہیں جیسا نمرود نے اسباب قتل کو اماتت اور ترک اسباب موت کو احیاء سمجھا تھا بلکہ ابراد کی حقیقت ہے ایجاد برد جیسا کہ احیاء کی حقیقت ہے ایجاد حیات اور یہ بجز خدا تعالیٰ کے کسی کے قبضہ میں نہیں پس بچپی و ممیت کا حاصل یہ ہوا کہ تمام تصرفات اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں۔ رہا یہ کہ اس عقیدہ کی بتلانے کی کیا حکمت ہے سو اسکو بھی ایک نص میں خود ہی بیان فرما دیا ہے ما اصابکم من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتب من قبل ان نبرأھا ان ذلک علی اللہ یسیر یہانتک تو مسئلۂ تقدیر کا بیان تھا آگے اسکی حکمت بتلاتے ہیں لکیلا تأسوا علی مافاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم کہ یہ مسئلہ تمکو اسلیئے تعلیم کیا گیا تاکہ تمکو کسی فوت ہونیوالی شئی پر رنج نہو اور کسی حاصل ہونیوالی شئی پر فرح نہو کیونکہ فرح مطلقاً محمود نہیں بلکہ جو فرح شکراً ہو وہ محمود ہے اور اسی کا ذکر ہے اس آیت میں قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا

۲۴

اور جو فرح بطراً ہو وہ محمود نہیں بلکہ مذموم ہے چنانچہ قارون کے قصہ میں ارشاد ہے اذ
قال لہ قومہ لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین ۰ اسی تقسیم کی بناء پر حدیث میں
ہے من اعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان (او کما قال) اسمیں اعطاء و منع
دونوں کے ساتھ للہ کی قید ہے جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں نہ بخل
مطلقاً مذموم بلکہ اگر خدا کیلئے ہوں تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم۔ اب آپکو حاجی
صاحب کی ایک تحقیق کی قدر ہوگی فرماتے تھے کہ اخلاق رذیلہ فی نفسہا مذموم نہیں
بلکہ خاص مصرف کے اختیار سے مذموم ہیں اور اگر انکو طاعات میں صرف کیا جائے تو
یہ محمود ہیں اسی طرح اخلاق حمیدہ بھی فضائل ذاتی الحق کی وجہ سے محمود ہیں پس اگر سخاوت
وغیرہ معاصی کی طرف مفضی ہو جائے تو محمود نہیں بلکہ مذموم ہیں غرض اخلاق سب
فطری اور جبلی ہیں اور درجۂ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم نہ محمود بلکہ مواقع استعمال سے
انمیں مدح وذم آجاتی ہے اسی کی نوع سے فرح بھی ہے کہ یہ مطلقاً محمود نہیں بلکہ بعض
افراد اسکے مذموم بھی ہیں جنکا ترجمہ عجب اور پندار اور اترانا ہے تو مسئلہ تقدیر اسلئے بتلایا
گیا تاکہ مصائب میں کسی شئی کے فوت ہونیسے رنجیدہ نہو اور نعمت و راحت پر اترائے
نہیں کیونکہ قائل تقدیر یہ سمجھیگا کہ جو کچھ حاصل ہوا ہے کسب و کمال سے نہیں بلکہ تقدیر
میں یوں ہی تھا اور آئندہ کی خبر نہیں کہ تقدیر میں کیا ہے تو وہ کبھی نہ اترائیگا نہ دنیا سے
دل لگائیگا اور یہی راحت کی چیز ہے کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو دنیا سے زیادہ
خوشی ہوتی ہے زوال کے وقت اُن کو اسی قدر رنج بھی ہوتا ہے اور اگر خوشی نہو یا اعتدال
سے ہو تو رنج بالکل نہو یا اعتدال سے ہو حضرت میں سچ کہتا ہوں کہ قلب کو جتنی قوت
اعتقاد تقدیر سے ہوتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوسکتی کفار چاہے لاکھ یاقوتیاں کھائیں
مگر اس اکسیر کے سامنے سب گرد ہیں بخدا التقدیر کا اعتقاد دلکو نہایت مضبوط کر دیتا ہے
یہ شخص کسی حالت میں متزلزل نہیں ہوتا جو مصیبت سامنے آئے گی یوں کہیگا کہ یہ تو
مقدر تھی ٹلنے والی نتھی خواہ میں راضی ہوں یا ناراض پھر خدا کی تقدیر سے ناراض ہوکر
عاقبت بھی کیوں خراب کی۔ نیز اسی کے ساتھ اسکے دل میں یہ بھی آتا ہے کہ اسمیں ضرور

۲۵

کوئی حکمت ہے یہ تو حکمت کا علم اجمالی ہے پھر اسکے بعد یہ چاہیئے کہ احادیث میں جو تفصیلی
حکمتیں مصائب و حوادث کی مذکور ہیں نیز اسپر جو ثواب بتلایا گیا ہے اُنکو پیش نظر رکھیں تو انشاء اللہ
غم بہت کم ہو جائیگا۔ چنانچہ چھوٹے بچوں کی موت میں ایک بڑی حکمت ہے اگر وہ پیش نظر
رہے تو چھوٹے بچوں کے مرنے پر غم کیساتھ خوشی کا بھی ایک پہلو سامنے ہوگا لوگوں کو اولاد
کے بڑے ہونے کی خوشی محض اس لئے ہے کہ انکا نفس یوں ہی چاہتا ہے ورنہ انکو کیا خبر
کہ بڑے ہو کر یہ کیسا ہوگا باعث راحت والدین ہوگا یا وبال جان ہوگا پھر وہ بڑا ہو کر مرے
تو یہ خبر نہیں کہ وہ والدین کو آخرت میں کچھ نفع دیگا یا خود ہی سہارے کا محتاج ہوگا اور بچپن میں
مرنے والے بچے بہت زیادہ کار آمد ہیں انمیں یہ احتمال ہی نہیں کہ دیکھئے آخرت میں یہ خود کس
حال میں ہو کیونکہ غیر مکلف تو یقیناً مغفور لہ ہے وہ آخرت میں والدین کے بہت کام آئیگا
ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انھوں نے جوانی میں نکاح نکیا تھا اور مجرد ہی رہنے کی نیت
تھی ہر چند مریدوں نے عرض بھی کیا مگر آپنے منظور نکیا ایک دفعہ دوپہر کو سو کر اٹھے تو اسی وقت
تقاضا کیا کہ جلدی میرا نکاح کرو۔ مریدوں نے فوراً اسکی تعمیل کی ایک مرید نے اپنی لڑکی سے
نکاح کر دیا آپ نکاح کے حقوق ادا کرتے رہے یہانتک کہ ایک لڑکا بھی پیدا ہوا اور کچھ دن
کے بعد مر بھی گیا جب وہ بچہ مر گیا تو آپنے فرمایا الحمد للہ مراد حاصل ہو گئی اور بیوی سے کہا کہ
اب مجھے تیری ضرورت نہیں میرا جو مقصود تھا پورا ہو گیا اب اگر تو نکاح کا لطف حاصل کرنا
چاہے تو میں طلاق دیکر کسی جوان صالح سے تیرا نکاح کر دوں اور اگر میرے ہی پاس رہنا چاہے
تو کھانے پہننے کی تیرے واسطے کمی نہیں مگر حقوق نکاح کا مطالبہ نکرنا وہ لڑکی بھی نیک تھی
اُس نے کہا مجھے تو صرف آپکی خدمت مقصود ہے اور کچھ مطلوب نہیں مگر خدام کو یہ بات
سُنکر حیرت ہوئی کہ یا تو اس تقاضے سے نکاح کیا تھا یا اب طلاق کو آمادہ ہو گئے اُنھوں نے
اسکا سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے نکاح کا تقاضا کسی نفسانی ضرورت کی وجہ سے نہیں کیا
تھا بلکہ اس کا منشا یہ تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا میدان قیامت برپا ہے اور لوگ
پلصراط سے گذر رہے ہیں جو دوزخ کے اوپر بچھایا گیا ہے پھر میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ پلصراط
سے گذرتے ہوئے اُسکے قدم ڈگمگائے اور قریب تھا کہ جہنم میں جا گرے دفعۃً ایک بچہ نے

اگر اسکو سنبھالا اور مضبوطی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر بجلی کی طرح پلصراط سے پار کر کے لیگیا
میں نے فرشتوں سے پوچھا کہ یہ بچہ کون تھا کہا اسی شخص کا بیٹا تھا جو بچپن میں انتقال کر گیا
تھا آج اسکا شفیع ہو گیا۔ خواب سے بیدار ہو کر مجھے فکر ہوئی کہ میرے پاس آخرت کی اور
جائدادیں تو ہیں نماز روزہ وغیرہ مگر یہ جائداد نہیں اور زمیندار کو ہر قسم کی جائداد جمع کرنی چاہیئے
کیونکہ بعض دفعہ ایک جائداد میں پیداوار نہیں ہوتی دوسری میں ہو جاتی ہے کبھی شکر میں
نفع ہو گیا اور گیہوں کے کھیت میں نقصان دونوں ملکر اوسط برابر ہو جاتا ہے کبھی باغ میں
فائدہ ہو گیا جانوروں میں خسارہ ہو گیا تو ہر قسم کی جائداد والا فائدہ ہی میں رہتا ہے اسلئے
ان بزرگ نے چاہا کہ یہ جائداد بھی پاس ہونا چاہیئے چنانچہ نکاح ہوا اور بچہ پیدا ہو کر مر گیا
تو ان کا مقصود حاصل ہو گیا۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچے جنت میں جانے سے
پہلے آخرت میں بھی بچے ہی رہیں گے اور ان کی خصلتیں بھی بچوں کی سی رہیں گی وہی
ضد کرنا اور اپنی بات پر اڑ جانا سر ہو جانا مگر یہ حالت دخول جنت سے پہلے ہو گی پھر جنت
میں پہونچکر باپ بیٹے سب برابر ایک قد کے ہو جائیں گے حدیث میں آیا ہے کہ یہ بچے
اڑ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم جنت میں نہ جائیں گے جب تک ہمارے ماں باپ کو
ہمارے حوالہ نہ کیا جائے ہم تو ان کو اپنے ساتھ لیکر جنت میں جائیں گے تو حق تعالیٰ
فرمائیں گے ایھا الطفل المراغم ربہ ادخل ابویک الجنۃ کہ اے ضدی بچے اپنے
خدا سے ہٹ کرنے والے جا اپنے والدین کو بھی جنت میں لیجا اسوقت یہ خوش خوش
جنت میں اپنے باپ ماں کے ساتھ جائیں گے۔

تو یہ بیگناہ بچے اللہ میاں سے بھی آپ کی بخشش کیلئے ضد کرینگے۔ اور اگر بچہ بڑا ہو کر
مر جائے تو حضرت خضر کا واقعہ یاد کر کے دل کو یہ سمجھا لو کہ نمعلوم اسمیں کیا حکمت ہو گی
شاید اگر یہ اور زندہ رہتا تو دین کو بگاڑ دیتا یا دنیا میں وبال جان ہو جاتا مولانا فرماتے ہیں

؎ آن پسر را کش خضر ببرید حلق   سر آن را در نیابد عام خلق

اور اگر کسی کے بالکل ہی اولاد نہو وہ یوں سمجھے کہ میرے لئے یہی حکمت ہے نمعلوم اولاد
ہوتی تو کن کن مصائب کا سامنا ہوتا چنانچہ خدا نے مجھے اولاد نہیں دی میں اسکو اپنے

واسطے عین حکمت سمجھتا ہوں حضرت حاجی صاحب سے میرے گھر میں کی خالہ نے دعا کیواسطے
عرض کیا تھا کہ اشرف علی کے اولاد ہو جائے۔ حاجی صاحب مجھسے فرمانے لگے کہ بھائی
تمہاری خالہ اولاد کیلئے دعا کرنے کو کہتی تھی۔ دعا سے کیا انکار ہے لیکن میرا جی تو یہی
چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ایسے ہی تم رہو۔ میں نے دل میں کہا کہ بس تو خیر صلا ہے
اگر آپ دعا بھی کرینگے جب بھی اولاد نہو گی کیونکہ دلی منشا تو یہ ہے اور ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں — می دہد یزداں مراد متقیں

میں نے کہا حضرت بس میں بھی وہی چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں۔ اولاد نہونے میں
بعض کیلئے ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اُس شخص کے تعلقات دنیا میں نہیں بڑھتے اور اولا
والے کے تعلقات بہت بڑھ جاتے ہیں چنانچہ ہماری پھوپی صاحبہ میرے لئے اس طرح دعا
کیا کرتی تھیں کہ اے اللہ میرے بھتیجے کا بھی ساجھا دنیا میں رلا دے (یعنی اولاد دیدے)
میں غصہ ہوتا تھا کہ تم مجھے کوستی ہو دنیا دار بنانا چاہتی ہو مگر یہ عنوان بتلا رہا ہے کہ اہل
عرف کے نزدیک دنیا کے اندر وہی پھنستا ہے جو صاحب اولاد ہو اور اس سے خود سمجھ لو کہ
جو صاحب اولاد نہو وہ کیا ہوگا وہ دنیا سے بے تعلق و بے لوث ہوگا بلکہ یوں کہئے کہ اللہ
ہوگا۔ اب تم خود سمجھ لو کہ اللہ والا ہونا اچھا یا دنیا والا ہونا اچھا مگر یہ بعض کے اعتبار سے ہے
ورنہ بعضے اولاد والے بے تعلق رہتے ہیں اور بعض بے اولاد دنیا دار ہوتے ہیں چنانچہ اگر
میرے اولاد ہوتی تو شاید میرے لئے تکلیف کا سبب ہوتی کیونکہ مجھے تعلقات سے پریشانی
ہوتی ہے نیز مجھے انتظام کا ہیضہ ہے بد انتظامی سے مجھے سخت الجھن ہوتی ہے اور اولاد کا انتظا
سب سے زیادہ دشوار۔ بس حاصل یہ ہے کہ جسکو اللہ تعالیٰ دیں اسکے لئے یہی اچھا اور جسے
نہ دیں اسکے لئے یہی اچھا اور جسکو دیں اور دیکر چھین لیں اُسکے لئے یہی مصلحت ہے، للہ ما
اخذ وللہ ما اعطی کا یہی مطلب ہے جو حدیث میں مصائب کی تسلیہ کیلئے وارد ہے
اور یہی مطلب ہے انا للہ کا اور اس اعتقاد کو صبر کے پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے اور یہ قرآ

؎ قلت والکمل الاحوال ما کان علیہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم وکذلک الانبیاء کانت لہم ازواج وذر
ودعا ابراہیم وزکریا علیہما السلام ان یولد لہما واستجیبا وعیسی علیہ السلام یولد لہ بعد النزول وفی الحدیث
تزوجوا الودود الولود فانی اباہی بکم الامم فینبغی ان یراعی جانب ذلک فی الکلام ۱۲ ظ

طرز خاص ہے کہ ہر چیز کا طریقہ ساتھ ساتھ بتلا دیا جاتا ہے یہاں صبر کا حکم تھا تو صبر کا طریقہ
ساتھ ساتھ ہی بتلا دیا جیسا کہ سہولت نماز کا طریقہ بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے انہا
لکبیرۃ کہ بیشک نماز گراں ہے۔ آگے طریق سہولت مذکور ہے الا علی الخشعین جس سے
معلوم ہوا کہ خشوع کے بعد نماز سہل ہو جاتی ہے آگے خشوع کا طریقہ ارشاد ہے الذین
یظنون انہم ملاقوا ربہم وانہم الیہ راجعون جسمیں خشوع کا طریقہ یہ بتلایا کہ لقار
رب اور یوم آخرت کا دھیان رکھے اسی طرح یہاں انا للہ الخ کے مضمون کو تحصیل صبر
میں بہت بڑا دخل ہے اور یہی وہ مضمون ہے جسکی وجہ سے حضرت ام سلیم صحابیہ نے کامل
صبر فرمایا اور اپنے خاوند کو بھی صابر بنایا اُن کا قصہ حدیث میں اس طرح ہے کہ اُن کا ایک
بچہ بیمار تھا حضرت طلحہ باہر سے آکر اُس کا حال دریافت کیا کرتے ایک دن اُس کا انتقال
ہو گیا۔ اور شام کو حضرت طلحہ آئے۔ تو حضرت ام سلیم نے ان پر ظاہر نہیں کیا کہ بچہ کا انتقال
ہو گیا تاکہ سنکر پریشان نہوں اور پریشانی میں کھانا نہ کھا سکیں بلکہ جب انھوں نے دریافت
کیا کہ بچہ کیسا ہے تو یہ جواب دیا کہ ابتو سکون ہے (یہ جھوٹ نتھا کیونکہ موت سے بڑھکر
کیا سکون ہوگا جسکے بعد حرکت کی امید ہی نہیں ۱۲) یہ سُنکر اُنھوں نے کھانا کھایا اور رات
کو بیوی کی طرف میلان بھی ہوا بیوی نے بے انتہا صبر کیا کہ اس سے بھی انکار نکیا جب
صبح ہوئی تو کہا کہ میں تمسے ایک مسئلہ پوچھتی ہوں بھلا اگر کسی نے ہمکو کوئی چیز بطور امانت
کے دی ہو پھر بعد میں وہ اپنی امانت کو واپس لینا چاہے تو کیا کرنا چاہیے حضرت طلحہ رض
نے جواب دیا کہ یہی چاہیے کہ جب مالک اُسکو واپس لینا چاہے تو بڑی خوشی سے واپس
کر دیا جائے حضرت ام سلیم نے کہا تو اپنے بچہ کو صبر کرو اور خوشی کے ساتھ اُسکے دفن کا
سامان کرو کیونکہ خدا نے اپنی امانت لیلی ہے حضرت طلحہ بڑے جھلائے کہ تمنے رات ہی
کیوں نہ خبر کی کہا کیا ہوتا رات کو دفن کرنے میں مصیبت ہوتی اور رات بھر پریشان رہتے
کھانا بھی نہ کھاتے اسلیئے رات خبر نہیں کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت
طلحہ گئے تو آپنے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو ام سلیم کا فعل بہت پسند آیا اور میں امید کرتا ہوں
کہ آج رات تم دونوں کو خدا نے مبارک اولاد عطا فرمائی ہے (چنانچہ عبداللہ بن طلحہ پیدا

ہوئے جو بڑے عالم بڑے سخی اور صاحب اموال واولاد تھے ۱۲) تو حضرت ام سلیم نے سچ فرمایا کہ یہ اولاد اللہ کی امانت ہے اسکو جب وہ لینا چاہیں خوش ہو کر خدا کے حوالہ کر دینا چاہیئے۔ اسپر شاید یہ سوال ہوگا کہ یہ امانت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے اسکی محبت کیوں دی ہے اسکا جواب یہ ہے تاکہ پرورش ہوسکے کیونکہ بدون محبت کے اس گوہ کے ڈھیر کی پرورش کرنا مشکل ہے۔ اسی لئے غیر کی اولاد کا پالنا بہت دشوار ہے اور جب بچہ کی پرورش ہو چکتی ہے تو محبت میں بھی کمی ہونے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بیٹے کے ساتھ ویسی محبت نہیں ہوتی جیسی چھوٹے سے ہوتی ہے غرض اولاد کو بھی خدا کی چیز سمجھو کہ اُنکی امانت چندروزہ ہمارے پاس ہے پھر اسکے فوت ہونے پر زیادہ ملال نہ ہوگا کیونکہ پریشانی کی بنا تو یہی ہے کہ تم ان کو اپنی چیز سمجھتے ہو اور یہ سمجھکر ان کے متعلق تجویزیں کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ان اللہ لہ ملک السموات والارض یعنی مالک بھی وہی ہیں مِلک بھی وہی ہیں یہاں مُلک سے مُلک کامل مراد ہے جسکی ساتھ مِلک بھی جمع ہو کیونکہ بدون اسکے مُلک ناقص ہے اور خدا نقصان سے بری ہے اسی لئے مالک یوم الدین میں مالکیت اور ملکیت دونوں کو جمع کیا گیا ہے دو قرائتوں میں اور قرائتین بمنزلہ آیتین کے ہیں ہر ایک کا مفہوم ثابت کرنا لازم ہے کیونکہ ضرورت دونوں کی ہے ایک جہت سے مَلکیت میں قوۃ ہے اور ایک جہت سے مالکیت میں اسلئے مقصود دونوں کو جمع کرنا ہے اسی لئے میں نے کہا کہ یہاں مُلک سے مراد مُلک کامل ہے یا یوں کہو کہ لام (لہٗ میں) مِلک کیلئے ہے تو مالک ہونا اسی سے ثابت اور ملک ہونا لفظ ملک سے ثابت۔ اور ایک آیت میں دو قرائتوں کو ایک ساتھ عمل میں جمع کرنا فقہاء کے عمل سے ثابت ہے چنانچہ حتی یطھرن میں فقہاء نے دونوں قرائتوں کو جمع کر کے احکام مستنبط کئے ہیں اسی طرح میں نے وارجلکم الی الکعبین میں دونوں قرائتوں کو جمع کیا ہے کہ دونوں کے مجموعہ کا مطلب یہ ہوا کہ پیروں کو مل مل کر دھویا کرو کیونکہ ان پر پانی بہالینا عموماً کافی نہیں ہوتا اسی لئے فقہاء نے دلک کو مطلقاً اور دلک رجلین کو خصوصاً مستحب کہا ہے اسی طرح مالک یوم الدین میں دونوں کو جمع کیا گیا ہے مطلب یہ کہ وہ مالک بھی ہیں ملک بھی ہیں

تو اب جہاں اللہ تعالیٰ کیلئے لفظ ملک مطلق آیا ہے وہاں یہی مجموعہ مراد ہوگا ورنہ محض ایک کے
اعتبار میں نقص لازم آتا ہے اور یہی نکتہ ہے من ولی ولا نصیر میں دو لفظوں کے جمع کرنے میں
کیونکہ ولی دوست کو کہتے ہیں خواہ وہ نصرت پر قادر ہو یا عاجز ہو اور نصیر مددگار و معاون کو کہتے
ہیں خواہ دوست ہو یا نہو اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جمع کر کے بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کو تم سے تعلق بھی ہے
اور وہ تمھاری نصرت و اعانت پر بھی قادر ہیں اور اس مضمون کو صیغہ حصر کیساتھ بیان فرمایا ہے
کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمھارا کوئی یار و مددگار نہیں۔ اس حصر میں اسطرف اشارہ ہو کہ بس اللہ تعالیٰ
ہی سے تعلق رکھو اور کسی سے بالذات تعلق نہ رکھو یہی خلاصہ ہے سارے سلوک کا اور جب اللہ تعالیٰ
کے سوا کسی شئی سے تعلق نہو گا تو پھر کسی شے کی فوت ہونیسے زیادہ قلق و غم بھی نہو گا بلکہ اسوقت
حق تعالیٰ کو خطاب کر کے یوں کہیگا ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست تو بماں ای آنکہ جز تو پاک نیست

بس اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں البتہ اخیر میں سالکین کو متنبہ کرتا ہوں کہ اسوقت جو مضمون
میں نے بیان کیا ہے جسطرح یہ مصائب دنیا کا خاتمہ کرنیوالا ہے اسی طرح سلوک کی تمام پریشانیوں کا
بھی قلع قمع کرنیوالا ہے کیونکہ سلوک کی تمامتر پریشانیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک کو ثمرات و احوال
کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے اور انکے متعلق اپنی تجویزیں اور امیدیں قایم کر لیتا ہے جب تجویز کے
خلاف ثمرات و کیفیات کے ظہور میں دیر ہوتی ہے تو پریشان ہوتا اور شیخ سے شکایتیں کرتا
پھرتا ہے۔ اور اسوقت کی بیان کا حاصل یہی ہے کہ بندہ کو تجویز کا کچھ حق نہیں تم اپنی تجویز کو قطع کرو
دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ سے بڑھکر کوئی محبوب نہیں تو اسکو چھوڑ کر غیر سے دل لگانا غلطی ہے اور ثمرات
و کیفیات غیر حق ہیں اسلئے انکا طالب نہونا چاہیے ؎ فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائی + اور ثمرات سے مراد ثمرات غیر اختیاریہ ہیں ثمرات اختیاریہ
مراد نہیں شاید کوئی عامی سمجھکر اختیاریات کے فوت پر بھی راضی رہا کرے ہرگز نہیں کیونکہ اختیاری
امور میں اپنے اختیار کا صرف کرنا واجب ہے ہاں ثمرات غیر اختیاریہ کی عدم حصول یا فوت سے غم نکرے
بس سمجھ لے کہ حق تعالیٰ کا تصرف انکی ہی تجویز ہے مجھے اسپر راضی رہنا چاہیے ؎

باغباں گر پنج روزی صحبت گل بایدش بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال — مرغ زیرک چون بدام افتد تحمل بایدش

سالکین کو بعض احوال ایسے پیش آتے ہیں کہ میں قسم تو نہیں کھاتا گو غلبہ ظن پر قسم کھانا بھی جائز ہے کہ اگر یہ حالات پہاڑ پر وارد ہوں تو پہاڑ بھی پھٹ جائے۔ اور وحی کے متعلق تو خود نص میں وارد ہے لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ یہ تو پہاڑ کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر اس پر قرآن نازل ہوتا تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور حضور کا تحمل مشاہد ہے کہ آپ نے تئیس سال تک نزول قرآن کا ثقل برداشت فرمایا اور وحی میں یہ اثر عالم ملکوت سے تعلق ہونیکی وجہ سے ہے اسی پر دوسرے حالات کو قیاس کر لو جو عالم ملکوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور پہاڑ تو کیا چیز ہے عارفین نے تو اس امانت کا بار اٹھا رکھا ہے جسکے اٹھانے سے زمین و آسمان بھی عاجز تھے

آسمان بار امانت نتوانست کشید — قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

تو سالکین پر اگر ایسے حالات طاری ہوں جنسے پہاڑ پھٹ جائے تو کیا تعجب ہے تو انکو اس مضمون کی کہ کیفیات کے متعلق خود کچھ تجویز نکرو اور ہر کیفیت کو خیر سمجھو بہت قدر ہو گی اسوقت اس سے بہت سہارا ملیگا اور رنج و غم زائل ہو جائیگا۔ صاحبو! واللہ اگر حق تعالیٰ سے تعلق ہو جائے تو سب کا فنا ہو جانا بھی سہل ہو جاتی۔ اور جسکو تعلق مع اللہ نصیب ہو گیا اور تفویض محض اختیار کر لی اس کے سامنے دنیا کے واقعات کیا چیز ہیں انکو تو وہ چٹکیوں میں اڑا دیتا ہے۔ صاحبو! تم اسی غرض سے سلوک اختیار کر لو کہ اس کے ذریعہ سے حوادث و مصائب سہل ہو جائیں گے سالک کی سامنے واقعات دنیویہ کی ایسی مثال ہے جیسے سلطان محمود سبکتگین کے لشکر میں نقارہ جنگ اٹھانیوالے اونٹ تھے یہ نقارے بہت بڑے بڑے بھاری ہوتے تھے ایک دفعہ لشکر جا رہا تھا اور نقارہ جنگ کا اونٹ ایک کھیت میں کو گذرا کاشتکار کے لڑکے نے ڈھیڑیا بجانی تا کہ اس کی آواز سے اونٹ بدک کر کھیت میں سے نکلجائے۔ ڈھیڑیا کو دیکھ کر اونٹ بہت ہنسا کہ میری کمر پر تو اتنا بڑا نقارہ بجتا ہے جسکی صدا سے زمین و آسمان گونج اٹھتے ہیں اس سے تو میں ڈرتا ہی نہیں تیری ڈھیڑیا سے ضرور ڈرونگا حضرت جسکے کمر پر کوس محمودی رکھا ہوا اسکو دنیا کی ڈھیڑیا کب پریشان کر سکتی ہے بس انھوں نے ایک غم لیلیا ہے جسنے عصائے موسیٰ کیطرح غم کے تمام سانپوں کو نگل لیا ہے اور خوشی بھی انکو ایسی ہے کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں اسلئے ایک بزرگ فرماتے ہیں لو علم الملوک ما عندنا لجالدونا بالسیوف کہ اگر بادشاہوں کو اس دولت کی خبر ہوتی جو ہمارے

۳۲

ہی تو وہ تلواریں لیکر ہمپر چڑھ آتے اور اس دولت کو چھیننے کی کوشش کرتے۔
ور وہ ہر حال میں خوش کیوں نہوں جبکہ جانتے ہیں کہ مصیبت وغم سب محبوب کا دیا ہوا ہے
خوشی کیوں نہو ؎ ناخوش تو خوش بود بر جان من + دل فدائے یار دل رنجان من۔
وب اگر عاشق کو آغوش میں لیکر زور سے دبانے لگے تو کیا عاشق کو اس سے رنج ہوگا ہرگز نہیں
ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے لگیں اور گو اسکے منہ سے آہ و نالہ نکل جائے مگر دل سے خوش ہوگا اور یوں
یگا ؎ نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت + سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی۔
ہ آغوش سے نکلنا کبھی نہ چاہے گا بلکہ آغوش یار ہی میں مرجانا چاہے گا اور یوں کہیگا ؎

نکلجائے دم تیری قدموں کے نیچے ۔۔۔ یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

اور اگر اس حالت میں کوئی دوسرا بھی اسکو مارنے لگے تو یوں کہیگا ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست ۔۔۔ تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

اُسوقت اس مراقبہ سے کہ محبوب مجھے دیکھ رہا ہے تمام کلفت آسان ہو جاتی ہے اور یہی
مراقبہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حوادث کے وقت تعلیم فرمایا ہے فاصبر
لحکم ربك فانك باعیننا خلاصہ علاج کا یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ اور غیر خدا سے
حالاً و عملاً و قالاً تعلق کم کرو پھر دنیا و آخرت کی راحت تمھاری ہی لئے ہے اگر فقر و فاقہ بھی ہوا
جب بھی تمکو راحت و چین ہی ہوگا اور اس شعر کے مصداق ہو جاؤ گے ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی + بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

بدون سریر اور سامان کے تم سلاطین سے بڑھکر سلطان ہو گے اور بادشاہوں کو خطاب
کرکے تم یوں کہو گے ؎

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم ۔۔۔ شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

اور یوں کہو گے ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ۔۔۔ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

یعنی آپکو حیات طیبہ حاصل ہو جائیگی یہ تو زندگی کی حالت ہوگی۔ اور مرتے ہوئے یہ حالت
ہوگی۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملئکۃ الا تخافوا

۳۳

ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون نحن اولیاءکم فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ ط ولکم فیہا ما تشتہی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون ہ نزلا من غفور رحیم یعنی مرتے ہوئے فرشتے بشارتیں دیں گے خوشخبری سنائیں گے جس سے ہرنیک بندہ کو اپنے اصلی گھر کا اشتیاق وانتظار ہو جاتا ہے اسی لئے تعجیل جنازہ کا امر ہے اب سمجھ لو کہ یہ موت کیسی خوشی کی ہوگی اور قبر میں یہ ہوگا کہ جنت کی طرف کھڑکیاں کھلجائیں گی وہاں بھی فرشتے بشارتیں سنائیں گے۔ اور میدان حشر میں یہ حال ہوگا لا یحزنہم الفزع الاکبر وتتلقٰھم الملٰئکۃ میں نے مولانا محمد فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سُنا ہے ؎

عاشقانرا با قیامت روز محشر کار نیست ۔۔۔ عاشقانرا جز تماشائے جمال یار نیست

حدیث میں بھی تو آیا ہے کہ قیامت کا دن کافر کیلئے پچاس ہزار سال کا ہوگا اور مؤمن کو ایسا معلوم ہوگا جیسے فرض نماز کا وقت۔ اور پلصراط پر گذرتے ہوئے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ یوں کہے گا جز یا مؤمن فان نورک اطفأ ناری کہ اے مؤمن جلدی پار ہو جا کہ تیرے نور کی برودت نے تو میری نار کی حرارت ہی کو بجھا دیا بتلائیے یہ پاکیزہ زندگی اچھی ہے یا یہ کتاخسی جسمیں ہم پھنسے ہوئے ہیں بس تعلق مع اللہ حاصل کرو جسکا تفصیلی طریقہ اسطرح معلوم ہوگا کہ کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدو یعنی اپنے کو اسکے سپرد کر دو۔ بس پھر جنت ہی جنت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اب میں ختم کر چکا دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمکو اپنے ساتھ تعلق عطا فرمائے اور فہم سلیم اور عمل نصیب ہو آمین وصلے اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلےٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین ہ واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین ہ

اشرف علی

۷ رجب ۱۳۴۷ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ نمبر ۸ مسمّٰی بہ

غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمائش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

(احقر شبیر علی عفی عنہ)

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شائع کیا

الوعظ المسمّٰی بہ غایۃ النجاح (فی) آیۃ النکاح

این	کہاں ہوا	بربرکات اہلیۂ صغریٰ حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم تھانہ بھون
متی	کب ہوا	۲۲ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ بروز یکشنبہ۔
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ ۵ منٹ
کیف	کس ہیئت پر ہوا	جالسا علی الکرسی
لِمَ	کس سبب سے ہوا	ڈپٹی علی سجاد صاحب کی دو صاحبزادیوں کا نکاح تھانہ بھون میں ہوا تھا اس تقریب میں اُن کے اعزہ واقربا کا اجتماع ہوا اُن کی درخواست پر بیان ہوا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	نکاح کا معاملہ بالکل سلوک کے مشابہ ہے جو درجات احوال اس تعلق نکاح کے ہیں وہی تعلق مع اللہ کے ہیں پس ہمکو اس سے سلوک باطن اور تعلق مع اللہ کا سبق لینا چاہیئے اور یہ بطور علم اعتبار کے بیان کیا گیا۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عموماً اور تعلیمیافتہ طبقہ کو خصوصاً۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۵۰ تقریباً اور مجمع مستورات پس پردہ اسکے علاوہ
الاشتات	متفرقات	یہ بیان اپنے مضمون مقصود میں جدید ہے اور اسکا اثر سامعین پر بہت اچھا ہوا بہت سے شبہات کا ازالہ ہو گیا اور [illegible] اکثر بیعت ہو گئے ۱۲ ظ۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ومن آیاتہ

ع ۵ بیان کا وقت تین گھنٹہ سے چند منٹ کم تھا مگر تسوید وعظ پورے تین گھنٹہ تک ہوئی ۱۲ ظ

ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا و جعل بینکم مودۃ و رحمۃ ط ان فی ذلک لاٰیات لقوم یتفکرون (سورۃ الروم پارہ ۲۱) ان آیات کی تلاوت سے غالباً اُن لوگوں کو جو ترجمہ سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں یہ شبہ ہوا ہوگا کہ شاید میں نکاح کے حقوق بیان کروں گا کیونکہ موقع بھی نکاح کا ہے اور درخواست کرنیوالے بھی اسی تقریب میں آئے ہیں مگر اسوقت میرا یہ مقصود نہیں نہ اسواسطے کہ یہ مضمون مقصود بالذات نہیں کیونکہ اگر یہ مضمون (یعنی حقوق نکاح کا بیان) فی نفسہ مقصود نہوتا تو نصوص میں اس کا ذکر نہوتا کیونکہ نصوص میں غیر ضروری امور کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اسوقت مجھے دوسرا مضمون بیان کرنا ہے جو نیا مضمون ہے جو غالباً آج سے پہلے کانوں میں نہ پڑا ہوگا اور حقوق نکاح کا بیان بعض مواعظ میں چند بار بیان ہوچکا ہے اور فقہ کے اردو رسائل میں بھی ان کا ذکر ہے۔ اسلئے اسوقت میں ان حقوق کو بیان نہ کروں گا۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ نصوص میں غیر ضروری امور کا ذکر نہیں کیا گیا اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ جو لوگ قرآن وحدیث میں غیر ضروری امور کو داخل کرتے ہیں وہ غلطی کرتے اور نصوص کی وقعت کو کم کرتے ہیں کیونکہ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی طب اکبر میں جوتہ سینے کی ترکیب داخل کردے اور ربط یہ بیان کرے کہ بعض امراض ننگے پانوں پھرنیسے بھی پیدا ہوتے ہیں جنکا علاج جوتہ پہننے ہی سے ہوسکتا ہے اسلئے ہمنے ناظرین کی آسانی کیلئے جوتہ سینے کی ترکیب بھی لکھدی ہے مگر یقیناً اس ربط کے بعد بھی یہ مضمون اُس کتاب کی وقعت کو کم کردیگا (کیونکہ یہ ربط محض لغو ہی اگر اس وجہ سے طب اکبر میں جوتہ سینے کی ترکیب اضافہ کیجائے گی تو پھر کپڑا بننے کی ترکیب بھی بڑھانا چاہئے کیونکہ بعض امراض عریانی سے پیدا ہوتے ہیں اور کھانا پکانے کی ترکیب بھی لکھنا چاہئے کیونکہ بعض امراض بھوکا رہنے یا خراب غذا کھانیسے پیدا ہوتے ہیں اور پاخانہ کمانیکی ترکیب بھی درج کرنا چاہئے کیونکہ بعض امراض غلاظت اور ترک صفائی سے پیدا ہوتے ہیں پھر وہ طب کی کتاب کیا ہوئی قیامت کی معجون مرکب ہوگئی ۱۲) اسی طرح تفسیر بالرای کرکے قرآن میں غیر ضروری امور اور فضول تحقیقات کو ٹھونسنا بھی قرآن کی وقعت کو کم کرتا ہے یہ سخت غلطی ہے جس کا منشا خود رائی ہے جس سے وہ تفسیر پیدا ہوئی ہے مگر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کی رائے کی صحت پر ہی کیا اطمینان ہے کیونکہ خود آرا میں بکثرت اختلاف ہے اس کا فیصلہ کیونکر ہو کہ کونسی

نصوص میں غیر ضروری امور کا ذکر نہیں

رائے صحیح ہے اب میں قطع نظر تفسیر بالرائے سے مطلق کثرت رائی کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں آجکل اکثر امور میں اسکے لئے ایک قاعدہ نکلا ہے کہ کثرت کیطرف فیصلہ کیا جائے۔ مگر اسمیں اول تو یہ کلام ہے کہ جسکو آپ کثرت سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں کثرت نہیں کیونکہ تمنے دس بیس پندرہ یا پچاس آدمیوں کو جمع کرکے اُن سے رائے لیلی اور کثرت پر فیصلہ کردیا حالانکہ کروڑوں آدمی ابھی ایسے باقی ہیں جن سے رائ نہیں لی گئی کیونکہ عوام سے کون رائے لیتا ہے اور اُنکی رائے شمار ہی کون کرتا ہے اگر عام سے رائے لی جائے اور اُنکی آرار کو شمار کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ جسکو آپ کثرت سمجھتے تھے حقیقت میں وہ قلت ہے اور اگر یوں کہو کہ ہمکو عوام سے رائے لینے کی ضرورت نہیں بلکہ ہم عقلار کو منتخب کریں گے اور اُنکی کثرت پر فیصلہ کا مدار رکھیں گے تو میں پوچھوں گا کہ عقلار کس معیار سے منتخب کئے جائیں گے اور اُس معیار کے صحیح ہونے کی کیا دلیل؟ اگر انتخاب عقلار کا معیار تمنے اپنی ذاتی رائے سے قائم کیا تو تمھاری رائے کے غلط نہ ہونیکی کیا وجہ؟ اور اگر کثرتِ رائے سے وہ معیار کیا تو ہمارے خیال میں تو آجتک کسی نے اس معیار کے متعلق کثرت رائ حاصل نہیں کی۔ اور جسدن اس مسئلہ کو کثرت رائے سے حل کیا جائیگا ہم دکھلادیں گے کہ یہ مسئلہ طے ہی نہوگا کیونکہ ہر شخص انتخاب عقلار کا معیار ایسا بیان کرے گا جسمیں وہ خود بھی داخل ہوسکے ایسا معیار کوئی نہ بیان کریگا جسکی وجہ سے وہ خود بیوقوف قرار پائے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں کسی ایک معیار پر کثرت رائے ہوجانا دشوار ہے (ظ) غالبًا آج آپکو کثرت رائے پر فیصلہ کرنے کی حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ یہ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت میں فیصلہ ہمیشہ شخصی رائے سے ہوتا ہے کیونکہ کثرت رائے کے حاصل کرنیکا جو معیار تجویز کیا جاتا ہے وہ شخصی رائے سے تجویز ہوتا ہے اسمیں خوب غور کرو یقینًا انتہا شخصی رائے پر ہوگی۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اس کثرت رائے کے فیصلہ میں بھی وہ خرابی موجود ہے جو شخصی رائ میں بیان کیجاتی ہے کیونکہ کثرت رائے کے فیصلہ سے بھی رعایا کی حریت باطل ہوتی ہے جس کا آج کل بہت چرچا ہے کہ مساوات اور حریت ہونا چاہیئے یہانتک کہ عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ تم عورتوں کو تو مردوں کی برابر پیچھے کرنا پہلے مردوں مردوں کو تو برابر کردو میں پوچھتا ہوں کیا پارلیمنٹ کے سب قوانین عام رعایا کی رائے کے موافق ہوتے ہیں؟

ف کثرت رائے پر فیصلہ کرنا لغو ہے

ف جن عقلار کی کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے انکو عاقل سمجھنے کی کیا دلیل اور انتخاب عقلار کا معیار کیا ہے

ف کثرت رائے میں بھی وہ خرابی موجود ہے جو شخصی رائے میں ہے [illegible]

ہرگز نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں افراد کی رائے کے خلاف ہوتے ہیں تو کیا اس صورت میں کثرت رائے سے حریت باطل نہیں ہوئی پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو جنکی رائے پارلیمنٹ کے فیصلہ کے خلاف ہے اس فیصلہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اُنپر جرم کی دفعات قائم کرتے ہیں آخر انکو آزادی کیوں نہیں دیجاتی یہ کیا کہ مرد و عورت تو برابر ہوں اور مرد مرد برابر نہوں کیا یہ ظلم وستم نہیں اور جب کثرت رائے سے بھی حریت کا ابطال ہوتا ہے اور وہی جبر و استبداد اسمیں بھی جو شخصی رائے میں ہے تو اب بتلائیے کہ ایک شخص کی غلامی اور استبداد سے پارلیمنٹ کی غلامی اور اُس کا استبداد کیوں افضل ہے؟ یقیناً بیس پچاس آدمیوں کی غلامی سے ایک کی غلامی بہتر ہوگی جیسا ایک عاقل سلیم الفطرۃ شاعر کہتا ہے ؎

اربا واحدا ام الف رب ادین اذا تقسمت الامور

ترکت اللات والعزی جمیعا کذلک یفعل الرجل البصیر

پس اپنی اپنی رائے کا یا کثرت رائے کا اتباع نکرو بلکہ حکم واحد کا اتباع کرو اور وہ حکم واحد وحی ہے اسمیں خود رائی سے فضولیات کو نہ ٹھونسو کیونکہ رائے کی صحت پر کسیطرح اطمینان نہیں ہوسکتا جیسا کہ اوپر مفصل معلوم ہوچکا پس اپنی رائے کو رہنے دو اور جو کچھ وحی بتلائے اس کا اتباع کرو۔ جو شخص وحی میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے وہ جاہل ہے مجنون ہے مگر آجکل بڑی حماقت یہ ہو رہی ہے کہ مجنون اپنے کو مجنون نہیں سمجھتا اور یہ بھی آثار جنون سے ہے (بلکہ جنون کا اعلیٰ نمبر ہے ۱۲) اور اگر کوئی یہ کہے کہ میں نصوص کی تفسیر اپنی رائے سے اسلئے کرتا ہوں کہ نصوص کی مشہور تفسیر میں شبہات پیدا ہوتے ہیں تو میں کہونگا کہ شبہات کا یہ علاج نہیں کہ تم اپنی رائے سے ہر شبہ کو دفع کرو بلکہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ شبہات کے منشا کا علاج کرو ہر شبہ کو الگ الگ دفع کرتے ہیں دردسری بھی ہے اور اس سے سلسلہ شبہات کا ختم بھی نہیں ہوسکتا تم منشا کا علاج کرو انشاء اللہ سب ایک دم سے زائل ہو جائیں گے اسکی ایسی مثال ہے جیسے رات کو اندھیرے میں گھر کے اندر چوہے چھچھوندر کودتے پھرتے تھے اور گھر والا ایک ایک کو پکڑ کر باہر نکالتا تھا مگر وہ پھر سب کے سب اندر آجاتے تھے ایک عاقل نے کہا کہ میاں یہ سب اندھیرے کی وجہ سے کودتے پھرتے ہیں تم لیمپ روشن کردو یہ سب خود ہی

بھاگ جائیں گے پھر کوئی پاس نہ پھٹکے گا چنانچہ لمپ روشن کیا گیا اور سب کے سب ادھر اُدھر اپنے بل میں گھس گئے۔ اسی طرح یہاں سمجھ لو کہ یہ وساوس و شبہات جو وحی اور قرآن میں آپکو پیش آتے ہیں ان کا منشا ظلمت قلب ہے جسکا علاج یہ ہے کہ قلب میں نور پیدا کر لو! پھر ایک شبہ بھی پاس نہ آئیگا اور وہ نور کیا ہے؟ نور محبت ہے۔ حضرت محبت و عشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے تو پھر محبوب کے کسی حکم اور کسی قول و فعل میں کوئی شبہ اور وسوسہ پیدا نہیں ہوتا اگر ایک پروفیسر فلسفی کسی طوائف پر عاشق ہو جائے اور وہ اس سے یوں کہے کہ سر بازار کپڑے نکالکر ننگے آؤ تو میں تمسے بات کرونگی ورنہ نہیں تو فلسفی صاحب اسکے لئے فوراً تیار ہو جائینگے اور یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ بی؟ اسمیں تیری کیا مصلحت ہے اب کوئی اس سے پوچھے کہ آپکی وہ عقل و فلسفیت اس طوائف کے سامنے کہاں چلی گئی افسوس قرآن و حدیث کے مقابلہ میں تو ساری فلسفیت ختم کی جاتی ہے اور ایک ادنی مردار کے احکام میں چون و چرا اور لم و کیف سب رخصت ہو گیا آخر اسکی کیا وجہ؟ یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ اسکی وجہ محبت و عشق ہے بس معلوم ہو گیا کہ خدا و رسول کے احکام میں شبہات پیدا ہونے کی وجہ عدم محبت یا قلت محبت ہے اگر آپکے دل میں نور محبت روشن ہوتا تو یہ سارے چوہے اور چھچھوندر خود بھاگ جاتے شیخ سعدی اسی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودے زآب و گل ۔۔۔ رباید ہمہ صبر و آرام دل

اور جب ایک مخلوق کے عشق کا یہ اثر ہے تو خالق کے عشق کا اثر کیا کچھ ہونا چاہیئے ؎

عجب داری از سالکان طریق ۔۔۔ کہ باشند در بحر معنی غریق

دمادم شراب الم درکشند ۔۔۔ وگر تلخ بینند دم درکشند

مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ۔۔۔ گوے گشتن بہر او اولےٰ بود

اور میں علماء کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علماء کے عرفی اخلاق ہی نے عوام کو خراب کیا ہے کہ جہاں ان کے سامنے کسی نے شبہات بیان کئے اور یہ ہر شبہ کے مفصل جواب کو تیار ہو گئے ارے اصلی جواب یہ ہے کہ مرض کو تشخیص کرو اور جڑ کو اکھاڑو! تم شاخوں کو چھانٹتے ہو اس سے

کیا ہوتا ہے جب جڑ موجود ہے تو چند روز میں ہزاروں نئے نئے پتے اور نکل آئیں گے محقق تشخیص
کر کے اصل مرض کا علاج کرتا ہے اور غیر محقق آثار کا علاج کرتا ہے ۔ میں نہایت پختگی سے دعوی کیساتھ
کہتا ہوں کہ جن مسلمانوں کو آجکل مذہب میں شکوک واوہام پیدا ہوتے ہیں انکے اس مرض کا منشا قلت
محبت مع اللہ ہے انکو اللہ ورسول کے ساتھ محبت نہیں ہے تعلق نہیں ہے اور محض برائے نام تعلق
کو تعلق کہا جاتا ۔ اور تعلق مع اللہ کے حاصل ہونیکا واحد طریق صرف یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت حاصل
کیجائے اہل محبت کی صحبت میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے بہت جلد محبت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اہل
غفلت کی صحبت سے غفلت جلدی پیدا ہوتی ہے پھر جب محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو جائے گا
یہ لم وکیف باطل اور وساوس وشبہات سب جاتے رہیں گے ۔ میں علماء سے خیر خواہی کیساتھ کہتا ہوں
کہ تم ان شبہات کے جواب میں کیوں اپنا دماغ تھکاتے ہو بس تم صرف ایک کام کرو کہ ان لوگوں کو
اہل اللہ کی صحبت ومحبت کا پتہ دیدو ۔ ورنہ تمھاری ساری تدبیروں اور تقریروں کا وہی حال ہوگا
جو مولانا نے ابتدائے مثنوی میں ناواقف طبیبوں کی تدبیر کا حال بیان فرمایا ہے کہ ایک بادشاہ
کی کنیزک بیمار تھی اطباء نے اس کا مرض سودا وصفراء تجویز کر کے دوائیں دینا شروع کیں اسکے
بعد طبیب الٰہی آیا اور اس نے تجویز کیا کہ ؎

رنجش از سودا واز صفرا نبود ۔۔۔ بوئے ہر ہیزم پدید آید زدود

اسکو سوداء یا صفراء کا مرض نہیں بلکہ یہ تو ایک زرگر کے عشق میں گرفتار ہے اور اس نے دوسرے
طبیبوں کی تدبیروں کے متعلق یوں کہا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشان کردہ اند ۔۔۔ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

بیخبر بودند از حال دروں ۔۔۔ استعیذ اللہ مما یفترون

اصل مرض سے آنکھیں بند کر کے آثار کا علاج کرنا ایسا ہے جیسا ایک شخص پاخانہ لئے بیٹھا ہو اور
بدبو آرہی ہو اور تم پاخانہ کو تو نہیں دھوتے اوپر سے عطر حنا اور عطر خس لگا رہے ہو اس سے کیا
ہوتا ہے جب تک پاخانہ کو دور نہ کرو گے تمھارے سارے عطر برباد ہو جائیں گے ۔ مگر غضب تو
یہ ہے کہ آج کل علماء بھی خود طریق علاج نہیں جانتے ۔ تو اب عوام نے اپنا علاج خود کرنا شروع کیا کہ
قرآن وحدیث کا ترجمہ پڑھنے لگے اور ترجمہ دیکھکر شبہات کا خود ہی جواب دینے لگے مگر میں تجربہ سے

کہتا ہوں کہ ایسے عوام کو خود ترجمہ پڑھنا حرام ہے۔ بلکہ تمکو لازم ہے کہ کسی محقق سے رجوع کرو اور جو طریق وہ بتلا دے اُسپر عمل کرو اپنی رائے کو دخل ندو پھر وہ یہی تمکو قرآن کا ترجمہ پڑہاے گا یا پڑھنے کی رائے دیگا مگر قابل بنا کر۔ اور اگر آپ اُسکے سامنے بھی اپنی رائے چلائیں گے تو اسکی ایسی مثال ہوگی جیسے اپنے بچہ کیلئے تم ایک نصاب تعلیم تجویز کرو اور وہ اُسمیں اپنی رائے کو دخل دے تو کیا آپ کو اُسکی رائے کی کچھ وقعت ہوگی؟ ہرگز نہیں صاحبو! دنیا و دین کا کوئی کام بدون تقلید محقق کے نہیں ہو سکتا۔ دیکھیئے اگر ایک سرکاری مکان دو لاکھ روپئے میں تیار ہوا ہو مگر انجنیر اُسکو پاس نکرے اور یہ کہے کہ دو ماہ میں یہ مکان گر جائیگا تو اُسی وقت لاکھوں کی عمارت کو بیکار کر دیا جاتا اور اُسکو خالی کر دیا جاتا بلکہ بعض دفعہ گرا دیا جاتا ہے یہاں کوئی اپنی عقل کو دخل نہیں دیتا بلکہ بلا چون وچرا انجنیر کی تقلید کیجاتی ہے یہی حال ڈاکٹروں کی تقلید کا ہے کہ اُنکی تجویز میں کوئی دخل نہیں دیتا صاحبو! جن لوگوں کی تقلید میں آپ عقل پرستی کرتے ہیں وہ تو خود بھی عقل پرستی نہیں کرتے ہاں عاقل پرستی کرتے ہیں۔ پس قرآن میں ہر بات کو اور ہر نئی تحقیق کو اپنی رائے سے ٹھونسنا سخت غلطی ہے آپ کی رائے باطل ہے کیونکہ آپ محقق نہیں ہیں۔ اسی شائد آپ یہ کہیں کہ جب علماء یہ کام نہیں کرتے تو ہم نے کہا لاؤ ہم ہی یہ کام کریں کیونکہ علماء پرانی لکیر کے فقیر ہیں وہ جدید تحقیقات کا ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں دیتے تو یہ کام ہم نے شروع کر دیا میں کہتا ہوں بیشک مگر آپ کے کام کی ایسی مثال ہوگی جیسے کسی طبیب کا لڑکا اپنے باپ کیساتھ مطب میں اور مریضوں کو دیکھنے جایا کرتا تھا مگر خود اُسے گھر کی عقل نتھی ایک دفعہ اُسکے باپ نے کسی مریض کی نبض دیکھکر کہا کہ آج معلوم ہوتا ہے تمنے نارنگی کھائی ہے مریض نے اقرار کیا حکیم صاحب نے اسکو پرہیز کی تاکید کر کے نسخہ لکھدیا جب واپس ہوئے تو لڑکے نے باپ سے پوچھا کہ آپکو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے کہا نبض سے تو یہ معلوم ہوا تھا کہ اس نے کوئی شے محرک صفرا کھائی ہے پھر چارپائی کے نیچے جو میں نے نظر کی تو نارنگی کے چھلکے نظر پڑے اس سے میں سمجھا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے۔ بس صاحبزادہ کے ایک قاعدہ ہاتھ آگیا کہ مریض کے پلنگ کے نیچے جو چیز پڑی ہو اس نے وہی کھائی ہے جب حکیم صاحب کا انتقال ہوا اور صاحبزادہ کی نوبت آئی تو آپ ایک رئیس کی نبض دیکھنے گئے اور چارپائی کے نیچے نظر ڈ

لینے لگے کہ آپنے آج نمدہ کھایا ہے (کیونکہ چارپائی کے نیچے نمدہ ہی پڑا تھا) رئیس نے کہا کہ نمدہ بھی
ئی کھایا کرتا ہے کہا کچھ ہی ہو نبض تو یہی بتلاتی ہے رئیس نے حکم دیا اسکی دم سے نمدہ باندھکر
ہر سے باہر نکالدو۔ یہ تو بالکل جاہل مطلق معلوم ہوتا ہے تو حضرت اسی طرح آپ کی حالت ہوگی
یونکہ آپکو گھر کی تو عقل نہیں شریعت سے اور قرآن سے مناسبت نہیں معلوم آپ اسمیں کیا سے کیا
ٹھونسیں گے۔ صاحبو! علمار کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن میں صنعت وحرفت ٹھونسیں اور نہ
قرآن صنعت وحرفت کی کتاب ہے۔ بلکہ قرآن قانون الٰہی ہے اور علمار کا کام وہ ہے جو وکلار
کا کام ہوتا ہے کہ وکیل صرف یہ بتلاتا ہے کہ یہ امر قانون کے موافق ہے یا خلاف ہے اس سے
زیادہ وکیل کا کام کچھ نہیں مثلاً اس سے قانون کی لم پوچھی جاوے اسی طرح علمار کا اس سے زیادہ
کچھ کام نہیں کہ جس بات کے متعلق شبہ ہو کہ یہ قانون کے خلاف تو نہیں ہے اسکو علمار سے پوچھ لو
وہ قانون الٰہی کے موافق یا مخالف ہونے کو واضح کردیں گے نہ اُن کا یہ کام ہے کہ اُس قانون
کی لم بتلادیں نہ یہ کام ہے کہ تمام سائنس کی تحقیقات کو قرآن میں داخل کریں اسی طرح نہ اُن کا
یہ کام ہے کہ قومی کاموں میں حصہ لیں نہ یہ کہ اسکے لئے چندہ کریں۔ انکا کام صرف قانون الٰہی کو سمجھنا
ہے اور اُن سے یہی پوچھنا بھی چاہئے کہ یہ بات قانون الٰہی کے تو خلاف نہیں۔ اور یاد رکھو اگر
سب لوگ میدان میں آجائیں گے تو چند روز کے بعد قرآن وحدیث کا سمجھنے والا آپکو کوئی نہ ملیگا
میں علمار کے میدان میں آنیکا من کل وجہ مخالف نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ سب کو میدان میں
نکلنا جائز نہیں ہاں جب علمار علم دین کو اچھی طرح حاصل کرلیں تو جنکو میدان میں نکلنے کا شوق
ہو وہ آئیں مگر کچھ لوگ حجرہ نشین بھی رہنا چاہئیں جنکا کام سوائے قال اللہ قال الرسول اور سوائے
کتابیں پڑھنے پڑھانے کے کچھ نہو کیونکہ تجربہ ہے کہ کتابی استعداد اور فتوی دینے کی قابلیت بدون
اسکے کامل نہیں ہوتی جو علمار میدان میں آئے ہوئے ہیں انمیں اکثر تو وہ ہیں جنکو کتابی استعداد بالکل
نہیں اور اگر کسی کو یہ قابلیت حاصل ہے تو یہ حجرہ نشینی ہی کی برکت ہے کہ وہ ایک مدت تک حجرہ نشین
ہوکر کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا ہے مگر آپ اس حجرہ ہی کو بند کرنا چاہتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوگا
کہ چند روز میں حدیث وقرآن وفقہ کے سمجھنے والے اور انکو صحیح طور پر حل کرنے والے دنیا سے نابید
ہوجائیں گے۔ اگر اس کی ضرورت کو آپ محسوس کرتے ہیں اور یقیناً ہر شخص اسکی ضرورت کو تسلیم

کرے گا تو ضروری ہے کہ سب علماء میدان میں نہ آئیں بلکہ کچھ میدان میں آئیں اور کچھ مناظرہ
کچھ تبلیغ کریں اور ایک جماعت ایسی ہو جو ان سب کاموں سے الگ رہکر حدیث و قرآن و فقہ
اور ضروریات کی تعلیم دیں۔ اُنکو سوائے تعلیم و تعلم کے کچھ نکرنا چاہیئے ورنہ قابل علماء ہرگز
نہونگے تقسیم خدمات بہت ضروری ہے اور تمام عقلاء اور متمدن اقوام اسکی ضرورت پر متفق ہیں
پھر حیرت ہی کہ ہمارے بھائی اسکو نظر انداز کر کے سبکو ایک کام میں کیوں لگانا چاہتے ہیں بعض
لوگوں نے اسکا نام رکھا ہے ملکر کام کرنا سو صاحبو! ملکر کام کرنیکے یہ معنی نہیں کہ بڑھئی اور معمار
سب ایک ہی کام کو لگ جائیں بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ مکان بنانے میں جتنے کاموں کی ضرورت
اُنکو بانٹ کر ایک کام بڑھئی کرے ایک کام لوہار کرے ایک کام معمار کرے جبھی کام تیار ہوگا
بڑھئی اور معمار اور لوہار سب کے سب اینٹوں ہی کے کام پر لگ گئے تو مکان ہرگز تیار نہوگا۔

ف علماء کام کرنیکے معنی یہ ہیں جیسے بڑھئی لوہار معمار ملکر مکان بناتے ہیں۔

بس اب یہ کہنا غلط ہے کہ علماء کام نہیں کرتے علماء کا جو کام ہے جس کا انھوں نے بیڑا اٹھایا
وہ اسکو بحمد اللہ بخوبی کر رہے ہیں آپ کو اُن کے کام میں دخل دینے کی ضرورت نہیں آپ اپنی
رائے سے قرآن و حدیث میں غیر ضروری اور فضول باتوں کو نہ ٹھونسیئے اور اپنی تحقیقات
شریعت میں داخل نہ کیجئے بلکہ قرآن و حدیث کو اُن لوگوں پر چھوڑ دیجئے جو اُسکے سمجھنے والے
ہیں اور اس معاملہ میں آپکو انہی کی تقلید کرنا چاہیئے اپنی رائے سے قرآن و حدیث میں کسی
چیز کا ٹھونسنا آپکو جائز نہیں بلکہ سراسر حماقت ہے چونکہ آجکل لوگوں میں یہ مرض عام ہوگیا
اسلیئے استطراداً اس کا بیان کر دیا گیا۔ چنانچہ میں ایک جگہ گیا ہوا تھا وہاں ایک صاحب
مجھسے کہنے لگے کہ آجکل تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں نر و مادہ ہوتے ہیں نباتات
میں بھی اشجار میں بھی تو مجھے فکر ہوئی کہ قرآن میں اس مضمون کا کہاں ذکر ہے گویا وہ تحقیق
ان کے نزدیک وحی سے بھی زیادہ تھی کہ اُسکے لئے تو کسی دلیل کی بھی ضرورت نتھی اُسپر ایمان لانے
کیلئے تو اتنا کافی ہو گیا کہ اخبار میں پڑھ لیا کہ آجکل تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے افسوس
یہ لوگ قرآن و حدیث کو تو بدون اپنی مزعوم دلیل کے ماننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ اُسمیں شکوک
و شبہات نکال لیتے ہیں اور نئی تحقیقات پر صرف اخبار میں دیکھکر ایمان لے آتے ہیں اس
بے انصافی اور بدتمیزی کی بھی کوئی حد ہے۔ پھر اسکے بعد یہ قاعدہ بھی ثابت کر لیا کہ قرآن

ف ایک صاحب نے قرآن سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ نباتات میں بھی نر و مادہ ہیں اور اسکی تردید۔

ف افسوس ہے لوگ قرآن وحدیث میں تو شبہات نکالتے ہیں اور تحقیقات سائنس پر فوراً ایمان لے آتے ہیں۔

واقعی بات مذکور ہونا چاہیئے اور اسکے متعلق کسی بزرگ رح کی طرف ایک شعر منسوب کیا جاتا ہے

جمیع العلم فی القرآن لکن   تقاصر عنہ افہام الرجال

قرآن میں تمام علوم ہیں لیکن لوگوں کی افہام اسکے سمجھنے سے قاصر ہیں (۱۲) مگر میں کہتا ہوں
اول تو سند صحیح سے اس کا ثبوت دو کہ یہ شعر کس بزرگ کا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسمیں یہی تو
گیا ہے کہ قرآن میں تمام علوم ہیں جمیع الجہل فی القرآن تو نہیں کہا تو اب تم اس کا ثبوت
کہ جن تحقیقات کو تم قرآن میں ٹھونستے ہو یہ علم ہے جہل نہیں ہے اور اگر علم سے مراد مطلق دانستن
ہے تو میں کہونگا کہ اگر ویسرائے کا امتحان قانون وغیرہ میں ہو رہا ہو تو کیا کوئی اسوقت یہ
کہیگا کہ ویسرائے کا امتحان پارچہ سازی و پارچہ دوزی میں بھی ہونا چاہیئے کیونکہ علم لغوی
یہ بھی ہے یقیناً کوئی اسکی جرأت نکریگا بلکہ یہ کہا جائیگا کہ ویسرائے کے علم کے سامنے یہ جہل ہے
علم نہیں اسی طرح جن باتوں کو آپ قرآن میں اپنی رائے سے ٹھونستے ہیں وہ علوم قرآن وحدیث
کے سامنے علم نہیں بلکہ جہل محض ہیں۔ غرض وہ صاحب بڑے حیران تھے کہ قرآن میں یہ
مسئلہ کہاں ہے کہ نباتات وغیرہ میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں تو انھوں نے تمام ترجمے دیکھے اور
ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ اس خیال سے بڑے اہتمام سے دیکھا کہ وہ نئی روشنی کے مفسر ہیں
شاید انھوں نے نئی تحقیقات کو قرآن میں ٹھونسا ہو باقی یہ مدرسوں اور مسجدوں کے ملانے تو
لکیر کے فقیر ہیں ان سے کیا امید ہے کہ سلف کے اقوال پر کچھ زیادتی کریں گے مگر ڈپٹی نذیر احمد
صاحب کے ترجمہ میں بھی کہیں اس مسئلہ کا ذکر نملا کیونکہ گو وہ نئی روشنی کے مفسر تھے مگر عمر میں پورانے
ہی تھے اسلئے وہ آجکل کے نوجوانوں کی طرح ٹھوس نتھے کہ قرآن میں جو چاہیں ٹھونس دیں۔
اور میں آپکو ایک بشارت سناتا ہوں کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمے میں بہت سی غلطیاں
تھیں جنپر میں نے ایک رسالہ میں تنبیہ کی تھی ڈپٹی صاحب نے میری تنقید کو پسند کیا اور یہ ارادہ
کیا تھا کہ اسکے بعد طبع ثانی میں ان اغلاط کو صحیح کر دونگا مگر انکو موقعہ نملا۔ تو وہ صاحب کہتے تھے
کہ جب مجھے کسی ترجمہ میں یہ مضمون نہ ملا اور مایوسی ہو گئی تو پھر ایک دن میری بیوی قرآن پڑھ
رہی تھی سورہ یسین میں جب اس آیت پر پہونچی سبحان الذی خلق الازواج کلہا مما
تنبت الارض ومن انفسہم ومما لا یعلمون تو میرا ذہن فوراً اس مسئلہ کیطرف منتقل ہوا

ف قرآن میں ہر مضمون کا ہونا ضروری نہیں جمیع احکام کی تعمیم ہے شعر مذکور سے تعمیم علوم پر استدلال کا جواب

ف ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کے متعلق ایک تازہ اطلاع

کہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ ہر شے میں نر و مادہ ہیں (اور عجیب بات ہے کہ
یہ مسئلہ آپکو قرآن میں بیوی کی قرارت سے سمجھ میں آیا خود مطالعہ کرنے میں سمجھ میں نہ آیا شاید
اسکی یہ وجہ ہو کہ نر و مادہ کا مسئلہ نر و مادہ کے اجتماع ہی سے حل ہو سکتا ہے ۱۲ ظ) کیونکہ اللہ
نے یہاں یہ فرمایا ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے تمام ازواج کو پیدا کیا زمین کی نباتات سے بھی او
خود تمھاری جنس میں بھی اور اُن چیزوں میں بھی جنکو تم نہیں جانتے اور ازواج کے معنی نر و مادہ
کے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ! یہ آپ سے کس نے کہدیا کہ زوج کے معنی نر و مادہ کے ہیں زوج
کے معنی لغت میں جوڑ کے ہیں چنانچہ زوج الخف موزہ کے جوڑہ کو کہتے ہیں اور زوج و فرد جفت
طاق کو کہتے ہیں کیا یہاں بھی آپ نر و مادہ کے معنی کریں گے ہرگز نہیں اور میاں بیوی کو بھی ازوا
اسی لئے کہتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کا جوڑہ ہے بس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں
مختلف اقسام پیدا کی ہیں نباتات میں بھی انسانوں میں بھی اور اُن چیزوں میں بھی جنکو تم نہیں جانتے
اور اقسام مختلفہ کو ازواج اسواسطے کہا گیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ ملکر مقسم کے افراد ہیں گویا آپ
جوڑے ہیں۔ یہ ہے آج کل کے استدلالات کی حقیقت جنکو سنکر ادنیٰ طالب علم بھی ہنستا ہے
یہ استدلال قرآن سے کیونکر ہوا بس یہ ایسا ہی استدلال ہے جیسا کہ شاہ عبد العزیز صاحب کے
پاس ایک جاہل کو لایا گیا تھا کہ حضرت یہ ماں کو نفقہ نہیں دیتا بلکہ ساری کمائی بیوی کو دیدیتا ہے
شاہ صاحب نے اُس سے وجہ پوچھی تو کہا قرآن میں ماں کا حق کہیں نہیں اور بیوی کا ہے اطعمھم
من جوع کو آپ نے من جوی پڑھا کہ کھانا دو جوی کو یعنی زوجہ کو شاہ صاحب نے پوچھا کہ تو نے
قرآن کا ترجمہ و تفسیر پڑھی ہے کہا نہیں پوچھا قرآن پڑھا ہے کہا نہیں صرف چند سورتیں شروع کی
پارۂ عم سے یاد ہیں (اس قابلیت پر آپکا یہ اجتہاد تھا کہ قرآن میں ماں کا حق نہیں ہے ۱۲)۔
شاہ صاحب نے فرمایا کہ تبت سورۂ تبت یدا ابی لہب بھی پڑھی ہے کہا جی ہاں فرمایا ذرا سناؤ تو
اس نے پڑھنا شروع کیا تبت یدا ابی لہب وتب ؏ ما اغنی عنہ مالہ وما کسب ہ
فرمایا دیکھو قرآن میں تو یہ ہے کہ ماں کا سب۔ جو کچھ ہے سب ماں ہی کا ہے بیوی کا تو صرف نفقہ
کہنے لگا جی ہاں اب سمجھ گیا اب میں ماں کو بھی دیا کرونگا۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قرآن سے
استدلال ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ الزامی جواب تھا کہ جیسی تفسیر تم نے اطعمھم من جوع کی کی ہے

ان لوگوں کے استدلالات کی ایسی مثال ہے جیسے شاہ صاحب نے قرآن سے یہ مسئلہ ثابت کیا تھا کہ مال ماں کا سب۔

ویسی ہی تفسیر بر قرآن سے یہ مسئلہ بھی نکل سکتا ہے۔ بس اسی طرح جو مسائل آجکل کے ذہین لوگ قرآن میں ٹھونستے ہیں وہ قرآن سے اسی طرح ثابت ہوتے ہیں جسطرح سورۂ ایلاف سے اور سورۂ تبت سے یہ مضامین ثابت ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے قرآن سے یہ مسئلہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ منی میں کیڑے ہوتے ہیں اُن کیڑوں سے بچہ بنتا ہے تو آپ نے خلق الانسان من علق سے اس مسئلہ کو ثابت کیا اور لکھا کہ علق لغت میں جونک کو کہتے ہیں اور وہ بھی ایک کیڑا ہے تو قرآن سے ثابت ہو گیا کہ بچہ منی کے کیڑوں سے بنتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن سے تو یہ ثابت نہوا بلکہ اگر تمھارے ترجمہ کو مان لیا جائے تو یہ ثابت ہوا کہ انسان کو جونک سے پیدا کیا گیا ہے اور اس کے تو سائنس والے بھی قائل نہیں۔ تو افسوس تمنے قرآن کا ترجمہ بھی بگاڑا اور مقصود پھر بھی ثابت ہوا۔ ان سب اختراعات کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی رائے کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ قرآن کو اُس سے حل کریں صاحبو! عوام کو لازم ہے کہ اپنے کو جاہل سمجھیں عاقل اور ذی رائے نہ سمجھیں اور اگر عاقل و ذی رائے سمجھیں تو دنیا کی باتوں میں رائے چلا لیا کریں قرآن و حدیث کو تختۂ مشق نہ بنائیں بلکہ علماء کو بھی لازم ہے کہ اپنے کو عالم نہ سمجھیں مگر جاہل بھی نہ سمجھیں کہ اسمیں ناشکری ہے بلکہ علماء سابقین سے اپنے کو کم سمجھیں۔ صاحبو! آجکل جو لوگ قرآن میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں اُنکو ایمان عزیز نہیں ورنہ اگر جان کی طرح انکو ایمان بھی عزیز ہوتا تو قرآن میں اپنی رائے کو نہ ٹھونستے نہ علماء سے مزاحمت کرتے جیسا کہ اطباء سے مزاحمت نہیں کرتے اور اگر وہاں طبیب یا ڈاکٹر کی رائے سے مزاحمت کرینگے تو وہ نکال باہر کر دیگا پھر معلوم دین ہی اتنا سستا کیوں ہے کہ اسمیں ہر شخص اپنی رائے کو دخل دیتا ہے بس ایمان کو تو یوں سمجھ لیا ہے کہ ہمکو خود لپٹتا پھرتا ہے کہ جب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لیں گے بس ایمان آجائیگا اور اگر کبھی چلا بھی جائیگا تو پھر کلمہ پڑھ لینے سے واپس آجائیگا اسی لئے بیوی کا نکاح ٹوٹنے کا تو لوگوں کو خوف ہوتا ہے مگر ایمان جانیکا خوف نہیں ہوتا سو یاد رکھو بیشک ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینے سے ہر بار لوٹ آتا ہے اور چاہے کتنی دفعہ کفر کرے اس سے ایمان تازہ ہو جائیگا مگر اس فعل میں اس بیوفائی میں خاصیت یہ ہے کہ پھر ایمان کی توفیق ہی نہو گی قرآن میں ہے ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم آمنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرا لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا۔ حالانکہ ثم ازدادوا کفرا

ف: ایک صاحب نے خلق الانسان من علق سے یہ ثابت کیا کہ منی میں کیڑے ہوتے ہیں اور بچہ انہی سے بنتا ہے۔ تردید

ف: عوام کو لازم ہے کہ اپنے کو جاہل سمجھیں اور علماء بھی اپنے کو علماء سلف سے کم سمجھیں

ف: لوگوں نے ایمان کو سستا سمجھ لیا ہے

ف: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے سے ایمان ہر بار لوٹ آتا ہے مگر بار بار کفر کرنے میں یہ خاصیت ہے کہ پھر ایمان کی توفیق نہیں ہوتی

کے بعد بھی ثم آمنوا کی گنجایش تھی مگر اسکے بعد حق تعالیٰ نے ثم آمنوا نہیں فرمایا کیونکہ اسپر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ اس فعل میں خاصیت یہ ہے کہ اسکے بعد اکثر توفیق ایمان نہیں ہوتی پس ایمان کی قدر کرو اور اسکی حفاظت کی کوشش کرو قرآن و حدیث میں اپنی رای کو دخل نہ دو اور نہ علماء سے مزاحمت کرو بلکہ محققین کے اپنے کو سپرد کر دو اس سے شبہات و وساوس کا دروازہ بند ہو جائیگا چونکہ آجکل یہ مرض عام ہے اسلئے میں نے اسپر تنبیہ کر دی میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسوقت مجھے حقوق نکاح کا بیان مقصود نہیں نہ اسواسطے کہ وہ مقصود بالذات نہیں کیونکہ اگر مقصود بالذات نہ ہوتے تو قرآن و حدیث میں ان کا ذکر نہ ہوتا بلکہ مجھے اس آیت سے ایک اور مضمون کی تائید کرنا مطلوب ہے اور میں اس آیت سے اُس مضمون کو ثابت کرنا نہیں چاہتا صرف تائید کرنا چاہتا ہوں آجکل یہ بھی ایک عام غلطی ہے کہ ثبوت اور نظیر و تائید کو ایک سمجھتے ہیں ان لوگوں کو علم خاک نہیں اگر انگریزی کی منطق کے بعد یہ لوگ عربی منطق پڑھیں تو معلوم ہو کہ انگریزی منطق محض بچوں کی باتیں ہیں۔ واللہ علماء کے سامنے ان لوگوں کو نہ علم ہے نہ عقل ہے کیونکہ انھوں نے علوم کی صورت ہی نہیں دیکھی عربی کے علوم وہ ہیں کہ ایک معمولی طالب علم کے سامنے بھی بڑے سے بڑا انگریزی داں طفل مکتب ہے اور جو فاضل علماء ہیں وہ تو ان سے ہزار درجہ اعقل ہیں مگر آج کل مولویوں کی وقعت اسلئے نہیں ہے کہ ان کا لباس خستہ ہے اور انگریزی دانوں کا لباس قیمتی ہے اور آجکل لیاقت کا معیار لباس ہی رہ گیا ہے چنانچہ ہم جو شملہ گئے تھے تو حالانکہ ہم لوگ بحمد اللہ معمولی لباس نہیں پہنتے اوسط درجہ کا اچھا لباس پہنتے ہیں مگر بعض جنٹلمینوں کی نظر میں وہ اتنا گھٹیا تھا کہ جب میں بیان کرنے کیلئے کھڑا ہوا تو ایک صاحب کرنل عبد المجید خاں سے جو ہمارے وعظ کے مشتہر تھے کہنے لگے کہ آپ کے مولویوں کا لباس تو ایسا ہے کہ گویا ابھی پاخانہ سے نکلے آرہے ہوں (مطلب تھا کہ بس انکی لیاقت بھی ایسی ہی ہوگی) کرنل صاحب نے کہا کہ میں اس سوال کا جواب ابھی نہیں دینا چاہتا وعظ ختم ہونیکے بعد جواب دونگا چنانچہ جب میرا بیان ختم ہوگیا تو کرنل صاحب نے کہا ہاں صاحب اب فرمایئے آپ کیا فرماتے تھے کہنے لگے اب کیا کہوں میری سخت حماقت تھی کہ میں لیاقت کا معیار لباس کو سمجھتا تھا اب معلوم ہوا کہ لیاقت اور قابلیت دوسری شے ہے ذرا دیکھئے تو سہی یہ ان لوگوں کی عقل کا حال ہے کہ لباس کو معیار لیاقت و قابلیت سمجھتے ہیں نہ معلوم یہ کہاں کی عقل ہے مجھے جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو میں نے دل میں کہا کہ میں

ف آجکل ثبوت و نظیر کو ایک سمجھا جاتا ہے

ف انگریزی منطق عربی منطق کے سامنے بچوں کا کھیل ہے

ف آجکل لیاقت کا معیار لباس رہ گیا ہے اور اسپر شملہ کی حکایت

ان لوگوں کے ضرور کان کھولوں گا چنانچہ اسکے بعد جو دوبارہ میرا بیان ہوا تو میں نے اس کا جواب دیا مگر تہذیب کیساتھ۔ گو انھوں نے تو اعتراض بدتمیزی سے کیا تھا مگر میں نے جواب میں تہذیب کو ہاتھ سے نہیں دیا میں نے بیان سے پہلے بطور تمہید کے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں بعض صاحبوں کو ہمارے لباس پر اعتراض ہے اور ممکن ہے کہ اُنکی نیت اسمیں اچھی ہو وہ یہ کہ اگر واعظ کا لباس قیمتی ہوگا تو سامعین کے قلوب میں اُسکی عظمت ہوگی اور عظمت سے بیان کا اثر زیادہ ہوگا اور اس نیت کیساتھ اس اعتراض کا منشا خیر خواہی ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ علمار آپ حضرات کے خیال کے موافق لباس کہاں سے لائیں کیونکہ مولویوں کے پاس اتنی آمدنی کہاں جس سے قیمتی لباس تیار کریں انمیں تو اکثر کی آمدنی بیس پچیس تیس روپے ماہوار ہے اور جو زیادہ عروج ہوا تو پچاس روپے کی تنخواہ ہوگئی تو اتنی آمدنی میں تو وہ ایسا ہی لباس بنا سکتے ہیں جیسا وہ پہن رہے ہیں مگر وہ مصلحت بھی قابل لحاظ ہے جو قیمتی لباس میں ہے کیونکہ بعض لوگوں کا یہ مذاق بھی ہے کہ اُنکی نظر میں لباس ہی سے لیاقت و قابلیت ظاہر ہوتی ہے تو اب اسکی صورت کیا ہو کہ یہ مصلحت بھی حاصل ہو اور مولویوں کا عذر بھی ملحوظ رہے میرے ذہن میں اسکی یہ صورت آئی ہے کہ آپ حضرات علمار کیلئے اپنے مال سے جوڑے تیار کریں۔ اور اس سے نہ گھبرایئے گا کہ ہملوگ وہ جوڑے لیکر اپنے گھر چلدیں گے ہرگز نہیں بلکہ انجمن میں اسی غرض سے داخل کردیں کہ وہ انکو صرف وعظ کے وقت پہن لیا کریں گے اور چلتے ہوئے انجمن میں واپس دے جائیں گے تاکہ وہ دوسرے واعظوں کے کام آویں جب کوئی مولوی معمولی لباس میں آوے آپ اُسکو یہ کپڑے پہنا دیجئے کہ انکو پہنکر وعظ کہو۔ اس صورت میں آپکا زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا بس جو کچھ ہونا ہوگا ایکدفعہ ہو جائیگا مگر اسکے بعد اس طرح یہ مقصود سہولت کیساتھ حاصل ہو سکتا ہے اب میں منتظر ہوں کہ معترض صاحب اس کا انتظام کرتے ہیں یا نہیں اگر اُن میں کچھ بھی غیرت ہے تو ضرور ہمارے واسطے جوڑے تیار ہونگے ورنہ اُنکو چاہیئے کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مریں (بس صرف یہ ایک جملہ میں نے تیز کہا) آپنے دیکھا کہ آجکل یہ تمیز رہگئی ہے کہ علمار کے پاس چونکہ لباس قیمتی نہیں اسلئے اُنکی وقعت نہیں دوسرا ان کے پاس دعویٰ نہیں کیونکہ اُنکو یہ مضمون یاد ہے ؎

ہر کہ گردن بدعوے افرازد　　خویشتن را بگردن اندازد

اور آجکل اُسی کی وقعت ہے جو خود اپنی زبان سے کہتا ہو کہ میں ایسا ہوں ویسا ہوں اور علماء
بیچارے تو خود یہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں ہمکو کچھ نہیں آتا اور تو اور وہ بیچارے تو ڈر کے مارے ایمان
کا بھی دعویٰ نہیں کرتے ہاں تحدث بالنعمۃ کے طور پر یوں کہدیتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے
ہمکو ایمان عطا کیا ہے دعویٰ نہیں کرتے بس ان کی تواضع نے اہل دنیا کو شیر کر دیا وہ یہ سمجھنے
لگے کہ جب یہ خود اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں اور مولوی ہو کر یہ جھوٹ نہیں بول سکتے تو یہ
واقع میں کچھ نہیں ہوں گے یہ آجکل کی عقل ہے جو ان حضرات کو مبارک ہو ورنہ حقیقت میں علماء کے
سامنے انگریزی منطق پڑھے ہوئے خاک بھی وقعت نہیں رکھتے وہ استحالہ و استبعاد میں امتناع
و تعذر میں ثبوت اور نظیر تک میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔ مگر علماء ان میں فرق کرتے ہیں اور ہر اک کی
حقیقت کو الگ الگ جانتے ہیں اسلئے میں نے کہدیا کہ اس آیت سے میں اُس مضمون کو جو اسوقت
بیان کرنا چاہتا ہوں ثابت نکرونگا بلکہ آیت سے صرف تائید کروں گا اور یہ حفظ حدود ہے کہ ہر مضمون
کو اُسکی حد پر رکھا جائے چونکہ اس سے پہلے والحافظون لحدود اللہ کا بیان ہوا تھا جسمیں بتلایا
گیا تھا کہ شریعت میں حفظ حدود کا بڑا اہتمام ہے اسلئے میں نے اسپر تنبیہ کر دیا کہ حفظ حدود میں یہ بھی
داخل ہے کہ دلالت کلام کے درجات کا لحاظ رکھا جائے کہ جو مضمون جسدرجہ میں مدلول کلام ہو اُسکو
اُس سے آگے نہ بڑھایا جائے اب میں اول آیت کا ترجمہ کرتا ہوں اسکے بعد مضمون مقصود کی تائید کرونگا
ترجمۂ آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی قدرت کی نشانیونمیں
سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے جوڑے بنائے یعنی ازواج کو پیدا کیا تاکہ
تمکو اُن سے سکون قلب حاصل ہو۔ یہ نکاح کا اصل موضوع لہ ہے یعنی سکون حاصل ہونا باقی خدمت وغیرہ
یہ سب فروع ہیں وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ اور تمھارے درمیان باہم محبت اور ہمدردی پیدا
کی یہ بھی دلائل قدرت میں سے ہے کہ جو دو شخص ابھی ایک ساعت پہلے اجنبی محض تھے اب اُنمیں نکاح کے
بعد کیسی محبت ہو جاتی ہے کہ دوسرے تعلقات میں اُسکی نظیر نہیں ملتی اسی لئے حق تعالیٰ نے اسکو صیغہ
امر سے بیان نہیں کیا کہ تمکو آپسمیں مودت و رحمت کا برتاؤ رکھنا چاہیئے بلکہ صیغہ خبر سے بیان فرمایا
کہ ہمنے تمھارے درمیان خاص تعلق پیدا کر دیا یعنی ہمنے تمھاری مدد کی ہے بدون ہماری مدد کے
اجنبیت میں ایسا تعلق نہیں ہو سکتا تھا اور یہاں مودت و رحمت دو لفظ اختیار کئے گئے اس سے

ف حفظ حدود میں یہ بھی داخل ہے کہ تائید اور اثبات میں فرق کیا جائے

ف آیت کا ترجمہ و تفسیر

مطلب یہ ہے کہ اس تعلق میں کبھی مودت کا غلبہ ہوتا ہے کبھی رحمت وہمدردی کا چنانچہ ابتدا میں عموماً محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور انتہا میں رحمت وہمدردی کا۔ اور اس عنوان میں عورتوں کی اس شکایت کا بھی جواب ہوگیا جو عورتوں کو مردوں سے اکثر ہوا کرتی ہے جب نکاح کو چند سال گذر جاتے ہیں تو عورتیں مردوں سے کہا کرتی ہیں کہ اب تمھارے دل میں ہماری ویسی محبت نہیں رہی جیسی شروع میں تھی اب وہ ولولہ اور تقاضا اور جوش عشق نہیں رہا اس شکایت کا منشا جہل ہے اور اگر مرد لاجواب ہو جائے تو یہ اُس کا جہل ہے دونوں جاہل ہونگے تو شکایت بڑھے گی عاقل اس اعتراض کو کبھی تسلیم نکریگا وہ اس کا یہ جواب دیگا کہ قاعدہ یہ ہے کہ قدامت کے بعد جوش کم ہوجاتا ہے مگر جوش کا کم ہوجانا زوال محبت کی دلیل نہیں بلکہ کمال محبت کی دلیل ہے کیونکہ جوش خود نقص کی دلیل ہے دیکھو ہنڈیا میں جب تک جوش رہتا ہے کچی ہے اور جب جوش کم ہو کر سکون ہوجاتا ہے اسوقت سمجھتے ہیں کہ ہنڈیا پک گئی اسی لئے انبیاء علیہم السلام اور کاملین میں کیفیات کا جوش کم ہوتا ہے اور متوسطین میں اُن سے زیادہ اور چھٹ بھیوں میں تو سب سے زیادہ جوش ہوتا ہے مگر سب جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کامل ہیں تو انکی محبت بھی سب سے کامل ہے حالانکہ وہاں جوش نہیں پس عورتوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ بیوی کے پرانی ہو جانے سے اگر مرد کا جوش کم ہو جائے تو یہ محبت کے کم ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اسکی دلیل ہے کہ محبت کامل ہوگئی ہے مگر رنگ بدل گیا ہے پہلے محبت و عشق کا رنگ تھا اب رحمت وہمدردی کا رنگ ہے پہلے محبت تھی مگر کسیقدر تکلف اور اجنبیت بھی تھی اب بالکل بے تکلفی ہے کہ ایک دوسرے کا ہمراز و دمساز اور راحت وغم کا شریک ہے گویا دو قالب ایک جان ہیں یہ نکتہ ہے مودت ورحمت دو لفظوں کے اختیار کرنے میں اسکے بعد ارشاد ہے ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون کہ اسمیں اُن لوگوں کیلئے دلائل قدرت ہیں جو سوچ اور فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسمیں ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس سے وجود صانع پر استدلال ہوتا ہے اس طرح کہ دیکھو عورت اور مرد دونوں انسان ہی ہیں مگر دونوں میں کسقدر تفاوت ہے کہ مرد کی خلقت اور بناوٹ جدا ہے عورت کی جدا ہے مرد سے بچہ نہیں پیدا ہو سکتا عورت سے بچہ پیدا ہوتا ہے مرد کو مرد سے وہ راحت اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا جو عورت سے حاصل ہوتا ہے تو ایک ہی نوع کے افراد میں ایسا تفاوت اور اسمیں مصالح کی اسقدر رعایت بدون صانع حکیم کے نہیں ہو سکتی اس سے یہ بات

ف قاعدہ یہ ہے کہ قدامت کے بعد جوش کم ہوجاتا ہے

ف محبت کا جوش کم ہوجانا زوال محبت کی دلیل نہیں بلکہ کمال کی دلیل ہے

ف معاملہ نکاح میں دلائل قدرت موجود ہیں اور ان کی تفصیل

ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی صانع ضرور ہے۔ ایک اعرابی کہتا ہے البعرۃ تدل علی البعیر والاثر یدل علی المسیر فالسماء ذات الابراج والارض ذات الفجاج کیف لا یدلان علی اللطیف الخبیر۔ کہ اونٹ کی مینگنی دیکھکر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں سے کوئی اونٹ گیا ہے اور قدم کا نشان دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کوئی گیا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی　　ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

تو یہ بڑے بڑے ستاروں اور چاند سورج والا آسمان اور یہ کشادہ اور فراخ سڑکوں والی زمین اپنے صانع حکیم کے وجود پر کیونکر دلالت نہ کرے گی ضرور کرے گی۔ سبحان اللہ! ایک جاہل بدوی کیسی عجیب بات کہتا ہے کہ جب آثار مؤثر پر دلالت کرتے ہیں دھواں دیکھکر تمکو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں آگ ہے نشان قدم دیکھکر یہ خبر ہو جاتی ہے کہ یہاں سے کوئی ضرور گیا ہے اور ایک نفیس عمارت دیکھکر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کا بنانے والا کوئی ضرور ہے اور یہ کوئی نہیں کہتا کہ یہ نشان قدم خود ہی بنگیا ہوگا یا یہ مکان خود ہی تیار ہو گیا ہوگا پھر حیرت ہے کہ اتنا بڑا آسمان اور یہ پہاڑ اور زمین دیکھکر اور اسکے نظام اکمل کا مشاہدہ کرکے تمکو اسکے صانع کا علم نہو اور یوں کہو کہ یہ خود ہی اپنی طبیعت سے بنگئے ہیں۔ اسکو کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا بلکہ ایک بدوی بھی اس خیال کو دلیل سے باطل کر رہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے اور قرآن میں جا بجا اسی فطری دلیل سے وجود اور توحید صانع پر استدلال کیا گیا ہے چنانچہ اس مقام پر بھی اس پر تنبیہ کیگئی ہے کہ اللہ تعالی نے تمھارے لئے تمھاری جنس میں سے بیبیاں بنائی ہیں۔ اگر غور سے کام لو تو اسمیں تمھارے لئے دلائل قدرت موجود ہیں۔ اور یہی وہ فطری امر ہے جو میثاق الست میں قلوب کے اندر پیوست کیا گیا ہے اس میثاق سے آپکو یہی سبق پڑھایا گیا ہے اور اسپر جو ایک شبہ مشہور ہے کیونکہ آجکل ہمارے دوستوں نے شبہات کا سبق بھی پڑھ لیا ہے کہ ہمکو تو یہ عہد یاد نہیں کہ کب اور کسوقت لیا گیا اور جب یاد نہیں تو اس عہد سے فائدہ ہی کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ آپکو اس عہد کی کیفیت بیشک یاد نہیں رہی لیکن اس کا مقصود سبکو یاد ہے اور مطلوب مقصود ہی کا یاد ہونا ہے کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا مقصود نہیں۔ دیکھو جن لوگوں نے کبھی فارسی پڑھی ہے انکو یہ محفوظ ہے کہ آمدن کے معنی آنا ہیں کیونکہ آمدن کا سبق آجکل ہر شخص

ف مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے

ف یہی وہ فطرت ہے جو میثاق الست میں قلوب کے اندر ڈالی گئی ہے اور اسپر جو شبہ ہوتا ہے ان کا جواب

گویاد ہے لیکن اگر آپ ان سے یہ پوچھیں کہ آمدن کے معنی آپکو کسدن اور کس جگہ پڑہائے گئے اور آمدنامہ آپنے کون سے استاد سے پڑہا ہے تو ان سوالات کا جواب شاید ہزار میں ایک ہی آدمی دیسکے گا کیونکہ یہ باتیں کسی کو محفوظ نہیں رہتیں تو کیا ان کے یاد نہ رہنے سے یہ کہا جائیگا کہ آمدنامہ پڑھنا فضول اور بیکار گیا ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہیگا کہ آمدنامہ پڑھنے سے مقصود صرف یہ تھا کہ اس کا مضمون یاد رہے کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا مقصود نتھا اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ میثاق الست سے مقصود یہ تھا کہ وجود صانع اور توحید صانع کا مضمون طبائع میں مرکوز ہو جائے کیفیت تعلیم کا محفوظ ہونا مقصود نتھا سو بحمد اللہ وجود اور توحید صانع فطرۃً ہر شخص کے دل میں مرکوز ہے اسی کا یہ اثر ہے کہ مصنوعات کو دیکھکر ایک جاہل بدوی بھی صانع کے وجود پر استدلال کرتا ہے اسپر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آمدنامہ کی جوہمنے مثال دی ہے تو وہاں ہزار میں ایک آدمی تو ایسا نکلتا ہے جسکو کیفیت تعلیم بھی یاد ہوتی ہے چنانچہ بعضے قوی الحافظ اب بھی بتلا سکتے ہیں کہ ہمنے آمدنامہ کس سے پڑہا تھا اور کس مکان میں پڑہا تھا مگر میثاق الست کی کیفیت یاد رکھنے والا تو کوئی ہزار میں بھی ایک نہیں ملتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ سیکو لیجئے اور پر قیاس کیجئے یہاں بھی بعضے قوی الحافظہ ایسے موجود ہیں جنکو اس عہد کی کیفیت ابتک یاد ہے چنانچہ شیخ سعدیؒ اس طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں ؎

الست از ازل ہمچناں شان بگوش بفریاد قالوا بلیٰ در خروش

ہمیں تو اجمالاً بتلایا گیا ہے کہ اس عہد کے یاد رکھنے والے اب بھی موجود ہیں اور بعض بزرگوں کے کلام میں اس سے زیادہ تفصیل موجود ہے چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہمکو یاد ہے کہ اسوقت ہماری دائیں طرف فلاں اور بائیں طرف فلاں تھا۔

اور انہی بزرگ کے کشف سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اسوقت ارواح صف بستہ نتھیں بلکہ یوں ہی گڈمڈ جمع تھیں جیسے میلہ میں اجتماع ہوا کرتا ہے پھر اسوقت جو لوگ باہم رو در رو ہو گئے انمیں تو طرفین سے محبت ہوتی ہے اور جو لوگ رو در پشت ہوے کہ ایک کا منہ دوسرے کی پشت کی طرف تھا انمیں ایک طرف سے محبت اور ایک طرف سے اعراض ہوتا ہے اور جو پشت در پشت ہوئے انمیں طرفین سے انقباض و اعراض ہوتا ہے اور ان بزرگ کے مذاق پر اس حدیث کا

بعض اہل اللہ کو میثاق الست کی کیفیت یاد ہے۔

یہی محمل ہے الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف۔
ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے کہ جسوقت ازل میں میثاق لیا گیا تو سب ارواح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا منہ تکنے لگیں کہ جو آپ کہیں گے وہی سب کہیں گے چنانچہ سب سے پہلے حضور اقدس (سردار عالم فداہ آباؤنا وامہاتنا) کی زبان مبارک سے بلی نکلا تو آپ کے بعد سب نے بلی کہا (صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ کما یحب ویرضی) تو حضرت آپ سبکو اپنے اوپر قیاس کیجیے اس امت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنکو اس عہد کی کیفیت یاد ہے بلکہ اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو جنت اور دوزخ کی پیمائش تک کر آئے کہ جنت کتنی بڑی ہے اس کے کتنے درجے ہیں اسی طرح دوزخ کی تفصیلی سیر کی اور اسکی پیمائش بھی کر لی اور یہ سیر روحانی طریقہ پر تھی۔ انہی بزرگ کو زمین آسمان سے باہر ایک سمندر بہت بڑا منکشوف ہوا ہے جسکی ایک موج اس غضب کی ہوتی ہے کہ اگر ملائکہ اسکو نہ روکیں تو آسمان وزمین کو غرق کر دے اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مگر عرش سب سے بڑا ہے اس سے بڑی کوئی چیز نہیں میں یہ کہہ رہا تھا کہ دلائل قدرت اور آثار خلق کو دیکھکر خلاق عالم کی ہستی کا اقرار فطری امر ہے اسپر یہ گفتگو تبعاً آگئی کہ فطرت میں یہ مضمون میثاق الست کے وقت سے مرکوز ہوا ہے اور اسکے بیان میں اور شبہات کے جوابات میں کلام قدرے طویل ہو گیا بہر حال مصنوع کو دیکھکر صانع پر استدلال فطری ہے گو اسکی فلسفی تقریر دقیق ہے جسکو ہر شخص آسانی سے نہیں سمجھ سکتا چنانچہ فلسفی طریقہ پر وجود صانع کی دلیل یہ ہے کہ تمام عالم حادث ہے کیونکہ بہت سی چیزوں کا حدوث تو ہمکو مشاہد ہوتا ہے اور جنکا حدوث مشاہد نہیں ہوا انکے احوال کا تغیر وانقلاب بتلا رہا ہے کہ یہ حادث ہیں کیونکہ محل حادث کا حادث ہوتا ہے ابھی میں نے اخبار میں ایک امریکن ڈاکٹر کا یعنی ماہر سائنس کا قول پڑھا ہے کہ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی روشنی میں بہت کمی آگئی ہے اور عنقریب اس کی روشنی زائل ہو کر یہ چراغ گل ہو جائیگا اور اسوقت دنیا میں اسقدر سردی پڑے گی کہ مخلوق کا زندہ رہنا محال ہے تمام عالم فنا ہو جائیگا (ہم تو اس خبر سے خوش ہوئے کہ اہل سائنس کو قرآن سے قیامت کی خبر کا یقین نہ ہوا تھا تو اب آلات رصد سے یقین آنے لگا ۱۲) غرض اشیاء عالم کا تغیر وانقلاب پتہ دے رہا ہے کہ یہ سب حادث ہیں قدیم نہیں یعنی ان کا وجود دائمی اور ضروری نہیں اور حادث

ف اس امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جنت ودوزخ کی پیمائش کر آئے ہیں۔

ف وجود صانع کی فلسفی دلیل۔

ف ایک ماہر سائنس کا قول ہے کہ آفتاب کی روشنی عنقریب زائل ہو جائیگی

کیلئے ممکن ہونا لازم ہے اور ممکن کیلئے کسی مرجح کی ضرورت ہے کیونکہ ممکن وہ ہے جس کا وجود و عدم مساوی ہو یعنی نہ اسکے لئے موجود ہونا ضروری ہے نہ معدوم ہونا ضروری ہے اور جس کا وجود و عدم برابر ہو تو اسکے وجود کیلئے کوئی مرجح ہونا چاہیئے ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئیگی اور ترجیح بلا مرجح باطل ہے پھر اس مرجح میں گفتگو کیجائے گی کہ وہ ممکن ہے یا کچھ اور ہے اگر مرجح ممکن ہو تو اسکے لئے دوسرے مرجح کی ضرورت ہوگی اور چونکہ تسلسل محال ہے اسلئے کہیں نہ کہیں سلسلہ ختم کرنا پڑیگا اور یہ ماننا پڑیگا کہ مرجح ایسی ذات ہے جو ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اسی واجب الوجود کو ہم صانع اور خلاق عالم کہتے ہیں۔ اسپر ایک شبہ سوال یہ ہوگا کہ صانع کے ماننے کے بعد بھی تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے کیونکہ صانع نے تمام مخلوقات کو ایکدم سے پیدا نہیں کیا اور ایک حال میں پیدا نہیں کیا بلکہ کسی کو آج پیدا کیا کسی کو آج سے ہزار برس سو برس پہلے پیدا کیا اور کسی کو بعد میں پیدا کریگا اور کسی کو حسین بنایا کسی کو بدشکل کسی کو مرد کسی کو عورت کسی کو امیر کسی کو غریب کسی کو عاقل کسی کو احمق تو یہاں مرجح کون ہے۔ زید کو آج کیوں پیدا کیا کل کیوں نہیں کیا تھا اور اسکو امیر کیوں بنایا عمرو کی طرح غریب کیوں نہ بنایا زید کو عمرو پر کیا ترجیح تھی مثلاً۔ اس سوال کا جواب حکماء اسلام کے سوا کوئی نہیں دیسکا فلاسفہ کی عقلیں یہاں آکر چکر کھانے لگیں حکماء اسلام نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ان امور میں ارادہ واجب مرجح ہے اور ارادہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے مرجح ہے اسکے لئے کسی دوسرے مرجح کی ضرورت نہیں (اسپر حکماء یونان کی طرف سے ان کے معتقدوں نے یہ اشکال وارد کیا کہ بیشک یہ تو ہمنے مان لیا کہ ارادہ کیلئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی ذات سے مرجح ہے مگر یقیناً خدا تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ ارادہ تو قدیم اور مراد حادث ہو اس صورت میں تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آتا ہے اور یہ محال ہے اس کا جواب حکماء اسلام نے ایسا دیا ہے کہ حکماء یونان کے دانت کھٹے ہوگئے فرمایا کہ صفات واجب اپنی ذات میں قدیم ہیں مگر ان کا تعلق ممکنات کیساتھ حادث ہے اور تخلف مراد کا تعلق ارادہ کے بعد محال ہے اس سے پہلے محال نہیں پس ہم یہ کہیں گے کہ ارادہ کا تعلق مختلف طور سے ہوتا ہے اسلئے مراد کا وجود بھی مختلف ازمنہ اور مختلف حالات کے ساتھ ہوتا ہے ۱۲ ظ) یہ عقلی دلیل ہے وجود صانع کی اب اگر کوئی یہ کہے کہ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا تو میں کہونگا کہ اس کا

صانع عالم کے ماننے کے بعد بھی ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے

وجود صانع کی عقلی دلیل ہو [illegible]

میرے پاس کچھ علاج نہیں میں تو جواب دیچکا اب اگر آپ کے پاس برتن نہو اور کھانا گر جائے تو
میں کیا کروں - اور اگر آپ یوں کہیں کہ اسکو ایسا آسان کر کے بیان کرو جو ہم بھی سمجھ جائیں تو میں
کہونگا کہ آپ ایک سائیس کو اقلیدس کی ایک شکل ایسے آسان طریقہ سے سمجھا دیجئے جسمیں
نہ اسکو اصول موضوعہ کے معلوم کرنے کی ضرورت ہو نہ علوم متعارفہ کی نہ حدود کی نہ دوسری اشکال
کی - صرف آپکی تقریر ہی سے ایک مجلس میں اقلیدس کی شکل سمجھ جائے تو میں بھی آپکو یہ تقریر آسان
کر کے سمجھا دونگا - اور اس مثال سے آپ برا نہ مانیں کہ ہمکو سائیس بنا دیا کیونکہ اول تو یہ لفظ عربی ہے
سیاست سے مشتق ہے سائس کے معنی عربی میں سیاست داں ہیں اور سیاست داں ہونا تو تعریف
کی بات ہی برا ماننے کی بات نہیں ہے آپ تو اپنے آپ کو سیاست داں سمجھتے ہی ہیں تو میں نے سائیس
کہدیا تو کیا برا ہوا - دوسرے یہ کہ میرا مقصود ہر بات میں آپکو سائیس سے تشبیہ دینا نہیں بلکہ صرف
اس بات میں تشبیہ دیگئی ہے کہ جسطرح وہ اقلیدس کے اصول موضوعہ اور مبادی سے ناواقف ہے
اسلئے اقلیدس کی شکلیں نہیں سمجھ سکتا اسی طرح چونکہ آپ دلائل عقلیہ کے اصول ومبادی سے
ناواقف ہیں اسلئے اس تقریر کو آپ نہیں سمجھ سکتے گو کتنا ہی آسان کر کے بیان کیا جائے کیونکہ
میں نے تو اسوقت بھی اردو ہی میں تقریر کی تھی عربی یا عبرانی میں تقریر نکی تھی مگر آپ کو اصول ومبادی
حاضر نہیں اسلئے آپ نہیں سمجھ سکتے اگر سمجھنا مطلوب ہے تو اول اصول ومبادی سے فراغت کیجئے
پھر فوراً سمجھ میں آجائیگا - خلاصہ یہ ہے کہ علماء کے پاس تو ہر بات کا جواب ہے مگر آپکے پاس سوال
ہی نہیں یعنی سوال کی اہلیت نہیں ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد ۔ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

ف علماء کے پاس ہر بات کا جواب ہے مگر آپکے پاس سوال کی اہلیت نہیں

اب شاید کسی کو یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ خلق ازواج میں آیات کثیرہ کہاں ہیں؟ جو کہ ان فی ذلک
لآیات میں صیغۂ جمع سے مفہوم ہو رہا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو دنیا میں ہزاروں لاکھوں
میاں بیوی ہیں پس ہر فرد کا وجود اور انکی باہمی مودت و رحمت الگ الگ دلیل ہے جو مجموعہ ہو کر
بہت سے دلائل ہیں - دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک ہی میاں بیوی کو لیا جائے تو خود انمیں
بھی بہت سے دلائل ہیں کیونکہ نکاح سے انسان کیلئے ایک نیا عالم شروع ہو جاتا ہے جو ہر شخص
کی زندگی کا ورق اولٹ دیتا ہے - یقیناً جس شخص نے کسی بچہ کو چار پانچ سال کی عمر میں دیکھا تھا

ف نکاح سے مرد وعورت کیلئے ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے اور اس مسئلہ تجدد امثال کی تائید ہوتی ہے

وہ اُسکو نکاح کے بعد اس حال میں دیکھے کہ وہ گھر کا سردار بنا ہوا بیوی بچوں کی پرورش کر رہا ہے
تو وہ ہرگز یہ نہ سمجھیگا کہ یہ وہی بچہ ہے جو میرے سامنے ننگا پھرا کرتا تھا یقیناً وہ اول اسکو دوسرا
آدمی سمجھیگا پھر لوگوں کے بتلانے کے بعد جب یہ سنے گا کہ یہ وہی لڑکا ہے تو اسکو بڑی حیرت ہوگی
کہ اللہ کیا سے کیا ہوگیا اور جس نے کسی شخص کو اس حال میں دیکھا ہو کہ آج اُسکی شادی ہو رہی ہے
پھر ایک عرصہ کے بعد اس حال میں دیکھے کہ وہ خود اپنے لڑکے کا نکاح کر رہا ہے تو اسکو بڑی حیرت
ہوگی یہ تو وہ باتیں ہیں جو دوسروں کو محسوس ہوتی ہیں اور خود اس شخص کو اگر وہ تامل سے
کام لے نکاح کے بعد اپنی زندگی میں ایسا انقلاب عظیم معلوم ہوگا کہ گویا یہ دوسری زندگی ہے
اور یہاں سے ایک مسئلہ کشفی کی تائید ہوتی ہے یعنی تجدد امثال کی جو صوفیہ کو کشف سے
معلوم ہوا ہے کہ ہر شے کیلئے ایک ہی وجود مستمر نہیں ہے بلکہ ہر آن میں پہلا وجود فنا ہو کر دوسرا
وجود عطا ہوتا ہے مگر چونکہ تبدل وجود علی الاتصال والتوالی پے درپے ہوتا رہتا ہے اسلئے عام
لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ہی وجود بچپن سے اخیر عمر تک مستمر ہے حالانکہ یہ ایک وجود نہیں بلکہ اسپر
ہزاروں لاکھوں وجود آئے ہیں جسکو اہل کشف مشاہدہ کرتے ہیں اسی کی ایک نظیر کو ایک عارف نے
یوں بیان کیا ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زمان از غیب جان دیگر ست

اور یہی محمل ہو سکتا ہے اس شعر کا جو مولانا کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے ؎

ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بار ہا روئیدہ ام

مگر یہ مسئلہ کشفی ہے اسپر اعتقاد لازم نہیں اور چونکہ نصوص اس سے ساکت ہیں نفی بھی نہیں کرتیں
اسلئے صحت کا بھی احتمال ہے۔ (اسوقت حضرت مولانا پر دھوپ آگئی اسلئے کرسی کو ہٹانا پڑا
تو فرمایا دیکھئے اونچا ہونے میں یہ خرابی ہے کہ ذرا اسی دیر میں دھوپ سے سکنے لگے مگر یہ ثبوت نہیں
محض تائید ہے ۱۲) یہ تو آیت کا مدلول تھا جو ترجمہ کے بعد بیان کر دیا گیا۔ اب میں بطور تشبیہ کے
اس مضمون سے ایک اور مضمون کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تشبیہ اور نظیر سے تائید اور توضیح
ہو جاتی ہے مثلاً کوئی تشبیہ کے طور پر یوں کہے کہ زید شیر ہے تو اس سے محض وضاحت اور تنویر
مقصود ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعی شیر ہے۔ اسی طرح جو مضمون میں بیان کروں گا وہ مدلول

جو مضمون اسوقت بیان ہوگا وہ مدلول آیت نہیں بلکہ اعتبار کے طور پر بیان ہوگا۔

آیت نہیں ہاں اسکی نظیر اور مثال ہے اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ حضرات صوفیہ پر جو بعض تفاسیر کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ قرآن کی نئی نئی تفسیریں کرتے ہیں یہ معترضین کی غلطی ہے صوفیہ نے ان باتوں کو تفسیر کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ محض تنظیر و تشبیہ کے طور پر بیان کیا ہے اور صوفیہ کے معتقدین جو اسکو تفسیر سمجھتے ہیں وہ بھی غلطی کرتے ہیں۔ مثلاً اذھب الی فرعون انہ طغی کے تحت میں صوفیہ نے لکھا ہے اذھب یا روح الی النفس فجاھدھا انھا قد طغت کہ اے روح نفس کی طرف جا اور اس سے جہاد کر کے اسکو مغلوب کر کہ وہ حد سے نکلا جا رہا ہے بعض ناواقفوں نے اسکو تفسیر سمجھ لیا پھر ان میں جو معتقد تھے وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون علیہ اللعنۃ کا قصہ مذکور ہی نہیں ہے بلکہ موسیٰ سے مراد روح ہے اور فرعون سے مراد نفس۔ مگر یہ سراسر جہل ہے واللہ صوفیہ کی یہ مراد ہرگز نہیں اور جو انکی طرف یہ بات منسوب کرے وہ جھوٹا ہے اور بخدا قرآن میں موسیٰ و فرعون سے روح و نفس ہرگز مراد نہیں بلکہ اسمیں موسیٰ علیہ السلام ہی کا قصہ فرعون کے ساتھ مراد ہے جو کہ ظاہری مدلول ہے ورنہ اگر ظاہری مدلول مراد نہ ہوا تو پھر قرآن سے نماز روزہ حج زکوۃ وغیرہ کچھ ثابت نہ ہو سکے گا۔ اور یہ وہی بات ہو گی جو ملحدین نے کہی ہے اور صوفیہ ملحد نہ تھے وہ الحاد سے بالکل بری تھے۔ بعض ملحدین نے یہ دعوی کیا ہے کہ قرآن میں صلوۃ سے مراد نماز شرعی نہیں بلکہ روح صلوۃ مراد ہے یعنی تعلق مع اللہ اسیطرح زکوۃ سے مراد زکوۃ شرعی نہیں بلکہ اسکی روح مراد ہے یعنی سخائے نفس اسی طرح تمام نصوص میں تاویل کی ہے اور کہا ہے کہ اعمال کا ایک ظاہر ہے ایک باطن علماء نے قرآن کو ظاہر پر محمول کیا ہے ہم اسکو باطن پر محمول کرتے ہیں اور ان لوگوں نے مولانا رومی کا ایک قول اپنی دلیل میں بیان کیا ہے ؎

پنج وقت آمد نماز اے رہنموں عاشقاں ہم فی صلوۃ دائموں

کہ دیکھو مولانا فرماتے ہیں کہ عوام تو پانچ ہی وقت نماز پڑھتے ہیں اور عشاق ہمیشہ نماز ہی میں رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ صلوۃ شرعیہ کا تحقق دائما نہیں ہو سکتا کیونکہ اکل و شرب و بول و براز اور سونے کی حالت میں نماز ظاہری نہیں ہو سکتی تو وہ کونسی نماز ہے جسمیں عشاق دائماً مشغول رہتے ہیں وہ روح نماز ہی تو ہے یعنی تعلق و حضور مع اللہ جو کسی وقت ان کے دل سے

جدا نہیں ہوتا میں کہتا ہوں کہ مولانا کے کلام سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عشاق ظاہری نماز ادا نہیں کرتے بلکہ مولانا کے کلام کے معنی عشاق کیلئے دو نمازوں کا ثابت کرنا ہے پس انھوں نے اول یہ فرمایا ہے کہ عوام تو پانچ ہی وقت نماز پڑھتے ہیں اسکے بعد عشاق کی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ وہ ہر وقت نماز میں رہتے ہیں اس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان پانچوں کو بھی ادا کرتے ہیں اور انہی پانچ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر دم نماز میں رہتے ہیں۔ اس سے یہ سمجھنا کہ مولانا نے عشاق سے نماز ظاہری کی نفی کی ہے اُن کے کلام کی تحریف ہے بلکہ مولانا نے اُسکی ساتھ عشاق کیلئے ایک زائد بات بیان فرمائی ہے جسکی وجہ سے اُن کے لئے دائماً مشغولی صلوٰۃ ثابت ہو رہی ہے۔ اور وہ زائد بات کیا ہے وہ نماز کا شوق اور انتظار ہے مطلب یہ ہے کہ عوام تو نماز پڑھکر اُس سے غافل ہو جاتے ہیں اور عشاق نماز کے بعد دوسری نماز کی فکر و انتظار میں بیتاب رہتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ نماز کے انتظار میں لگا رہنے والا نماز ہی میں ہے اسلئے عشاق ہر وقت نماز میں ہیں یعنی اُن کو ہر وقت نماز کا ثواب ملتا رہتا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ عشاق کی نماز دوسری ہے اور وہ پانچ وقت کی یہ نمازیں نہیں پڑھتے۔ یہ تو مولانا کے کلام سے استدلال کا جواب تھا۔ رہا اُن کا یہ کہنا کہ اعمال کیلئے ایک ظاہر ہے ایک باطن یہ مسلم لیکن اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ اعمال کی صورت اور ظاہر مطلوب نہیں دیکھو اسکی تو ایسی مثال ہے جیسے آپ کے بیٹے کا ایک ظاہر ہے یعنی قالب اور ایک باطن ہے یعنی روح کیونکہ انسان صرف ظاہر سے انسان نہیں بلکہ اپنی روح کیساتھ انسان ہے اگر روح نہو تو یہ قالب مٹی میں دفن کرنے کے قابل ہے لیکن کیا آپ یہ کہسکتے ہیں کہ صرف روح ہی مطلوب ہے اور قالب بالکل مطلوب نہیں اگر یہی ہے تو پھر اپنے بیوی بچوں کو گلا گھونٹ کے مار دو کیونکہ روح تو پھر بھی رہے گی اُسکو تو گلا گھونٹنے سے موت نہ آئے گی صرف قالب کو موت آئے گی تو کیا حرج ہے یہ تو مطلوب ہی نہیں۔ اسپر شاید آپ یہ کہیں کہ مطلوب تو روح ہی ہے اور قالب مطلوب نہیں مگر چونکہ یہ روح ہمارے پاس بدون اس قالب کے نہیں رہ سکتی اسلئے بدن بھی مطلوب ہے۔ جزاک اللہ بس یہی ہم کہتے ہیں کہ جس چیز کو آپ روح صلوٰۃ کہتے ہیں وہ روح آپ کو بدون نماز کی اس صورت و

اس عمل کا تحقق بدون
ظاہر کے نہیں ہو سکتا
اور اسکی مثال

قالب کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی وہ روح اسی صورت کیساتھ لگی ہوئی ہے اگر اُسکو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس صورت کو لازم پکڑو ورنہ بدون اسکے جو شخص روح صلوٰۃ کے حصول کا مدعی ہو وہ یقیناً جھوٹا ہے یہ تو معتقدوں کی حالت تھی کہ انھوں نے صوفیہ کے ان اقوال کو تفسیر سمجھ لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ مقصود صرف باطن ہی ہے ظاہر مراد ہی نہیں۔ اور جو لوگ ان کے معتقد نتھے وہ ان پر فتوی لگانے لگے کہ صوفیہ ملحد ہیں کہ قرآن کے اندر تحریف کرتے ہیں آیات کی تفسیر بالرائے کرتے ہیں یہ بھی غلطی پر ہیں۔ اور جو سچے معتقد اور محقق تھے انھوں نے یہ کہا کہ صوفیہ کی مراد تفسیر کرنا نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اے قرآن پڑھنے والے تو قرآن کے قصوں کو محض قصہ سمجھکر نہ پڑھ بلکہ اُن سے سبق حاصل کر کیونکہ قرآن میں جو قصے مذکور ہیں وہ عبرت حاصل کرنیکے لئے بیان کئے گئے ہیں جیسا خود قرآن میں ارشاد ہے لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب ماکان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شیء وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون ٥ پس جب تو موسی علیہ السلام کے قصہ پر پہونچے تو اس سے یہ سبق حاصل کر کہ تیرے اندر بھی ایک چیز موسٰی کے اور ایک چیز فرعون کے مشابہ ہے یعنی روح اور نفس دوسری عبارت میں یوں کہو کہ انسان کے اندر دو قوتیں ہیں ایک داعی الی الخیر جو مشابہ موسٰی علیہ السلام کے ہے دوسری داعی الی الشر جو مشابہ فرعون ملعون کے ہے پس تو بھی اپنی روح کو نفس پر غالب کر جس کا طریقہ مجاہدہ اور تبلیغ ہے پس تو نفس کو آیات الٰہیہ یاد دلاتا کہ اُسکو خوف الٰہی پیدا ہو اور نافرمانی سے باز آجائے یہ علم اعتبار ہے کہ دوسرے کے قصہ کو اپنی حالت پر منطبق کر کے سبق حاصل کیا جائے۔ پس اس آیت سے روح و نفس کی حالت پر حکم کرنا استدلال کے طور پر نہیں بلکہ بطور اعتبار کے ہے۔ استدلال تو مفہوم لغوی سے ہوتا ہے ان طرق کیساتھ جو اہل معانی و اصول نے بیان کئے ہیں اور اعتبار تشبیہ و اشارہ کے طور پر ہوتا ہے اور ان دونوں کی اصل قرآن سے ثابت ہے لیکن قرآن میں دلیل و استدلال کا لفظ صراحۃً نہیں آیا بلکہ اسکے مرادفات آئے ہیں چنانچہ ارشاد ہے قل ھاتوا برھانکم اور ارشاد ہے قل ھل عندکم من علم چونکہ برہان اور علم دلیل کے معنی میں ہے اسلئے اس کا نام استدلال رکھنا صحیح ہو گیا جیسے افتیم

علم اعتبار کی حقیقت اور یہ کہ وہ قرآن کی تفسیر نہیں

استدلال و اعتبار میں فرق

استدلال و اعتبار دونوں کی اصل قرآن میں موجود ہے

الصلوٰۃ کے معنی میں یوں کہتا کہ حق تعالیٰ نے نماز کو فرض کیا ہے صحیح ہے حالانکہ اقیموا الصلوٰۃ میں اللہ اور فرض کا لفظ صراحۃً نہیں مگر اس کا قائم مقام موجود ہے۔ اور دوسرے طریق کا نام خود قرآن ہی میں اعتبار آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فاعتبروا یا اولی الابصار اس سے اوپر بنی نضیر کے (جو یہود کا ایک قبیلہ ہے) جلا وطن کئے جانیکا قصہ مذکور ہے جسکے بیان کرنیکے بعد یہ فرمایا ہے کہ اے بصیرت والو اس سے عبرت حاصل کرو یعنی اگر تم ایسی حرکت کروگے جو ان لوگوں نے کی ہے تو اپنے واسطے بھی اسی عذاب کو تیار سمجھو۔ اور یہی تو علم اعتبار ہے کہ دو چیزوں میں مشابہت ہو تو ایک نظیر سے دوسری نظیر کا استحضار کیا جائے اور یہی عبرت حاصل کرنیکے معنی ہیں کہ دوسرے کی حالت کو اپنے اوپر منطبق کیا جائے کہ اگر ہمنے اسکے جیسے اعمال کئے تو ہمارا بھی وہی حال ہوگا جو اس کا ہوا ہے رہا یہ سوال کہ جسطرح صوفیہ نے علم اعتبار کا استعمال کیا ہے کیا نصوص میں بھی ایسا استعمال آیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ بحمد اللہ اسکی نظیر نصوص میں بھی موجود ہے۔ اور میں یہ بات خود نہیں کہتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے میں اسکا ثبوت دیتا ہوں اور وہ اتنے بڑے محقق ہیں کہ بعض لوگوں نے انکو غیر مقلد سمجھ لیا ہے کہ وہ ائمہ کی تقلید ہی نہ کرتے تھے مگر یہ غلط ہے وہ مقلد ہی ہیں مگر مقلد محقق ہیں لکیر کے فقیر نہیں جیسے سالکین و مجذوبین کے سلوک و جذب میں مراتب ہیں کہ بعض سالک مجذوب ہیں بعض مجذوب سالک ہیں بعض سالک محض ہیں بعض مجذوب محض ہیں ایسے ہی تقلید و تحقیق کے بھی مراتب ہیں کہ بعض مقلد محض ہیں بعض محقق محض ہیں اور بعض مقلد محقق ہیں بعض محقق مقلد ہیں۔ تو شاہ صاحب مقلد محض نہ تھے بلکہ مقلد محقق تھے اسی لئے بعض کو ان پر غیر مقلدی کا شبہ ہوا تو اتنے بڑے محقق نے دو حدیثوں کے متعلق فوز الکبیر میں یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے صحیحین میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ تقدیر کا مسئلہ ارشاد فرمایا ما منکم من احد الا وقد کتب لہ مقعدہ من النار و مقعدہ من الجنۃ قالوا یا رسول اللہ افلا نتکل علی کتابنا و ندع العمل یعنی ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں یا دوزخ میں پہلے ہی سے لکھدیا گیا ہے۔

اسپر حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے حضورؐ نے فرمایا اعملوا فکل میسر لما خلق لہ اما من کان من اھل السعادۃ فسییسر لعمل السعادۃ و اما من کان من اھل الشقاوۃ فسییسر لعمل الشقاوۃ ثم قرأ فاما من اعطی واتقٰی و صدق بالحسنی الآیہ متفق علیہ (مشکوٰۃ ص۱۱) کہ عمل کرتے رہو ہر شخص کیلئے وہ عمل آسان کردیا گیا ہے جسکے لئے وہ پیدا ہوا ہے جو شخص اہل سعادت سے ہوگا اسکے لئے عمل سعادت آسان ہوگا اور جو اہل شقاوت سے ہوگا اسکے لئے عمل شقاوت آسان ہوگا اسکے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسری واما من بخل واستغنیٰ[ع۱] وکذب بالحسنی فسنیسرہ للعسری ہ (ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو شخص (اللہ کی راہ میں) صدقہ دے اور تقویٰ اختیار کرے اور اچھی بات (یعنی دین اسلام) کی تصدیق کرے تو ہم اسکے لئے راحت کی چیز (یعنی جنت) کا سامان کردینگے اور جو بخل کرے اور ایسے ہی برائی اختیار کرے اور اچھی بات (یعنی دین اسلام) کی تکذیب کرے ہم اسکے لئے تکلیف کی چیز (یعنی جہنم) کا سامان کردینگے ۱۲)

اب اسپر سوال ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقدیر کا ذکر کہاں ہے آیت کا مدلول تو یہ ہے کہ اعطاء و تقویٰ سے جنت آسان ہوجاتی ہے اور بخل و استغناء سے دوزخ آسان ہوجاتی ہے اس کا جواب شاہ صاحبؒ نے یہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بطور علم[ع۲] اعتبار کے اس آیت کے

ع۱ قال الشیخ مقابلۃ الاستغناء بالتقوی یشعر بان المراد بالاستغناء عدم المبالاۃ والغفلۃ ففیہ دلالۃ ان الغنی المذموم ہو ما کان مع الغفلۃ وعدم المبالاۃ وان التقوی حقیقۃ الفکر فان المقابل للاستغناء ہو التقوی بہذا المعنی ۱۲ھ وہذا اسہل تفسیر قولہ تعالی ہدی للمتقین ای الذین ہم فی فکر وخشیۃ ویتاید ہذا التفسیر باللغۃ فان التقوی لغۃ الخوف والحذر ۱۲ اشرف۔

ع۲ قلت ولا یخفی ما فی ہذا الجواب من البعد والاسہل فی التوجیہ ان یقال فی معنی الآیۃ ان من اعطی واتقی وصدق بالحسنی فہو الذی اردنا بہ التیسیر للیسری ومن بخل واستغنی وکذب بالحسنی فہو ممن اردنا بہ التیسیر للعسری وہذا راجع الی قولہ صلے اللہ علیہ وسلم اعملوا فکل میسر لما خُلِقَ لہ ای وعملہ علامۃ لما کتب لہ من السعادۃ والشقاوۃ وہذا ہو الظاہر من الآیۃ لا ان الاعطاء والتقوی مؤثر فی تیسیر الیسری او البخل والاستغناء فی عکسہ بل کل ذلک امارات و علامات لما اراد اللہ بہ وقدر لہ من قبل والمیسر ہو اللہ تعالی واللہ اعلم ۱۲ ط لیس المقصود ترجیح توجیہ علی توجیہ بل المقصود اثبات ان العلماء الراسخین حملوا ہکون علم الاعتبار من القرآن وبعید ان یحملوا بالباطل ۱۲ اشرف۔

مضمون سے حدیث کے مضمون پر استشہاد فرمایا ہے اور مقصود تشبیہ دینا ہے کہ جیسے بواسطہ اعمال کے بعض کے لئے جنت اور بعض کیلئے دوزخ کو آسان کر دیا ہے اسی طرح بواسطہ تقدیر کے بعض کیلئے اعمال صالحہ کو بعض کیلئے معاصی کو آسان کر دیا ہے اور یہ تشبیہ محض توضیح کیلئے ہے کہ تقدیر سے تیسیر ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی اس آیت میں تیسیر اعمال سے مذکور ہے پس مقصود تشبیہ سے توضیح ہے مشبہ کی اسی لئے تشبیہ میں شرط ہے کہ مشبہ بہ میں وہ صفت اوضح و اشہر ہو گو اقوی نہ ہو اب یہاں سے تشبیہ کے متعلق ایک مشہور سوال کا بھی حل ہو گیا وہ یہ کہ اللھم صل علی محمد و علیٰ آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم میں جو صلوٰۃ علی رسول اللہ نبینا صلے اللہ علیہ و علیٰ آلہ و اصحابہ وسلم کو صلوٰۃ علی ابراہیم علیہ السلام کیساتھ تشبیہ دیگئی ہے تو اسپر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے صلوٰۃ ابراہیمیہ کے افضل و اکمل ہونیکا صلوٰۃ محمدیہ سے اور منشا اس کا وہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقوی و افضل ہونا شرط ہے حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے بلکہ صرف اوضح و اشہر ہونا ضروری ہے افضل و اکمل ہونا ضروری نہیں اور اسکی دلیل خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں اللہ نور السمٰوات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیہا مصباح ط اسمیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ نور مصباح لوگوں کے ذہن میں پہلے سے حاضر ہے - اسپر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن میں تو نور شمس و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو انکی ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دیگئی اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقوی ہے مگر سورج میں ایک عیب یہ ہے کہ اسپر نگاہ نہیں جمتی اسکی ساتھ تشبیہ دیجاتی تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا اسپر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور قمر سے اسلئے تشبیہ نہیں دی کہ اسکے متعلق تو یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس تو اسکی ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہوتا

عہ اسپر اشکال یہ ہوتا ہے کہ نور قمر کا مستفاد من الشمس ہونا تو اہل علم ہی میں مشہور اور چراغ کے نور کا مستفاد ہونا دیا سلائی یا چقماق کی آگ سے ہر شخص کو مشاہد ہے اور خود نص میں اس کا ذکر ہے یکاد زیتھا یضیئ ولم تمسسہ نار ط میں پس میرے خیال میں نور قمر سے تشبیہ نہ دینے کی توجیہ یہ کیجائے تو اچھا ہے کہ قمر میں محاق کا عیب ہے کہ کبھی ہلال ہے کبھی بدر کامل ہے کمال کے بعد زوال ہے ولیس نور اللہ کذلک - نیز اصل سوال کا جواب (بقیہ صفحہ آئندہ)

کہ نورِ حق بھی کسی سے مستفاد ہے پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور و منوّر بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اسکے نور میں کچھ کمی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہونچتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شئے نورانی بنکر کسی اور کو بھی منور کر سکے (اگر کہا جائے کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہو جاتا ہے اور در و دیوار کو بھی منور کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطہ فی العروض ہوتا ہے واسطہ فی الثبوت نہیں ہوتا اور چراغ واسطہ فی الثبوت ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ نورِ حق واسطہ فی الثبوت ہوتا ہے) مگر یہ تشبیہ من کل الوجوہ نہیں کہ اس سے کوئی نعوذ باللہ دوسرا خدا تصنیف کرنے لگے مطلب صرف یہ ہے کہ نورِ حق دوسروں کو منوّر بھی کرتا ہے اور منوِّر بھی گو دوسروں کی تنویر اس درجہ کی نہو اور یہ بات چراغ ہی میں ہے شمس و قمر میں نہیں ہے اور یہ سب نکات ہیں مقاصد نہیں ہیں ہر شئے کو اپنی حد پر رکھنا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ نکات ہیں اسلئے علماء سے ان کے پوچھنے کا بھی کسی کو حق نہیں۔ اگر وہ خود بتلا دیں تو اُن کا احسان ہے یہ چٹنی مربی ہیں اور دعوت پلاؤ زردہ کی ہوتی ہے چٹنی مربی کی دعوت نہیں ہوتی وہ تو غذا کو لذیذ بنانے کیلئے ہے خود مقصود نہیں یہ تفصیل آیت کی تفسیر میں تھی جو استطراداً مذکور ہو گئی مجھے اس آیت کے

ذکر سے صرف یہ مقصود تھا کہ اس میں نورِ حق کو نورِ مصباح سے تشبیہ دیگئی ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ نورِ مصباح کو نورِ حق سے کچھ نسبت نہیں پس ثابت ہو گیا کہ تشبیہ کیلئے مشبہ بہ کا مشبہ سے اقوی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) سہل یہ ہے کہ نور شمس و قمر دونوں میں یہ نقص ہے کہ اُس سے روشنی حاصل کرنے میں کسی کے کسب و طلب و اختیار کو دخل نہیں اور اللہ تعالیٰ کے نور سے استفادہ کرنے میں کسب و طلب و عمل کو دخل ہے کہ جو کوئی اپنے قلب کو مثل زجاجہ کو کعبہ کی صاف و شفاف کرلے اور اسمیں ذکر اللہ و عشق اور اخلاص کا زیت مبارک بھرلے تو نورِ حق سے مستفید و منور ہو جائیگا ورنہ نہیں پس اسکی مثال نورِ مصباح ہی سے اولی ہے جس سے استفادہ و تنور باختیار و طلب عبد ہے نہ بالاضطرار علاوہ ازیں یہ کہ نور شمس و قمر گو اقوی ہے مگر اُسکی طرف انسان کی احتیاج اسقدر حاضر فی الذہن نہیں جسقدر نور مصباح کی احتیاج حاضر فی الذہن ہے کیونکہ شمس و قمر کا طلوع و غروب عادت کے موافق خود ہوتا رہتا ہے بہت سے آدمیوں کو اُس کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا اور نور مصباح کی ضرورت کی طرف ہر ایک کو التفات ہوتا ہے۔ رات کے وقت ہر شخص کو اُس کی طلب ہوتی اور اس کی طرف التفات بھی ہوتا ہے۔ ہذا ما عندی و کل ذلک من قبیل النکات ولعل ہذا احسن واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ

ہونا لازم نہیں صرف اوضح و اشہر ہونا شرط ہے پس درود شریف میں بھی جو صلوٰۃ محمدیہ کو صلوٰۃ ابراہیمیہ کیساتھ تشبیہ دیگئی ہے اسکی بنا بھی اسی پر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر خاص رحمت وصلوٰۃ کا نازل ہونا اہل ادیان میں مشہور تھا پس اس تشبیہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ صلوٰۃ ابراہیمیہ صلوٰۃ محمدیہ سے افضل واکمل ہو۔ بہرحال شاہ صاحب نے حدیث کی شرح میں علم اعتبار کی اصل قرآن سے بتلائی ہے ایک حدیث تو یہ تھی جسکے متعلق بیان ہو چکا۔

دوسری حدیث مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ یہ اعمال جو لوگ کر رہے ہیں یہ پہلے سے مقدر ہو چکے ہیں کہ کون کیا کریگا یا ہر شخص ابتداءً عمل کرتا ہے حضور نے فرمایا بل شئ قضی علیھم ومضی فیھم وتصدیق ذلک فی کتاب اللہ عزوجل ونفس وما سواھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ہ کہ نہیں بلکہ یہ وہ اعمال ہیں جو ان کیلئے پہلے ہی سے مقدر ہو چکے ہیں یہی وہ بات ہے جسکو ایک حدیث میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے جف القلم بما ھو کائن میں اسوقت تقدیر کا مسئلہ بیان نہیں کر رہا تاکہ شبہات کا جواب دوں ممکن ہے اسوقت کسی کے ذہن میں یہ سوال آیا ہو کہ جب سارے اعمال پہلے سے مقدر ہو چکے ہیں تو پھر عمل صالح میں سعی کی کیا ضرورت ہے جو مقدر ہوگا ہو جائیگا یا یہ شبہ آیا ہو کہ جب پہلے سے سب کچھ مقدر ہو چکا ہے تو پھر کافر و فاجر کا کیا قصور ہے میں اسوقت چونکہ مسئلہ تقدیر کو حل نہیں کر رہا اسلئے ان شبہات کا جواب دینے کی مجھے ضرورت نہیں ہے (جسکو شوق ہو وہ اس بحث کو تفسیر بیان القرآن کے شروع میں ختم اللہ علی قلوبھم کی تفسیر میں دیکھ لے ۱۲) ہاں اسوقت ایک بات کہتا ہوں جو مقنع ہے (یعنی اس سے صاحب انصاف کو تسلی ہو جائیگی گو بحث کرنیوالا ساکت نہو ۱۲) وہ یہ کہ اگر خدا تعالیٰ کے سامنے یہ جواب کافی ہے کہ ہم سے جو گناہ صادر ہوئے ہیں تو ہم کیا کرتے آپنے مقدر میں ہی لکھدیا تھا تو یہ جواب آپکے غلام اور نوکر اور اولاد کی نافرمانی کے وقت بھی آپ کے مقابلہ میں کافی ہونا چاہیئے جب غلام یا نوکر آپ کی نافرمانی کرے یا اسکے ہاتھ سے کوئی نقصان ہو جائے تو اسکو سزا ہرگز نہ دیا کرو بلکہ تقدیر کو کافی جواب سمجھا کرو کہ غریب معذور ہے اسکی تقدیر میں یہی عمل تھا۔ اسی طرح اولاد اگر تعلیم حاصل نکرے لڑکا اسکول سے بھاگتا ہو تو اسکو تنبیہ نکیا کرو بس صبر کر لو کہ اسکی تقدیر میں یہی ہے۔ یہ کیا بات

کہ یہاں تو باوجود اعتقاد تقدیر کے آپکو صبر نہیں آتا بلکہ اول پوری تدبیر سے کام لیتے ہو بچہ کو سزا دیتے ہو لالچ بھی دیتے ہو جب کوشش کرتے کرتے تھک گئے اُسوقت تقدیر پر صبر و شکر کر کے بیٹھتے ہو اور خدا کے سامنے عذر تقدیر کو کافی جواب سمجھتے ہو اگر تقدیر پر بھروسہ کر کے دینی اعمال سے بیفکری اختیار کیجاتی ہے اور اپنے کو بدعملی میں بیقصور سمجھا جاتا ہے تو دنیا کے کاموں میں بھی تدبیر کو چھوڑ دینا چاہیئے اور اپنے ماتحتوں پر کسی غلطی کی وجہ سے گرفت نکرنا چاہیئے اُنکو بھی بیخطا بیقصور سمجھنا چاہیئے۔ صاحبو! اس طریقہ کو چھوڑو تم خدا تعالی پر ہرگز الزام قائم نہیں کرسکتے بخدا وہ ہر مجرم شخص کو لاجواب اور قائل کر کے سزا دینگے کسی کو ایسے حال میں سزا ندیجائے گی وہ اپنے کو بیقصور سمجھتا ہو بس تم باتیں نہ بناؤ باتوں سے کام نہ چلیگا عمل ہی سے کام چلیگا۔ ارے اگر کسی کیلئے پھانسی کا حکم ہو گیا ہو تو اُسکو بجائے پھانسی کی علت کی تحقیق کے اور اُس علت میں شبہات کے مراحم خسروانہ کی تفتیش و تلاش کرنا چاہیئے اس سے تو کچھ کام چلیگا پھانسی کی علت کی تحقیق سے کیا کام چل سکتا ہے مشہور ہے کہ افلاطون نے حضرت موسی علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر حوادث تیر ہوں اور آسمان کمان ہو اور تیر انداز حق تعالی ہوں تو بچنے کی کیا صورت ہے موسی علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر انداز کے پہلو میں جا کھڑا ہو پھر تیر سے بچا رہیگا کیونکہ تیر اُسی کو ہلاک کرتا ہے جو اُسکی زد پر ہو اور جو تیر انداز کے پہلو میں کھڑا ہو اُسپر تیر نہیں پہونچتا۔ سبحان اللہ! عجیب جواب ہے جسکو سنکر افلاطون نے اقرار کیا کہ یہ جواب نبی کے سوا کوئی نہیں دیسکتا۔ صاحبو! بس تدبیر و تقدیر کے مسئلہ میں گفتگو نکرو بلکہ حق تعالی سے تعلق پیدا کرو یہ وساوس و شبہات جبھی تک ہیں جب تک خدا سے تعلق نہیں اور تم عقل کے تابع ہو اس عقل کو فنا کرو خدا کی محبت اور انکا قرب حاصل کرو ؎

آزمودم عقل دور اندیش را | بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

اور خدا تعالی کی محبت حاصل ہونیکا طریقہ یہ ہے کہ خود رائی چھوڑ کر اپنے کو کسی صاحب محبت کے حوالہ کردو ؎

قال را بگذار و مرد حال شو | پیش مرد کاملے پامال شو

؎ سالہا تو سنگ بودی دلخراش | آزموں را یک زمانے خاک باش

ف باتوں سے کام نہ چلیگا عمل سے کام چلیگا

ف موسیٰ علیہ السلام اور افلاطون کا عجیب مکالمہ۔

ف شبہات کا علاج صرف تعلق مع اللہ ہے اور اس کا طریق محقق صاحب محبت کا اتباع ہے۔

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ | خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

تم اپنی عقل پر ناز نکرو کیونکہ اہل اللہ کے سامنے تمہاری عقل ایک طفل مکتب سے بھی کم ہے
بس اب تو عقل اسکو سمجھتے ہیں کہ چار پیسے کمانے کے قابل ہو گئے۔ بی اے ایم اے ہو گئے
حالانکہ عقل وہ ہے جو خدا کو پہچانے جو اہل اللہ کو عطا ہوئی ہے پس ان کے سامنے اپنی عقل
پر ناز کرنا ایسا ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

ناز را روے بباید ہمچو ورد | چوں نداری گرد بد خوئی مگرد

جب تمکو یہ عقل حاصل نہیں تو اہل اللہ کے سامنے اپنی دنیوی عقل پر ناز نکرو ؎

چو نتو یوسف نیستی یعقوب باش | ہمچو او با گریہ و آشوب باش

؎ عیب باشد چشم نابینا و باز | زشت باشد روی نازیبا و ناز

پیش یوسف نازش و خوبی مکن | جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

آزمودم عقل دور اندیش را | بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

تم اپنے کو جاہل مطلق سمجھکر کسی محقق کے سپرد کردو اُسوقت تعلق مع اللہ کی دولت حاصل
ہو گی پھر تعلق مع اللہ اور محبت باللہ کے بعد ان شبہات واعتراضات کا یہ حال ہو گا کہ

؎ عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت | ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند | در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت | مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت

تعلق مع اللہ کے بعد سب وساوس خود ہی چلے جائیں گے اسی لئے مولانا جوش میں آکر
ایک مقام پر عشق کی زور و شور سے مدح فرماتے ہیں ؎

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما | اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما | اے تو افلاطون و جالینوس ما

اور اگر یہ حاصل نہیں تو یاد رکھو کہ ان باتوں سے اور دلیلوں سے کچھ کام نہ چلیگا میں علما سے
بھی کہتا ہوں کہ آپکی یہ تقریریں اور نکات و اسرار سب رکھے رہ جائیں گے اور سالکین سے بھی
کہتا ہوں کہ یہ مواجید و اذواق اور معارف و حقائق بدون تعلق صادق کے سب بیکار ہیں۔

محبت تمام وساوس کو جلا کر صاف کر دیتی ہے

علماء و مشائخ کو تنبیہ کہ علوم و اسرار و معارف بدون تعلق کے صرف کلام ہی کلام رہیگا اور عمل کا اہتمام کرے

حضرت نوکر کا فیشن کام نہیں آتا کہ وہ بنا ٹھنا رہے اور باتیں بنایا کرے بلکہ اسکی خدمت کام آتی ہے امام غزالی رحمہ نے لکھا ہے کہ حضرت جنید رحہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا آپ کی ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا نفدات الحقائق والعبارات وتعطلت الرموز والاشارات وما نفعنا الا رکیعات فی جوف اللیل کہ ساری عبارتیں اور اسرار و نکات واشارات غائب ہوگئے ان سے کچھ کام نہ چلا بس وہ چھوٹی چھوٹی چند رکعتیں کام آئیں جو آدھی رات میں پڑھ لیا کرتے تھے۔ صاحبو! بڑی چیز یہ ہے کہ انسان اصل عمل اور مقصود کو لازم سمجھے اگر مقصود کے ساتھ غیر مقصود بھی حاصل ہو جائے تو نور علی نور ہے ورنہ کچھ نفع نہیں اگر مقصود حاصل نہ ہوا۔ آج کل غضب یہ ہے کہ علماء وصوفیہ سب غیر مقصود کے درپے ہیں مقصود سے اکثر لوگ غافل ہیں بلکہ کوسوں دور ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسوقت مجھے تقدیر کے مسئلہ کا بیان کرنا مقصود نہیں تاکہ اُن شبہات کا جواب دوں جو اس مسئلہ پر وارد ہوتے ہیں بلکہ اسوقت تقدیر کا ذکر اس سلسلہ میں آگیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کے ذکر میں بھی علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے یعنی حضور فرماتے ہیں انتم فی عمل قد فرغ منہ وتصدیق ذلک فی کتاب اللہ ونفس وما سواھا کہ جو اعمال تم کر رہے ہو یہ وہ ہیں جن سے فراغت ہو چکی ہے یعنی سب پہلے ہی مقدر ہو چکے ہیں اسکے بعد آپ نے فرمایا کہ اسکی تصدیق قرآن میں موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ونفس وما سواھا قسم ہے نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اسکو پیدا کیا ما بمعنی من ہے اور یہاں نفس کیساتھ قسم کو قسم بالرب پر جو مقدم کیا گیا ہے تو اسمیں اشارہ ہو سکتا ہے اس امر کی طرف کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کہ نفس بڑی چیز ہے یہ ہماری قسم کا مقسم بہ بننے کے قابل ہے تم اسکو پہچانو اگر اسکو پہچان لوگے تو ہمکو بھی پہچان لوگے چونکہ معرفت نفس وسیلہ ہے معرفت رب کا اسلئے نفس کی قسم کو مقدم کیا گیا جیسے مقدمہ ذکر میں مقدم ہوتا ہے گو مقصودیت میں مؤخر ہو اور یہ بھی نکتہ ہے کوئی علم مقصود نہیں۔

تفہیم حدیث کیطرف رجوع

آمدیم

ونفس وما سواھا میں تقدیم نفس کا عجیب نکتہ

اس حدیث میں حضور نے مسئلہ تقدیر کو بیان کرنے کے بعد صراحۃً یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اسکی تصدیق کتاب اللہ کی اس آیت میں ہے پہلی حدیث میں یہ صراحت نہ تھی صرف اتنی بات تھی کہ

آپ نے مسئلہ تقدیر کے بعد ایک آیت کی تلاوت کی تو وہاں اس بات پر کہ مسئلہ تقدیر کو اس آیت کے مضمون سے مناسبت حاصل ہے صرف قرینہ حالیہ تھا اور یہاں قرینہ مقالیہ موجود ہے مگر اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں بھی تقدیر کے مسئلہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ صرف یہ مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کی اور خالق نفس کی قسم کھائی ہے اور اسکے ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ۔ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا کہ خدا نے نفس کو پیدا کر کے اُسکو خیر و شر کا الہام کیا یعنی انسان کے نفس میں نیکی اور بدی کی دو طاقتیں فطرۃً رکھدی ہیں اس سے مسئلہ تقدیر کی تائید و تصدیق کیونکر ہوئی۔

شاہ صاحب نے یہاں بھی وہی جواب دیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہاں بھی علم اعتبار کے طور پر تشبیہ دی ہے کہ جسطرح فجور و تقوی کا القاء ہوا ہے اسی طرح اعمال کو مقدر بھی کر دیا ہے۔ پس بقول شاہ صاحب کے ان دو حدیثوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے بڑے شخص کے سر رکھکر میں یہ کہ رہا ہوں خود اتنی بڑی بات نہیں کہتا کیونکہ یہ بڑا دعوی ہے۔ اور اگر کوئی شخص شاہ صاحب کے قول کو نہ مانے تو میں اس سے کہوں گا کہ پھر وہ ان حدیثوں کی شرح کر دے یقیناً ان حدیثوں اور آیتوں میں وہ کوئی وجہ ربط بجز اسکے جو شاہ صاحب نے فرمایا بیان نہ کر سکے گا یہ شاہ صاحب کا علم وہبی ہے میں نے ان حدیثوں کا ایسا حل کسی کے کلام میں نہیں دیکھا اب شاہ صاحب سے بڑے سے اسکو نقل کرتا ہوں وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں ان سے بھی علم اعتبار کا استعمال منقول ہے چنانچہ آیت انزل من السماء ماء فسالت اودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل زبدا رابیاہ کی تفسیر میں ابن عباس نے فرمایا ہے یرید بالماء الشرع والدین وبالاودیۃ القلوب کہ یہاں پانی سے شرع اور دین اور آودیہ سے (بطور تشبیہ کے) قلوب مراد ہیں صاحب روح المعانی نے اسکو نقل کر کے اسپر اعتراض کیا ہے کہ یہ تو صوفیہ کی تفسیر کے مثل ہے ابن عباس رض ایسی تفسیر نہیں کر سکتے اسلئے یہ روایت غیر صحیح معلوم ہوتی ہے پھر بعد تسلیم صحت کے یہ توجیہ کی ہے انما قصد ان قولہ تعالیٰ کذلک یضرب اللہ الحق والباطل معناہ الحق یتقرر فی القلوب الخ اور میں نے مسائل السلوک میں یہ توجیہ کی ہے کہ ان صح ذلک فمقصود الحبر منہ الاشارۃ۔ اسی طرح

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اقوال سے علم اعتبار کا ثبوت۔

ابن عباسؓ نے اعلموا ان اللہ یحیی الارض بعد موتہا کی تفسیر میں فرمایا ہے لین القلوب بعد موتہا والا فقد علم احیاء الارض مشاھدۃ یعنی یہاں ارض سے مراد مردہ قلوب ہیں کہ اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو زندہ کر دیتے ہیں ورنہ زمین کا حال تو سبکو معلوم ہے (یعنی اُسکی حالت بتلانیکا اتنا اہتمام ضروری نتھا) یہ بھی علم اعتبار ہی ہے۔ اور والا فقد علم احیاء الارض مشاھدۃ سے تفسیر مشہور کی نفی کرنا مقصود نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اے مخاطب تجکو اس آیت میں ظاہری مدلول پر اکتفا نکرنا چاہیئے کیونکہ وہ تو ظاہر ہی ہے بلکہ اس سے قلوب کی حالت کی طرف انتقال کرنا چاہیئے کہ دلوں کی بھی وہی حالت ہے جو زمین کی حالت مشاہد ہے۔ اور یہ روایات میرے رسالہ مسائل السلوک میں مذکور ہیں ان آثار وغیرہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ علم اعتبار صوفیہ کی بدعت نہیں بلکہ نصوص میں اسکی اصل موجود ہے پس جو لوگ علم اعتبار کی رعایت کرنے میں صوفیہ پر زندقہ والحاد کا فتوی لگاتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں ہاں جو شخص اسکو قرآن کی تفسیر سمجھے اُسکے زندقہ والحاد میں ہمکو بھی کلام نہیں۔ بہر حال علم اعتبار کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مشبہ کو دوسرے مشبہ بہ سے واضح کیا جائے ثابت نکیا جائے بلکہ مشبہ ثابت بدلیل آخر ہے۔ اور یہ نہ مجاز میں داخل ہے خواہ مجاز مرسل ہو خواہ استعارہ کیونکہ مجاز میں موضوع لہ کے مراد نہ ہونے پر قرینہ ہوتا ہے اسلئے غیر موضوع لہ مراد ہوتا ہے اور یہاں نہ موضوع لہ کے غیر مراد ہونے کا کوئی قرینہ ہے نہ غیر موضوع لہ مراد ہے اور نہ یہ کنایہ میں داخل ہے کیونکہ کنایہ میں معنی موضوع لہ متروک نہیں ہوتے بلکہ کلام کا مدلول اصلی وہی موضوع لہ ہوتا ہے مگر مقصود اُسکا لازم یا ملزوم ہوتا ہے جیسے طویل النجاد کہ اسمیں مدلول وضعی متروک نہیں مدلول کلام وہی ہے مگر مقصود طویل القامۃ ہے کیونکہ طویل النجاد کیلئے طویل القامۃ لازم ہے اور اعتبار میں وہ معنی نہ مقصود ہے نہ مدلول کلام ہے۔ پس یہ اعتبار گویا قیاس تصرفی ہے اور مشابہ ہے قیاس فقہی کے مگر عین قیاس فقہی نہیں کیونکہ قیاس فقہی میں علت جامعہ مؤثر ہے حکم مقیس میں اسلئے وہ حکم منسوب الی القیاس ہوتا ہے یہاں یہ بھی نہیں صرف مقیس مقیس میں تشابہ ہے اور اس مشابہت کو حکم میں کوئی اثر نہیں بلکہ وہ حکم خود مستقل دلیل سے ثابت ہے یہ حقیقت ہے علم اعتبار کی پس صوفیہ تو اسکے حدود سے نہیں نکلتے کیونکہ وہ معانی منقولہ کے نہ مدلولیت کے مدعی ہیں نہ مقصودیت

علم اعتبار کی تحقیق کی توضیح اور یہ کہ وہ مجاز و کنایہ و استعارہ کا غیر ہے۔

کے اور جہلاء صوفیہ خود اُن کے مدلولیت ہی کے منکر ہیں اور جدید تعلیم یافتہ مدلولیت کے تو منکر نہیں مگر مقصودیت کے مابین بلکہ مقصود معانی سیاسیہ ہی کو سمجھتے ہیں ان سب فرقوں کے سب فرقوں کو اچھی طرح سمجھ لو۔

اب سمجھئے کہ جس مضمون کو میں اسوقت بیان کرنا چاہتا ہوں وہ اس آیت کا نہ مدلول ہے نہ مقصود ہے بلکہ صرف اُسکو اسکے مدلول سے مشابہت حاصل ہے پس یہ بیان اس آیت کے تحت میں بطور علم اعتبار کے ہوگا وہ مضمون یہ ہے کہ آپکو آیت کے ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر خلق ازواج میں بہت سی آیات و دلائل قدرت کا ہونا بیان فرمایا ہے تو میں کہتا ہوں کہ علاوہ اُن دلائل و آیات کے جو مدلول ظاہری ہیں اس تعلق ازواج میں ایک اور بات بھی ہے جس سے ہمکو سبق لینا چاہیئے۔

نکاح کا معاملہ ایسا ہے کہ اسمیں غور کرنے سے آنکھیں کھلتی ہیں اور سالک کو سبق ملتا ہے کہ یہ تعلق نکاح کے معاملات تعلق مع اللہ کی بعض معاملات کے نظائر ہیں۔ تو گویا معاملات نکاح میں اُن معاملات پر بھی ایک طرح کی آیات ہیں۔ کیونکہ نکاح کے اندر تین درجے ہوتے ہیں۔ ایک درجہ عدم تعلق کا ہے کہ ابھی تک نکاح کا پیغام بھی نہیں دیا گیا بلکہ ذہن خالی ہے ایک (دوسرا) درجہ خطبہ کا ہے کہ پیغام دیا گیا اس درجہ میں قدرے تعلق ہو جاتا ہے (اسکے بعد ایک تیسرا درجہ ہے کہ پیغام دینے کے بعد پیغام منظور ہو گیا اور رشتہ قرار پا گیا اس درجہ میں پہلے سے زیادہ تعلق ہو جاتا ہے اور آپسمیں لین دین آمد و رفت ہدایا تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۱۲) ایک (چوتھا) درجہ اسکے بعد ہے جسکا نام نکاح ہو جانا اور وصول ہو جانا ہے یہ تو ظاہر ہے۔ اب سمجھئے کہ یہی حال سلوک اور تعلق مع اللہ کا ہے کہ وہاں بھی تین درجات ہیں ایک درجہ بے تعلقی کا ہے باین معنی کہ اللہ تعالیٰ کی طلب نہیں گو علم ہے تو یہ تو ایسا ہے جیسا ہمکو یہ علم ہے کہ فلاں گھر میں ایک لڑکی ہے سو ظاہر ہے کہ اس علم کا نام تعلق نہیں بلکہ تعلق طلب اور خطبہ سے شروع ہوتا ہے اسی طرح یہاں سمجھو کہ علم و معرفت قبل از طلب کو تعلق مع اللہ نہیں کہا جاسکتا اسکے بعد ایک درجہ یہ ہے کہ طلب پیدا ہو گئی اور کسی بزرگ سے درخواست کیگئی کہ ہمکو اللہ تعالیٰ کے ملنے کا راستہ بتلاؤ اور اس نے

ﮧ و عسہ بلکہ چار ۱۲ ظ +

راستہ بتلانا شروع کر دیا اور یہ راستہ پر چلنے لگا پھر کوئی ابتدا میں ہے کوئی وسط میں ہے یہ مشابہ خطبہ کے ہے۔ (مگر ابھی تک اسکو یہ نہیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی مجھسے تعلق ہے یا نہیں اسکے بعد ایک درجہ یہ ہے کہ ادہر سے بھی اسکی ساتھ تعلق کا اظہار ہونے لگا اور رضا کے آثار و معاملات اسکے ساتھ ظاہر ہونے لگے یہ وہ درجہ ہے جو منظوری خطبہ کے بعد ہوتا ہے ۱۲) اسکے بعد ایک درجہ وصول کا ہے کہ نسبت مع اللہ عطا ہو گئی اور یہ شخص واصل بحق ہو گیا۔ اسپر شاید کسی کو یہ شبہ ع۵ ہو کہ بارگاہ حق کی تو کہیں انتہا ہی نہیں جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست | ہر چہ بروئی میرسی بروئے مایست

اور ایک عارف کہتے ہیں ؎

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا | کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

اور جب اسکی انتہا کہیں نہیں پھر وصول کے کیا معنی کیونکہ وصول تو محدود تک ہو سکتا ہے غیر محدود تک وصول کہاں ہو سکتا ہے۔ اور یہی وہ مضمون ہے جو پہلے وعظ میں بیان سے رہ گیا تھا کیونکہ میں نے پہلے وعظ میں یہ دعوی کیا تھا کہ شریعت میں ہر شے کیلئے ایک حد ہے اسپر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ تعلق مع اللہ کی تو حسب تصریح صوفیہ کوئی حد نہیں بلکہ یہ تعلق غیر متناہی ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ وصول کے دو معنی ہیں ایک وصول محدود ہے ایک غیر محدود ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں ایک سیر الی اللہ یہ تو محدود ہے ایک سیر فی اللہ یہ غیر محدود ہے۔ سیر الی اللہ یہ ہے کہ نفس کے امراض کا علاج شروع کیا یہانتک کہ امراض سے شفا ہو گئی اور ذکر و شغل سے قلب کی تعمیر شروع کی یہانتک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہو گیا یعنی تخلیہ و تحلیہ کے قواعد جان گئے موانع مرتفع کر دیئے معالجہ امراض سے واقف ہو گئے نفس کی اصلاح ہو گئی اخلاق رذیلہ زائل ہو گئے اور اخلاق حمیدہ سے انوار ذکر سے قلب آراستہ ہو گیا اعمال صالحہ کی رغبت طبیعت ثانیہ بنگئی اعمال و عبادات میں سہولت ہو گئی نسبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو گیا تو سیر الی اللہ ختم ہو گئی اسکے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا تعلق سابق میں ترقی ہوئی اسرار و حالات کا ورود ہونے لگا یہ غیر

ع۵ یہی وہ شبہ ہے جو وعظ الحدود والقیود کے بالکل اخیر میں ایک حاشیہ میں مذکور ہے ۱۲۔

محدود ہے یہی وہ تعلق ہے جسکی نسبت کہا گیا ہے ؎

بحر یست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

اور اسکی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص سائنس کا امتحان دیتا ہے یہانتک کہ پاس ہو گیا اور سند بلگئی تو اسوقت سیر الی سائنس ختم ہوئی اسکے بعد سیر فی سائنس ہے کہ تحقیقات میں اضافہ ہو نئی نئی باتیں منکشف ہوں اسکی کوئی حد نہیں چنانچہ اہل سائنس خود اسپر متفق ہیں کہ تحقیقات سائنس کا سلسلہ غیر محدود ہے جب ایک دنیوی تعلق کا یہ حال ہے تو تعلق مع اللہ کا کیا حال ہوگا۔ دوسری مثال اور لیجئے کہ ایک کرہ جو اپنے مرکز سے الگ ہو گیا ہو اور وہ حرکت اینیہ کرکے مرکز پر پہونچ جائے تو اسوقت حرکت الی المرکز ختم ہوئی پھر اسکے بعد اپنے مرکز پر پہونچکر وہ حرکت وضعیہ کرتا ہے اسکی کوئی حد نہیں اسی طرح یہاں سمجھو بس وہ شبہ جاتا رہا کہ جب بارگاہ حق غیر متناہی اور غیر محدود ہے تو وصول کے کیا معنی سو میں نے بتلا دیا کہ تعلق مع اللہ ایک معنی کے اعتبار سے محدود ہے یعنی سیر الی اللہ کے اعتبار سے اور اکثر اسی حد پر خلافت دیجاتی اور سالک کو مجاز بنایا جاتا ہے جیسا علوم ظاہرہ میں ایک نصاب خاص کے ختم کرنے اور پاس کر لینے پر سند دیجاتی ہے یہ محدود ہے پھر آگے عمر بھر علوم میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہ غیر محدود ہے اور ایک درجہ غیر محدود ہے اسی طرح یہاں تعلق کا محدود ہونا بھی صحیح ہے اور غیر محدود ہونا بھی صحیح ہے۔ (اور اسی کے مشابہ ایک سوال اور ہے کہ جب ہر شے محدود ہے تو کیا ایمان بھی محدود ہے۔ جواب یہ ہے کہ ایمان کے حدود و قیود یہ ہیں کہ ذات کی کنہ کی تفتیش اور اسمیں فکر نکرے ظنیات کو مدار اعتقاد نر کھے وغیر ذلک یہ سوال و جواب نظر ثانی میں زائد کیا گیا) یہ تو ایک شبہ کا جواب تھا اب میں کہتا ہوں کہ معاملۂ نکاح سے ہمکو چند سبق لینا چاہیئے کہ یہ دنیا میں نظیر ہے تعلق مع اللہ کی۔ اول یہ سبق ہو کہ جب تم ایک عورت کی طلب سے مستغنی نہیں ہو تو خدا کی طلب سے کیونکر مستغنی ہو گئے ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن
صبر چوں داری ز رب ذو المنن

ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں
صبر چوں داری ز نعم الماہدوں

پھر جب کوئی شخص کسی عورت کو پیغام دیتا ہے تو اسوقت یہ سوچے کہ ایک عورت کی طلب

محدود ہونے کی مثال — سیر فی اللہ غیر محدود

کیلئے اُسکو پیغام دینے میں کتنی کتنی باتوں کی رعایت کرنا پڑتی اور اسکی تلاش میں کیسی کیسی دقتیں اٹھانا پڑتی ہیں کہ بقول عورتوں کے جوتیاں بھی گھس جاتی ہیں خطا پر خط اور قاصد پر قاصد بھیجے جاتے ہیں اور لڑکی والا ہے کہ اشارہ کنایہ ہی کرتا رہتا ہے صاف طور سے تسلی نہیں کرتا بس حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق حاصل کرنیکا جن مشائخ کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اگر وہ ایک دو دفعہ ٹالیں اور درخواست کی ساتھ ہی تمکو بیعت نکریں تو اسکو بھی تحمل کرنا چاہئے پھر خطبہ منظور ہو جاتا ہے تو اب یہ حالت ہے کہ ہدایا و تحالف سے اسکے اہل وخاندان کو راضی کرنے کی کوشش کیجاتی ہے اور انکی نامرضی سے پوری طرح بچتے ہیں کہ کہیں ایسا نہو وہ ہماری حالت کو دیکھکر پیغام چھوڑ الیں تو ایسے ہی طلب حق کے بعد سالک کو رضائے حق میں سعی اور نا مرضیات سے بچنے کا اہتمام بلیغ کرنا چاہئے پھر ایک اور بات بھی جو اس مجمع میں بیان کرنے کی نتھی مگر چونکہ مشہور ہے اسلئے بیان کرتا ہوں کہ جس لڑکی کو پیغام دیا جاتا ہے گو ابھی نکاح نہوا ہو صرف پیغام ہی سے اُسکو بھی اس شخص سے گونہ تعلق ہو جاتا ہے جس نے اسکو پیغام دیا ہے ہم نے بعض واقعات ایسے سنے ہیں کہ پیغام چھٹنے پر جیسے لڑکے کو رنج ہوا لڑکی کو بھی رنج ہوا۔ خیر یہاں تو یہ بات اکثری ہے جسمیں لزوم نہیں مگر طلب حق میں تو لزوماً عادۃ اللہ یہی ہے کہ جب کوئی اُنکی طلب کرتا ہے تو وہ بھی اسکی طلب کرتے ہیں یعنی وہ بھی اسکے حال پر متوجہ ہو جاتے ہیں احادیث میں مصرح ہے من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا الحدیث پس سالک کو طلب میں سرگرم ہونیکی ساتھ یہ بھی تصور کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کو بھی میری ساتھ تعلق ہے وہ بھی مجکو چاہتے ہیں یہ مراقبہ مفید ہوگا اس سے محبت بڑھے گی ورنہ افسردہ ہو جائیگا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست
تشنگان گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں +

یعنی محبوب کو تم سے تعلق ضرور ہے اگر اُنکو تعلق نہوتا تو تمکو طلب ہی نصیب نہوتی ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں کہ بہ نسبت ہست ہم این وہم آں

مگر فرق اتنا ہی کہ ؎ عشق معشوقاں نہاں ست وستیر + عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر +

سالک کو یہ تصور کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ بھی اسکو چاہتے ہیں اور اسکی دلیل نصوص شرعی اور اقوال عارفین سے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ ۸۴ مسمی بہ

المرابطہ

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی مولائی محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

(احقر شبیر علی عفی عنہ)

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شائع کیا

۲۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی به
المرابطة

این	کہاں ہوا	مکان اہلیہ صغریٰ حضرت حکیم الامۃ ام مجدہم تھانہ بھون
متی	کب ہوا	۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ بروز شنبہ شروع ۸ بجے صبح
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ مگر تسوید وعظ بوسے ۴ گھنٹہ میں ہوئی۔
کیف	کس ہیئت پر ہوا	جالسًا علی الکرسی
لم	کس سبب سے ہوا	جامع وعظ کی بھتیجی اور حضرت حکیم الامۃ کی اہلیہ کی نواسی رشیدہ سلمہا کی شادی کی تقریب میں اعزہ کا اجتماع ہوا انکی درخواست پر بیان ہوا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	تاکید عمل۔ اور یہ کہ تصوف کی حقیقت علم مع العمل ہے مگر عمل میں اعمال ظاہرہ و باطنہ سب داخل ہیں اور یہ کہ قابل اہتمام اعمال ہیں کیفیات مہتم بالشان نہیں۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	علماء کو اور نو تعلیم یافتہ جماعت کو خصوصًا
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وکان لہٗ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مجمع رجال ۶۰ تقریبا و مجمع مستورات پردہ میں اسکے علاوہ
الاشتات	متفرقات	اس آیت کا بیان پہلے بھی ایک بار ہو چکا ہے اُس کا نام یاد نہیں اور مضامین غالبًا مکرر نہیں ہیں۔

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ **اما بعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

يا ايها الذين آمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا الله لعلكم تفلحون ○

اس بیان کا سبب بجز مہمانوں کی درخواست کے کچھ نہیں ہے پہلے سے قصد نہ تھا اور درخواست کے بعد بھی اسواسطے قصد نہ تھا کہ مضمون ذہن میں کوئی حاضر نہ تھا مگر توکلا علی اللہ اس شرط کے ساتھ وعدہ کر لیا تھا کہ اگر مضمون ذہن میں آگیا تو بیان کر دوں گا اسکے بعد میں نے بہت سوچا مگر کوئی مضمون نہ آیا پھر رات کو خود ہی فضل ہوا کہ مضمون ذہن میں آگیا اور یہ کوئی نیا مضمون نہیں بلکہ وہ مضمون ہے جس کا تذکرہ قریب قریب ہر جلسہ میں مختلف عنوانوں سے آجکل ہوتا تھا عنوان اس کا عمل ہے بزرگوں نے اس کا بہت اہتمام فرمایا ہے چنانچہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں جابجا ارشاد ہے ○

کار کن کار بگذر از گفتار — کاندریں راہ کار باید کار

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جسوقت خلیفہ ہوئے اور پہلے پہل خطبہ پڑھنے کھڑے ہوئے تو مضمون کی آمد نہوئی تو آپنے کچھ دیر سوچا جب سوچنے سے بھی آمد نہوئی فرمایا انتم الی امام فعال احوج منکم الی امام قوال وستاتیکم الخطب بعد قوموا الی صلوتکم رحمکم اللہ کہ تمکو کام کرنے والے امام کی زیادہ ضرورت ہے باتیں بنانے والے کی ضرورت نہیں مطلب یہ تھا کہ میں انشاءاللہ کام کر کے دکھلاؤں گا خالی باتیں نہ بناؤں گا تو حضرت عثمان نے بھی اس ارشاد میں عمل کی اہمیت پر تنبیہ فرمائی ہے حضرت عثمان میں حیا و خجلت کا مادہ زیادہ تھا جیسا حدیث پڑھنے والوں پر مخفی نہیں اور حیاء کثرت کلام سے مانع ہے اس لئے حضرت عثمان بوجہ غلبۂ حیا کے خطبۂ طویلہ بیان نکر سکے آجکل لوگ کثرت کلام کو ہنر سمجھتے ہیں لیکن حدیثوں سے اسکی مذمت معلوم ہوتی ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے ان اللہ یبغض البلیغ من الرجال اللہ تعالی بلیغ لوگوں کو پسند نہیں فرماتے بلیغ سے مراد وہ نہیں جو اہل معانی کی اصطلاح میں ہے بلکہ بلیغ سے مراد وہ شخص ہے جو بے تکلف بولتا چلا جائے کیونکہ مذموم یہی ہے اور بلاغت مصطلحہ مذموم نہیں (بلکہ محمود ہے لقولہ تعالی وقل لهم في انفسهم قولا بليغا ۱۲) بہرحال کثرت کلام مذموم ہے۔ حضرت شیخ فرید عطار فرماتے ہیں ○

دل ز پر گفتن بمیرد در بدن — گرچہ گفتارش بود در عدن

حضرات عارفین کو اس کا مشاہدہ شب و روز ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک کلمہ سے قلب سیاہ
ہو جاتا ہے اسکے متعلق تجربہ یہ ہے اور میں اس لفظ سے بھی شرماتا ہوں کیونکہ در پردہ اسمیں
اپنے عارف ہونیکا دعویٰ ہے اور میں تو اُن کی خاک پا بھی نہیں ہوں۔ بس یوں کہئے کہ
تجربہ کاروں سے سنا ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر ہوتی رہے تو اُس سے قلب پر ظلمت کا
اثر نہیں ہوتا چنانچہ ایک کنجڑا دن بھر لیلوا مرود پکارتا پھرے تو ذرہ برابر قلب میں اس سے
ظلمت نہ آئے گی کیونکہ بضرورت ہے اور بضرورت ایک جملہ بھی زبان سے نکل جائے تو
دل سیاہ ہو جاتا ہے پس شیخ فرید عطار کے قول کا مطلب یہ ہوا کہ بضرورت باتیں کرنے سے
دل سیاہ ہو جاتا ہے اور یہی مراد بلیغ سے حدیث میں ہے جو بضرورت زیادہ باتیں کرے
اور بے تکلف بے سوچے گفتگو کرے کیونکہ ایسا وہی شخص کر سکتا ہے جو بیفکر ہو اور جسکے
دل کو فکر لگا ہوا ہو وہ بے تکلف گفتگو نہیں کر سکتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ جسقدر علوم میں
ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر کلام کی روانی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر کبھی روانی زیادہ ہو
تو وہ مخاطبین کا فیض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخاطب کو فائدہ پہونچانا چاہتے ہیں اُن کے افادہ
کیلئے قلب میں مضامین مفیدہ کثرت سے وارد ہو جاتے ہیں پس شیوخ ناز نکریں کہ ہمنے
بڑے بڑے علوم و اسرار بیان کر دیئے کیونکہ کبھی سامعین کی برکت سے بھی مضامین کا ورود
ہوتا ہے اور اسوقت اسکی مثال قیف جیسی ہوتی ہے کہ وہ محض واسطہ ہے بوتل میں تیل
پہونچانیکا اب اگر قیف ناز کرنے لگے کہ میں نے تیل پہونچایا یہ اسکی حماقت ہے بلکہ اس کو
بوتل کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اسکی برکت سے اسکو بھی تیل سے کسیقدر تلبس ہو گیا ایک عالم
کی حکایت ہے کہ ان کے وعظ میں ایک عارف موجود تھے جو اُن کی طرف متوجہ تھے اُنکی توجہ
کا یہ اثر ہوا کہ وعظ میں عجیب عجیب علوم بیان ہوئے درمیان میں واعظ کو عجب ہوا کہ آج
تو میں نے بڑے علوم بیان کئے ہیں۔ عارف کو اس خطرہ کا کشف ہو گیا تو اُس نے اپنی توجہ
اُن کی طرف سے ہٹالی توجہ کا ہٹانا تھا کہ واعظ کو آمد بند ہو گئی اسلئے اگر کسی وقت روانی
بیان میں ہو اور علوم عجیبہ بیان ہو جائیں تو اسکو سامعین کا فیض سمجھنا چاہیئے غرض کہ
کلام خود مقصود نہیں بلکہ افادہ و استفادہ کیلئے ذریعہ ہے اور مقصود عمل ہے بزرگان دین

کی یہی وصیت ہے شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دمے بے قدم

قدم سے مراد عمل ہے اہل طریقت تو یہاں تک مشاہدہ کرتے ہیں کہ جس کام کو وہ خود نہیں کرتے اسکی نصیحت بھی دوسروں پر مؤثر نہیں ہوتی اور جس کام کو خود کرتے ہیں اُسکی نصیحت بھی مؤثر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے وصیّت کی ہے کہ عارف کو بھی خلوت کی ضرورت ہے گو وہ اس درجہ پر پہونچ چکا ہو کہ ؎

خلوت وچلہ برولازم نماند

مگر دوسروں کے افادہ کیلئے اسکو خلوت لازم سمجھنا چاہیئے تاکہ جلوت میں جو علوم کا افادہ ہو چکا ہے ان کے علاوہ خلوت میں نئے علوم مجتمع ہو جائیں اور چشمہ بند نہو بلکہ پانی کی آمد برابر ہوتی رہے۔ چونکہ آجکل لوگوں کو عمل کی طرف توجہ نہیں عوام تو عوام خواص کو بھی زیادہ توجہ اسرار و ذوقیات ہی کی طرف ہے اسلئے بھی یہ مضمون زیادہ ضروری ہوگیا۔ اور خواص کو عمل کی طرف توجہ اسلئے کم ہے کہ عمل میں ابتداءً لذت نہیں ہوتی اور ذوقیات میں سراسر لذت ہے عمل کی مثال ابتداء میں مثل دوا کے ہے اور انتہاء میں مثل غذا کے ہے منتہی کو عمل میں زیادہ لذت ہوتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے جعلت قرة عینی فی الصلوٰة اب جو سالکین یہ شکایت کرتے ہیں کہ ذکر میں اور نماز و روزہ میں مزہ نہیں آتا مجھے ان پر ہنسی آتی ہے کہ انھوں نے طبیب سے بھی کبھی یہ شکایت کی کہ دوا میں مزا نہیں آتا پھر یہاں اس شکایت کے کیا معنی؟ صاحب تمکو جو ذکر و اوراد بتلائے گئے ہیں بطور دوا کے بتلائے گئے ہیں پھر دوا میں لذت کی طلب کیسی؟ ہاں اسکی عادت کرلو تو پھر مثل غذا کے اسمیں بھی لذت آئے گی کیونکہ عادت کے بعد دوا ہی غذا بنجاتی ہے جیسے افیون اور تماکو کہ حقیقت میں یہ چیزیں دوا ہیں مگر عادت کے بعد غذا سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتے ہیں۔ پس عمل میں لذت اور سہولت کا طالب ہونا غلطی ہے اور اگر شیخ ایسا طریقہ بتلادے جس سے عمل میں سہولت ہو جائے تو یہ اُس کا فرض منصبی نہیں محض تبرع ہے چنانچہ حکیم کا فرض منصبی صرف نسخہ لکھدینا اور دوا بتلا دینا ہے مریض کو یہ حق نہیں کہ طبیب سے الائچی اور پان کا مطالبہ کرنے لگے اگر وہ نسخہ بتلاکر الائچی اور پان بھی کھلادے تو یہ اُسکا

احسان ہے جیسا بعض اطبا شفقت کے طور پر مریضوں کو بدپرہیزی کی اجازت دیدیتے ہیں
مولانا حکیم معین الدین صاحب مرحوم کی حکایت سنی ہے کہ وہ اپنے سامنے مریض سے پرہیز
کراتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے سامنے جس چیز کو دل چاہے کھالو کیونکہ وہ نسخہ میں اس کی
رعایت کر لیتے تھے مگر پیچھے اسکی اجازت نتھی تو یہ محض اُن کی شفقت تھی مریض کو اسکی درخو
کا حق نتھا شیوخ چونکہ مربی ہیں اور بدپرہیزی کرانا تربیت کے خلاف ہے اسلئے اُن سے بھی بدپر
کی اجازت مانگنے کا کسی کو حق نہیں اور لذت و سہولت کی طلب بھی ایک درجہ میں بدپرہیزی کی
طلب ہے کیونکہ معالجہ باطن کا مدار مجاہدہ پر ہے اور مجاہدہ میں لذت کہاں اگر مجاہدہ میں لذت
ہو تو مجاہدہ نرہے گا اسلئے بعض دفعہ شیوخ قصداً بھی سہولت و یسر کا طریقہ نہیں بتلاتے ہاں
بعض دفعہ کسی کو شفقت کے طور سے ایسے طریقے بتلا دیتے ہیں جنسے عمل میں سہولت ہو جائے
وہ بھی اسیوقت تک جب تک خود سالک درخواست نکرے اور اگر ان سے درخواست کی تو ہو
اسکی رای بدل جاتی ہے کہ تجکو تو سہولت کے راہ سے نہ پہونچایا جلئے گا بلکہ ناک رگڑ کے ہی عمل
کرایا جائیگا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ طالب کو سہولت و لذت کی درخوارست کا حق نہیں بلکہ اسکو لازم
کہ خاموشی اختیار کرے شیخ جو طریق مناسب سمجھے گا خود اختیار کریگا مگر ایسی خاموشی بھی جائز نہیں
کہ حالات سے بھی شیخ کو مطلع نکرے کیونکہ شیوخ عالم الغیب نہیں ہاں عالم العیب (بالمہملہ) تو
ہیں بشرطیکہ وہ عیب غیب نرہے بلکہ احوال سے اُسکو برابر اطلاع دیجائے تو وہ سالک کے
امراض و عیوب پر مطلع ہو جاتا ہے اسی لئے میں نے آداب سلوک کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان
کیا ہے اطلاع و اتباع قافیہ کا تو مجھے خبط ہے کیونکہ قافیہ سے کلام موزوں اور خوشنما ہو جاتا ہے
نیز اُس کا یاد رکھنا بھی آسان ہو جاتا ہے اسی طرح دو لفظ اور ہیں اعتقاد و انقیاد کہ سالک کو
شیخ سے اول اعتقاد ہونا چاہیے پھر اُسکے احکام کی اطاعت کرنا چاہیے کبھی اعتقاد کے بجائے
اعتماد کہدیتا ہوں کیونکہ اعتقاد وہی معتبر ہے جو اعتماد کے ساتھ ہو یہ حاصل ہے معاملہ شیوخ
و مریدین کا۔ مگر آجکل یہ حقوق پامال کئے جا رہے ہیں کہ ہر سالک اپنی رائے کو شیخ کی رای میں
شامل کرنا چاہتا ہے سو اس طرح کامیابی دشوار ہے طب ظاہر میں بھی ایسا مریض شفایاب
نہیں ہو سکتا جو معالج کی رائے میں اپنی رائے کو داخل کرے۔ میری پھوپی زاد بھائی حکیم مصباح الحق

بڑے قابل حکیم تھے ایک بار وہ خود مریض ہوئے اور حکیم عبدالمجید خانصاحب کے پاس علاج کیلئے گئے تو انکی حالت یہ تھی کہ حکیم صاحب کے ہر نسخہ میں ترمیم کرتے تھے کیونکہ خود بھی حکیم تھے مگر نتیجہ یہ ہوا کہ جب حکیم عبدالمجید خانصاحب کو اسکی اطلاع ہوئی صاف فرمادیا کہ یہ اس مرض سے جانبر نہوں گے کیونکہ انکو کسی طبیب پر اعتماد نہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ جانبر نہوئے۔

اسرار و ذوقیات کے نعمت ہونے میں شک نہیں اگر بدون طلب کے حاصل ہو جائیں تو شکر کرنا چاہئے مگر چونکہ خود مقصود و مطلوب نہیں ہیں اسلئے ان کے درپے نہونا چاہئے۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ ذوق و شوق دانش وغیرہ حجب نورانیہ ہیں اور حجب نورانیہ حجب ظلمانیہ سے اشد ہیں کیونکہ حجب ظلمانیہ کی طرف سالک متوجہ نہیں ہوتا انکو خود دفع کرنا چاہتا ہے اور حجب نورانیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا اور التفات کرنے لگتا ہے جسکی وجہ سے توجہ مقصود سے ہٹ جاتی ہے اسلئے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی وقت انوار و اسرار و ذوقیات کیطرف توجہ ہونے لگے تو لا الٰہ الا اللہ کے لا سے ان کی بھی نفی کرنا چاہئے کیونکہ مقصود وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست	ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

اور اگر کسی وقت ذوقیات و احوال سے اپنے کو خالی پائے اسوقت یوں کہے ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست	تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

روزہا سے مراد احوال و کیفیات ہیں کہ اگر کسی وقت یہ نہوں تو دلگیر نہو بلکہ یہ سمجھے کہ خدا تو ہے پھر اسکے ہوتے ہوئے کسی کے نہ ہونے کا کیا غم محب کو تو محبوب سے کام ہے اغیار سے کیا کام؟

؎ فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب	کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائی

محب وہ ہے کہ محبوب فیرینی کھلائے تو اسپر راضی رہے پھیکا دودھ پلائے تو اسپر راضی رہے اور ایلوا کھلائے تو اسپر بھی راضی رہے محب کی تو یہ شان ہونا چاہئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو	دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

سرمد مجذوب اس مضمون کو ذرا صاف بیان کرتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد	یک کار ازیں دو کار می باید کرد

باتن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

کیا دو ٹوک فیصلہ ہے کہ اگر یہ خدا پسند نہیں تو کوئی دوسرا خدا تجویز کرلو جو تمکو ہمیشہ لذت ہی میں رکھے اور اگر یہی خدا پسند ہے تو وہ تو تمھاری مرضی کے تابع نہو گا بلکہ اپنی مرضی کے موافق حکم کریگا پھر شکایت کے کیا معنی ؟ اگر تمکو خدا سے محبت ہے تو محبوب کی ہر ادا محبوب ہونا چاہیے اسکی ایک موٹی مثال ہے کہ اگر کوئی عاشق وصال محبوب کیلئے تڑپتا پھرتا ہو پھر اتفاق سے محبوب اسکو پیچھے سے آکر بغل میں دبائے اور ایسا دبائے کہ پسلیاں ٹوٹنے لگیں اور وہ عاشق سے یوں کہے کہ اگر تجکو اس سے تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں اور رقیب کو بغل میں لیلوں کہ وہ بھی اس کا مشتاق ہے تو بتلایئے عاشق کیا کہے گا ؟ یقیناً یوں کہیگا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

افسوس ایک مخلوق کی تو ہر ادا محبوب ہو جو کہ اپنے ہی جیسی ہے کہ اپنی نوع میں سے ہے اور ممکن ہے کہ محب میں اُس سے زیادہ کمالات ہوں عقل و فہم و علم و ہنر وغیرہ مگر اُس کا صرف چہرا حسین ہے خواہ صبیح ہے یا ملیح کیونکہ اسمیں مذاق کا اختلاف ہے بعض کو صباحت پسند ہے بعض کو ملاحت غرض صرف اتنی سی بات کی وجہ سے اُسکی ہر ادا پر جان فدا کرنے کو تیار ہیں اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں حالانکہ حقیقی کمال اور حقیقی حسن و جمال اُنہی میں ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود کوے گشتن بہر او اولی بود

سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودے زاب و گل ربایدہمہ صبر وارام و دل
چو در چشم شاہد نیاید زرت زر و خاک یکساں نماید برت
عجب داری از سالکاں طریق کہ ہستند در بحر معنی غریق
دمادم شراب الم در کشند وگر تلخ بینند دم درکشند

اور اس سے بڑھکر اُن خشک لوگوں پر افسوس ہے جو محبت حق ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ سے محبت نہیں ہو سکتی ہے بس محبت حق کے معنی یہی ہیں کہ احکام پر چلتے رہو افسوس ان لوگوں کو اپنے حرمان پر تو افسوس نہوا الٹا اہل محبت کی دولت ہی کا انکار کرنے لگے۔ صاحبو! وہ تو یہ کہتے

ہیں کہ خدا کی محبت نہیں ہوسکتی کیونکہ اسکو دیکھا نہیں اور میں یہ کہتا ہوں کہ غیر حق کی محبت نہیں ہوسکتی جسکو میں دلیل سے ثابت کرسکتا ہوں اور اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں میرے دعوے کی دلیل یہ ہے کہ محبت مخلوق کا سبب ذات محبوب نہیں کیونکہ ذات من حیث ہی ذات تو بچپن میں بھی موجود ہے اور بڑھاپے میں بھی پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ محبوب سے محبّت جوانی میں یا دوسرے بعض حالات میں ہوئی بلکہ محبت کے اسباب چار ہیں کمال جمال۔ نوال۔ قرابت کمال کی وجہ سے جو محبت ہوتی ہے وہ دیدار پر موقوف نہیں کیونکہ بہت سے اہل کمال ایسے ہیں جنکو ہمنے نہیں دیکھا مگر ہمکو اُن سے محبت ہے مثلاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سب مسلمانوں کو محبت ہے اور جملہ انبیاء سے محبت ہے اور ایسی محبت ہے کہ اولاد ووالدین سے زیادہ چنانچہ مسلمان اپنے والدین کی شان میں گستاخانہ کلمات سنکر صبر کرسکتے ہیں مگر حضرات انبیاء کی شان میں گستاخی ہوتے ہوئے دیکھکر صبر نہیں کرسکتے یہ تو دینی محبت کی مثال ہے اور دنیوی محبت کی مثال یہ ہے کہ شاہنامہ پڑھنے والوں کو رستم سے محبت ہوجاتی ہے مجھے خود اپنا واقعہ بچپن کا یاد ہے کہ جب میں شاہنامہ پڑھتا تھا تو ہر لڑائی کا بیان شروع کرتے ہوئے یہ تمنا ہوتی تھی کہ رستم ہی غالب ہو اسپر دوسرا کوئی غالب نہو۔ دوسرا سبب جمال ہے یعنی حُسن سو اسکی عارضی ہونے کی یہ حالت ہے کہ مخلوق میں کسی کا حُسن بھی ذاتی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہے چندروز میں موت آکر سارے حُسن کا خاتمہ کردیتی ہے اور زندگی میں بھی اگر عورت کا سر مونڈ دیا جائے تو سارا حُسن جاتا رہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق بامردہ نباشد پائدار	عشق را باحی و باقیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود	عشق نبود عاقبت ننگے بود

پس مخلوق کی حالت دیکھکر یہ حقیقت عیاں ہے کہ ان کا حسن کسی دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ خدا کے سوا کوئی نہیں تو اب جو شخص کسی مخلوق پر عاشق ہے وہ حقیقت میں خدا پر عاشق ہے کیونکہ جس کمال وجمال پر یہ فریفتہ ہے وہ خدا کا پیدا کیا ہوا اُس کا عطا کیا ہوا ہے مکان کی تعریف کرنیوالا حقیقت میں معمار کی مدح کررہا ہے خوشخط تحریر پر فریفتہ ہونے والا

۲۳

دراصل کاتب پر فریفتہ ہو رہا ہے گو اسکو خبر نہیں اسی طرح یہاں سمجھو تیسرا سبب نوال ہے وہ
بھی حقیقی صفت حق تعالیٰ ہی کی ہے جیسا ابھی جمال کی تقریر میں مذکور ہوا اب رہگئی قرابت
سو قرابت متعارفہ تو اللہ تعالیٰ کیلئے محال ہے البتہ اسکی حقیقت یعنی دو شخصوں میں اور دو
زیادہ ایک نسبت یہ حق تعالیٰ کے ساتھ ایسی حاصل ہے جو کسی کی ساتھ بھی نہیں اسکی تفصیل
احیاء میں مبسوط ہے اب تو میرا یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ غیر حق کی محبت نہیں ہو سکتی بلکہ محبت
جب ہو گی خدا ہی سے ہو گی اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

حسن خویش از روی خوباں آشکارا کردۂ　　پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

اب اگر یہ سوال پیدا ہو کہ خدا تعالیٰ کی درگاہ تک ہم کیونکر پہونچیں اور اُن کی محبت کس طرح
حاصل کریں تو مولانا اس مقام پر اسکو بھی بتلاتے ہیں مولانا کا کلام جامع ہوتا ہے وہ سب
پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　بر کریماں کارہا دشوار نیست

لفظ بر کریماں میں اس طرف اشارہ ہے کہ وصول الی اللہ تمھاری سعی سے نہ ہوگا بلکہ اُن
کرم سے ہوگا میں اسکی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے شیر خوار بچہ کو آپ اپنے پاس بلانا چاہیں
جو کھڑا تو ہو جاتا ہے مگر چل نہیں سکتا۔ آپ اُسکو بلاتے ہیں کہ یہاں آؤ حالانکہ یہ بھی جانتے
ہیں کہ وہ آ نہیں سکتا مگر کسی مصلحت سے آپ اسکے منتظر ہوتے ہیں کہ یہ ذرا چلے اور گر پڑے
تو گود میں لیلیں بس یہاں بھی اسی کی ضرورت ہے کہ ذرا چلو اور گر پڑو پھر وہ خود ہی اٹھا
ورنہ خود آپ اس راستہ کو طے نہیں کر سکتے ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

اور عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ما بداں مقصد عالی نتوانیم رسید　　ہاں مگر لطف شما پیش نہد گامے چند

جب محبوب حقیقی حق تعالیٰ شانہ ہیں جیسا ابھی ثابت ہوا تو کیا محبت کا یہی حق ہے کہ
ہو تو قبض کی تمنا ہے اور قبض ہو تو بسط کی تمنا ہے اری تمکو تو خاموش چلنا چاہیئے کہ

خواجہ خود روش بندہ پروری داند

بض کے اندر بعض دفعہ سخت حالت ہوجاتی ہے کہ بعض نے اسوقت خودکشی تک کا ارادہ کرلیا
ر محبت کا مقتضا وہ ہے جسکو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

باغباں گر چند روزی صحبت گل بایدش | بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے درانِ بند زلفش از پریشانی منال | مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

اور اگر کوئی قبض کی تدبیر کرکے بسط حاصل کرلے اور اسپر نازاں ہو تو اسکے متعلق فرماتے ہیں ؎

تکیہ بر تقوی و دانش در طریقت کافریست | راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

غرض محبت کا مقتضی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سب تصرفات پر راضی رہے اور ساری تجویزوں کو
ناکردے دل لگنے یا نہ لگنے کا طالب نہو لذت وذوق کی ہوس نکرے بلکہ کام میں لگا رہے ؎

بس زبون وسوسہ باشی دلا | گر طرب را باز دانی از بلا

عارف فرماتے ہیں ؎

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب | کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائی

بعض سالکین کی عمر گذر گئی کہ انکو ذوق حاصل نہیں ہوا پھر بعض تو خالی رہے اور بعض نشتر دہنکے
غموں سے بھرے ہوئے ہیں مگر وہ اسپر بھی راضی ہیں ؎

اے ترا خاری بپا نشکستہ کی دانی کہ چیست ✤ حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

یہ بھی تجویز ہے کہ قبض کی دعا کرنے لگے کیونکہ وعظ میں سن لیا تھا کہ قبض نافع ہے یہ بھی غلطی ہے
بلکہ تفویض کلی لازم ہے اپنی طرف سے نہ لذت کی طلب کرے نہ عدم لذت کی نہ قبض کی نہ بسط کی
درحضرت سمنون محب کا واقعہ پیش نظر رکھے اُن پر ایک حالت غالب ہوگئی تھی اُسوقت انکے منہ
سے یہ شعر نکلا ؎

ولیس لی فی سواک حظ . فکیف ماشئت فاختبرنی

کہ مجھے جسطرح چاہو آزما لو مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں حظ نہیں یہ سخت بات تھی جسپر غیب سے
امتحان شروع ہوگیا کہ ان کا پیشاب بند ہوگیا اسی واسطے حدیث میں ایسی دعا سے ممانعت ہے
چنانچہ حضور نے ایک صحابی کو مرض شدید میں مبتلا دیکھا پوچھا کیا تمنے کوئی دعا کی ہے کہا ہاں
میں نے یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ جسقدر عذاب آخرت میں مجھے ہونیوالا ہو سب دنیا میں ہوجائے

حضور نے فرمایا سلوا اللہ العافیۃ کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرنا چاہیے کہ دنیا و آخرت دونوں میں عافیت عطا ہو۔ غرض حضرت سمنون کا پیشاب بند ہو گیا اور اب دعا بھی نہیں کرتے کیونکہ دعا کرتے ہوئے شرماتے تھے یہ بھی ایک حال تھا مگر اس سے کاملہ حال یہ تھا کہ دعا کرتے اور کہتے کہ مجھ سے خطا ہوئی میں توبہ کرتا ہوں مجھے آپ کے امتحان کا تحمل نہیں مگر مغلوب کو کوئی رائے دیجا سکتی پھر حق تعالیٰ نے ان کے صبر پر رحم فرما کر دعا کی اجازت دینا چاہی مگر صاف طور سے نہیں کہ ان پر الہام ہو جاتا کیونکہ جب یہ خود اللہ تعالیٰ سے نہیں بولتے تو وہ ان سے کیوں کلام کریں بلکہ اجازت کی یہ صورت ہوئی کہ ایک فرشتہ کو بھیجا گیا کہ سمنون کی آواز میں زور زور سے دعا کرے یہ بھی ایک عجیب انداز تھا

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست   بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

فرشتہ نے اس زور سے دعا کی کہ خانقاہ میں سب مریدوں نے سنا صبح کو ایک خادم نے عرض کیا کہ رات کو کیا آپ نے دعا کی تھی ہم نے تو رات بھر آپ کی دعا کی آواز سنی ہے سمجھ گئے اور خوش ہوئے کہ الحمد للہ کہ مجھے دعا کی اجازت ہوئی پھر اسکی یہ صورت اختیار کی کہ مکتب کے بچوں کے پاس جاتے اور ان سے فرماتے ادعوا لعمکم الکذاب کہ اے بچو! تم اپنے جھوٹے چچا کیلئے دعا کرو۔ کذاب اسلئے کہا کہ دعوے پر جمے نہ رہے امتحان کا تحمل نہ کر سکے۔ سبحان اللہ کیسا اچھا علاج کیا کہ اپنے کو بچوں کا محتاج بنایا۔ امت محمدیہ کے بچے بھی مشائخ کی امداد کے قابل ہیں۔ امت محمدیہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بدویہ نے اپنی اولاد کی تعریف میں کہا تھا ھم کالحلقۃ المفرغۃ لایدری این طرفاھا۔ کہ میری اولاد ڈھلے ہوئے حلقے کے مشابہ ہے کہ کسی کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کا کنارہ کدھر ہے یعنی سب برابر ہیں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں غضب کی تشبیہ ہے جو اس بدویہ کو سوجھی یہی حال امت محمدیہ کا ہے کہ اسکے بچے بھی مقبول بڑے بھی مقبول بعض اوقات بچے بڑوں کے محتاج ہیں اور ایک وقت میں بڑے بچوں کے محتاج ہیں۔ طالبین مشائخ کے محتاج اور بعض اوقات مشائخ طالبین کے محتاج

تشنگاں گر آب جویند از جہاں   آب ہم جوید بعالم تشنگاں

بانگ مے آید کہ اے طالب بیا   جود محتاج گدایان چوں گدا

ایک پیغمبر کی حکایت حدیث میں ہے کہ وہ استسقا کو جارہے تھے راستہ میں ایک چیونٹی کو دیکھا کہ ہاتھ اٹھائے دعا کر رہی ہے آپ نے ساتھیوں سے فرمایا کہ لوٹ چلو اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کی دعا قبول فرمائی ہے جب چیونٹی کی دعا بھی قبول ہوتی ہے تو مسلمانوں کے بچے تو اُس سے بدرجہا افضل ہیں اُنکی دعا کیوں نہ قبول ہوگی نیز حدیث میں ہے کہ عالم کے لئے مچھلیاں اور چیونٹیاں دعا کرتی ہیں گو آجکل لیڈروں کے نزدیک علماء عضو معطل اور بیکار ہیں مگر حیوانات ان کے واسطے دعا کرتے ہیں کیوں؟ دو وجہ سے ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ نے ان کو اسی کام میں لگا دیا ہے کہ علماء کے واسطے دعا کریں دوسرا اسواسطے کہ حیوانات کی خیر بھی بقاء علماء ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ بقاء عالم علماء کی وجہ سے ہے جسکی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے لاتقوم الساعۃ حتی یقال فی الارض اللہ اللہ (او کما قال) کہ زمین میں جب تک خدا کا نام لیا جاتا ہے اسوقت تک قیامت نہ آئے گی اور مشاہدہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے نام کی بقاء علماء کی وجہ سے ہے بس علماء کا وجود بقاء عالم کا ذمہ دار ہے مگر افسوس لیڈران کو نکما سمجھتے ہیں اور سنا ہے کہ آجکل ایک جماعت علماء کے استیصال کی فکر میں ہے اور طرح طرح کی تدبیروں سے ان کے اثر کے مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے بُرا بھلا بھی اُنکو کہا جارہا ہے مگر علماء اس بارہ میں خاموش ہیں وہ بہت احتیاط کرتے ہیں وہ کسی کو بلا ضرورت برا نہیں کہتے مگر اب ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی رعایت نہ کی جاے جبکہ وہ ہماری رعایت نہیں کرتے اور وہ ضرورت یہ ہے کہ عوام ان کی باتوں سے گمراہ ہورہے ہیں یہ لیڈر دین کے احکام میں دخل دیتے اور اپنی راے سے جسطرح چاہتے ہیں احکام میں تحریف کردیتے ہیں اور عوام انکو مولوی مولانا سمجھے ہوئے ہیں اسلئے میں صاف کہتا ہوں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں مسلمانوں کو گمراہ کررہے ہیں کیونکہ دین کا مدار اعتقاد پر ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد ہو اور رسول پر اعتقاد جبھی ہوگا جبکہ حاملانِ شریعت سے اعتقاد ہو کیونکہ عوام کو رسول کی معرفت علماء ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس نے علماء کو نہیں پہچانا وہ رسول کو نہیں پہچان سکتا بس جو لوگ علماء کی استیصال کی فکر میں وہ خود مسلمانوں کی بلکہ عالم کی استیصال کی فکر میں ہیں میں ایک بات اور کہتا ہوں گو کہنے کی تو نہیں ہے وہ یہ کہ

عالم اگر بدعمل بھی ہو جب بھی تمکو اسپر اعتراض کا حق نہیں کیونکہ وہ مدعی علم کا ہے نہ کہ عمل کا اُسکی
بدعملی سے علم تو غلط نہیں ہو گیا طبیب اگر بد پرہیز ہو تو مریض کا کیا نقصان ہے وہ مریض کو تو
صحت ہی کا طریقہ بتلاے گا اسی طرح عالم بےعمل تمکو فتوے تو صحیح دیگا مسائل تو غلط نہ بتلائیگا
اور یہ لیڈر جاہل تو احکام غلط بتلاتے ہیں۔ دیکھئے کیمیا گر خود ننگا ہو تو تمہارا کیا نقصان ہے
اور بڑے بڑے رؤسا اُس کے پیچھے کیوں پھرتے ہیں محض اسوجہ سے کہ وہ دوسروں کو ننگا
نہیں کرتا اور اُسکے پاس ایسی چیز ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے یہ مضمون طویل ہو گیا گفتگو اسپر
چلی تھی کہ جب چیونٹیوں اور مچھلیوں کی دعا قبول ہوتی ہے تو مسلمانوں کے بچوں کی دعا
کیوں قبول نہوگی اسی لئے حضرت سمنون بچوں سے دعا کراتے تھے یہاں سے معلوم ہوا کہ بچوں کی دعا
قبول ہوتی ہے مگر بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بچوں کی دعا قبول نہیں ہوتی چنانچہ مشہور ہے کہ
ایک میانجی استسقا کے لئے بچوں کو لیجا رہے تھے کسی ظریف نے کہا اگر بچوں کی دعا قبول ہوا
کرتی تو میانجی سب سے پہلے تم مرجاتے کیونکہ بچے روزانہ تمکو کوستے ہیں۔ مگر یہ حکایت صحیح بھی ہو تو بہت سے
بہت یہ کہا جائیگا کہ بچوں کی بددعا قبول نہیں ہوتی اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ دعا بھی قبول
نہیں ہوتی۔ اور حضرت سمنون تو دعا کے واسطے بچوں کے پاس گئے تھے بددعا کے واسطے نہیں
گئے تھے اسلئے حکایت پر کوئی اشکال نہیں۔ یہ حکایت میں نے اسپر بیان کی تھی کہ اپنی طرف سے
نہ قبض کی طلب کرے نہ بسط کی نہ بلا کی نہ امتحان کی بلکہ تفویض کلی اختیار کرے۔ اسپر شاید یہ
شبہ ہو کہ بلا میں گرفتار ہو جائے تو کیا اسکے ازالہ کی بھی دعا نکرے اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں
سلوا اللہ العافیۃ وارد ہے جسمیں دعا کی اجازت ہے بلکہ امر ہے اسلئے یہ دعا جائز و مامور بہ
ہے۔ خلاصہ یہ کہ مواجید و اذواق کے درپے نہونا چاہیئے بلکہ عمل کا اہتمام کرنا چاہیئے مگر آجکل
خواص بھی اسمیں کوتاہی کر رہے ہیں اسلئے میں نے اس آیت کا بیان اختیار کیا ہے جسمیں عمل
کی تاکید ہے چنانچہ ارشاد ہے یاایہا الذین آمنوا اصبروا وصابروا اے ایمان والو!
صبر کرو اور مقابلہ میں بھی صبر کرو۔ دو لفظ اسواسطے اختیار کئے گئے کہ صبر کبھی لازم ہوتا ہے کبھی
متعدی یعنی جس حالت پر صبر کیا جاوے کبھی اُسکا تعلق صرف اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے
جیسے مرض وغیرہ کبھی دوسروں سے تعلق ہوتا ہے جیسے محاربہ وغیرہ تو دونوں حالتوں میں صبر کا

امر ہے اسکے بعد ارشاد ہے ورابطوا اور اسوقت مجھے زیادہ تر اسی جملہ کو بیان کرنا مقصود ہے
اصبروا وصابروا اسکی تمہید ہے اور واتقوا اللہ تکمیل ہے اور لعلکم تفلحون تتمیم ہے
جیسا آئندہ واضح ہو جائیگا۔ اب رابطوا کے معنی سنئے۔ بیضاوی نے اسکی تفسیر داوموا
اور واظبوا کی ہے یعنی عمل پر مداومت اختیار کرو کیونکہ ربط کے معنی لغت میں باندھنا ہی
اور مواظبت ودوام میں بھی نفس کو باندھتا ہے اور اسی واسطے بعض نے اسکی تفسیر مرابطۃ الخیل
سے بھی کی ہے کیونکہ اس سورت کے زیادہ حصہ میں محاجہ باللسان ومحاجہ بالسنان کا ذکر ہے
اسکے مناسب رباط الخیل ہی ہے تو اس لفظ کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے مگر کسی مقصود کیلئے
ایک تفسیر کا اختیار کر لینا جائز ہے اسلئے میں نے اسوقت بیضاوی کی تفسیر پر تقریر اختیار کی ہے
شاید اسپر طلبہ کو اشکال ہو کیونکہ انکو شبہات بہت پیدا ہوتے ہیں حتی کہ ایک طالبعلم نے تیلی کے بیل کو بھی شبہات
کی تعلیم دی تھی وہ تیلی سے تیل لینے گئے تو دیکھا بیل کی آنکھوں پر پٹی ہے اور گلے میں گھنٹی پڑی ہے اور وہ چکر لگا رہا ہے
پوچھا یہ گھنٹی اسکے گلے میں کیوں ڈالی ہے کہا اسواسطے کہ ہم ہر وقت اسکے ساتھ نہیں رہ سکتے
بلکہ اپنے دوسرے کام میں بھی لگ جاتے ہیں تو اسی گھنٹی کے بجنے سے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ
بیل چل رہا ہے۔ طالب علم نے کہا یہ تو کوئی دلیل نہیں کیونکہ ممکن ہے کسی وقت ایک ہی جگہ
کھڑے کھڑے سر ہلاتا رہے۔ تیلی نے کہا مولانا میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی تم یہاں سے
چلدو اگر میرے بیل نے یہ منطقی باتیں سن لیں تو ہم تو پریشان ہو جائیں گے تم تیل بھی کسی اور سے
لیلینا۔ اس تیلی نے الزامی جواب دیا کہ میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی ورنہ تحقیقی جواب یہ تھا کہ
مولانا چلنے کی آواز میں اور ایک جگہ کھڑے ہو کر سر ہلانے کی آواز میں بڑا فرق ہے اس لئے
یہ شبہ لغو ہے غرض طلبہ کو احتمالات بہت پیدا ہوتے ہیں اسلئے ممکن ہے یہاں بھی کسی کو یہ شبہ
ہو کہ استدلال کو احتمال مضر ہے پھر دو تفسیروں کے ہوتے ہوئے ایک سے استدلال کیونکر
صحیح ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ احتمال استدلال کو مضر اسوقت ہے جبکہ اسی آیت پر مقصود
کا مدار ہوتا اور یہاں ایسا نہیں بلکہ دوسری نصوص اس مقصود میں صریح موجود ہیں مگر اسوقت
اس آیت کی تلاوت بطور عمود کلام کے کر دیگئی ہے اسپر مدار مقصود نہیں۔ غرض عمل میں مواظبت
کی ضرورت ہے ورنہ بدون مواظبت کے تو اس عمل کی وہ مثال ہوگی جیسے ایک طالب علم نے

ایک گانوں کے سب بے نمازیوں کو نمازی بنا دیا تھا قصہ یہ ہوا کہ اس طالب علم نے گانوں میں جاکر وعظ کہا اور بے نمازیوں کی مذمت کی اور انکو سور سے بدتر کہا واعظ کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ بلاضرورت خشن گفتگو نکرے اور ضرورت سے ہو تو جائز ہے جیسے میں نے ابھی لیڈروں کو ضال ومضل کہا تھا کیونکہ انھوں نے علماء کو برا بھلا کہا ہے اور اسمیں اہل اسلام کا ضرر ہے مگر حضرات علماء نے اس بارہ میں بہت احتیاط کی ہے کہ وہ انکو بھی برا نہیں کہتے اور ان سے زیادہ صوفیہ نے احتیاط کی ہے کہ صوفیہ تو اجماعی برے کو بھی برا نہیں کہتے چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے یزید کے بارہ میں سوال کیا کہ یزید کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں۔ فرمایا شاء بہت اچھا تھا مگر کسی نے ان سے یہ سوال نہیں کیا کہ شیطان کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں سو اسمیں انکی وکالت میں کرتا ہوں کہ مظہر مضل اعلیٰ درجہ کا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہادی ہے اسکے مظاہر تو حضرات انبیاء ہیں اور سب سے اکمل ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور ایک صفت مضل بھی ہے اس کا مظہر کامل شیطان ہے اور خدا کی صفت اضلال کا مظہر ہونا بھی ایک صفت کمال گو نقص ہی کا کمال ہے اسی طرح حضرت رابعہ بصریہ کے سامنے بعض زاہدین دنیا کی مذمت کر رہے تھے فرمایا قوموا عنی فانکم تحبون الدنیا انکو دنیا کی مذمت بھی ناگوار تھی اس لئے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ کہ تمکو دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے۔ اہل مجلس نے کہا کہ ہم تو اسکی مذمت کر رہے ہیں پھر محب کدھر سے ہوئے فرمایا من احب شیئاً اکثر ذکرہ کہ تذکرہ بھی محبت کی دلیل ہے یہ ایک مجمل کلام ہے ایک مجذوبہ کا جسکی شرح کی ضرورت ہے میں نے ثواب کیلئے ان دیوانوں کی وکالت اختیار کی ہے اسلئے میں اسکی شرح کرتا ہوں کہ ذکر مذمت بھی بعض دفعہ عظمت کی دلیل ہوتا ہے دیکھو اگر ایک چمار سے تمھارا مقابلہ ہوا اور غلبہ تم ہی کو حاصل ہوا ہو جب بھی تم اسکے تذکرہ سے شرماتے ہو اور اگر کسی جرنیل سے مقابلہ ہوا ہو اور تم غالب آگئے ہو تو اسکو ہر جلسہ میں ذکر کرتے ہو اسکی وجہ صرف یہی ہے کہ چمار کی تمھارے قلب میں عظمت نہیں اسلئے مذمت کے ساتھ بھی اس کا ذکر نہیں کرتے اور جرنیل کی عظمت ہے اسلئے اس کا ذکر کرتے ہو تو دنیا کا ذکر مذمت بھی ہمیشہ خیر نہیں بلکہ کبھی عظمت سے ناشی ہوتا ہے یعنی ایسی عظیم الشان چیز سے ہم رغبت نہیں رکھتے سو حضرت رابعہ کو قرائن سے معلوم ہو گیا کہ انکا

(باقی آئندہ)

ذکر دنیا گو مذمت کیساتھ ہے مگر عظمت سے ناشی ہے کیونکہ ان کا مقصود اس مذمت سے مخاطبین کے دلوں سے عظمت دنیا نکالنا نہ تھا کیونکہ مخاطب سب زاہد تھے بلکہ صرف اپنا کمال ظاہر کرنا تھا کہ ہمنے دنیا پر لات ماردی ہے اور حضرات انبیاء کے کلام میں جو دنیا کی مذمت وارد ہے وہ عظمت سے ناشی نہیں کیونکہ اُن کا مقصود مخاطبین کے قلوب سے اسکی عظمت و محبت نکالنا ہے لیجئے باولی کا کلام بھی راولا ہو گیا۔ مگر میں ہر جگہ ان باولوں کی وکالت نہیں کرتا صرف ضرورت کے موقعہ پر کرتا ہوں اور جہاں ضرورت نہو وہاں وکالت نہیں کرتا مثلاً حضرت رابعہ ایک دفعہ حج کو تشریف لیگئیں اور حج سے فارغ ہو کر دعا کی کہ اے اللہ! مجھے اجر دیجئے اور آپکو اجر دینا ہوگا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو میرا حج قبول ہو گیا ہے تو اسی صورت میں تو حج مبرور پر اجر کا وعدہ آپنے فرمایا ہی ہے یا قبول نہیں ہوا تو یہ بہت بڑی مصیبت ہے کہ محبوب کے در سے محروم جاوں ؎

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم — ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

اور مصیبت پر بھی آپکا وعدہ ہے کہ مصیبت زدوں کو ثواب دیا جائے گا پس میرا ثواب ہر حال میں ثابت ہو گیا۔ تو اس کلام پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر جہنمی بھی اس مقدمہ سے ثواب کا استحقاق ثابت کرنے لگیں گے کہ ہم سے زیادہ مصیبت میں کون ہے اور اہل مصیبت[ف] کیلئے اجر کا وعدہ ہے تو ہمکو بھی ثواب دیا جائے مگر یہاں میں وکالت نہیں کرتا کیونکہ مقصود تنگ ہے سو ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح دل چاہے مانگے خواہ ناز کے طریقہ سے مانگے یا نیاز کے طریقہ سے میں یہ کہہ رہا تھا کہ صوفیہ نے تو بُروں کو بھی بُرا نہیں کہا کیونکہ اُنکو محبوب کی یاد سے ہی فرصت نہیں کہ اغیار میں مشغول ہوں۔ ایک عارف نے کسی صوفی کو ایک جاہل سے جھگڑا کرتے دیکھا تو کہا ؎

گر ایں مدعی دوست بشناختے، — بہ پیکار دشمن نہ پرداختے،

[ف] اگر حضرت رابعہ کے کلام میں اہل مصیبت کو مسلم مبتلی کیساتھ خاص کیا جائے تو یہ اشکال نہو گا اور مصیبت پر اجر کا وعدہ مسلمانوں ہی سے ہے نہ کفار سے ۱۲ ظ۔ مگر خود وہ وعدہ ہر مصیبت پر نہیں مصیبت غیر اختیاریہ پر ہے اور رد عمل مصیبت اختیاریہ ہی جیسے خودکشی مصیبت ہے مگر اسپر بجائے اجر کے عقوبت ہوگی کیونکہ وہ مصیبت مکتسبہ ہے اسطرح کسی عمل کا قبول نہونا کسی اختیاری کوتاہی کے سبب ہے ۱۲ اشرف علی

کاندہلہ میں ایکبار مولویوں کے مجمع میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کافر کو کافر کہنا کیسا ہے ایک جماعت یہ کہہ رہی تھی کہ تہذیب کے خلاف ہے اور ایک جماعت کہہ رہی تھی کہ جائز ہے کیونکہ قرآن میں بکثرت کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے پہلی جماعت نے اس کا یہ جواب دیا کہ قرآن میں خطاب کے موقعہ میں کافروں کو کافر نہیں کہا گیا (بلکہ یاایہا الناس سے خطاب کیا گیا ہے) اور گفتگو اسمیں ہے کہ کافر کو کافر کہکر خطاب کرنا کیسا ہے پھر ایک مولوی صاحب کو حکم بنایا گیا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں خطاب کے موقعہ پر بھی کافروں کو کافر کہا گیا ہے۔ قل یاایہا الکافرون لا اعبد ما تعبدون۔ مگر میں اس محاکمہ کا بھی محاکمہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کفار کو کافر کہکر بلاضرورت خطاب نہیں کیا گیا اور جہاں اس لفظ سے خطاب کیا گیا ہے وہاں ضرورت تھی وہ یہ کہ ان ظالموں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک بیڈھنگی درخواست کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کر لیا کریں ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کر لیا کرینگے اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی کہ ان سے فرما دیجئے کہ اے کافرو! میں تمھارے معبودوں کی پرستش نکرونگا نہ تم میرے معبود کی عبادت کروگے نہ اب نہ آئندہ تو یہاں ان لوگوں کی امیدیں قطع کرنے کیلئے سختی کیساتھ کافر کہکر انکو خطاب کیا گیا ہے باقی آیات میں اس لفظ سے خطاب نہیں کیا گیا کیونکہ ضرورت نتھی پس فیصلہ یہ ہوا کہ خشن خطاب بلاضرورت نکرنا چاہیئے ہاں ضرورت سے ہو تو جائز ہے۔ ایک بات استطراداً یہاں اور سمجھنے کی وہ یہ کہ اس سورت کی متعلق بعض لوگوں نے ایک غلطی کی ہے کہ لکم دینکم ولی دین کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ تمھارے واسطے تمھارا دین ہے ہمارے واسطے ہمارا دین ہے۔ اور یہ تفسیر کرکے اسی آیت کے حکم کو باقی بھی سمجھا ہے چنانچہ بعض صوفیہ نے اسی کو اپنا معمول بنالیا اور صلح کل اپنا مذہب بنالیا کہ موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود کسی سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں مگر یہ استدلال اسلئے غلط ہے کہ اول تو یہاں دین بمعنی مذہب ہونا مسلم نہیں بلکہ بمعنی جزا ہونا محتمل ہے یعنی جیسا تم کروگے ویسا بھروگے پس لکم دینکم ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہتے ہیں کما تدین تدان اور اس صورت میں منسوخ ماننے کی بھی ضرورت نہ ہوگی اور اگر یہی تفسیر کیجاوے تو اس صورت میں یہ آیت منسوخ ہوگی حال اس سے صلح کل کی تائید

نہیں ہوتی ہے۔ اب تو آپکو معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن سے استدلال بدون معرفت عربیہ کے جائز نہیں ہے اسکے لئے محض ترجمہ ڈپٹیہ مہارت علوم شرعیہ پڑھ لینا کافی نہیں ۵

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند — نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریکتر زمو ایں جاست — نہ ہر کہ سر تبراشد قلندری داند

لوگ اس ترجمہ کی زبان کی تعریف کرتے ہیں مگر زبان بھی کچھ عمدہ نہیں چنانچہ یجمھون کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ٹامک ٹوئیاں مار کر بن فصحاء دہلی و لکھنؤ کی زبان سے ٹامک ٹوئیاں کبھی نہیں سنا گیا یہ محض بازاری زبان ہے اسی طرح انا ذھبنا نستبق کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہم کبڈی کھیل رہے تھے یہ بالکل غلط تفسیر ہے کیونکہ استباق کے معنی باہم دوڑنے کے ہیں کہ ایک شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرے اور کبڈی میں ایسا نہیں ہوتا دوسرے کبڈی کا لفظ فصیح بھی نہیں تیسرے کبڈی میں موضع لعب سے غیبت نہیں ہوتی پھر یہ برادران یوسف کا عذر کیونکر بن سکتا ہے بلکہ عذر کے موقع ...... پر وہ بھی کہسکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلنے کیلئے دوڑ رہے تھے اور یوسف علیہ السلام سامان پر تھے ہماری نگاہ سے وہ اوجھل ہوگئے کہ بھیڑیا کھا گیا اور ہمکو خبر نہوئی۔ بہرحال کبڈی کے ساتھ تفسیر کرنا عقل کے بھی خلاف لغت کے بھی خلاف فصاحت کے بھی خلاف ہے مگر لوگ ہیں کہ اس ترجمہ پر لٹو ہیں۔ بہرحال اس صورت میں ضرورت کی وجہ سے کفار کو کفار کہا گیا ہے ورنہ بلاضرورت مخاطب کو سخت الفاظ سے خطاب کرنا ممنوع ہے توان مولوی صاحب نے دیہات کے بے نمازیوں کو بلاضرورت سور اور کتا بتایا تھا اسپر وہ بگڑ گئے اور ان پر مارنے کو چڑھ آئے میزبان نے یہ رنگ دیکھکر مولوی صاحب کو اطلاع کی پوچھا آخر میں نے کیا قصور کیا کہا تمنے بے نمازیوں کو سور اور کتا کہا ہے کہا پھر تمکو تو نہیں کہا دیہاتی بولے کہ ہم بھی تو بے نمازی ہیں کہا تم کدھر سے بے نمازی ہو گئے تم نے کبھی عید بقرعید کی بھی نماز نہیں پڑھی گانوں والوں نے کہا ہاں عید بقرعید کی تو پڑھ لیتے ہیں کہا پھر تم تو نمازی ہو اب کیا تھا اب خوش ہوگئے اور لگے دعوتیں کرنے تو بدون مواظبت کے جو عمل ہوگا وہ تو ایسا ہوگا جیسا یہ دیہات والے نمازی تھے تو کیا ان کو کوئی نمازی کہسکتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح بدون مواظبت ذکر کے آدمی ذاکر نہیں ہوسکتا

بدون مواظبت صبر کے صابر نہیں ہو سکتا وعلی ہذا القیاس مگر مداومت و مواظبت کی یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر وقت اسی میں لگا رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو وقت جس عمل کا مقرر ہے اسوقت میں وہ عمل بجالائے ورنہ نماز پر مواظبت دشوار ہو جاوے گی کیونکہ نماز ہر وقت جائز نہیں اور یہی غلطی بعض صوفیہ کو پیش آئی ہے کہ وہ صورت صلوٰۃ کی ضرورت کے منکر ہو گئے اور دلیل یہ بیان کی کہ سورۂ معارج میں ہے والذین ہم علی صلوتہم دائمون اور صورت صلوٰۃ کا دوام ہو نہیں سکتا اس سے معلوم ہوا کہ مراد روح صلوٰۃ ہے جسپر دوام ہو سکتا ہے مگر دلیل غلط ہے کیونکہ انھوں نے دوام کے معنی نہیں سمجھے اسکو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھو حضور کا ارشاد ہے المرأ فی الصلوٰۃ ما دام ینتظر الصلوٰۃ فذلکم الرباط فذلکم الرباط یعنی نماز کے انتظار میں رہنا بھی حکما نماز ہی میں رہنا ہے جس شخص نے صبح کی نماز پڑھلی اور نیت یہ ہو کہ ظہر کی نماز بھی پڑھونگا وہ اسی وقت سے منتظر صلوٰۃ ہے۔ اسپر شاید کسی کو شبہ ہو کہ صبح کی نماز پڑھکر تو ہم بہت سے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں کوئی تجارت وزراعت میں مشغول ہوتا ہے کوئی کھانے پکانے کے سامان میں اور قاعدہ ہے النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد کہ نفس ایک آن میں دو طرف توجہ نہیں کر سکتا تو صبح سے ظہر تک انتظار کا تحقق کہاں ہوا جبکہ درمیان میں بہت سا وقت اس حالت میں گذرا ہے کہ ظہر کی کی نماز کا خیال بھی نہیں آیا اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف توجہ محال نہیں یعنی محال عقلی نہیں گو مستبعد ہو مگر آجکل یہ بھی ایک حماقت ہے کہ محال عادی کو محال عقلی سمجھتے ہیں۔ رامپور میں ایک صاحب سے معراج کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی وہ کہنے لگے کہ معراج کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا یہ تو محال ہے میں نے کہا آپ اسکے استحالہ پر دلیل قائم کیجئے کہنے لگے اسکی کوئی نظیر نہیں ملتی میں نے کہا عدم نظیر سے استحالہ پر استدلال نہیں ہو سکتا بہت سے بہت عدم وقوع پر استدلال ہوگا اور عدم وقوع سے استحالہ ثابت نہیں ہو سکتا اور اگر نظیر بتلادی جائے تو وہ بھی ایک واقعہ ہوگا اگر وہ محتاج دلیل نہیں تو معراج ہی کے واقعہ کو بلا دلیل مان لیجئے اور اگر وہ بھی محتاج دلیل ہے تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اسلئے نظیر کا مطالبہ فضول ہے۔ آجکل یہ بھی ایک غلطی ہے کہ نظیر کو دلیل سمجھتے ہیں لوگوں کو علم سے مس ہی نہیں رہا کہ دلیل کو تو

دلیل نہیں سمجھتے غیر دلیل کو دلیل کہتے ہیں چنانچہ میرے اس جواب پر وہ صاحب کہنے لگے کہ تسلی نہیں ہوئی میں نے کہا آپ کی تسلی تو جب ہو کہ میں یہاں سے اڑوں اور آپ کے سامنے آسمان پر جاؤں مگر شاید اسوقت بھی تسلی نہوتی بلکہ خود انکو معراج ہوتی تو تسلی ہوتی اور ممکن ہے اسوقت بھی تردد رہتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی بابت فرمایا ہے ولو فتحنا علیھم بابا من السماء فظلوا فیہ یعرجون لقالوا انما سکرت ابصارنا بل نحن قوم مسحورون ؁ کہ اگر یہ لوگ آسمان کے دروازوں میں بھی چڑھ جائیں جب بھی ان کو اپنے اوپر نظر بندی یا سحر کا شبہ ہوتا غرض مجھے اول تو اس قاعدہ ہی میں کلام ہے میں ایک آن میں دو طرف توجہ ہونے کو محال عقلی نہیں سمجھتا چنانچہ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی کی نسبت سنا گیا ہے کہ وہ ایک وقت میں تین کام کرتے تھے درس بھی دیتے شطرنج بھی کھیلتے اور تصنیف بھی کرتے رہتے حالت یہ تھی کہ جب تک طالب علم پڑھتا رہتا تصنیف کرتے رہتے اور اور اسی درمیان میں شطرنج کا مہرہ بھی بدلدیتے اور جب وہ عبارت سے فارغ ہوتا تصنیف بند کر کے اسکی تقریر کر دیتے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ یہ تو ایک آن میں تین کام نہوئے بلکہ ایک آن میں ایک کام ہوا تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ گو ظہور عمل کا جدا آن میں ہوا مگر یہ کام ایسے ہیں کہ ایک آن کی توجہ میں نہیں ہو سکتے اسلئے لازم ہے کہ ان کی توجہ تینوں کاموں پر ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور یہ محال کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نماز کے اندر دکان کا حساب بھی کرتے ہیں تو جیسے یہ ہو سکتا ہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ تجارت کی حالت میں آپ نماز میں لگے رہیں چنانچہ ارشاد ہے رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ آپکو نماز تجارت سے مشغول نہیں کرتی انکو تجارت نماز اور ذکر اللہ سے مشغول نہیں کرتی۔ مگر شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو وہ کر سکتا ہے جو ایسا ذاکر شاغل ہو کہ ذکر اللہ اسکے دل میں سرایت کر گیا ہو عوام سے تو ایسا نہیں ہو سکتا گویا ان کے نزدیک عوام انتظار صلوٰۃ سے اور دوام فی الصلوٰۃ کی فضیلت سے محروم ہیں مگر یہ دعویٰ بلا دلیل ہے الحمد للہ اس اشکال کو رفع کرنا اللہ تعالیٰ نے مجھے سمجھا دیا وہ اسطرح کہ اول یہ مقدمہ سمجھ لو کہ ایمان ہر وقت فرض ہے اور مومن ہر وقت مومن ہے اسکی کوئی ساعت ایمان سے خالی نہیں

حالانکہ ایمان کی حقیقت تصدیق بالقلب ہے اب اگر دوام ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس تصدیق کا ہر وقت استحضار رہے تو ظاہر ہے کہ ہر وقت اس کا استحضار نہیں ہوتا معلوم ہوا کہ دوام کے کوئی اور معنی بھی ہیں پس سمجھو کہ دوام ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ایک بار تصدیق کا استحضار کرکے پھر اسکی ضد کا استحضار نہو جب تک ضد کا استحضار نہو گا اسوقت تک اس استحضار کو باقی سمجھا جائیگا اور یہ شخص ہر ساعت میں مومن ہے۔ یہ تو شرعی مثال ہے جس سے دوام کے یہ معنی معلوم ہوئے اور محسوسات میں بھی اسکی چند مثالیں ہیں مثلاً مشی فعل اختیاری ہے اور ہر قدم کا اٹھانا فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری مسبوق بالقصد ہوتا ہے مگر کیا ہر قدم پر قصد جدید ہوتا ہے ہرگز نہیں اگر ایسا ہو تو مشی دشوار ہو جائے لامحالہ یہی کہا جائیگا کہ ابتدا میں جو ایک بار قصد کیا ہے وہی اخیر تک مستمر ہے علی ہذا ستار بجانیوالے کا ہر نقرہ فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری مسبوق بالقصد ہے مگر یہاں بھی ہر نقرہ پر قصد جدید نہیں ہو سکتا ورنہ ستار بجانا دشوار ہو جائے اور یقیناً خراب بجیگا پس یہاں بھی یہی کہا جائیگا کہ ایک ہی قصد اخیر تک مستمر ہے غرض شرعیات سے اور محسوسات سے ہر طریقہ سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ ایک ہی قصد مستمر ہو سکتا ہے اب سمجھئے کہ جس شخص نے صبح کی نماز پڑھی ہے اور اسیوقت دل میں ارادہ ہے کہ ظہر بھی پڑھوں گا تو اس کا یہ قصد مستمر کیوں نہو گا گو درمیان میں استحضار نہ رہے اب صوفی صاحب سن لیں کہ دوام صلوٰۃ صورت صلوٰۃ میں بھی ہو سکتا ہے یعنی صلوٰۃ کی ساتھ خاص نہیں اب انصاف کیجئے کہ جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھکر اپنے کو مجتہد سمجھتے ہیں یہ انکی حماقت ہے یا نہیں اب تو آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ دین کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ؎

هزار نکته باریک‌تر ز مو اینجاست — نه هر که سر بتراشد قلندری داند

آجکل جو لیڈر دین کے رہنما بنے ہوئے ہیں انکی مثال ایسی ہے کہ ؎

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند — این چنین ارکان دولت ملک را ویران کنند

اور جو لوگ کام کے ہیں وہ حجرہ میں گمنام پڑے ہوئے ہیں اور خدا سے ان ظالموں کے ظلم کی جو وہ دین پر کر رہے ہیں فریاد کرتے ہیں ؎

پری نهفته رخ و دیو در کرشمه و ناز — بسوخت عقل ز حیرت که این چه بوالعجبیست

بعض لوگ ان حجرہ نشینوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی میدان میں نکلو حجرہ میں کیوں بیٹھے ہو مگر ان سے کوئی پوچھے کہ حجرہ والوں کو میدان میں آنے کون دیتا ہے ان سے کام کون لیتا ہے؟ اگر یہ میدان میں نکلیں گے تو شریعت کے اتباع کا حکم کریں گے جو آجکل لوگوں کے نزدیک تعصب اور تنگ خیالی ہے پھر تم خود ہی یہ کہوگے کہ یہ مولوی ہمارے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں ان کو حلال وحرام وجائز وناجائز ہی کی پڑی رہتی ہے۔ اب میدان میں نکلکر نہ ان سے میدان کا کام ہوگا نہ خلوت کا دونوں سے گئے گذرے ہوئے اس سے تو ان کا خلوت ہی میں رہنا اچھا۔ اور تمکو خبر بھی ہے جو لوگ میدان میں نکلے ہوئے ہیں وہ بھی ان حجرہ نشینوں ہی کی برکت سے کام کر رہے ہیں کیونکہ یہ حجرہ والے ہر وقت مسلمانوں کی کامیابی اور صلاح وفلاح کی دعا کرتے رہتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید + ہم بعون ہمت مردان رسید

صاحبو! دین کا سمجھنا ان لیڈروں کا کام نہیں ہے بلکہ یہ انہی لوگوں کا کام ہے جنھوں نے حجرہ میں بیٹھکر چراغوں کا دھواں پھانکا ہے اور پانی کی جگہ تیل پی لیا ہے بعض طلبہ کو اتفاق پیش آیا ہے کہ مذاق میں کسی نے انکو پانی کی جگہ تیل دیدیا اور وہ مطالعہ میں ایسے مصروف تھے کہ انکو اصلا اسکی خبر نہوئی۔ ایک طالب علم کی حکایت کتابوں میں لکھی ہے کہ ایک رات انکے گھر میں تیل نتھا بڑے پریشان ہوئے اتفاق سے بادشاہ کا جلوس سامنے سے گذرا جسکے ساتھ مشعلیں تھیں یہ انکے ساتھ ہو لئے اور کتاب ہاتھ میں لیکر مطالعہ کرتے چلے گئے یہانتک کہ جلوس محل شاہی میں داخل ہوا یہ بھی ساتھ ساتھ چلے گئے بادشاہ کی نظر ان پر پڑ گئی تھی اس نے خدام کو کہدیا تھا کہ انکو روکا نہ جائے یہانتک کہ جلوس خاص خلوت گاہ میں پہونچا یہ بھی وہیں پہونچ گئے اور برابر مطالعہ میں مشغول رہے بادشاہ انکو دیکھتا رہا مگر انکو کچھ خبر نہوئی جب مطالعہ سے فارغ ہوئے اور اپنے کو خاص خلوت گاہ شاہی میں دیکھا تو قرائن سے سمجھ گئے کہ میں شاہی محل کے اندر ہوں اب یہ ڈرنے لگے بادشاہ نے تسلی دی کہ ڈرو نہیں مجھے تم سے بہت محبت ہوگئی ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ تمھارے لئے کافی وظیفہ مقرر کردوں تاکہ تم فراغ قلب سے تحصیل علم میں مشغول رہو کہا حضور یہ تو جھگڑا ہے میں تنخواہ لینے وغیرہ کا پابند نہیں ہو سکتا کہ آزادی میں خلل پڑتا ہے واقعی ؎

آنکس کہ ترا شناخت جان را چہ کند　　فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

ہاں اگر آپ مجھے راحت دینا چاہتے ہیں تو کسی بنئے سے کہدیجئے کہ مجھے تیل دیدیا کرے
اور ماہوار آپکو حساب دکھلا کر تیل کے دام آپ سے لیلیا کرے مجھ سے کچھ نہ مانگا کرے چنانچہ
بادشاہ نے اُن کے واسطے تیل کا انتظام کر دیا۔ تو تحقیق احکام اور تدقیق ان علماء کا کام ہے
لیڈروں کا کام نہیں غضب یہ کہ لیڈر علماء کا کلام بھی تو نقل نہیں کرتے بلکہ اپنا کلام بیان
کرتے ہیں اور اپنے کلام سے علماء کے کلام کو رد کرتے ہیں حالانکہ وہ اس بات کی بھی لیاقت
نہیں رکھتے کہ علماء کے کلام کو سمجھ بھی سکیں اسپر ان کا حوصلہ یہ ہے کہ علماء کو میدان میں
نکلنے کی تاکید کرتے اور اُنکو اپنی تقلید پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ صاحبو! میرے نزدیک تو اسوقت
میدان میں نکلنے کا وقت نہیں کیونکہ حدیث میں ہے اذا رأیت شحا مطاعا و دنیا مؤثرۃ
وھوے متبعا واعجاب کل ذی رأی برأیہ فعلیك بخاصۃ نفسك
ودع عنك امر العامۃ اور میرے نزدیک آجکل یہ سب علامات موجود ہیں اسلئے آجکل گوشہ
نشینی لازم ہے مگر میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا اگر کسی عالی ہمت کے نزدیک ابھی ان علامات
کے ظہور کا وقت ہو تو بسم اللہ وہ میدان میں نکلیں مگر ایا ہجوں کو کیوں اپنے ساتھ کھینچتے ہیں
آخر ایک کام یہ بھی تو ہے کہ خدا سے دعا کریں توانکو اس کام کے واسطے رہنے دیں ایک جماعت
اسکے واسطے بھی تو ہونا چاہیئے یہ تقسیم عمل اچھی ہے مگر افسوس آجکل دعا کو لوگ عمل ہی نہیں سمجھتے
اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں یہ گفتگو درمیان میں اس بات پر آگئی تھی کہ میں نے دوام عمل
کے معنی کی تحقیق کر کے عرض کیا تھا کہ یہ علوم محض ترجمہ قرآن پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے
جیسا آجکل بعض لوگ اسی قدر علم سے اجتہاد کا دعوی کرتے ہیں بہرحال یہاں صبر و مصابرۃ
و مرابطت کا امر ہے اور تقوی اسکی تکمیل ہے۔ صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ما تکرہ
یعنی نفس کو ناگوار امور پر جمانا اور مصابرت کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے
ناگوار امور پر نفس کو ثابت قدم رکھنا اور مرابطت کے معنی یہ ہیں کہ صبر و مصابرت پر مواظبت
کیجائے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ عمل ان سب میں مشترک ہے مطلب یہ ہوا کہ
عمل میں مستعد رہو اور اسی میں برابر لگے رہو اب بعض اعمال تو ابتدائی کرنیکے ہیں جیسے نماز روزہ

زکوٰۃ وغیرہ انکو دیانات کہا جاتا ہے ان پر جمنا تو صبر ہے۔ اور بعض اعمال میں دوسروں سے
واسطہ ہے جیسے نکاح و بیع و جہاد وغیرہ یہ معاملات ہیں ان میں احکام شرعیہ پر جما رہنا مصابرۃ
ہے۔ پھر دیانات میں تو صبر سہل ہے کیونکہ ان میں حظ نفس بھی ہے زکوٰۃ میں حظ یہ ہے کہ دوسروں
پر احسان ہے حج میں حظ یہ ہے کہ سیر و تفریح ہوتی ہے (نماز میں حظ یہ ہے کہ اس سے دل میں
نور پیدا ہوتا ہے جو موجب راحت ہے، روزہ میں طبیعت ہلکی ہلکی رہتی ہے اس سے بھی راحت
حاصل ہوتی ہے ۱۲) مگر معاملات میں صبر دشوار ہے اسلئے وہاں بھی صاف طور سے مصابرت
کا امر کیا گیا کہ نفس کو معاملات میں بھی شریعت کے موافق عمل کرنے پر مجبور کرو۔ اور یہ حکم صبر و
مصابرت اعمال باطنیہ کو بھی شامل ہے کیونکہ وہ بھی اعمال کی ایک قسم ہیں عمل کہتے ہیں فعل
اختیاری کو اسلئے اعمال باطنیہ بھی عمل میں داخل ہیں چنانچہ ایمان کو نصوص میں عمل کہا گیا ہے
پھر جسطرح نماز روزہ کا شریعت میں امر ہے اسی طرح محبت، شکر وغیرہ کا امر ہے اور جیسے چوری زنا
وغیرہ سے منع کیا گیا ہے اسی طرح ریا و حسد و کبر سے ممانعت ہے۔ پھر جسطرح اعمال ظاہرہ میں بعض
اعمال اپنے متعلق ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے اسی طرح اعمال باطنہ بھی دو قسم کے ہیں
بعض اپنے کرنے کے ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے پس وہاں بھی صبر و مصابرت
دونوں کا امر ہے بلکہ اعمال باطن میں صبر و مصابرت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ باطن میں
بعض دفعہ ایسے مصائب و مصاعب پیش آتے ہیں جنکا تحمل اہل ظاہر ہرگز نہیں کر سکتے بعض دفعہ
قبض میں سالک یوں سمجھتا ہے کہ فرعون مجھ سے افضل ہے گو وہ کافر تھا مگر اسکو تو ایک دفعہ
لا الٰہ الا اللہ کہنے سے نجات ہو جاتی اور مجھے ہزار دفعہ بھی لا الٰہ الا اللہ کہنے سے اس
مصیبت سے نجات نہیں ہوتی چنانچہ بعض نے اس حالت میں خودکشی بھی کر لی ہے ان کو
مستہلکین کہا جاتا ہے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا
انکو عذاب ہوگا۔ فرمایا جا ظالم! وہ تو خدا کی محبت میں شمشیر عشق سے جان دے رہا ہے اور تجھے
فتوے کی سوجھی ہے اس شعر میں اسی کا فیصلہ ہے ؎

گر خطا گوید ورا خاطی مگو — ور شود پر خون شہید او را مشو

خون شہیداں را ز آب اولیٰ ترست — ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

۹

اس حالت میں جو شخص خودکشی سے مرجائے معذور ہے گو ماجور نہیں مگر ماذور بھی نہیں یہ تین لفظ بھی میں نے مقفی اختیار کئے ہیں تین حالات کے اعتبار سے۔ یعنی اگر کوئی شخص حدود شرعیہ سے باختیار خود نکلے وہ تو ماذور ہے (گنہگار ہے) اگر بلا اختیار نکلے معذور ہے اگر حدود کے اندر ہے ماجور ہے (اسکو ثواب ملیگا ترقی ہوگی) باطن کے مصاعب میں سے ایک یہ صورت بھی ہے کہ ایک سالک کو اثنار ذکر میں آواز آئی۔ جو چاہے کر تو تو کافر ہو کر مریگا،، اس آواز سے وہ سہم گیا شیخ کے پاس گیا اور سارا حال عرض کیا سبحان اللہ شیخ بھی کیسی دولت ہے جسکو میسر ہو فرمایا گھبراؤ نہیں یہ دشنام محبت ہے محبوبوں کی عادت ہے کہ عشاق کو یوں ہی تنگ کیا کرتے ہیں۔ اسپر سوال ہوتا ہے کہ کیا یہ بات جھوٹ تھی اگر ایسا ہے تو معاذ اللہ حضرت حق کی طرف کذب کی نسبت لازم آتی ہے علمار ظاہر تو امکان کذب ہی میں آج تک لڑ رہے ہیں یہیں تو وقوع کذب لازم آگیا اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کذب نہیں کیونکہ کافر باصطلاح صوفیہ بمعنی فانی ہے خسرو فرماتے ہیں ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

اے فانی عشقم تو اس غیبی آواز کا مطلب یہ ہوا کہ جو چاہے عمل کر تو فانی ہو کر ہی مرے گا ایسا یہ کلام ایسا ہو گیا جیسا حدیث میں آیا ہے لعل اللہ اطلع الی اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم۔ اور صوفیہ نے یہ اصطلاح لغت سے لی ہے کیونکہ لغت میں کفر معنی ستر ہے اور فانی بھی اپنی ہستی کا ساتر ہے صوفیہ کی اصطلاحات کہیں لغت سے ماخوذ ہیں کہیں عرف عام سے کہیں فلسفہ سے کہیں علم کلام سے کہیں کسی اور فن سے اور یہ خلط مبحث انھوں نے اسلئے کیا ہے تاکہ اسرار پر پردہ پڑا رہے نااہل تک نہ پہونچ جائیں کیونکہ ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اسی لئے ان علوم و اسرار کو بر سر منبر بیان کرنے کی ممانعت ہے یعنی بلا ضرورت بیان نکرے اور میں اسوقت ضرورت سے بیان کر رہا ہوں۔ غرض یہ غیبی صدا صوفیہ کی اصطلاح میں تھی عام اصطلاح میں نتھی اور یہ عنوان مزاح کیلئے اختیار کیا گیا تاکہ ذرا تھوڑی دیر کو عاشق پریشان ہو جائے۔ اور مزاح حدیث سے بھی ثابت ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے

بھی بعض دفعہ مزاح فرمایا ہے چنانچہ ایک بڑھیا نے حضور سے دعا کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہونچا دے حضور نے فرمایا لا تدخل العجوز الجنۃ کہ بوڑھی عورت جنت میں نہ جاوے گی وہ لگی رونے تب آپ نے یہ آیت پڑھی انا انشأناھن انشاءً فجعلناھن ابکارا عربا اترابا لاصحاب الیمین مطلب یہ تھا کہ بوڑھی عورت بڑھیا ہو کر جنت میں نہ جائے گی بلکہ جوان ہو کر جائے گی۔ ایکبار حضرت ابوذرؓ نے ایک مسئلہ کے متعلق بار بار سوال کیا آپ نے ہر دفعہ جواب دیا پھر اخیر میں فرمایا وان رغم انف ابی ذر کہ ہاں یہی جواب ہے اگرچہ ابوذر کی ناک رگڑ جائے یہ مزاح ہی تو تھا گو بظاہر عتاب تھا مگر عاشق کو اسمیں ایسا لطف آتا ہے کہ حضرت ابوذر جب اس حدیث کو بیان کرتے تو اخیر میں یہ بھی کہتے وان رغم انف ابی ذر وان رغم انف ابی ذر کیونکہ ان کو اسمیں حظ آتا تھا حضرت شیخ ابو المعالی رح کا ایک مرید حج کو گیا تو آپ نے اسکے ہاتھ روضۂ اقدس پر سلام کہلا کر بھیجا جب مرید نے شیخ کا سلام پہونچایا تو روضۂ اقدس سے آواز آئی اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہدینا۔ شیخ کو یہ واقعہ مکشوف ہو گیا مگر جب مرید واپس آیا تو آپ نے پوچھا کہو تم نے ہمارا سلام پہونچایا تھا کہا ہاں حضور پہونچا دیا تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی آپکو سلام فرمایا ہے۔ فرمایا انہی لفظوں سے کہو جو حضور نے فرمائے ہیں کہا جب آپکو وہ الفاظ معلوم ہیں تو مجھے آپ کیوں بے ادب بناتے ہیں فرمایا اسمیں بے ادبی کیسی اسوقت تمھاری زبان سے وہ الفاظ ادا نہوں گے بلکہ تمھاری زبان حضور کی زبان ہوگی تم تو محض سفیر ہو غرض اس نے وہی الفاظ کہے کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہنا،، یہ سنتے ہی شیخ پر وجد طاری ہو گیا اور یہ شعر پڑھا ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی ۔۔۔ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

یہی راز تھا حضرت ابوذر کے بار بار وان رغم انف ابی ذر کہنے میں ایک بزرگ فرماتے ہیں اگر یکبار بگوید بندۂ من + از عرش بگذرد خندۂ من۔ (وہ اگر کہدے مجھے اپنا غلام + سب سے پیارا نام ہو میرا یہی ۱۲) بلکہ حدیث سے حق تعالیٰ کا مزاح فرمانا بھی ثابت ہے کہ جہنم سے جو مسلمان نکالے جائیں گے انکا لقب جہنمین ہوگا کیونکہ انکو اسی میں

خط ہوگا جسکی مثال اوپر گذر چکی ہے انمیں ایک شخص جو سب سے اخیر میں نکالا جائیگا۔ حق تعالیٰ
اُس سے فرمائیں گے کہ مانگ کیا مانگتا ہے وہ عرض کریگا کہ میرا منہ جہنم کی طرف سے پھیر دیا جاوے
حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ بس اس کے بعد تو کچھ نہ مانگے گا وہ کہے گا نہیں اور کچھ نہ مانگونگا چنانچہ
جہنم کی طرف سے اُس کا منہ پھیر دیا جائیگا اُسوقت اُسکو جنت کا ایک درخت نظر آئیگا عرض
کریگا اس درخت کے نیچے مجھکو پہونچا دے۔ ارشاد ہوگا کہ تونے تو ابھی وعدہ کیا تھا کہ اور کچھ
نہ مانگوں گا وہ معذرت کرنے لگا کہ بس یہ درخواست اور پوری کر دیجئے پھر کچھ نہ مانگونگا غرض
اسی طرح رفتہ رفتہ وہ جنت میں پہونچ جائیگا تو یہ بھی مزاح ہی ہے نہ مقصود تو اُسکو جنت میں
پہونچانا تھا مگر اس طرح رگڑ رگڑ کر پہونچایا جائیگا لہذا اب اس حکایت پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ
مزاح کا ثبوت احادیث میں بھی ہے دوسرے ہم یہ بھی کہسکتے ہیں کہ کافر سے مراد صدائے غیبی میں
کافر باللہ نہیں بلکہ کافر بالطاغوت ہے اور یہ استعمال نص میں بھی وارد ہے فمن یکفر
بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی۔ غرض باطن میں ایسے
ایسے مصائب و مصاعب پیش آتے ہیں کہ اگر امداد نہو تو انسان تو انسان پہاڑ بھی پاش
پاش ہو جائے وحی میں اسقدر ثقل تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لو انزلنا ھذا القرآن علی
جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ گو انبیاء کے ساتھ حق تعالیٰ کی امداد
ہوتی ہے وہ اسکے متحمل ہوتے ہیں چنانچہ جسکا نزول پہاڑ کو پاش پاش کر دیتا اُسکا نزول
حضور کے قلب پر ہوتا ہے اور وہ ثابت رہتا ہے چنانچہ ارشاد ہے قل من کان عدوا لجبریل
فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے
کہ نزول قرآن حضور کے قلب پر ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ قلب معانی کا ادراک کرتا ہے اور الفاظ
کا ادراک سمع کو ہوتا ہے پس اس سے لازم آتا ہے کہ منزل من اللہ صرف معانی ہوں الفاظ منزل
من اللہ نہ ہوں اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے بہت معانی کا منزل ہونا
معلوم ہوا الفاظ کا منزل نہونا کیسے معلوم ہوا کیونکہ عدم ذکر دلیل ذکر عدم نہیں ہے آگے منزل
ہونا دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے مثلاً انا انزلناہ قرآنا عربیا اور عربی ہونا صفت
الفاظ ہی کی ہے مگر اس جواب سے عوام کو شفا نہیں ہوتی۔ دوسرا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب

دیا ہے اور یہ جواب انکے سوا کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا وہ فرماتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ زبان داں
کو اپنی مادری زبان میں گفتگو سنتے ہوے اول التفات معانی کی طرف ہوتا ہے اور الفاظ کیطرف
بعد میں التفات ہوتا ہے اور غیر مادری زبان میں اول التفات الفاظ کی طرف ہوتا ہے ثانیاً معانی
کی طرف ۔ جیسا آپ لوگ اسوقت میرا بیان سن رہے ہیں چونکہ میں آپکی مادری زبان میں بول رہا
ہوں اسلئے معانی کی طرف آپکا اول التفات ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف اگر ہوتا ہے تو ثانیاً پس
قرآن مجید چونکہ آپ کے زبان میں ہے اسلئے وحی کے اسماع کے وقت اول التفات آپکو معانی کیطرف
ہوتا تھا الفاظ کی طرف اس لحاظ سے قرآن کو منزل علی القلب کہدیا گیا ہے اس سے یہ لازم
نہیں آتا کہ الفاظ منزل نہیں اب میں وہ جملہ پھر دہراتا ہوں کہ فقط ترجمہ پڑھنے سے قرآن فہمی حاصل
نہیں ہو سکتی ذرا ترجمہ پڑھنے والے تو یہ علوم بیان کریں اور وہ تو ان اشکالات کو حل کریں یقیناً
اقرار کریں گے کہ یہ علوم انکو حاصل نہیں ہو سکتے اسی لئے میں یہ بہی کہا کرتا ہوں کہ بعض لوگوں کو
ترجمۂ قرآن دیکھنا حرام ہے ۔ کانپور میں ایک مؤذن میرے پاس قرآن کا ترجمہ لایا کہ آیت سے
تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں پیروں کا دہونا فرض نہیں بلکہ مسح کافی ہے کیونکہ ترجمہ میں فاغسلو
وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین کا ترجمہ یوں لکھا
تھا دہوؤ اپنے موہنوں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملو اپنے سرونکو اور پیرونکو ٹخنوں تک
تو اسکو یہ ترجمہ کہ ملو اپنے سرونکو اور پیروں کو دیکھکر شبہ ہوا کہ پیروں کا بہی ملنا فرض ہے دہونا
فرض نہیں ۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ اسکو کسطرح سمجھاؤں کہ ارجلکم کا عطف رؤسکم پر نہیں بلکہ
وجوھکم وایدیکم پر ہے کیونکہ وہ عطف معطوف کو کیا جانے تو میں نے اسکو دوسری طرح سمجھایا
کہ اس سے پوچھا تمکو قرآن کا کلام الٰہی ہونا کیسے معلوم ہوا کہا علماء کے کہنے سے میں نے کہا کیا
تیرے نزدیک علماء ایسے دیندار ہیں کہ جس کلام کو وہ اللہ کا کلام کہدیں تم اس کا یقین کر لوگے
کہا جی ہاں علماء دیندار نہوں گے تو اور کون ہوگا میں نے کہا کہ پھر انہی علماء کا یہ قول بہی ہے
کہ وضو میں پیروں کا دہونا فرض ہے مسح جائز نہیں تو کیا وہ اس فتوے میں بے ایمان ہیں پس
انکی اس بات کو نہ ماننے کی کیا وجہ ۔ اور خبردار جو تمنے آئندہ ترجمہ دیکھا ۔ اس طرح ایک اہل مد
بوڑھے میاں مجھسے پوچھنے لگے کہ کیا قرآن پڑھتے ہوے راعنا نہ پڑھا کروں اس لفظ کو چھوڑ دیا

کروں۔ میں نے پوچھا یہ کیوں؟ کہا ترجمہ میں لکھا ہے کہ اے ایمان والو! راعنا مت کہو۔ وہ
اس کا یہ مطلب سمجھی کہ تلاوت کے وقت بھی نہ کہو۔ میں نے کہا کہ تلاوت کے وقت راعنا
ضرور کہو اور تمکو ترجمہ کا دیکھنا حرام ہے بس تم اہل مدہو اپنی مددوں کا حساب کیا کرو۔ اور یہ میں
جو ایسے لوگوں کیلئے ترجمہ دیکھنا حرام کہتا ہوں تو اسمیں ترجمہ قرآن کی (معاذاللہ) توہین نہیں
بلکہ مقصود ان لوگوں کی اہانت ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ
حسین عورت کا دیکھنا نامحرم کو حرام ہے تو کیا اس سے حسین عورتوں کی توہین ہوگئی؟ جنمیں
حضرت عائشہؓ اور حضرت سارہ اور حضرت رابعہ بھی داخل ہیں تو کیا کوئی اس جملہ سے ان بزرگ
عورتوں کی توہین نکال سکتا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہی کہا جائیگا کہ مقصود ان ناظرین کے دین کی
حفاظت ہے اسی طرح یہاں سمجھو نیز اگر یوں کہا جائے کہ آشوب چشم والیکو آفتاب کی طرف
دیکھنا حرام ہے کیونکہ اندھا ہونیکا اندیشہ ہے تو کیا اس سے آفتاب کی توہین مفہوم ہو سکتی ہے
ہرگز نہیں۔ اگر بریلوی اس جملہ کو سن لیں تو شاید کفر کا فتوی فوراً لگا دیں کیونکہ انکے یہاں تکفیر
کیلئے اسکی بھی ضرورت نہیں کہ معنی کفر کا قصد کیا جائے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ اس سے کفر لازم آسکتا
ہے اسلئے متکلم کافر ہے گو وہ معنی جو انھوں نے سمجھے متکلم کے باپ دادوں نے بھی نہ سمجھے ہوں کر
انکی تکفیر کی ایسی مثال ہے جیسے کانے نے سامنے سے ایک شخص کو آتا ہوا دیکھکر دور ہی سے
کہنا شروع کیا تو حرامزادہ تیرا باپ حرامزادہ۔ اس نے کہا بھائی میں نے کیا قصور کیا جو مجھے حرامزادہ
بناتا ہے۔ کہا مثل مشہور ہے کانا حرامزادہ تو تمنے مجھے دیکھکر اپنے دل میں ضرور مجھے حرامزادہ
کہا ہوگا اسلئے میں نے بدلہ لیلیا۔ خواہ اس غریب نے کہا ہو یا نہ کہا ہو مگر انکو بدلہ لینا ضرور
یہی حال بریلی کے تکفیریوں کا ہے کہ اپنی طرف سے کلام کے ایک معنی تراش کر متکلم کی تکفیر کرنے
لگتے ہیں گو اسکے وہم میں بھی یہ معنی نہ آئے ہوں۔ مگر یہ تکفیر کا محکمہ ہمارے یہاں نہیں ہے۔ یہ انہیں
مبارک ہو۔ ہمارے بزرگ تو ایسے تھے کہ میں نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ایک صوفی کا
مقولہ جو ایک رسالہ میں تازہ دیکھا تھا بیان کیا کہ شیخ نے اس سے پوچھا تو خدا کو جانتا ہے کہا!
خدا کو کیا جانوں میں تو ایک جانتا ہوں،، یہ مقولہ بیان کرتا ہوں میں نے عرض کیا کہ حضرت
لوگ کیسے بیباک ہوتے ہیں کہ ایسا سخت کفر کا کلمہ کہدیا مولانا ہنسنے لگے اور فرمایا اسمیں کفر کی کیا

بات ہے۔ اچھا تم بتلاؤ کیا تم خدا کو جانتے ہو؟ بتلاؤ اللہ میاں کیسے ہیں بس یہ سوال کرنا تھا کہ میں حقیقت کو سمجھ گیا کہ صوفی کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت بلا واسطہ مجکو نہیں ہے بلکہ مجھے شیخ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی اس سے زیادہ میں نہیں جانتا تو دیکھئے مولانا نے ایسے سخت کلمہ کو کتنا ہلکا کر دیا یہ کلام ضمنی آگیا تھا اصل میں اسکو بیان کر رہا تھا کہ باطن میں بھی صبر و مصابرت کی ضرورت ہے کیونکہ اسمیں بڑے بڑے مصاعب واقع ہوتے ہیں اصبروا وصابروا میں اسی کا حکم ہے۔ اب یہاں ایک سوال محتمل ہے وہ یہ کہ مقصود بیان تو ضرورت عمل ہے اور آیت میں ضرورت صبر کا ذکر ہے تو یہ مقصود پر کیسے منطبق ہوگی جواب یہ ہے کہ یہ مقصود کی تمہید ہے اور مقصود رابطوا ہے جسکی ایک تفسیر عمل ہے جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے اب اسکے تمہید ہونے کو سمجھئے وہ یہ ہے کہ صبر ایک ایسا عمل ہے جسکے فوت ہونے سے ہمارے سب اعمال خراب ہو رہے ہیں چنانچہ نماز بھی اسی کے فوت ہونیسے گراں ہے ورنہ ظاہر میں نماز بالکل معمولی چیز معلوم ہوتی ہے مگر پھر بھی مشاہدہ ہے کہ وہ گراں ہے اور ایسی گراں ہے کہ حق تعالیٰ بھی اسکو گراں بتلا رہے ہیں وانہا لکبیرۃ جس چیز کو اللہ تعالیٰ گراں فرمائیں خود سمجھ لو وہ کیسی گراں ہوگی سو اس گرانی کی وجہ وہی عدم انصبہ ہے جسکو قرآن مجید میں اس عنوان سے ارشاد فرمایا ہے کہ الا علی الخشعین جس سے معلوم ہوا کہ نماز کی گرانی کا سبب ترک خشوع ہے۔ مگر اس دلالت کیلئے خشوع کے معنی معلوم ہونے کی ضرورت ہے اور اس سے قطع نظر اسلئے بھی اسکے معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ اسکے معلوم نہ ہونے سے بہت لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ خشوع کو دشوار سمجھتے ہیں پھر اسکے ساتھ یہ مقدمہ اور ملا لیا کہ نماز بدون خشوع کے بیکار ہے اور اسکی تائید میں یہ شعر یاد کر لیا ؎

بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر ... ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

اسلئے وہ نماز ہی چھوڑ بیٹھے مگر میں نے اس شعر کا رد کیا ہے کیونکہ یہ شعر مثنوی رومی کا نہیں ہے بلکہ نان و حلوا کا شعر ہے میں نے اسکے جواب میں کہا ہے ؎ ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر۔ مگر اسکی ساتھ ایک شرط ہے وہ یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے یہ ارادہ ہو کہ ہم نماز اسواسطے پڑھتے ہیں تاکہ عبدیت پیدا ہو و کر اللہ اسواسطے کرتے ہیں تاکہ محبت حق پیدا ہو تو ہیں دعوے سے

کہتا ہوں کہ قصد اثر سے جو عمل کیا جائیگا وہ ضرور مؤثر و نافع ہوگا خواہ اسمیں یکسوئی حاصل ہو یا نہو دل لگے یا نہ لگے وساوس آئیں یا نہ آئیں البتہ اگر اثر کا قصد بھی نہو تو پھر نان و حلوا کا شعر صحیح ہے افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ عمل کرتے ہوئے اثر کا قصد بھی نہیں کرتے۔ بہر حال خشوع کی حقیقت یہ نہیں کہ وسوسہ بالکل نہ آئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے قصد سے نہ لاوے غرض آمدن مضر نہیں آوردن مضر ہے مگر آنا لانا ایسا نہو کہ لانے کو آنا سمجھتا رہے جیسا ایک نیم ٹر واعظ کی حکایت ہے کہ اسکے گھر میں کسی کی مرغی آگئی بیوی نے نکالنا چاہا کہا نکالو نہیں بلکہ تین بار آواز دیکر پوچھو کسکی ہے مگر مرغی آہستہ کہنا کسکی ہے زور سے کہنا جب تین بار اسطرح پکار دیا گیا تو کہا اسکو ذبح کر لو لقطہ ہے جب وہ پک کر تیار ہوئی تو بیوی سے کہا کہ بوٹیاں مت نکالنا کیونکہ وہ تو مشتبہ مال ہے شوربا نکال لینا کیونکہ اسمیں تو پانی مصالحہ گھی وغیرہ سب ہمارا مال ہے (حالانکہ بوٹیوں کا ست بھی اسی میں تھا جو کہ مشتبہ بلکہ حرام تھا ۱۲) بیوی نے چمچہ لیکر شوربا نکالنا چاہا واعظ صاحب بولے یوں نہیں بلکہ دیگچی سے انڈیل کر نکالو بیوی نے کہا اسطرح تو بوٹیاں بھی آئیں گی کہا جو اپنی خوشی سے آئے اس کو آنے دو تم مت لاؤ

۱۶

توجسطرح اس جاہل نے لانے کو آنا سمجھا تھا ایسے ہی بعض لوگ نماز میں خود خیالات لاتے ہیں مگر اس دھوکہ میں رہتے ہیں کہ یہ تو خود آرہے ہیں۔ بس از خود خیالات نہ لاؤ تو خشوع حاصل ہوگیا اور یہ فعل اختیاری ہے مگر ہر ایک کو آسان نہیں بلکہ اسی کو آسان ہے جو خیالات کے مجتمع رکھنے کا عادی ہے راز اس کا یہ ہے کہ نماز کی گرانی کا سبب قید ہے تو جو شخص قید کا پہلے سے عادی ہے اسکو نماز گراں نہیں اور جو آزادی کا عادی ہے اسکو گراں ہے اور یہی قید صبر ہے پس نماز بھی صبر کے فوت ہونے ہی سے گراں ہوئی اگر صبر کی عادت ہو جائے جسکی حقیقت حبس و قید نفس ہے تو پھر نماز پھولوں ہلکی ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ آزادی کا طالب ہونا الحاد و زندقہ ہے دین تو نام ہی قید کا ہے چنانچہ نماز میں قیود ہیں روزہ میں قیود ہیں ہر کام میں قیود ہیں مگر خاشعین کے واسطے وہ قید ایسی ہیں ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند شکارت نجوید خلاص از کمند

مولانا فرماتے ہیں ؎

گرد وصد زنجیر آری بگسلم　　　غیر زلف آں نگار مقبلم

حضرات انبیار علیہم السلام کے جو مراتب بلند ہیں اسکی یہی تو وجہ ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ قیود و حدود کا حق ادا کیا ہے انپر وہ بلائیں گذری ہیں جنکو دوسرا برداشت نہیں کر سکتا ؎

زاں بلاہا کانبیا برداشتند　　　سر بہ چرخ ہفتمیں افراشتند

اور جب دین نام ہی قید کا ہے تو یہ ضروری بات ہے کہ اول اول جی نہ لگے گا کیونکہ نفس ابھی قید کا عادی نہیں ہے۔ اس جواب کا تو حاصل یہ تھا کہ صبر عمل کی تمہید ہے اور ترقی کر کے یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ دین کا ہر عمل صبر ہی ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ ہر عمل میں حدود و قیود ہیں اور صبر کی حقیقت بھی قید ہی ہے اس سے بھی وہ شبہ بالکل مرتفع ہو گیا کہ مقصود تو ضرورت عمل ہے اور آیت میں صبر کا امر ہے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اعمال شرعیہ کو اللہ تعالیٰ نے صبر کے عنوان سے بیان فرمایا ہے تاکہ سنتے ہی مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ اسمیں ہمت کی ضرورت ہوگی بس اب سالکین کو جی نہ لگنے کی شکایت کرنا فضول ہے کیونکہ تمکو تو صبر ہی کا امر ہے اور ہر عمل کی حقیقت صبر ہی ہے۔ اور صبر میں جی لگنا کیسا ؟ بلکہ جی نہ لگنے کی صورت میں زیادہ خوش ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تمکو ثواب زیادہ دینا چاہتے ہیں اسپر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر تو کاملین سے ہم ہی اچھے ہیں کہ ہمکو ثواب زیادہ ملتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں اچھے وہی ہیں کیونکہ انھوں نے اسقدر محنت کی ہے کہ اب انکو قید میں بھی حظ آنے لگا تو صبر بھی اُن ہی کا بڑھا ہوا ہے اور تم اسمیں بھی انکی برابر نہیں مگر جتنا صبر بھی تمسے ممکن ہے اختیار کرو کہ تمہارے اختیار میں بھی ہے لذت کی طلب چھوڑو جسکو وصول سمجھا جاتا ہے کہ وہ تمہارے اختیار میں نہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رح کا ارشاد ہے کہ مقصود طلب ہے وصول مقصود نہیں کیونکہ وصول تمھارے اختیار میں نہیں بلکہ اُن کے اختیار میں ہے تم سے تو مطلوب صرف وہ کام ہے جو تمھارے اختیار میں ہے اور وہ طلب وسعی کے سوا کچھ نہیں بس تم اپنا کام کرو اللہ میاں کے کام میں کیوں دخل دیتے ہو ؎　کار خود کن کار بیگانہ مکن۔　ہاں اتنی اجازت ہے کہ وصول کی دعا کر لیا کرو مگر اسکے درپے نہو مولانا فرماتے ہیں ؎

۱۷

آب کم جو تشنگی آور بدست　　تا بجوشد آبت از بالا و پست

مولانا بڑے محقق ہیں فرماتے ہیں کہ پانی کی تلاش نکرو بلکہ پیاس پیدا کرو پانی خود بخود آ

تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　آب ہم جوید بعالم تشنگاں

جب پیاس ہوگی پانی بھی پاس آجائیگا یعنی تم طالب سے مطلوب ہو جاؤ گے آگے اس مضمون

ذرا وضاحت سے بیان فرماتے ہیں

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں　　کو بہ نسبت ہست ہم این وہم آں

مگر اتنا فرق ہے کہ عاشق کا عشق ببانگ دہل ہوتا ہے اور محبوب کا عشق مخفی ہوتا ہے

عشق معشوقاں نہاں ست وستیر　　عشق عاشق با دو صد طبل ونفیر

اور یہی حقیقت ہے تصوف کی کہ طلب پیدا کرے اور عمل کا اہتمام کرے تصوف کوئی دوسری

چیز نہیں ہے متقدمین نے صوفی کی تفسیر عالم باعمل سے کی ہے۔ مگر آجکل لوگوں نے اسکو بہت

بدنام بنا دیا ہے یہاں تک۔ کہ ایک عیسائی انگریز یہی کہنے لگا کہ ہم تو تین ہی خدا کے قائل ہیں

تمہارا ٹوپی (صوفی) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔ یہ وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو بگاڑا ہے اور غضب

کہ بہت سے جہلاء وحدۃ الوجود کے معنی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ ہر چیز خدا ہے حتی کہ میں نے زندگی

میں ایک مولوی کو درس میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ نعوذ باللہ واجب الوجود کلی طبعی ہے جزئی

اور ظاہر ہے کہ کلی طبعی کا وجود جدا گانہ نہیں ہوتا بلکہ افراد کے ضمن میں ہوتا ہے تو نعوذ باللہ

کا وجود مستقل کوئی نہیں بلکہ موجودات کے ضمن ہی میں ہے یہ وحدۃ الوجود نہیں بلکہ کفر صریح ہے

وحدۃ الوجود تو یہ ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر خدا کی ہستی کا مشاہدہ کرے نہ یہ کہ خدا کی ہستی کو

اپنی ہستی کا مشاہدہ کرے۔ ایک بزرگ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ منصور نے

انا الحق کہا اور فرعون نے بھی انا ربکم الاعلیٰ کہا جسکا حاصل انا الحق ہی ہے پھر وہ مقبول

ہوئے یہ مردود ہوا اسکی کیا وجہ الہام ہوا کہ منصور نے اپنے کو مٹانے کیلئے انا الحق کہا

اور فرعون نے ہمکو مٹانے کیلئے انا الحق کہا تھا اسلئے وہ مقبول ہوا یہ مردود ہوا مولانا فرماتے

فرماتے ہیں

گفت منصورے انا الحق گشت مست　　گفت فرعونے انا الحق گشت پست

رحمۃ اللہ آں انار ادروفا لعنت اللہ ابن انار ادرقفا

عن متقدمین نے صوفی کی تفسیر عالم باعمل کی ہے جس سے تصوف کی حقیقت علم باعمل
ل ہوئی متقدمین کے علوم بڑے پختہ ہیں انہی سے تمسک کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اہل صحو تھے
بتاخرین میں اہل سکر زیادہ ہیں رہا یہ کہ جب تصوف کی حقیقت علم مع العمل ہے تو خشک
م کون ہوئے اس کا جواب یہ ہے کہ خشک عالم وہ ہے جو عمل کو ظاہر کے ساتھ خاص کرتا ہے
ر عمل باطن کا اہتمام نہیں کرتا اور جسکو علم کیساتھ عمل ظاہر و عمل باطن دونوں کا اہتمام ہے
ا عالم تر ہے۔ پھر جو عالم باعمل ہوگا اور اعمال ظاہرہ و باطنہ کا جامع ہوگا اللہ تعالیٰ اسکو
عن خاص نعمتیں بھی عطا فرماتے ہیں پھر وہ نعمتیں دو قسم کی ہیں ایک موعود وہ تو رضا حق
ر جنت ہے اور بس۔ اور غیر موعود کیفیات باطنیہ ذوق و شوق و احوال و مواجید اور اسرار
یرہ ہیں۔ انکی ایسی مثال ہے جیسے باغ میں پانی تو دیتے ہیں درختوں کی پرورش کیلئے
ر پانی دینے سے گھاس بھی نکل آتی ہے جو دیکھنے میں درختوں سے زیادہ خوشنما ہوتی ہے
ر مالی کی تراش و خراش سے اسمیں خوبصورتی زیادہ آجاتی ہے اب جو لوگ احوال و کیفیات
اسرار کے طالب ہیں انکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص باغ میں گھاس ہی گھاس چاہیے
سکی خدمت کرے حتی کہ درختوں کی جڑوں میں سے بھی گھاس کو صاف نکرے اس کا نتیجہ
ہوگا کہ ہزاروں روپیئے کے قیمتی درخت برباد ہو جائیں گے صرف گھاس رہ جائیگی جو
ایک دو روپیئے سے زیادہ کی نہوگی عاقل وہ ہے جو درختوں کی خدمت کرے انکی نگہداشت
کرے گھاس کا کیا ہے وہ تو خودرو ہے اپنے آپ ہی پیدا ہو جائے گی۔ بس سمجھ لو کہ اعمال
کی مثال درختوں جیسی ہے اور احوال و اسرار کی مثال گھاس کی سی ہے انکی طلب میں نہ پڑو
اعمال کا اہتمام کرو یہ خود بخود بلا وعدہ کے اکثر عطا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے
کہ تصوف کی حقیقت علم مع العمل ہے اسمیں علم سے مراد خاص مولویت نہیں بلکہ اسقدر علم
جسکی عمل میں ضرورت ہے خواہ عربی پڑھکر حاصل ہو یا اردو کے رسائل سے یا علماء سے پوچھ پاچھ
کرکے بس بقدر ضرورت علم حاصل کرکے خلوت اختیار کرنا اور عمل کا اہتمام کرنا چاہیئے مگر ایسی
خلوت ہو کہ جب کوئی اشکال پیش آئے تو خلوت کو توڑ کر محقق کے پاس جائے اور اشکال کو رفع

کرے ورنہ بعض حالتوں میں شیطان اس کا ایمان تک سلب کر دیگا۔ محققین لکھتے ہیں کہ
شیطان بعض دفعہ اپنی قوت خیالیہ سے سالک کی نظر میں آسمان اور انوار پیدا کر دیتا ہے
اور اسوقت شیاطین بصورت ملائکہ اس سے کلام کرتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر جاہل دہوکہ کھاتا
ہے اسی لئے محققین نے فرمایا ہے کہ اگر ملائکہ بھی اس سے ہمکلام ہوں تو اُسکو شریعت پر
پیش کرے اگر شریعت کے مواقع ہو قبول کرے ورنہ رد کر دے کیونکہ ملائکہ کا کلام بلا واسطہ
نبی کے حجت نہیں بلکہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اس سے کلام کریں تو کلام حق بھی بلا واسطہ نبی کے
غیر نبی کیلئے حجت نہیں کیونکہ (اس کا اولاً کلام حق ہونا ہی یقینی نہیں دوسرے) اللہ تعالیٰ
کبھی امتحان کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ اس سے جو کلام ہو اس سے امتحان مقصود ہو اور نبی امتحان
نہیں کرتا اسلئے کلام حق وہی حجت ہے جو بواسطہ رسول کے ہو کہ اسمیں امتحان وغیرہ کا احتمال
نہیں تو خلوت میں بعض دفعہ سخت عقبات پیش آتے ہیں جنکو محقق ہی حل کر سکتا ہے اسی کو
عارف فرماتے ہیں ؎

درراہِ عشق وسوسہ اہرمن بسے ست ہشدار و گوش را بہ پیامِ سروش دار

پیام سروش سے مراد وحی ہے کہ وحی کا اتباع ہر وقت لازم ہے ورنہ شیطان ایمان تک
سلب کر لیتا ہے اسی لئے جاہل کو خلوت محضہ جائز نہیں ہاں عالم محقق کو جائز ہے کیونکہ
وہ اسرار کو صحیح طور سے سمجھیگا مگر ایک وقت اسپر بھی ترک خلوت لازم ہے یعنی افادہ کے لئے
کیونکہ شیخ کے ذمہ طالبین کا افادہ فرض ہے اس کے ذمہ ضروری ہے کہ ایک وقت افادہ
کیلئے بھی مقرر کرے عارف اسی کو فرماتے ہیں ؎

بنمائے رخ کہ خلقے والہ شوند وحیراں بکشای لب کہ فریاد از مرد وزن برآید

غرض بے وحدت کو تو وحدت جائز نہیں یا وحدت کو جائز ہے (بے وحدت[عہ] معلوم کیسا لفظ
اور اسکے کیا معنی ہیں اسی طرح بیہودہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لفظ مرکب ہے یا بسیط مجھے
لا ادری کہتے میں کچھ تامل نہیں بلکہ فخر ہے اور اپنے عدم علم کو اسلئے ظاہر کرتا ہوں کہ شاید کسی کو

عہ شاید بد انتظام کو بے وحدت اسلئے کہتے ہیں کہ اُسکے افعال میں شان اجتماع نہیں جو وحدت سے
ہوتی ہے بلکہ انتشار واختلال ہے جو کثرت کو لازم ہے واللہ اعلم ۱۲ ظ۔

معلوم ہو تو ظاہر کردے) غرض تصوف کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہی نماز روزہ تصوف ہے اور یہی اعمال مقصود ہیں رہا یہ کہ پھر مجاہدہ وغیرہ کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نماز و روزہ کو نماز روزہ بنانے کیلئے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ یہاں سے ان صوفیوں کی غلطی واضح ہو گئی جو عمل کو بیکار سمجھتے ہیں صرف روح عمل کو کافی سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر صورت عمل بیکار ہے تو بہت اچھا آج سے اگر تم پونڈا مانگوگے تو تمکو گڑ دیا جائیگا اسوقت منہ نہ بنا کیونکہ روح تو موجود ہے اسوقت یہ کیوں کہتے ہو کہ گڑ میں وہ بات کہاں جو پونڈے میں ہے پھر ہمکو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ نری روح میں وہ بات کہاں۔ جو نماز میں ہے۔ دوسرے اگر روح عمل ہی مقصود ہوتی تو وہ تو عالم ارواح میں بھی حاصل ہوسکتی تھی عالم اجسام میں ہمکو کیوں بھیجا گیا؟ یقیناً اس لئے کہ روح مجرد سے صورت اعمال کا تحقق نہ ہوسکتا تھا یہ صاف دلیل ہے اسکی کہ صورت بھی مطلوب ہے مگر نہ ایسی صورت جو روح سے خالی ہو بلکہ صورت اور روح دونوں کو جمع کرنا چاہئے خلاصہ یہ کہ آدمی نہ تو ایسا خشک ہو کہ اعمال کی جان سے تعلق ہی نہ ہو نہ ایسا روح میں تر ہو کہ ڈوب ہی مرے۔ آجکل بعض جاہل صوفی محقق علماء کو عارضی جوش و خروش سے خالی دیکھکر اسرار طریق سے بےخبر سمجھکر یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل — کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

کہ یہ لوگ ہماری حالت کو کیا جانیں انکو خبر ہی نہیں کہ ہم پر کیا گذرتی ہے میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ ساحل دو ہیں ایک اِدھر کا ایک اُدھر کا تو کجا دانند حال ما کا مصداق وہ شخص ہے جو ادِھر کے ساحل پر ہے جس نے دریا میں قدم ہی نہیں ڈالا اور جو شخص اُدھر کے ساحل پر کھڑا ہے وہ ڈوبا بھی ہے ترا بھی ہے پھر کامیاب ہو کر پار ہو کر ہنس رہے ہیں جاہلوں کو اُن کے تبسم سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ ان پر کچھ گذرا ہی نہیں ارے اُن پر سب کچھ گذر چکا ہے وہ تمھاری حالت سے بھی واقف ہیں اور اس سے آگے کی حالت سے بھی واقف ہیں اور تم کو اُن کے تبسم سے جو یہ دھوکہ ہو رہا ہے کہ ان کے دل میں کچھ نہیں یہ تمھاری حماقت ہے کہ دور ہی سے دیکھکر تمنے فیصلہ کرلیا اُن کے پاس جاؤ پاس رہو تو معلوم ہوگا کہ اُن کا ہنسنا ایسا ہے جیسا توا چولھے سے اُتارنے کے بعد ہنسا کرتا ہے۔ ذرا اُس پر ہاتھ رکھکر دیکھو کیسا جلا بھنا ہے کہ تمکو

بھی جلا پھونک دیگا اسی کو نواب صاحب شیفتہ فرماتے ہیں وہ نواب بھی تھے اور صوفی عارف بھی تھے کیونکہ تصوف کیلئے لنگوٹہ باندھنا شرط نہیں وہ فرماتے ہیں ؎

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو | کہ بینی خندہ برلبہا و آتش پارہ در دلہا

ہاں یہ ضرور ہے کہ منتہی کو جوش و خروش نہیں ہوتا یعنی اکثر نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی ہو بھی جاتا ہے بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ حضرات انبیاء پر بھی بعض دفعہ غلبہ حال ہو جاتا ہے چنانچہ جنگ بدر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے غلبہ کیلئے بہت دیر تک دعا کی اخیر میں یہ بھی فرمایا اللھم ان تہلک ھذہ العصابۃ لم تعبد بعد الیوم اے اللہ اگر یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو دنیا میں کوئی آپکا نام نہ لیگا۔ بھلا اگر کوئی اللہ کا نام نہ لیتا تو خدا کا اسمیں کیا نقصان تھا اسلیں ظاہر میں یہ جملہ بہت سخت معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ سنایا ہے ہیں کہ آپکو کوئی نہ پوچھے گا اسکی تاویل قریب بجز اسکے کچھ نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اسوقت خاص حالت کا غلبہ تھا اسلئے ناز میں یہ جملہ فرمادیا۔ دوسرا واقعہ اسی غلبہ حال کا عبداللہ بن ابی منافق کی نماز پڑھنے کا ہے یہ شخص بڑا سخت منافق تھا مگر اسکے بیٹے مخلص مسلمان تھے انھوں نے حضور کو اپنے باپ کے مرنے کی اطلاع دی اور دعا کی درخواست کی چونکہ اسوقت تک منافقین کی نماز جنازہ سے صراحۃً ممانعت نازل نہوئی تھی اسلئے حضور نے وعدہ فرمالیا کہ میں دعا بھی کروں گا اور نماز بھی پڑھوں گا چنانچہ آپ نماز پڑھنے کو تیار ہو گئے اسوقت حضرت عمرؓ نے آپکو نماز سے روکنا چاہا اور اسکے کلمات اور واقعات شمار کرنا شروع کئے کہ یا رسول اللہ یہ تو منافق تھا اس نے فلاں دن یوں کہا تھا فلاں وقت یوں کہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپکو ان کیلئے استغفار و دعا سے منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے استغفر لھم اولا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم حضور نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ خواہ استغفار کروں یا نکروں اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے پر اسکی مغفرت ہو جائے گی تو میں ستر سے زیادہ استغفار کرلونگا غرض آپنے نماز پڑھادی نماز سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آیت نازل ہوئی ولا تصل علی احد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ انھم کفروا باللہ ورسولہ وماتوا وھم

فاسقون جسمیں آئندہ کیلئے صاف طور سے منافقین کے جنازہ کی نماز سے اور انکی قبر پر جانے سے منع کردیا گیا جب حضرت عمر کو یہ معلوم ہوا کہ آیت میری رای کے موافق نازل ہوگئی تو ان پر بے انتہا خجلت کا غلبہ ہوا کہ یہ کیا ہوا کہ میری رائے کے موافق وحی نازل ہوئی اب انکو حضور کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی تھی سبحان اللہ یہ ہے محبت اور ادب اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضور کی رائی سے حضرت عمر کی رائی افضل ہوگئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر کی رای بھی حضور ہی کی رائے تھی وہ بھی حضور ہی کا فیض تھا کیونکہ کفار و منافقین پر غیظ اور اُن سے نفرت حضرت عمرؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے نصیب ہوئی ورنہ آپ کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قتل رسول کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے حضور پر ایمان لانیکے بعد حق تعالیٰ نے انکو کفار و منافقین سے نفرت اور غیظ عطا فرمایا مگر حضرت عمرؓ صرف عمر ہی تھے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم رسول بھی تھے اور عمر بھی تھے بلکہ یوں کہو کہ آپ آدم بھی تھے نوح بھی تھے ابراہیم بھی تھے موسیٰ بھی تھے عیسیٰ بھی تھے

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضور میں تمام شانیں جمع تھیں غیظ و غضب علی الکفار بھی آپ کے اندر تھا اور رحمت و رأفت بھی اعلیٰ درجہ کی آپ میں تھی مگر آپ میں غلبہ رحمت ہی کو تھا اسلئے جب تک کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا آپ رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے جب رحمت کا کوئی بہانہ نہوتا اُسوقت غضب فرماتے تھے (عبداللہ بن ابی گو منافق تھا مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا اور منافقوں کے احکام کفار معلنین کے احکام سے جدا تھے انکی ساتھ احکام حیات میں وہی برتاؤ ہوتا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور موت کے احکام ہنوز نازل نہوئے تھے اسلئے بوجہ غلبۂ رحمت کے آپنے احکام حیات پر قیاس کرکے اسکی ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا اور حضرت عمر نے بوجہ غلبۂ غیظ و شدت کے احکام حیات کو ضرورت و مصلحت پر مبنی سمجھکر احکام ممات میں منافقین کو کفار معلنین پر قیاس کیا۔ اور یہ بھی حضور ہی کا فیض تھا۔ اور یہ قیاس بھی آپ سے مخفی نہ تھا مگر حضور نے غلبۂ رحمت کی وجہ سے پہلے قیاس کو ترجیح دی کیونکہ جب تک آپ کو موقعہ ملتا تھا آپ رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور کی یہ شان ہم مسلمانوں

کیلئے بہت کچھ موجب تسلی ہے کیونکہ ؎

دوستاں را کجا کنی محروم | تو کہ با دشمناں نظر داری

اور ؎ چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیباں | چہ باک از موج بحر آنرا کہ دارد نوح کشتیباں ۔۱۲ جامع

اب اس مقام پر میں ایک سوال علماء ظاہر سے کرتا ہوں وہ یہ کہ استغفرلہم اولا تستغفرلہم سے حضور نے تخییر کس طرح سمجھی یہ تردید تو تسویہ کیلئے ہے کہ انکے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے انکو دعاء استغفار سے کوئی نفع نہ ہوگا چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں۔ اسیطرح ان تستغفر لہم سبعین مرۃً میں عدد کا ذکر تحدید کیلئے تھوڑا ہی ہے اگر ستر دفعہ استغفار کروگے تو مغفرت نہوگی اس سے زیادہ کروتو ہو جائے گی بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جب بھی نہ مانوں گا ہزار دفعہ کہے گا جب بھی کچھ نہوگا اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے گی اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کیلئے ہوتا ہے نہ تحدید کیلئے۔ پھر حضور نے خیرت فاخترت وسأزید علی السبعین کیسے فرمایا۔ علماء ظاہر اس کا شافی جواب نہیں دیسکتے اور جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھکر اجتہاد کے مدعی ہیں وہ تو کیا ہی جواب دیں گے پیچھے اب میں علماء باطن کا جواب عرض کرتا ہوں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اسوقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معانی کی طرف التفات نہیں فرمایا بلکہ محض نفس الفاظ سے تمسک فرمانے لگے۔ اور نفس الفاظ میں تخییر وحصر کی گنجائش ضرور ہے گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہو اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ حال کاملین پر بھی کبھی ہو جاتا ہے اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ مقصود بیان تو اتنا طویل نتھا جتنا وقت گذر گیا مگر بات میں بات نکلتی آئی اسلئے زیادہ دیر ہوگئی اور یہ بلا ارادہ ہوا میرا ارادہ اتنی دیر بیان کرنے کا بھی نتھا مگر انشاء اللہ یہ تطویل بھی نافع ہی ہوئی کہ بہت سی کام کی باتیں کان میں پڑ گئیں مقصود بیان یہ ہے کہ میں عمل کی ترغیب دے رہا ہوں اور میں نے بتلا دیا ہے کہ تصوف کا خلاصہ صرف علم مع العمل ہے اور علم بھی صرف عمل کیلئے مطلوب ہے تو یوں کہئے کہ اصل مقصود عمل ہے اور ہمیں آجکل بہت کوتاہی ہو رہی ہے کہ لوگ عمل کا اہتمام نہیں کرتے احوال و مقامات کے پیچھے پڑے

ہوئے حالانکہ اصل چیز نماز روزہ اور معاملات و معاشرات میں احکام شرعیہ کا اتباع ہے اسی کا ذکر اس آیت میں ہے اصبروا و صابروا جو عمل کی تمہید ہے یا یہی عمل کی تعبیر ہے آگے ارشاد ہے ورابطوا جسکے معنی واظبوا و داوموا علی الاعمال یعنی صرف بلکہ صبر و مصابرت یا صرف ایک دفعہ صبر و مصابرت کافی نہیں ہے بلکہ اسکے مقصود یا مدلول پر کہ عمل ہے مواظبت کی ضرورت ہے۔ اب سمجھئے کہ مرابطہ کے انواع بہت ہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ نفس کی اقسام مختلف ہیں کسی کا نفس امارہ ہے کسی کا لوامہ کسی کا مطمئنہ۔ مگر صوفیہ نے مرابطہ کی تفصیل زیادہ تر نفس امارہ کے متعلق بیان کی ہے۔ میں نے نفس مطمئنہ اور نفس لوامہ کے اعتبار سے اسمیں کچھ زیادات کی ہیں جن سے صوفیہ نے تعرض نہیں کیا۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ مرابطہ کی صورت کبھی بہلانے پھسلانے کی شکل میں ہوتی ہے کبھی ڈانٹ ڈپٹ کی شکل میں۔ تو جو نفس مطمئنہ ہے اُسکی ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کا برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ اُسکی ساتھ اجر و فضائل یاد دلا کر بہلانے پھسلانے کا معاملہ ہوتا ہے جس کا نام مواعدہ ہے کیونکہ نفس مطمئنہ تو خود ہی عمل کا طالب ہے اور مجاہدات سے اُسکے اندر عمل کا شوق پیدا ہوگیا ہے مگر کبھی بشریت کی وجہ سے سستی کرنے لگتا ہے تو اسوقت اسکو ترغیب اور مواعدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور نفس مطمئنہ کو جو مطمئنہ کہا جاتا ہے اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ آتش محبت سے خالی ہے بلکہ انکی حالت یہ ہوتی ہے کہ اندر اندر جلتے بھنتے رہتے ہیں گو ظاہر میں ہنستے پھرتے ہیں نواب شیفتہ نے انکی حالت کو خوب بیان کیا ہے ؎

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو　　کہ بینی خندہ برلبہا و آتش پارہ در دلہا

اور ایک نفس لوامہ ہے جو کبھی برے کام بھی کرتا ہے مگر پچھتاتا بھی ہے اسکے ساتھ مسامحت کا معاملہ کیا جاتا ہے یعنی اُسکو نرمی سے تنبیہ کیجاتی ہے کیونکہ وہ تو خود ہی اپنی حرکات پر نادم ہے اور توبہ کرکے عمل کا اہتمام کر رہا ہے اور ایک نفس ہے امارہ جو گناہوں سے رکتا ہی نہیں اسکی سختی کا معاملہ کیا جاتا ہے صوفیہ نے اسی کے معاملہ کو زیادہ بیان کیا ہے پس نفس امارہ کو دوام عمل اور مواظبت کا عادی بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اول تو اس سے ہر دن صبح ہی کو شرطیں کر لو کہ تجکو آج اسطرح عمل کرنا پڑیگا اس کا نام ہے مشارطہ پھر دن بھر اُسکی نگہداشت رکھو کہ شرط کے موافق عمل کر رہا ہے یا نہیں اس کا نام ہے مراقبہ پھر رات کو دن بھر کا اعمال کا حساب لو

۲۵

کہ آج کیا کیا کام کیے اور شرط پوری کی یا نہیں اس کا نام ہے محاسبہ۔ اب حساب کرنے سے
اگر یہ معلوم ہوا کہ شرط کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو اسکو کسی ایسی مشقت کی سزا دو جس سے اسکی
اصلاح ہو اس کا نام ہے معاقبہ پھر جو اسکی سستی سے اس نے کوتاہی کی ہے اسکے تدارک کیلئے
اسپر کچھ جرمانہ مقرر کرو کبھی نفلیں زیادہ پڑھا دو کبھی روزہ لازم کردو کبھی صدقہ خیرات بڑھا دو اس کا
نام ہے معاہدہ اسکے بعد اسکی نافرمانی پر اسپر ملامت کرو اور تدارک پر آمادہ کرو اس کا نام ہے
معاتبہ اور اگر محاسبہ کے وقت یہ معلوم ہو کہ نفس نے بد پرہیزی اور خلاف ورزی نہیں کی بلکہ
شرائط کو پوری طرح ادا کر دیا تو اب اسکو شاباشی دو اس کا صوفیہ نے ذکر نہیں کیا نہ اس کا
نام تجویز کیا سو میں انشاء اللہ اس کا نام بھی وعظ کے صاف ہونے کے وقت تجویز کرلونگا۔
خلاصہ یہ کہ ہمیشہ نفس کو بدپرہیزی سے بچانا چاہیئے کہ احکام الٰہیہ کی مخالفت نکرے۔ اور صوفیہ
نے یہ سب طریقے حدیثوں سے معلوم کرکے مقرر کیے ہیں مثلاً حدیث میں ہے حاسبوا قبل
ان تحاسبوا اسمیں محاسبہ کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں ہے من استطاع منکم الباءۃ
فلیتزوج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء جو شادی کرسکے وہ نکاح کرے
اور جسکو اسکی وسعت نہو وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اسکی رگ شہوت کو دل دیگا یہ مجاہدہ ہے
اور ترک جمعہ پر تصدق دینار کا امر ہے یہ معاقبہ ہے اسی طرح نصوص میں غور کرنے سے سب کی عہ
اصل مل سکتی ہے پس یہ باتیں گھڑی ہوئی نہیں ہیں مگر اہل ظاہر کی نظر یہاں تک نہیں پہنچتی
اسلئے انکو یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک غیر مقلد عالم میرے پاس آئے اور کئی روز تک
مجلس میں بیٹھے انکی یہ حالت تھی کہ جب کوئی مجھ سے سوال کرتا تو وہ خود جواب دینے لگتے کہ
حدیث میں اسکے متعلق یہ آیا ہے میں خاموش رہتا ایک دن ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ مجھپر
شہوت کا غلبہ ہے وہ مولوی صاحب جلدی سے بولے کہ روزہ رکھو حدیث میں اس کا بھی
علاج ہے فان الصوم لہ وجاء۔ سائل نے کہا کہ میں نے روزہ بھی رکھا تھا مگر اس سے
شہوت اور زیادہ ہوگئی اب وہ مولوی صاحب تو خاموش ہوگئے اُن سے کچھ جواب نہ بن پڑا
میں نے بزرگوں کے طفیل سے اسکا بھی جواب دیا میں نے کہا کہ روزہ میں ابتداءً شہوت کا غلبہ ہوتا ہے

[illegible] بس مختصراً اسکا کافی

عہ مثلاً ملاحظہ ہو جامع صغیر احیاء العلوم میں مبسوطاً اور حضرت کے مجموعہ خطب کے خطبہ ماہ رجب

کیونکہ اس سے طبیعت میں لطافت پیدا ہوتی ہے اور لطافت سے شہوت بڑھتی ہے مگر زیادہ روزے رکھنے سے پھر شہوت کم ہو جاتی ہے اور حدیث میں لزوم صوم کو علاج فرمایا ہے نہ کہ مطلق صوم کو اور لزوم مقتضی ہے اعتیاد و تکرار کو (کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جیسے زیادہ کثافت طبع سے شہوت کم ہوتی ہے اسی طرح زیادہ لطافت سے بھی کم ہو جاتی ہے رہا یہ سوال کہ پھر روزہ کی کیا ضرورت ہے بلکہ یہ طریقہ بتلانا چاہئے کہ بہت پیٹ تن کے کھائے انا شناپ کھائے اس سے بھی شہوت کم ہو جائیگی تو یہ صورت خطرناک ہے کیونکہ بہت کھانے سے قسم قسم کے امراض پیدا ہو جائیں گے جن سے جان کا خطرہ ہے اور روزہ ان خطرات سے خالی ہے[۱۲]) میں نے یہ حکایت اسلئے بیان کی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اہل ظاہر کی نظر حدیث میں وہاں تک نہیں پہونچتی جہاں تک اہل باطن کی پہونچتی ہے اسلئے صوفیہ پر ان کا یہ اعتراض لغو ہے کہ انھوں نے یہ طریقے کہاں سے گھڑ لئے تو خوب سمجھ لو کہ انھوں نے قیاس سے نہیں گھڑے بلکہ سب کی اصل حدیثوں میں موجود ہے گو آپکو معلوم نہو اور حدیث من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تسہیل اعمال کے طریقے بھی بتلائے ہیں مگر یہ حضور کے ذمہ لازم نتھا یہ محض رحمت و تبرع ہے اسی طرح شیوخ کے ذمہ بھی یہ امور لازم نہیں اگر وہ بتلا دیں تو ان کا احسان ہے اس لئے میں کبھی تو طرق تسہیل بتلا دیتا ہوں کبھی نہیں بتلاتا مثلاً بعض لوگ غلبہ غضب کی شکایت کرتے ہیں تو اُن سے یہ سوال کرتا ہوں کہ غضب اختیاری ہے یا غیر اختیاری وہ کہتے ہیں کہ غیر اختیاری ہے پھر سوال کرتا ہوں کہ اس کے مقتضا پر عمل کرنا اختیاری ہے یا غیر اختیاری وہ کہتے ہیں کہ اختیار ہے اسپر میں کہتا ہوں کہ جب یہ اختیاری ہے تو بس غضب کے مقتضا پر عمل نکرو یہاں تک تو تبلیغ ہے اور یہی شیخ کے ذمہ ہے آگے طالب کا کام ہے کہ ہمت کر کے غضب کے مقتضا پر عمل نکرے مگر شفقت کے طور پر بعض کو سہولت کا طریقہ بھی بتلا دیتا ہوں مثلاً یہ کہ اُس جگہ سے خود ہٹ جائے یا مخاطب کو الگ کر دے اگر قدرت ہو۔ اگر قدرت نہو تو خود ہی الگ ہو جائے۔ اور بعض طریقے غصہ کم کرنے کے حدیث میں بھی آئے ہیں مثلاً یہ کہ پانی پی لے وضو کر لے یا اعوذ باللہ پڑھے مگر یہ طرق لطیف ہیں جو لطیف طبائع کے مناسب ہیں آجکل طبائع کثیف ہیں اسلئے سخت تدابیر

کی ضرورت ہے جنمیں سے ایک تدبیر وہ ہے جو میں نے بیان کی کہ وہاں سے ہٹ جائے یا مخاطب کو الگ کر دے اور یہ زیادت علی الحدیث نہیں ہے بلکہ اسی سے مستنبط ہے کیونکہ ان سب تدابیر کا راز یہ ہے کہ غصہ کے وقت توجہ کو ہٹانا اور دوسری طرف متوجہ کر دینا غصہ کو کم کر دیتا ہے پس توجہ کے ہٹانے کی جو صورت بھی ہوگی وہ حدیث ہی کے تحت میں ہوگی رہا صورتوں کا بدلنا یہ تبدل علاج بہ تبدل مزاج میں داخل ہے آجکل کی طبائع ایسی کثیف ہیں کہ اعوذ باللہ تو کیا سارا قرآن بھی پڑھ دو جب بھی اثر نہو کیونکہ لوگ آجکل محض زبان سے اعوذ باللہ پڑھتے ہیں دل سے نہیں پڑھتے ہماری تو حالت یہ ہے ؎

اللہ اللہ می کنی بہر زباں — بے طمع پیش آ و اللہ را بخواں

اور اگر استحضار عظمت الٰہیہ کیساتھ دل سے اعوذ باللہ پڑھی جائے تو ضرور اثر ہو ہمنے عرب میں اس اثر کا مشاہدہ کیا ہے کہ دو جماعتیں آپس میں غصہ کر رہی ہیں لڑنے کو آمادہ ہو گئی تلواریں نیام سے نکل آئی ہیں کہ ایک تیسرے شخص نے آکر کہدیا یا شیخ صل علی النبی یہ کہنا تھا کہ طرفین کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور دونوں درود پڑھنے میں مشغول ہو گئے اللھم صل وسلم وبارک علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین پھر ایک ادہر کو چلدیا ایک ادہر کو چلدیا۔ یہاں تو لاکھ دفعہ بھی صل علی النبی کہو تو غصہ ٹھنڈا نہو اسلئے میں یہ بتلاتا ہوں کہ مخاطب کو سامنے سے الگ کر دو یا خود الگ ہو جاؤ تو توجہ ہٹ جائے گی غصہ جاتا رہیگا اور یہی صرف توجہ بڑا علاج ہے۔ غم کا جسوقت کسی کے یہاں موت ہو جاتی ہے تو میں یہی علاج بتلاتا ہوں کہ اس واقعہ کا تذکرہ نکرو غم کو تازہ نکرو واقعہ کو سوچو نہیں اس سے بہت جلد غم زائل ہو جاتا ہے اور یہی مطلب ہے لا تخافی ولا تحزنی کا ورنہ بظاہر اسپر اشکال وارد ہوتا ہے کہ خوف وحزن تو امر غیر اختیاری ہے اور اوامر ونواہی کا تعلق امور اختیاریہ سے ہوتا ہے پھر یہاں خوف وحزن سے نہی کیونکر متعلق ہوئی۔ ترجمہ قرآن دیکھنے والے اس اشکال کا جواب دیں؟ یقیناً وہ اس کا جواب نہ دیسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا جواب سمجھایا ہے وہ یہ کہ خوف وحزن کی ایک ابتدا ہے ایک بقا۔ ابتدا تو غیر اختیاری ہے اور بقا میں انسان کے اختیار کو بھی دخل ہے کہ واقعہ کو سوچتا رہے اسکا تذکرہ کرتا رہے اس سے حزن بڑھ جاتا ہے

بس لاتخافی ولاتحزنی کا مطلب یہ ہے کہ خوف وحزن کو ترقی مت دینا یعنی اس کا تذکرہ نکرنا نہ اسکی سوچ میں پڑ جانا اس طرح طبعی حزن بھی خود کمزور ہو جائیگا۔ مگر آجکل تو یہ حالت ہے کہ تعزیت کرنے جو آتا ہے وہ سارا قصہ پوچھتا ہے خصوص عورتیں غمزدہ عورت سے گلے ملکر روتی ہیں اب یہ غریب تو ایک ہے اور گلے لگنے والیاں سَو ہیں اسکے دل پر تو سَو دفعہ نشتر لگتا ہے اور آنے والیوں کے دل پر ایک ہی ایک دفعہ لگتا ہے اگر بناوٹ نہ ہو اسلئے یہ طریقہ تعزیت کا واہیات ہے بس میں تو اس طرح تعزیت کرتا ہوں کہ بھائی جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا اب رونے دھونے سے مردہ تو زندہ ہونے سے رہا نہ اُس کا اسمیں کچھ نفع ؟ تم وہ کام کرو کہ اُسکو بھی نفع ہو اور تمکو بھی وہ یہ کہ قرآن لیکر بیٹھ جاؤ اور پڑھ پڑھ کر اُسے بخشو نفلیں پڑھو اور ان کا ثواب اُسکو بخشو اللہ اللہ کرو اور اسکا ثواب اُسکو پہونچاؤ اُسکے لئے دعائے مغفرت کرو اور یہ سوچو کہ وہ جنت میں گیا جہاں یہاں سے زیادہ راحت ہے اور کچھ دنوں میں ہم بھی وہیں پہونچکر اُس سے مل لیں گے حدیثوں میں بھی یہی طریقہ بتلایا گیا ہے اور فقہاء نے بھی بے ضرورت تذکرہ کرنے سے منع کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ تین دن کے بعد بستی والے تعزیت نکریں ہاں باہر سے آنیوالوں کو اجازت ہے۔ اس کا راز وہی ہے کہ زیادہ تذکرہ سے غم بڑھتا ہے۔ اسکے متعلق نظام الدین بیرسٹر کی حکایت بڑے مزہ کی ہے واقعی انھوں نے دانائی سے کام لیا کہ اُنکے والد کا انتقال ہوا تو اول تو انھوں نے اپنے معمولات کو ترک نہیں کیا جو کام جسوقت کرتے تھے سب اپنے اپنے وقت پر کرتے رہے جب کھانیکا وقت آیا باورچی سے کھانا منگایا اُس نے کہا حضور میں نے تو یہ سوچکر کہ آج والد صاحب کا انتقال ہوا ہے آپ کھانا نہ کھائیں گے کچھ نہیں پکایا کہا سبحان اللہ! وہ تو اپنی موت سے مرے تو ہمکو زندہ مارنا چاہتا ہے کچھ مختصر سی سزا دی اور کھانا پکوایا اسکے بعد انھوں نے والد کی تعزیت کیلئے ایک مسل بنائی اور اُسکے لئے ایک میعاد مقرر کی جو شخص اس میعاد میں تعزیت کو آتا رہا اُسکی باتیں سنتے رہے اور مسل میں درج کرتے رہے اُن کے یہاں ہر بات کیلئے مسل تیار ہوتی تھی جب میعاد گذر گئی تو مسل داخل دفتر کر دی اسکے بعد کوئی شخص آیا اور تعزیت کے الفاظ شروع کئے اُسکو پہلے ہی روکدیا کہ شاید آپ والد صاحب کی تعزیت کرنا چاہتے ہیں اُس نے کہا ہاں! کہنے لگے کہ تعزیت کی مسل داخل

دفن ہوچکی ہے اب میں اسکو نہیں سننا چاہتا کوئی اور بات کیجئے وہ غریب اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ خیر یہ طریقہ اچھا ہو یا نہو مگر اس کا منشا ضرور اچھا تھا کہ غم کا تذکرہ ہمیشہ نہونا چاہئے بلکہ اسکے لئے میعاد مقرر ہونا چاہیے۔ اور میعاد کے اندر بھی تعزیت اس طرح کرنا چاہئے جس سے غمزدہ کو تسلی ہو نہ یہ کہ اور غم تازہ ہو مگر بدتہذیبی کے ساتھ بھی تعزیت نکرے جیسے ایک صاحب نے بیٹے کی وفات پر کسی کو یہ کہتے ہوے سنا تھا کہ خدا آپکو نعم البدل دے اس نے یہی جملہ یاد کرلیا پھر کسی کا باپ مرا تو آپنے اُسکو بھی اسی جملہ سے تعزیت کی کہ اللہ تعالی آپکو نعم البدل عطا فرمائے وہ جھلا گیا کہ میری ماں کو خصم کرانے آیا ہے اسی طرح ایک اہلکار کی ماں مرگئی اُسکو بہت غم تھا ایک دیہاتی آیا لوگوں سے پوچھا آدمی کیوں جمع ہیں ایک مسخرہ تھا کہنے لگا امیروں کے چوچلے ہیں میاں کی اونٹنی مرگئی اُسکا ایک بکھیڑا بنالیا۔ کہنے لگا دیکھو میں ٹھیک کردونگا آپ آئے اور اس طرح تعزیت کی کہ میاں سسری مرگئی مرگئی غم کا ہے کا تو جس طرح اس نے بےتحقیق بدتہذیبی کی ایسی بدتہذیبی اچھی نہیں۔ غرض صوفیہ نے تمام امراض باطنہ کے علاج کا سہل طریقہ سے تجویز کیا ہے جو علم اخلاق کی کتابوں میں مدون ہے۔ اخلاق میں صوفیہ نے بہت کتابیں لکھی ہیں امام غزالی کی کتابیں سب سے زیادہ اسکے حامل ہیں مگر احیاء العلوم طویل بہت ہے اب الحمدللہ انہی علوم کے طفیل سے چھوٹے رسالے چھپ گئے ہیں وہ اسکے لئے کافی ہیں یہ تو رابطوا کے متعلق بیان تھا آگے ارشاد ہے واتقوا اللہ یعنی خدا سے ڈرو یہ تکمیل ہے مضمون سابق کی کیونکہ اگر خدا کا خوف نہو تو نہ رابطہ ہوگا نہ مشارطہ نہ معاقبہ نہ محاسبہ۔ ان سب کی بنیاد خدا کا خوف ہی ہے پس واتقوا اللہ اسلئے بڑھایا کہ مدار ان سب اعمال کا اسی پر ہے۔ اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ جب تقوی سب اعمال کی بنیاد ہے تو پھر واتقوا اللہ کو مقدم کرنا چاہئے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تقوی شرعی مراد ہے اور تقوی شرعی وہ ہے کہ خوف خدا کیساتھ عمل بھی ہو اگر عمل نہو محض خوف ہی ہو تو وہ تقوی شرعی نہوگا اور قاعدہ یہ ہے کہ حق تعالی کی ایسی عظمت ان اعمال ہی سے قلب میں پیدا ہوتی ہے پس یہ تقوی اعمال کا اثر ہوا اسلئے واتقوا اللہ کو مؤخر کیا گیا حاصل یہ ہوا کہ ان اعمال سے جو عظمت حق تمھارے قلب میں پیدا ہوگی اُس کا استحضار رکھو تو یہ اعمال

سہل ہو جائیں گے پس تقویٰ ان اعمال کا نتیجہ بھی ہے اور ان کو سہل کرنے والا بھی
ہے اب میں یہاں بمناسبت مقام تقویٰ کے متعلق ایک اشکال کا جواب دینا چاہتا
ہوں ترجمہ دیکھنے والے ذرا اس کا حل کریں وہ یہ کہ ھدی للمتقین پر اشکال وارد
ہوتا ہے کہ اس میں تو تحصیل حاصل ہے جو لوگ پہلے سے متقی ہیں اُن کو تو ہدایت
حاصل ہے پھر اُن کے واسطے ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے
کہ یہاں تقویٰ لغوی مراد ہے یعنی قرآن اُن لوگوں کے واسطے ہدایت ہے جنکے دل میں
خدا کا خوف ہو دوسرا جواب یہ ہے کہ مان لیا کہ تقویٰ شرعی ہی مراد ہے اور یہی مدار
تھا اشکال کا کہ تقویٰ شرعی کے بعد ہدایت کے کیا معنی ہدایت تو ایسے شخص کو پہلے
ہی سے حاصل ہے پس اس معنی کو تسلیم کر کے دوسرا جواب دیا جا سکتا ہے ایک بار ہردوئی
میں ایک مولوی صاحب کو چند جنٹلمینوں نے اس اعتراض سے پریشان کر رکھا تھا اور
وہ اسکو تسلیم کر رہے تھے کہ مراد تقویٰ شرعی ہی ہے مگر اشکال کو حل نہ کر سکے تھے میں بھی
اس جلسہ میں آ گیا اور میں نے اسی کی تائید کی نا کہ مولوی صاحب کی بات نیچی نہو مگر اس
اشکال کو سہل عنوان سے حل کر دیا جس سے سامعین کا شبہ زائل ہو گیا۔ وہ عنوان یہ تھا
کہ میں نے ان سے کہا کہ ھدی للمتقین ایسا ہے جیسے آپ لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ کورس
بی اے کا ہے۔ تو آپ بتلائیے کہ اس قول کے کیا معنی ہیں کیا یہ مطلب ہے کہ اس کو وہ پڑھتا ہے
جو بی اے ہو چکا کہنے لگے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کورس ایسا ہے کہ جو اس کو پڑھے گا
وہ بی اے ہو جائیگا میں نے کہا بس یہی مطلب اس کا ہے کہ یہ قرآن متقین کے واسطے ہدایت
ہے یعنی جو اسپر عمل کریگا وہ متقی بنجائیگا۔ اس تقریر سے وہ مولوی صاحب بہت خوش
ہوئے کیونکہ وہ اس مضمون کی تعبیر کرنا چاہتے تھے مگر قادر نہ تھے میری تعبیر سنکر ان کی
خوشی کی کچھ حد نہ رہی اور یہ جواب میرا گڑھا ہوا نہیں بلکہ منقول ہے جلالین میں الصائرین
الی التقوی سے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے لوگ تقویٰ کے درجہ کو
پہونچ جاتے ہیں مگر لوگ جلالین پڑھتے پڑھاتے تو ہیں سمجھتے نہیں ہیں۔ اسکے بعد ارشاد ہے
لعلکم تفلحون اسمیں ترغیب ہے کیونکہ سہولت عمل میں دو ہی چیزوں کو زیادہ دخل ہے

ایک ترہیب کو دوسرے ترغیب کو۔ واتقوا اللہ میں ترہیب تھی۔ اس جملہ میں ترغیب ہے اسمیں اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال مذکورہ کو سہل فرما دیا ہے اور اسکی اسواسطے ضرورت تھی کہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ سے دو طرح کا ہے ایک محکومیت کا ایک محبت کا محکومیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ تسہیل اعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے کیونکہ خود محکوم ہونا وجوب امتثال کیلئے کافی ہے مگر محبت کا مقتضا یہ ہے کہ تسہیل کا طریقہ بھی بتلا دیا جائے کیونکہ محبت خاص رعایت کو مقتضی ہوتی ہے خواہ حاکم کی جانب میں محبت ہو خواہ محکوم کی جانب میں اور دونوں طرف ہو تو نورٌ علیٰ نور۔ پھر اسکی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ ترغیب کے لئے اللہ تعالیٰ ہمکو اپنے کسی وصف کی طرف متوجہ فرماتے مثلاً یوں فرماتے کہ میں تمسے راضی ہوجاؤں گا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہمکو ہمارے وصف کی طرف متوجہ کیا جائے یہاں اللہ تعالیٰ نے دوسری صورت اختیار فرمائی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف تو ہم سے غائب ہیں اور اپنے اوصاف کو ہم زیادہ سمجھ سکتے ہیں تو ترغیب کے موقعہ پر یہ فرمانا کہ تمکو ان اعمال سے یہ وصف حاصل ہوجائیگا۔ زیادہ مؤثر ہے اسلئے ارشاد فرماتے ہیں کہ امید ہے تمکو ان اعمال سے فلاح حاصل ہوجائے گی۔ اسکو ہم جلدی سمجھ لیں گے کیونکہ فلاح ہمارا وصف ہے۔ پھر یہاں فلاح مطلق ہے جو فلاح دنیا و آخرت دونوں کو شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی فلاح کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اعمال شرعیہ کا اہتمام کیا جائے مگر آجکل لیڈروں نے فلاح دنیا کے طریقے کچھ اور سوچے ہیں یہ وہ صورت اختیار کرتے ہیں جو یورپ نے اور غیر اقوام نے اختیار کی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تدبیریں فلاح دنیا میں مؤثر نہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ مسلمانوں کے واسطے مفید نہیں کیونکہ مسلمانوں میں ان تدابیر کی تاثیر سے ایک مانع موجود ہے وہ کیا معصیت ؟ خدا کی نافرمانی۔ اور یہ مانع کفار میں نہیں ہے کیونکہ وہ مکلف بالفروع نہیں وہ تو صرف ایمان کے مکلف ہیں انکو کفر ہی کا عذاب ایسا سخت ہوگا جس سے بڑھکر کوئی عذاب نہیں بقیہ اعمال کی بابت نہ ان سے باز پرس ہے نہ ان پر کوئی سزا ہے اور مسلمانوں سے کفر کا عذاب تو ہٹا ہوا ہے کیونکہ بحمداللہ وہ دولت ایمان سے مشرف ہیں اسلئے ان کے اعمال پر باز پرس و گرفت ہوتی ہے جب یہ ایسے طریق فلاح دنیا کیلئے

۳۲

اختیار کرتے ہیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہیں تو ان کو کامیابی نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ ان تدابیر کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں تاکہ دنیا ہی میں مخالفت کی سزا بھگت لیں بس ان کی اور کفار کی ایسی مثال ہے جیسے ٹوپی اور جوتہ کہ ٹوپی میں نجاست لگجائے تو فوراً پھینکدی جاتی ہے اور اچھی طرح پاک کرنے کے بعد اُس کو استعمال کیا جاتا ہے اور جوتہ میں ناپاکی لگ جائے تو اسکو پھینکتے نہیں ہیں بلکہ رگڑ کر کام میں لے آتے ہیں تو جسطرح ہر چیز کے پاک کرنیکا طریقہ مختلف ہے اسی طرح ہر قوم کی فلاح و ترقی کا طریقہ الگ ہے یہ ضرور نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو نافع ہو وہ سبکو نافع ہو۔ اور اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ تدابیر ہمکو بھی نافع ہیں تب بھی ہمکو تو احکام الٰہیہ کا اتباع لازم ہے اور ان تدابیر غیر مشروعہ کا اختیار کرنا جائز نہیں کیا شراب اور قمار و سود میں نفع نہیں؟ ضرور ہے خود نص میں ارشاد ہے قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس مگر اس نفع کو لیکر کیا کریں جسکے ساتھ خدا کا غضب بھی ملا ہوا ہے اسلئے مسلمانوں کو وہی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں جو شریعت کے موافق ہوں اُسکی یہی صورت ہے کہ عمل کا اہتمام کیا جائے۔ اب لیڈر تدابیر تو خلاف شرع کرتے ہیں اور علماء کی شکایت کرتے ہیں کہ یہ ہماری ساتھ ملکر کام نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ اعمال غیر مشروعہ میں تو شرکت کر ہی نہیں سکتے اگر یہ اعمال مشروعہ بھی ہوتے تب بھی ان کی یہ شکایت صحیح نہ تھی کیونکہ ملکر کام کرنیکے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب کے سب ایک ہی کام کو لپٹ جائیں بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ کام تقسیم کر دیئے جائیں جیسے لوہار بڑھئی معمار مزدور سب ملکر مکان بناتے ہیں اسکے یہ معنی تھوڑا ہی ہیں کہ ہر اینٹ کو لوہار ہی ہاتھ لگائے بڑھئی بھی ہاتھ لگائے بلکہ اپنے اپنے کام کو ہر ایک الگ کر رہا ہے پھر نتیجہ مجموعہ پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر لیڈر شریعت کے موافق بھی تدابیر کریں تب بھی علماء کا یہ کام نہیں کہ وہ ان تدابیر میں عملی حصہ لیں بلکہ یہ کام عوام کا ہے یا لیڈروں کا علماء کا کام یہ ہے کہ جو تدبیر تم کرنا چاہو اول علماء سے استفتاء کر لو کہ یہ جائز بھی ہے یا نہیں وہ اسکے متعلق حکم شرعی بتلادینگے تم اسپر عمل کرو تمام متمدن اقوام کا یہی طریقہ ہے کہ اُن کے یہاں عملی محکمہ الگ ہوتا ہے علمی محکمہ الگ ہوتا ہے یہ نہیں کیا جاتا کہ ایک کام کیلئے طلبہ اور اساتذہ بھی اپنا پڑھنا پڑھانا

۳۳

چھوڑ دیں اور سب اگر اس کام میں لگ جائیں بلکہ یہ لوگ علمی ترقی میں بدستور لگے رہتے ہیں کام کرنیوالی جماعت دوسری ہوتی ہے بہرحال اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہم کی فلاح اطاعت وعمل ہی سے حاصل ہوگی دنیا میں بھی آخرت میں بھی اب چونکہ مسلمانو نے عمل صالح کو ترک کر رکھا ہے تو دیکھ لیجئے کیسی فلاح ہو رہی ہے کہ ہر روز پہلے سے بدتر ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عمل کی تاکید بھی فرمائی ہے اور تسہیل بھی ساتھ ساتھ ہے تکمیل وتتمیم بھی ساتھ ساتھ ہے پس یہ آیت عمل کے مکمل بیان کو حامل ہے اس لئے میں نے اسکو اختیار کیا تھا پھر لطف یہ ہے کہ آیت کے سب اجزاء ایک ہی شے کے متعلق ہیں یعنی عمل کے اور اسی کو دل چاہا کرتا ہے کہ ایک مجلس میں ایک ہی مضمون کا بیان ہو چنانچہ الحمد للہ اسوقت ایک ہی مضمون کے متعلق بیان ہوا ہے گو درمیان میں استطراداً دوسرے مضامین بھی آگئے مگر وہ سب تابع تھے اصل مضمون ایک ہی تھا اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمکو علم وعمل کا جامع بنائے اور ہمارے اعمال ظاہرہ وباطنہ کی اصلاح وتکمیل فرمائے مشائخ کی بھی اور طالبین کی بھی نیز مشائخ کو طالبین پر شفقت عطا ہو اور طالبین کو استفادہ واعتماد کی توفیق ہو اور سب کا خاتمہ بالخیر ہو آمین وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

تم بحمد اللہ الذی بنعمتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

اشرف علی

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ نمبر ۸۵ مسمّٰی بہ

الجبر بالصبر

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی و مولائی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

(احقر شبیر علی عفی عنہ)

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شایع کیا

۳۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی ب
الجبر بالصّبر

این	کہاں ہوا	تھانہ بھون بر مکان جناب بابو منشی اکبر علی صاحب مرحوم
متی	کب ہوا	۲۴ ذیحجہ ۱۳۴۷ھ بروز دوشنبہ بوقت صبح۔
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ ۴۵ منٹ
کیف	کس ہیئت پر ہوا	جالسا علی الکرسی
لم	کیوں ہوا	بدرخواست اہلخانہ جناب بابو منشی محمد مظہر علی صاحب دام ظلہم
ماذا	کیا مضمون تھا	چونکہ درخواست کنندہ کا ایک فرزند دلبند انتقال کر گیا تھا اور اسکے بعد منشی اکبر علی صاحب مرحوم کا وصال ہو گیا انکے بعد مولوی شبیر علی کے لخت جگر صغیر علی کا اور انکی ایک بھانجی کا انتقال ہوا اسلئے صبر کی تعلیم عجیب طرز سے دیگئی کہ یہ ثابت کر دیا گیا کہ دنیا میں جسقدر مصائب ہم پر واقع ہوتی ہیں سبکی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز ہمسے لیجاتی ہے دوسری [illegible]
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ووفقہ لما یحب و یرضی۔
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۵۰ تقریبا مجمع رجال و مجمع نساء پس پردہ اسکے علاوہ
الاشتات	متفرقات	یہ بیان اپنے مضمون میں واحد و بے نظیر ہے۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم **اما بعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥ یاایھا النبی قل لمن فی

اید یکم من الاسری ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیراً یؤتکم خیراً مما اخذ منکم ویغفر لکم واللہ غفور رحیم ٥ مجکو اسوقت جو مضمون بیان کرنا ہے یہ آیت اس باب کی تو نہیں ہے مگر اسکے مناسب ہے پھر ایک مناسب سے دوسرے مناسب تک پہونچکر مقصود کا بیان ہو جائیگا۔ اور گو مقصود کیلئے خاص آیات بھی موجود ہیں مگر مجھے اسوقت تعمیم مطلوب ہے اور وہ تعمیم اس مناسب سے زیادہ واضح ہوگی کیونکہ اسمیں مقصود کی علت بھی مذکور ہے یعنی ایتار نعم البدل کی جو کہ مقصود ہے علت کہ ایمان ہے مذکور ہے جسکے اشتراک سے مضمون زیادہ عام ہو جاویگا۔ اسلئے اسکو تلاوت میں اختیار کیا گیا۔ تعمیم کا یہ حاصل ہوگا کہ یہ آیت مقصود کو اور اسکے نظائر و اشباہ سبکو شامل ہو جائیگی۔ اس بیان کا محرک بعض واقعات کا پیش آنا ہے جو اہل واقعات کی طبیعت پر گراں ہیں اسلئے گرانی کے ہلکا کرنے کی ضرورت ہے اور وہ واقعات مشترک النوع مختلف الاصناف ہیں نوع تو وفات ہی اور اصناف میں بعض وہ ہیں جو چھوٹوں کے فوت ہونے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی بچوں کے انتقال سے اور ایک واقعہ ایسا ہے جسمیں فوت ہونیوالی بعض کے لحاظ سے بڑے تھے بلکہ اکثر کے لحاظ سے بڑے تھے اور بعض کے لحاظ سے ہمسر تھے اور وہ اپنے بھائیوں کے لحاظ سے بھی ہمسر تھے گو کچھ تھوڑا بہت عمر میں فرق ہو مگر اخوت کا تعلق ایسا ہے کہ اسمیں ہمسری کا رنگ غالب ہوتا ہے تھوڑے سے فرق سے اسمیں ہمسری فوت نہیں ہوتی یہ واقعات تو اقارب میں پیش آئے اور کل ایک دوست مہمان آئے ہیں اُنکے بھی بچہ کا انتقال ہو گیا ہے تو اب یہ مضمون اقارب و احباب سبکے لئے خاص طور پر مفید ہے اور چونکہ اسوقت تعمیم کے ساتھ بیان ہوگا اسلئے ہر ناگوار واقعہ میں اس سے نفع ہوگا اور کم و بیش ہر شخص کو دنیا میں کوئی نہ کوئی واقعہ ناگوار ضرور پیش آتا ہے اور جسکو پیش نہ آیا ہو اسکو آئندہ پیش آنیکا احتمال ہے اسلئے یہ مضمون سبکی ضرورت کا ہے اسی لئے علوم دینیہ کی ہر شخص کو ضرورت ہے تاکہ وقوع کے وقت اس سے کام لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے واقعات کا بھی پہلے سے انتظام فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے سیقول السفہاء من الناس ما ولّٰھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا یہ آیت تحویل قبلہ کے متعلق ہے کیونکہ قبلہ کے احکام اول اول بدلتے رہے ہیں پہلے مسلمانوں کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اسکو عارضی قبلہ بنایا تھا اور آئندہ

اُسکو منسوخ کرنا تھا اور اسپر کفار کی طرف سے اعتراض واقع ہونیوالا تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے
اس کا اہتمام فرمایا کہ آئندہ واقع ہونیوالے اعتراضات سے مسلمانوں کو زیادہ رنج نہ پہونچے
تو پہلے ہی سے اطلاع فرمادی کہ بیوقوف اور نادان لوگ تمھارے اوپر اس اس طرح اعتراض کرینگے
تم اُن سے دلگیر نہونا اور اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ اعتراض سے اثر تو ہوتا ہی ہے اکابر پر بھی اثر
ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی صبر کرتا ہے کوئی جواب دیتا اور انتقام لے لیتا ہے ہمارے اکابر
کا معمول یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پر صبر کرتے ہیں اور اسمیں ایک لطیف راز ہے جو ذوقاً میرے
قلب میں اللہ تعالیٰ نے ڈالا ہے وہ راز یہ ہے کہ یہ حضرات ہر شخص کو اُسکے مقصود تک پہونچانا چاہتے ہیں
اور چونکہ معترض کا مقصود ایذا ہے[ع] اسلئے اُسکو مقصود میں کامیاب کرنے کیلئے جواب نہیں
دیتے کہ اگر جواب دینگے تو اُس کا مقصود حاصل نہو گا کیونکہ جواب دینے سے شفاءِ غیظ ہو جاتا اور
اعتراض کا اثر ہلکا ہو جاتا ہے پس وہ ایک مسلمان کا جی خوش کرنے کیلئے جواب نہیں دیتے غرض
اہل اللہ بےحس نہیں ہوتے اُنکو بھی اعتراض سے اثر ہوتا اور اُن کا بھی دل دکھتا ہے مگر وہ بعض
وجوہ سے صبر کرتے ہیں۔ اگر اعتراض سے اثر نہو تو صبر میں فضیلت ہی نہو گی اس لئے اللہ تعالیٰ
نے واذا ما غضبوا ھم یغفرون فرمایا ہے کہ جب اُنکو غصہ آتا ہے تو معافی اور درگذر سے
کام لیتے ہیں لم یغضبوا نہیں فرمایا کہ اُنکو غصہ ہی نہیں آتا کیونکہ غصہ کا نہ آنا کمال نہیں
کمال یہ ہے کہ غصہ آئے اور اُس کے مقتضیٰ پر عمل نہو بعض لوگ اہل اللہ کو فانی سمجھکر
اُنکی ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں کہ بیدھڑک جو چاہتے ہیں اعتراض کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں
کہ ان پر اثر نہو گا سو وہ خوب سمجھ لیں کہ اثر اُنپر بھی ہوتا ہے اور وہ صبر کرتے ہیں اور انکے صبر کا
وبال اشد ہے حضرات صحابہ کو بھی اعتراض سے ناگواری ہوتی تھی کیونکہ اسی میں اجر ہے مگر
ناگواری زیادہ ہو تو ناقابل برداشت ہو جاتی ہے جس سے دنیا اور دین کے کاموں میں خلل
واقع ہونے لگتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام فرمایا کہ گو ناگواری ہو مگر ہلکی ہو تاکہ

[ع] وفیہ ان ہذا المقصود حرام والاعانۃ علی الحرام حرام والاسلم ان یقال انہم لا یجیبون عملا بقولہ تعالیٰ ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور وانما کان من عزم الامور لما فیہ من مجاہدۃ النفس وتسکین الدہما رلما فی الانتقام والانتصار للنفس آثارۃ الفتنۃ وزیادتہا ولذا سمی اللہ تعالیٰ جزاء السیئۃ وان کان عدلا فی الحقیقۃ ولکنہ یزید الشر ویورث البغضاء وفیہ ان ہذا من الاحوال لا من الاعمال والاعانۃ من الاعمال ۱۲ منہ۔

قابل برداشت ہو جائے اور اجر زیادہ ہو۔ حاصل انتظام کا یہ ہے کہ پہلے سے خبر دیدی کہ بیوقوف لوگ عنقریب اعتراض کرینگے اور ظاہر ہے کہ پیش آنے والی بات سے پہلے ہی مطلع کر دینا ناگواری کو کم کر دیتا ہے کیونکہ ناگواری خلاف توقع سے ہوا کرتی ہے مثلاً آپ کسی شخص سے یہ توقع کرکے ملنے جائیں کہ وہ آپکی بہت زیادہ تعظیم و مدارات کرے گا اسکے بعد اگر اُسکی طرف سے ذرا بھی خاطر کرنے میں کمی ہوگی تو بہت رنج پہونچے گا اور اگر اُس سے کوئی توقع نہو تو اب اُسکی بیرخی اور روکھے پن سے زیادہ ملال نہو گا کیونکہ اُس سے کچھ امید ہی پہلے سے نتھی غرض ناگواری ہمیشہ خلافِ توقع سے ہوتی ہے اسی لئے حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ نے ایکبار اپنے استاد الاستاذ کا مقولہ بیان فرمایا کہ راحت اگر چاہتے ہو تو کسی سے توقع نرکھنا پھر مولانا نے حاضرین جلسہ سے فرمایا کہ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو خدام نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مربی اور محسن ہیں اور ہمسے زیادہ ہمارے حال پر شفقت فرماتے ہیں۔ فرمایا مگر میں تمسے خیر خواہی کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھسے بھی توقع نرکھنا اس کا اثر یہ ہوگا کہ اس حالت میں جو کچھ خدمت مجھسے ہو جائیگی اُسکو غنیمت سمجھو گے اور خلاف توقع ہونے کی وجہ سے مسرت ہوگی اور کسی وقت میں خدمت میں کمی کروں تو تمکو شکایت اور ناگواری نہوگی۔ اور یہی راز اس کا ہے کہ میں نے حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ سے حاجی صاحبؒ کے وصال کے بعد بیعت نہیں کی حالانکہ مجھے رغبت تھی مگر میں نے اسی لئے بیعت نہیں کی کہ حضرت کی عنایات تو میرے حال پر بدون بیعت کے بھی بہت ہیں اور جس تعلق کیلئے بیعت کیجاتی ہے وہ مجھے بدون بیعت کے بھی حضرت سے حاصل ہے اور بیعت سے یہ ہوگا کہ حضرت کے حقوق مجھپر زیادہ ہو جائیں گے اُسوقت اگر کسی بات میں بھی کمی ہوئی تو ممکن ہے حضرت کو ناگواری ہو اور اب حضرت کو میری طرف سے کسی قسم کے حقوق کا انتظار نہیں ہیں جسقدر بھی حق تعلق ادا کروں وہ سراسر موجب انشراح ہے تکدر کا احتمال ہی نہیں اور بیعت کے بعد تکدر کا احتمال بھی تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص اسکو میری نفس کی تاویل سمجھے مگر حقیقت میں جو وجہ تھی وہ میں نے بیان کر دی بہرحال چونکہ ناگواری ہمیشہ خلاف توقع سے ہوتی ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے مطلع فرما دیا کہ تم پر اعتراضات بھی ہونگے اسلئے اُن کے لئے ابھی سے آمادہ ہو جاؤ۔ اور یہیں سے نکتہ معلوم ہوتا ہے اس کا کہ اللہ تعالیٰ

نے الذین اذا اصابتھم مصیبۃ فرمایا ان اصابتھم نہیں فرمایا کیونکہ اذا یقین کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور ان احتمال کے موقعہ پر پس اذا اصابتھم میں تبلادیا گیا کہ مصیبت تو آوے ہی گی ؎

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید زجام دہر مئی کل من علیہا فان

اور اس علم کے بعد مصیبت سے وہ غم نہیں ہوتا جو دفعۃً آنے سے ہوتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ بڑے عاقل ہیں جو موت کو ہر دم یاد کرتے رہتے ہیں کیونکہ اُن پر موت دفعۃً نہ آئے گی اسلئے اُنکو موت سے وحشت بھی نہ ہوگی۔ دنیا دار اپنے کو عاقل سمجھتے ہیں یہ غلط ہے وہ بہت سے بہت آکل ہیں عاقل نہیں ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے دل میں حساب دکتاب معاش کا لگاتے رہتے ہیں اور بڑے بڑے منصبے قائم کرتے ہیں اور وہ حساب وکتاب پورا ہوتا نہیں کیونکہ ؎

ما کل یتمنی المرأ یدرکہ تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

تو جب خلاف امید واقعات ان کو پیش آتے ہیں اُسوقت سخت پریشانی کا سامنا ہوتا ہی اور اہل اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت یہ سمجھتے ہیں شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ اور اسکا محض احتمال کافی نہیں کیونکہ احتمال تو سارے عالم کو ہوتا ہے کہ شاید آج موت آجائے بلکہ اُنکی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے اُس شخص کی حالت ہوتی ہے جسکے پاس بادشاہ کا پیام پہونچ جائے کہ آج ہم تمکو بلانیوالے ہیں تیار رہنا۔ اور کوئی وقت مقرر نکرے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ اس شخص کا سارا دن اہتمام ہی میں گذر جاتا ہے اسیطرح اہل اللہ ہر وقت اپنے معاملات کو صاف کرتے رہتے ہیں تاکہ جسوقت بلاوا آجاوے خوشی سے چلنے کو تیار ہو جائیں۔ صاحبو! احتمال وہی معتدبہ ہے جسکے مقتضا پر عمل ہو ورنہ یوں تو ڈاکو کو بھی ڈاکہ ڈالنے کے وقت سزا کا احتمال ہوتا ہے۔ مگر جب اُسکے مقتضا پر عمل نہو تو ایسا احتمال چولھے میں ڈالنے کے قابل ہے پس اہل اللہ کو شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ کا احتمال مع العمل ہوتا ہے کہ وہ حقوق اللہ وحقوق العباد سے سبکدوشی کی فکر کرتے رہتے ہیں اگر نمازیں فوت ہوئی ہیں

؎ انسان کی ہر آرزو پوری نہیں ہوا کرتی بلکہ ہوائیں کبھی کشتی کے خلاف بھی چلتی ہیں ۱۲ ظ

ہو قضا کر لیتے ہیں یا قضا کرتے رہتے ہیں اسپر تم شاید یہ کہو کہ دس سال کی نمازیں ایک دن میں
س طرح قضا ہونگی اور جب قضا نہ ہو سکیں تو ہر دم موت کیلئے کیونکر تیار ہو سکیں گے اس کا
اب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جس شخص کو ادا کا اہتمام ہو گیا اور اپنی وسعت کے
افق کام بھی کرنے لگا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مثل ادا کرنے والے ہی کے ہے پس وہ
پنی وسعت کے موافق ادا کرتا رہے اور جو رہ جاوے اسکے متعلق وصیت کر جائے جو ثلث
ال سے زیادہ میں صحیح نہیں اور اسمیں بھی بندوں کے حال پر عنایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
بندوں کے حقوق کو (بوجہ انکی احتیاج کے) اپنے حقوق سے (بوجہ استغفار کے) مقدم رکھا
ہیں فرمایا کہ نماز روزہ وغیرہ کے فدیہ کی وصیت ثلث سے زائد میں نکرو کیونکہ اسمیں ورثہ کا
نقصان ہے اور ہمارا کوئی نقصان نہیں ہمتو اگر چاہیں ویسے بھی معاف کر دیں گے پس اگر
سی شخص کے ذمہ لوگوں کا ایک لاکھ روپیہ قرض ہو اور وہ آج ادا کرنیکا ارادہ کرے تو جتنا اس سے
ہو سکے ادا کرنا شروع کرے جسکے لئے اسکی ضرورت نہیں کہ اپنے کو زیادہ تنگی میں ڈالی بلکہ اپنے
والج ضروریہ سے جو فاضل ہو اسکو قرض میں دینا شروع کرے خواہ ایک ہی روپیہ ماہوار ادا
رنا شروع کر دے تو وہ آج ہی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سبکدوش قرار پائیگا مگر یہ ضروری ہے
فضول خرچوں کو بند کر دے اب اگر اس نے ایک لاکھ میں سے ۵ ہی ادا کئے اسکے بعد
موت آگئی تو وہ عند اللہ کالمؤدی ہے۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مقروض کو فضول خرچ بند
کر دینا چاہیے اسپر ایک قصہ یاد آیا کہ مولانا نواب قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت
مقروض تھے۔ ایک دفعہ آپنے دہلی کے سب بزرگوں کی دعوت کی شاہ محمد اسحٰق صاحب کو بھی
مدعو کیا اور مولانا مظفر حسین صاحب کاندہلوی کو بھی مدعو کیا سب حضرات نے تو دعوت
قبول کر لی مگر مولانا مظفر حسین صاحب نے منظور نکی نواب صاحب نے شاہ اسحٰق صاحب سے انکی
شکایت کی شاہ صاحب نے فرمایا کہ مولوی مظفر حسین کیا تمکو نواب صاحب کی آمدنی میں بھی
شبہ ہے اور کیا تمہارے نزدیک ہم نے مشتبہ مال کی دعوت قبول کی ہے مولانا مظفر حسین صاحب
نے عرض کیا کہ حضرت میں آپکے سامنے کیا چیز ہوں جو نواب صاحب کے مال کو مشتبہ
سمجھوں مگر میں نے اسواسطے دعوت سے عذر کیا کہ نواب صاحب مقروض ہیں اور دعوت

میں وہ رئیسانہ خرچ کرینگے جو تین چار سو روپیہ سے کم نہوگا اور مقروض کو ایسا کرنا جائز نہیں اُ
لازم ہے کہ جو رقم دعوت میں خرچ کریں اُسکو قرض ہی میں ادا کر دیں تو عند اللہ کچھ سبکدو
ہو جائے شاہ صاحب نے یہ بات سُنکر فرمایا کہ بھائی اس طرف ہمارا ذہن بالکل نہیں گیا واقع
تمھاری رائے صحیح ہے اور اب ہم بھی دعوت قبول نکرینگے چنانچہ سب بزرگوں نے انکار کر
اور یہی کہا کہ آپکو بجائے دعوت میں رقم لگانیکے قرض میں یہ رقم ادا کرنا چاہئے۔ حالانکہ اُ
قرضہ میں اس رقم سے کچھ سہارا نہ لگتا تھا کیونکہ قرض بہت تھا مگر عند اللہ اتنا ادا کرنا بھی معتبر
دنیاداروں کے یہاں تو قاعدہ یہ ہے کہ ایک لاکھ میں سے ایک روپیہ ادا کرنا معتبر نہیں مگر
عند اللہ معتبر ہے یعنی وہ اس سے راضی ہو جاتے ہیں دنیاداروں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک
راجہ پر ایک لالہ کا قرض تھا اُس نے عدالت میں نالش کی حاکم نے لالہ سے کہا کہ سود معاف
اور اصل لیلو اُس نے انکار کیا کہ ہمارا تو کاروبار سود ہی پر ہے اور یہی ہماری کمائی ہے اسکو
معاف کردوں حاکم نے کہا بہت اچھا تم اصل بھی لو اور سود بھی لو چنانچہ اُس نے مع سود
ڈگری کر دی مگر فیصلہ میں یہ لکھا کہ قرض قسط وار وصول کیا جاوے اور قسط ایک روپیہ سال
مقرر کر دی کیونکہ حاکم کو یہ اختیار ہے کہ جتنی چاہے قسط مقرر کر دے۔ اس فیصلہ سے لالہ تو
زندہ درگور ہو گیا اُسکے نزدیک یہ ادا قابل شمار نہوئی مگر عند الحاکم معتبر ہے وہ شبہ جاتا
کہ اگر کسی کے ذمہ دس سال کی نمازیں قضا ہوں یا دس لاکھ روپیہ قرض ہو تو وہ ایک د
میں کیونکہ سبکدوش ہو سکے گا سو میں نے بتلا دیا کہ ایک دن کے اندر ہی انسان تمام حقوق
سے حکماً سبکدوش ہو سکتا ہے تو اہل اللہ موت کو یاد کرتے ہیں اور اسکے مقتضا پر عمل بھی
کرتے ہیں اس سے انکو آخرت کا نفع تو ہوتا ہے دنیا میں بھی راحت ہوتی ہے کیونکہ جب
وہ ہر دم موت کو یاد کرتے ہیں تو کسی مصیبت سے وہ پریشان نہیں ہوتے کیونکہ جب اُن
موت سے جو اشد الحوادث ہے وحشت نہیں تو اور کسی حادثہ سے پریشانی کیوں ہوگی اور د
کو موت سے بہت وحشت ہے اسلئے وہ ہر ایسی مصیبت سے پریشان ہو جاتا ہے جسمیں موت
کا خطرہ ہو چنانچہ شاید مولانا جامی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بڑھیا کی لڑکی جسکا نام مہستی
تھا بیمار ہوئی تو بڑھیا اُسکی محبت میں کہا کرتی کہ اے موت مجھے لیلے اور بچی کو چھوڑ دے ایک دا

گھر میں بیٹھی تھی کہ اُسکی گائے محلہ میں کسی کے گھر میں چلی گئی اور ہانڈی میں منہ ڈالدیا ہانڈی
سکے منہ میں پھنس گئی اور وہ اسی حلیہ سے گھر میں آئی تو بڑھیا یہ سمجھی کہ یہ موت ہے جسکو
ں روزانہ پکارا کرتی تھی تو وہ گھبرا کر کہتی ہے کہ ؎

گفت اے موت من نہ مہستیم — پیرزال غریب محنتیم

اے موت میں مہستی نہیں ہوں مہستی تو وہ سامنے پلنگ پر پڑی ہے میں تو غریب بڑھیا
ہوں۔ موت کے خیال سے ہی ساری محبت اور مامتا جاتی رہی اب وہ موت سے کہتی ہے
کہ مہستی وہ پڑی ہے اُسے لیلے بات یہ ہے کہ انسان بڑا خود غرض ہے اسکو اولاد سے
محبت بھی اپنے حظ نفس کیلئے ہے کہ اُنکے تماشے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور یہ جو بعض
لوگ کسی کی محبت میں جان دیدیتے ہیں شاید کوئی یہ سمجھے کہ وہ دوسرے کو اپنی جان سے
زیادہ عزیز سمجھتا ہے یہ غلط ہے بلکہ وہ بھی حظ نفس کیلئے جان دیتا ہے کیونکہ وہ رنج عشق
کے تحمل سے اپنے کو عاجز سمجھتا اور جس کی وجہ سے موت کی تکلیف کو اس سے اخف سمجھتا ہے
اسلئے وہ موت کو اس کلفت پر اپنی ہی راحت کیلئے ترجیح دیتا ہے پس انسان سب خود
غرض ہیں خواہ دین کی غرض ہو یا دنیا کی پھر دینداروں میں بھی کوئی ثواب کی نیت کرتا ہے
کوئی ثواب سے بھی بالا ہے مگر وہ بھی خود غرض ہے کیونکہ وہ رضائے حق کا طالب ہے اور یہ
غرض سب سے بالاتر ہے جیسے ایک صاحب حال بزرگ کے سامنے کسی نے دوسرے کو کہا
پانی پلادے ثواب ہوگا یہ سنکر فرمایا ہائے ثواب کیلئے پانی پلاتے ہو محبوب کیلئے نہیں پلاتے
ظاہر میں یہ بزرگ بےغرض معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بھی غرضمند تھے کیونکہ وہ ایسی
غرض کے طالب تھے جس سے بڑھکر کوئی غرض نہیں حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ
نے ایکبار رسالہ ارشاد مرشد مجھے دیا کہ مطبع نظامی میں طبع کرادیا جائے کیونکہ مطبع نظامی
میں تصحیح وخوبی طبع کا اہتمام تمام مطبعوں سے زیادہ تھا چنانچہ رسالہ طبع کراکے میں حضرت کی
خدمت میں بھیجا حضرت نے اُسکے مصارف دریافت فرمائے تو میں نے عرض کیا حضرت
عبدالرحمن خاں صاحب بڑے سخی ہیں انھوں نے اس کا کچھ عوض نہیں لیا محض ثواب
کیلئے طبع کردیا ہے۔ فرمایا کہ عبدالرحمن خاں کو تم سخی کہتے ہو وہ تو بڑے بخیل ہیں کہ ایک ذرہ سے

سکے بدلہ میں سات سو روپئے کے طالب ہیں انھوں نے یہاں بھی اپنی تجارت کو نہیں چھوڑا!
میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان سب خود غرض ہیں اسلئے اپنی جان سے زیادہ کسی کو کسی سے محبت
نہیں اسلئے دنیادار لوگ موت سے اور مصائب سے بہت گھبراتے ہیں اور اہل اللہ چونکہ
موت کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اُسکے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں اسلئے اب اُنکو نہ بیوی کے
مرنے کا رنج ہوتا ہے نہ بچہ کا کیونکہ وہ تو خود ہی موت کیلئے تیار ہے اور انکی ہر بات سے دوسرے کو
یہ محسوس ہوجاتا ہے کہ یہ ہر دم موت کیلئے تیار ہیں چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کی
خدمت میں ایک شخص روتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے دعا فرما دیجئے کہ حق تعالیٰ
اُسکو شفا عطا فرمائیں حضرت نے ہنسکر فرمایا کہ عجیب بات ہے ایک شخص قید خانہ سے چھوٹ
رہا ہے اور دوسرا روتا ہے کہ یہ قید خانہ سے کیوں رہا ہوتا ہے وہ کہنے لگا حضرت میری روٹی
کون پکائیگا۔ فرمایا جی ہاں جب تم ماں کے پیٹ میں تھے تو وہ وہاں بھی تمکو روٹی پکا کر کھلاتی
ہوگی۔ پھر فرمایا کہ میاں تم بھی چند روز میں وہیں پہونچنے والے ہو جہاں وہ جا رہی ہے میں نے
دل میں کہا کہ آیا تو تھا بیوی کو موت سے بچانے اپنی ہی موت کی بشارت لیچلا اُسوقت
تک تو حضرت ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اسکے بعد ایک ایسی بات پر برہم ہوگئے جو آجکل
برہم ہونے کی بات نہیں سمجھی جاتی بلکہ حب دین کی علامت سمجھی جاتی ہے وہ کہنے لگا کہ حضرت
فلاں شخص نے مجھے مدینہ لیجانیکا وعدہ کیا تھا اب وہ وعدہ سے ہٹنے لگا ہے دعا فرما دیجئے
کہ وہ مجھے مدینہ لیجائے بس حضرت یہ سنتے ہی برہم ہوگئے فرمایا ہمارے سامنے شرک کی باتیں
نکرو (غیر اللہ پر اتنی نظر کہ اُسکے ہی لیجانے سے تو تم مدینہ پہونچوگے) حضرت کی مجلس میں بیٹھکر
بات بات سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہر دم موت کیلئے تیار ہیں اور ہر کام میں خدا تعالیٰ پر نظر ہے
اب ایسے شخص پر موت گراں کیوں ہوگی اور وہ کسی مصیبت سے کیوں پریشان ہوگا۔ غرض جس
مصیبت کیلئے انسان پہلے سے آمادہ رہے اُسپر وہ مصیبت خفیف ہوجاتی ہے۔ اس لئے
اللہ تعالیٰ نے سَیَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ میں صحابہ کو پہلے سے مطلع فرما دیا کہ تحویل قبلہ
کے وقت تمپر اعتراضات ہوں گے اُنکے لئے آمادہ ہو جاؤ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے
اس کا اہتمام فرمایا ہے کہ آئندہ واقعات سے مسلمانوں کو زیادہ رنج و کلفت نہو اور اسی لئے

شریعت کی تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم میں اس کا لحاظ فرمایا ہے کہ پریشانی اور غم اس سے ہلکا ہو جاتا ہے میں ایسا ہی مضمون بیان کرتا ہوں کہ اسکے استحضار سے کسی غم میں ثقل نہ رہیگا۔ یہانتک داعی اور محرک کا بیان تھا اب میں مضمون کا حاصل حقیقت کے لحاظ سے بتلانا چاہتا ہوں تو اس مضمون کی حقیقت اس عنوان سے جو آج بیان ہوگا شاید کبھی سننے میں نہ آئی ہوگی اس لحاظ سے یہ تعلیم جدید ہے گو فی الواقع علوم دینیہ سب قدیم ہیں مگر ہمارے علم وسماع کے لحاظ سے بعض علوم جدید ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے انکو سنا نہیں یا خاص عنوان سے نہیں سنا۔

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ جنگ بدر میں (اور بدر ایک موقع کا نام ہے جہاں غزوہ ہوا تھا) کچھ کفار قید ہو کر آئے تھے جنکو فدیہ لیکر چھوڑ دیا گیا۔ حق تعالیٰ کو یہ امر ناپسند ہوا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اسکے بعد ان قیدیوں کے متعلق ارشاد ہے۔ یاایہا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسریٰ ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یؤتکم خیرا مما اخذ منکم ویغفر لکم اے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں سے جو آپ کے ہاتھوں میں قیدی ہیں فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالےٰ تمھاری قلوب میں کچھ بھلائی دیکھیں گے (مراد ایمان ہے) تو تمکو اس مال سے بہتر (عوض) عطا فرمائیں گے جو تمسے (اسوقت فدیہ میں) لیا گیا ہے اور تمھاری مغفرت فرما دینگے۔ مراد یہ ہے کہ تمکو دنیا ہی میں اس کا عوض اس سے بہتر عطا فرما دینگے مقابلہ مغفرت سے ظاہر یہی ہے کہ اس جملہ میں اعطاء فی الدنیا مراد ہے اور جملہ ثانیہ میں اجر آخرت مراد ہے ویغفر لکم یعنی آخرت میں تمھاری مغفرت فرما دینگے واللہ غفور رحیم کہ اللہ تعالیٰ تو بہت مغفرت فرمانے والے اور رحم فرمانے والے ہیں (اسلئے تمکو اس وعدہ میں تردد نکرنا چاہئے ۱۲) حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اگر تمھارے دل میں ایمان ہو تو تمکو اس مالی نقصان کا اندیشہ نکرنا چاہئے جو فدیہ سے اسوقت پہونچا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمکو دنیا وآخرت میں اس کا نعم البدل عطا فرمائینگے اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر نقصان ومصیبت کا نعم البدل ملتا ہے اور ہر چند کہ مورد آیت کا خاص ہے مگر جس امر پر اس وعدہ کو مرتب فرمایا ہے وہ مورد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اسلئے آیت سے یہ قاعدہ مفہوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر مصیبت کا نعم

البدل ملتا ہے یہاں تو تعمیم پر کوئی صیغہ صراحۃً دال نہیں مگر دوسری نصوص سے اس تعمیم کی تائید ہوتی ہے۔ اس وعدہ اور قاعدہ کو ملحوظ رکھکر ایاب اور حقیقت واضح ہوئی وہ یہ کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے یہی حقیقت ہماری نظر سے غائب ہوتی ہے اسلئے مصیبت سے رنج زیادہ ہوتا ہے۔ اب دیکھو کہ تجارت میں انسان یہ چاہا کرتا ہے کہ میرے مال کی نکاسی ہو کہ جو چیزیں میرے ہاتھ کے تلے ہیں کوئی اُن کا لینے والا خریدنے والا ہو اگر خریدار کوئی نہ آئے تو تاجر گھبرا جاتا ہے خاصکر ایسی اشیاء میں جو باقی رہنے والی نہیں جیسے کل روز برف بہت ارزاں دلی کے بھاؤ پر ملگیا تھا کیونکہ خریدار کم ہوئے اور برف کا رہنا دشوار تھا اسلئے دہلی کے بھاؤ پر یعنی اپنی خرید پر ہی دیگیا شہروں میں تو ایسا بہت ہوتا ہی کہ شام کو برف نہایت ارزاں ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تاجر اپنے مال تجارت کے پڑا رہنے پر رنجیدہ ہوتا ہے نکل جانے پر رنجیدہ نہیں ہوتا حالانکہ وہ اپنے خریداروں کے ہاتھ ایک محدود نفع پر بیچتا ہے مگر پھر بھی وہ خریداروں کا مشتاق رہتا ہے کہ کوئی میرا مال لیلے مرابحہ نہو تو تولیہ ہی ہو تو لیہ نہو تو میلی کچیلی صافی ہی سہی۔ یعنی نفع نہو تو کچھ خسارہ ہی سہی چنانچہ بعض دفعہ ایسے مال کو جس کا خریدار کوئی نہو کسیقدر خسارہ سے بھی فروخت کر دیتا ہے جب تجارت کی یہ حقیقت ہے۔ تو صاحبو! اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ یہ واقعات رنج و مصیبت تمامتر تجارت ہی ہیں اور تجارت بھی ایسی جس سے بڑھکر نفع کسی تجارت میں نہیں ہوتا تو کیا پھر بھی دشیون باقی رہے گا۔ میں رنج طبعی کا منکر یا مانع نہیں جو فطری طور پر ہوتا ہے بلکہ میں آگے اسکی ضرورت پر کلام کرونگا کہ طبعی رنج تو ہونا چاہیئے ورنہ ثواب و اجر ہی نہوگا مگر میں اسوقت رنج عقلی کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں کہ واقعاتِ رنج و مصیبت کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد رنج عقلی نہونا چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حالات کی دو قسمیں ہیں گوارا و ناگوار پھر ان میں سے ہر اک کی دو قسمیں ہیں اختیاری و غیر اختیاری یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے جنمیں سے ہر اک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں اور مؤمن اگر ان کے حقوق ادا کرتا رہے تو اسکو نعم البدل ملتا ہے اسلئے مؤمن کسی حالت میں نقصان میں نہیں بلکہ ہر حالت میں نفع میں ہے۔ اسی لئے حدیث میں ہے نعم الرجل المؤمن

ان اصابتہ سراء حمد وان اصابتہ ضراء صبر وفی کل اجر اوکما قال مؤمن آدمی بڑی اچھی حالت میں ہے اگر اسکو راحت پہونچتی ہے حمد و شکر کرتا ہے اگر تکلیف پہونچتی ہے صبر کرتا ہے اور ہر ایک میں اسکو اجر ملتا ہے یعنی شکر میں بھی اجر ہے اور صبر میں بھی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امور غیر اختیاریہ میں جو اجر ہے وہ اُن اعمال کی وجہ سے ہے جو اختیاراً اسوقت مؤمن سے صادر ہوتے ہیں یعنی راحت میں حمد جسکی حقیقت یہاں شکر ہے اور وہ ایک عمل ہے جو اس نے حق تعالیٰ کی حضور میں پیش کیا ہے اسکے عوض میں اجر ملتا ہے اور مصیبت میں صبر کرنا بھی ایک عمل ہے جسپر اجر ملتا ہے پس دونوں صورتوں میں نعم البدل اسی عمل پر ملا جو اختیاری ہے پس جس طرح یہاں ان کے اعطاء واخذ کے عوض میں بھی انسان کے اوپر کچھ حقوق ہیں یعنی شکر و صبر مثلاً حق تعالیٰ بندہ کو نعمت مال عطا فرمائیں یا نعمت اولاد تو اسکے عوض میں اسکے اوپر شکر واجب ہے یا اس سے مال و اولاد کو لیلیں تو اسپر صبر واجب ہے اسی طرح اعراض و اعمال پر بھی یہ حقوق ہیں مثلاً نماز روزہ وغیرہ کی توفیق عطا فرمائیں یا ذکر میں انوار و علوم عطا فرمائیں تو اسپر شکر لازم ہے اور اگر ذکر میں انوار و کیفیات سلب ہو جائیں تو اسپر صبر لازم ہے اور یہاں خود اعمال پر بھی اجر ملتا ہے اور ان کا شکر ادا کرنے پر بھی اجر ہے چنانچہ نماز روزہ حج زکوٰۃ کے عوض تو اسکو وہ اجر ملتا ہے جو خیال سے باہر ہے حدیث میں ہے اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر تو نماز روزہ حج وزکوٰۃ پس جملہ اعمال صالحہ کا بجالانا بھی ایک تجارت ہوئی جسکے نفع کی یہ شان ہے کہ ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　کہ بیک گل می خری گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　انچہ در وہمت نیاید آں دہد

اور اگر عبادت کا تعلق اموال سے ہو تو وہ بھی تجارت ہے جسکے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے صراحۃً لفظ ارشاد فرمایا ہے ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم الجنۃ جسمیں تجارت کی حقیقت پر صاف طور سے تنبیہ ہے اور قال تعالیٰ فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین یشرون الحیوۃ الدنیا بالآخرۃ ط وفیہ لفظ الشراء بمعنی البیع وقال

اولئك الذین اشتروا الضللة بالھدی فما ربحت تجارتھم وما کانوا مھتدین ط
وفیہ ان اختیار الکفر صفقۃ خاسرۃ وقال تعالیٰ ولبئس ما شروا بہ انفسھم لو کانوا یعلمون
۱۲) چونکہ تجارت کی طرف طبائع عام طور سے راغب ہیں اسی لئے تجارت کا عنوان اللہ تعالیٰ
نے اختیار فرمایا کہ تم جو اعمال کرتے ہو وہ درحقیقت یہ ایک معاملہ تجارت ہے جو اللہ تعالیٰ
کے ساتھ تم کر رہے ہو۔ افسوس نماز کو ہم لوگوں نے اسی لئے مصیبت سمجھ لیا ہے کہ اس کی
حقیقت نہیں سمجھی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اسکی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز دیدی اور ایک
چیز لیلی تو نماز سے کبھی گرانی نہو اور نہ اسکو بیگار کی طرح ٹالا جائے بلکہ جسطرح تاجر اپنے مال کو
صاف ستھرا رکھتا ہے اور خوبصورت بنا کر خریدار کو دیتا ہے اسی طرح ہم بھی نماز کو خوبصورتی
کے ساتھ ادا کیا کرتے یہ تو گوارا حالات کے متعلق بیان تھا اب ناگوار حالات کے متعلق سنئے
کہ ان میں بھی تجارت کی حقیقت موجود ہے اور گو اس حقیقت سے جہل عام ہے نعمتوں میں
بھی اور مصائب میں بھی مگر نعمتوں میں اس جہل کا وہ ضرر نہیں جو مصائب میں ہے کیونکہ
نعمتوں میں رنج تو نہیں ہوتا جس سے پریشانی بڑھکر دین اور دنیا کے کاموں میں خلل واقع ہو
بخلاف مصائب کے کہ وہاں اس حقیقت کے جہل سے رنج کا اثر دل پر چھا جاتا ہے جس سے تمام
کاموں میں خلل واقع ہو جاتا ہے اسلئے یہاں علاج کی ضرورت زیادہ ہے۔ اب میں مصائب کے
متعلق بھی اس حقیقت کو ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ سنئے احادیث کے الفاظ میں غور کرنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ مصائب میں بھی تجارت کے الفاظ حضور نے استعمال فرمائے ہیں چنانچہ آپکی
صاحبزادی کا بچہ مرنے لگا اور انھوں نے حضور کو بلایا تو آپنے انکی تسلی کیلئے فرمایا ان للہ
ما اخذ وللہ ما اعطےٰ وکل عندہ باجل مسمی فلتصبر ولتحتسب کہ اللہ ہی کا ہے جو
کچھ دیا اور اللہ ہی کا ہے جو لیا بس صبر کریں اور ثواب کی امید رکھیں۔ یہاں اخذ و اعطاء
ہے اور اخذ و اعطا ہی تجارت کی حقیقت ہے یہاں محض صوری تجارت ہے حقیقی تجارت
نہیں کیونکہ حقیقی تجارت تو یہ ہے کہ اپنی چیز دے اور دوسرے کی لے اور یہاں جو کچھ ہے سب
خدا ہی کا ہے اسکی ایسی مثال ہے جیسے ہم بچہ کو کوئی چیز بطور اباحت کے دیں (اباحت کی
قید اسلئے بڑھائی تاکہ آگے شرعی اعتراض وارد نہو ۱۲) پھر کسی مصلحت سے وہ چیز اس سے لیلیں اور

دوسری دیدیں مثلاً کسی کو اپنی اولاد کو اصول تجارت سکھلانا مقصود ہے وہ اسکو ایک آبگینہ کا ٹکڑا دیتا ہے اور ایک اشرفی کے بدلہ میں بچہ سے اسکو خرید لے تاکہ وہ آبگینہ کی حقیقت اور روپیہ و اشرفی کی قیمت سے واقف ہو جائے تو یہ درحقیقت تجارت نہیں ہے بلکہ صورت تجارت ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے بعض چیزیں بندہ کے نام زد کر دی ہیں جو اباحت ہی کے طور سے ہے گو اُسپر ملک کے آثار بھی مرتب کئے گئے ہیں مگر حضرت حق کی ملک کے اعتبار سے یہ نامزدگی اباحت ہی ہے ہاں دوسروں کے اعتبار سے ملک کہنا صحیح ہے اسکی ایسی مثال ہے جیسے طلبہ کو مدرسے کتابیں دی جاتی ہیں تو مدرسہ کی ملک کے اعتبار سے تو یہ کتابیں طلبہ کے نامزد بطور اباحت کے ہیں مگر بعض آثار اسمیں ملک کے بھی ہیں چنانچہ ایک طالب علم سے دوسرا طالب علم بلا اذن کے کتابیں نہیں لے سکتا اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی بعض مصالح کی وجہ سے بعض اشیاء کو ہمارے نامزد فرمادیا ہے۔ ایک مصلحت تو یہ ہے کہ نامزدگی میں بندہ کو حظ آتا ہے کہ میرا مال۔ میری بیوی۔ میرا بچہ میری زمین میرا مکان وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے یہ کہ تاکہ اس سے کوئی چھین نہ سکے اگر نامزدگی نہو اور بندہ کی ملک نہو تو کسی کے پاس کوئی چیز سلامت نہ رہے اور یہیں سے میں کہتا ہوں کہ حقیقت شریعت کی محتاج ہے یعنی وہ حقیقت جو عام طور پر صوفیہ کے ذہن میں ہے (ورنہ طریقت وحقیقت شریعت ہی کے اجزاء ہیں) مگر جس حقیقت کو جہلاء صوفیہ گاتے پھرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ وہ بھی شریعت کی محتاج ہے اگر شریعت نہو تو صوفی صاحب کی تسبیح و مصلی اور نذرانے اگر کوئی ملانا لیجائے پھر وہ برا نہ مانیں کیونکہ ؎

درحقیقت مالک ہر شے خداست | ایں امانت چند روزہ نزد ماست

جب بندہ کی کوئی شئے نہیں نہ اُسکو حق ملک حاصل تو ملانوں کو یہ کہنے کا حق ہے کہ کچھ دنوں خدا کا مال تمنے برتا اب ہم برتیں گے اعتراض اور ناگواری کی کیا بات ہے۔ جیسے مولانا نے ایک جبری کی حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک شخص کے باغ میں گھسکر مالک کے سامنے انگور توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ مالک نے کہا میاں یہ کیا حرکت ہے نہ اجازت لی نہ قیمت دی اور میرے باغ میں لگے تصرف کرنے۔ جبری نے کہا بس بس خاموش بیٹھا رہ باغ بھی خدا کا پھل بھی

خداکا میں بھی خداکا تو روکنے والا کون ہے مالک باغ بڑا ہوشیار تھا اس نے اپنی غلام کو آواز دی کہ ایک رسی اور ختکا لانا غرض دونوں نے رسی میں جبری کو باندھا اور کٹائی شروع ہوئی اب لگا چلانے مالک باغ نے کہا کہ رسا بھی خداکا ختکا بھی خداکا میں بھی خداکا تو بھی خداکا پھر چلاتا کیوں ہے چونکہ چوٹ کا تحمل نہ ہوسکتا تھا اسلئے یہ جواب نہ دیسکا کہ چلانا بھی خدا کی طرف سے ہے اسلئے اعتراض لغو ہے بلکہ ہوش درست کر کے کہنے لگا ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار　　اختیار ست اختیار ست اختیار

وہ چوٹ کھاکر صوفی نہ رہا بلکہ مولوی ہوگیا۔ تو صاحبو! اگر یہ حقیقت واضح کردی جائے تو سب آدمی بالشویک ہوجائیں جنکا دعوی یہ ہے کہ سب انسان مساوی ہیں کسی کو کسی سے زیادہ مالدار بننے کا حق نہیں بلکہ جسکے پاس زیادہ مال ہوتا ہے اُس سے لیکر غریبوں میں تقسیم کردیتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب نے مثنوی کے اس شعر کا ؎

سر نہان ست اندر زیر و بم　　فاش گر گویم جہاں برہم زنم

یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر مسئلہ وحدۃ الوجود ظاہر کردوں تو عالم میں فساد برپا ہوجائے کم فہموں کی نظر سے امتیاز اٹھ جائے یہ جو عالم میں نظام و امن قائم ہے یہ شریعت ہی کی بدولت ہے کہ یہ زید کا حق ہے یہ عمرو کا حق ہے دوسرے کے حق میں تصرف حرام ہے تو ان مصالح کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندہ کے نامزد بعض چیزیں کردی ہیں مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ تم اس نامزدگی سے حق تعالیٰ کا بھی مقابلہ کرنے لگو۔ اگر کوئی آقا اپنے غلام سے کہدے کہ یہ پلنگ تمہارا ہے تو اسمیں مصلحت یہ ہے کہ دوسرے غلام اسکو تنگ نکریں بلکہ اسکی نامزد چیزیں بلا تکلف اسکو تصرف کرنے دیں اب اگر یہ غلام آقا کو بھی اس پلنگ پر بیٹھنے سے روکنے لگے تو یقیناً وہ بڑا نمک حرام ہوگا۔ صاحبو ایسی حالت ہماری ہو رہی ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ نے تو ہماری مصلحت کے لحاظ سے نامزدگی فرمائی تھی ہم خدا تعالیٰ کے تصرف کو بھی ان چیزوں سے روکنا چاہتے ہیں اور اگر وہ کوئی تصرف کرتے ہیں تو ہم پیٹ پھاڑ کر مرے جاتے ہیں حالانکہ جو چیز بادشاہ کے نامزد ہوجائے اور اُسکے خزانہ میں پہونچ جائے وہ تو زیادہ محفوظ ہوجاتی ہے ہمارے نامزد رہتی تو خطرات کا اندیشہ تھا

عــہ ڈونڈا ۱۲

چنانچہ جس بچہ کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا اُسکے بارہ میں یہی آیا ہے کہ اُسکی فطرت میں کفر تھا اگر زندہ رہتا کافر ہوتا اور ماں باپ کو اُس سے بہت محبت تھی اندیشہ تھا کہ ماں باپ پر بھی اُسکے کفر کا اثر پہونچتا کیونکہ جس طرح اولاد ماں باپ کے اثر سے بگڑتی ہے اسی طرح کبھی والدین بھی اولاد کے اثر سے بگڑ جاتے ہیں تو اب جو اولاد بچپن میں مرجائے اُنکے متعلق سوچنا چاہیئے کہ نہ معلوم یہ جوان ہو کر کیسے ہوتے ممکن ہے جوانی میں یہ ایسے ہوتے کہ ہمکو ان سے نفرت ہوتی اور ہم خود انکی موت کی تمنا کرتے اور اب معصومی کی حالت میں انتقال ہوا ہے تو یہ سب خطرات سے محفوظ ہو گیا کیونکہ معصوم بچے جمہور کے نزدیک جنتی ہیں اور امام صاحبؒ سے جو اس مسئلہ میں اللہ اعلم بما کانوا عاملین منقول ہے جس کا حاصل توقف ہے تو اسکی وجہ یا تو عدم بلوغ نصوص ہے اور اسمیں کچھ نقص نہیں کیونکہ تدوین علوم واحادیث سے پہلے علماء کو نصوص تدریجاً ہی پہونچی تھیں تو ایک وقت میں اگر کسی عالم کو کوئی حدیث نہ پہونچے تو کیا تعجب ہے۔ اور تو اور حضور خاتم الانبیا صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک وقت ایسا گذرا ہے جسکے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں ماکنت تدری ما الکتٰب ولا الایمان ولکن جعلناہ نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا الآیہ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے ہوتا ہے وقل رب زدنی علما۔ کہ زیادتِ علم کی دعا فرماتے رہا کیجئے جس سے معلوم ہوا کہ حضور کے علوم میں بھی تدریجاً ترقی ہوتی تھی۔ دوسری بات میرے ذہن میں امام صاحب کے توقف کے متعلق یہ آئی ہے کہ امام صاحب نے اس عنوان میں ہمکو ایسے امور کی تحقیق سے منع فرمایا ہے جنپر دین کا مقصود موقوف نہیں چونکہ بچوں کے دخول جنت وعدم دخول کی تحقیق پر کوئی دینی مقصود موقوف نہیں ہے تو جسکو اسکی تحقیق نہوئی ہو وہ اسکے درپے نہو اسلئے امام صاحب نے سائل کو مجمل جواب دیا اُسکے سامنے تحقیق بیان نہیں فرمائی کیونکہ اُس کا سوال فضول تھا۔ امام صاحب نے بہت سے فروع میں اسی اصل کو ملحوظ فرمایا ہے آجکل ایسے فضول سوالات بہت کئے جاتے ہیں جنپر دین کا کوئی مقصود موقوف نہیں مثلاً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ فلانا کام بڑا گناہ ہے یا چھوٹا گناہ ہے میں جواب دیا کرتا ہوں کہ اگر چھوٹا گناہ ہوا تو کیا ارتکاب کا قصہ ہے اگر کہے ہاں تو میں کہتا ہوں کیا کبھی اپنے چھپر میں

چنگاری لگانے کے متعلق بھی یہ سوال کیا ہو کہ یہ چنگاری چھوٹی ہے یا بڑا انگارہ ہے اور اگر یہ معلوم ہو کہ چھوٹی چنگاری ہے تو کیا اسکو چھپر میں لگانے کی جرأت کروگے؟ اگر کہو نہیں کیونکہ ذراسی چنگاری بھی کبھی بڑھ جاتی ہے میں کہتا ہوں کہ اسی پر چھوٹے گناہ کو قیاس کرلو جو شخص چھوٹے گناہ پر جرأت کرتا ہے وہ کل کو بڑے گناہ پر بھی جرأت کریگا۔

اسی طرح یہ سوال کیا جاتا ہے کہ چند مردوں کو ثواب بخشا جائے تو تقسیم ہو کر پہونچے گا یا بلا تقسیم کے سبکو برابر پہونچے گا اگر تقسیم ہو کر پہونچتا ہے تو ایا جان کو تو بہت کم ملیگا۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس فکر میں کیوں پڑے اگر تقسیم ہو کر بھی ثواب پہونچا تو اللہ تعالیٰ کو بڑھانا بھی تو آتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چھوارہ کے صدقہ کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ جبل احد سے بھی بڑھ جاتا ہے اب بتلاؤ کہ پہاڑ میں کتنے ارب چھوارے ہوں گے اور اتنے ارب میں اگر تقسیم جاری ہو تو کیا حرج ہے۔ ارے میاں اللہ تعالیٰ کے یہاں تو ذرا سا عمل بھی قبول ہو جاوے تو بہت ہے پھر تم کس فکر میں پڑے ہمارے حاجی صاحب نے خوب فرمایا ہے ؎

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم ۔ بس ہو اپنا ایک بھی نالہ اگر پہونچے وہاں

مگر اب علماء بھی ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہو جاتے ہیں اور ہمنے بھی لڑکپن میں ایسی تحقیق کی ہے مگر اب معلوم ہوا کہ یہ مشغلہ فضول تھا پس عوام کو یہ چاہیئے کہ فضولیات کی تحقیق نکریں اور علماء کو یہ چاہیئے کہ ان فضولیات کا جواب نہ دیں مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی سے ایک شخص نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے متعلق سوال کیا مولانا نے سائل سے پوچھا کہ اول یہ سوال کس کا ہے اور وہ اور تم کیا کام کرتے ہو کہا کہ سوال فلاں حافظ صاحب کا ہی اور وہ رنگریز ہیں اور میں درزی ہوں فرمایا کہ تم کپڑے سیتے رہو اور ان حافظ صاحب سے کہدو کہ کپڑے رنگتے رہیں علی جانیں اور معاویہ جانیں تمسے ان کے معاملہ کا کیا تعلق میں اطمینان دلاتا ہوں کہ قیامت کے دن ان کا مقدمہ تمھارے اجلاس میں نہ آئیگا۔

اسی طرح ایک شخص نے میرٹھ میں ایک عالم سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین مومن تھے یا نہیں عالم نے کہا کہ آپ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں کہا ہاں پڑھتا ہوں کہا اچھا بتلاؤ نماز کے اندر کتنے فرض ہیں اب وہ خاموش ہیں۔ فرمایا جاؤ تمکو

نماز کے فرائض کی خبر نہیں جس کا سب سے اول قیامت میں حساب ہوگا۔ اور زائد باتوں کی تحقیق کے درپے ہو۔ اور ان فضولیات کی تحقیق میں نفس کا کید یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی تحقیق میں تو عمل کرنا پڑتا ہے اور عمل دشوار ہے اور فضولیات کے سوال میں لوگ تو اسکو دیندار سمجھیں گے کہ ایسے ایسے باریک سوال کرتے ہیں اور کرنا کچھ پڑتا نہیں اسلئے عام طور سے لوگ فضول سوال کر کے دیندار مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ خیر عوام تو جاہل ہیں مگر بعض علماء کو کیا ہو گیا کہ وہ بھی ایسے سوالات کا جواب دیتے ہیں میں ایسا رکوع نہیں پاتا چنانچہ ایک جنٹلمین نے ابھی چند روز ہوئے سود وغیرہ کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا کہ میں فلسفی نہیں ہوں اسلئے میرے ذمہ مصالح و اسرار و فلسفۂ احکام کا بیان کرنا ضروری نہیں صرف اللہ و رسول کا حکم بیان کرنا میرے ذمہ ہوگا اسلئے میں قال اللہ و قال الرسول کے سوا کچھ نہ کہونگا تو امام صاحب نے اس احتیاط کی وجہ سے اس مسئلہ میں جواب واضح نہیں دیا بلکہ توقف کے عنوان سے سائل کو سوال لاطائل سے روکنا چاہا۔ دوسرا راز امام صاحب کے ایسے جواب میں یہ ہے کہ اطفال کا جنتی ہونا اصل میں اخبار احاد سے ثابت تھا مگر عوام آحاد اور متواتر میں فرق نہیں کرتے اسلئے احتیاط کی اور یہ احتیاط وہ کریگا جسکو عظمتِ حق کا ذوق ہو۔ اس سے بڑھکر دیکھئے ملائکہ و انبیاء علیہم السلام قطعاً معصوم ہیں مگر حالت یہ ہے کہ انبیاء تھراتے ہیں لرزتے ہیں تو جہاں عظمت کا غلبہ ہوگا وہاں احتیاط ضرور ہوگی اسلئے امام صاحب نے اس مسئلہ میں توقف کیساتھ جواب دیا تاکہ عوام اس پر جزم کر کے بیفکر نہو جائیں اور عشرہ مبشرہ کے بارہ میں توقف اسلئے نہیں فرمایا کہ وہاں جو نصوص ہیں وہ معنیً متواتر اور اجماعی ہیں لیکن اب ممکن ہے کہ مسئلہ اطفال بھی ظنی سے بڑھ گیا ہو بوجہ انضمام اجماع متاخر کے گو وہ اجماع بھی مختلف فیہ ہو کیونکہ بعض اجماع مختلف فیہ بھی ہیں جیسا اہل علم کو معلوم ہے۔ لہذا اب ہمکو اسپر یقین کر لینا چاہئے کیونکہ اب یہ مسئلہ گویا متفق علیہ ہے دوسرے ہمارا علاج اسی میں ہے کہ ہم بچوں کو معصوم اور بیگناہ سمجھیں کیونکہ ہم لوگ بچوں کے مرنے سے زیادہ دلگیر ہوتے ہیں ہمکو تسلی کی زیادہ ضرورت ہے اور زیادہ تسلی اسمیں ہے اب اسکے دلائل سنئے حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے تین بچے مر گئے ہوں وہ اسکے لئے جہنم کی

آگ سے آڑ بنجائیں گے کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ کسی کے دو بچے مرے ہوں فرمایا وہ
کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ جسکا ایک ہی بچہ مرا ہو فرمایا وہ بھی پھر کسی نے عرض کیا یا رسول
جس کا ایک بھی بچہ نہ مرا ہو قال انا فرط لامتی ولن یصابوا بمثلی فرمایا تو میں اپنی امت
کیلئے آگے جاکر سامان کرنے والا ہوں اور میری موت جیسا حادثہ میری امت پر کوئی نہ
(اسلئے اُن کے واسطے میری وفات کا صدمہ ہی مغفرت کو بس ہے (نفدیک بآباءنا و
امھاتنا یا رسول اللہ ﷺ فلوان رب الناس ابقی محمداً سعدنا ولکن امرہ کان ماضیا
۱۲) یعنی میں آگے جاکر اپنی امت کیلئے مغفرت کی سعی وسفارش کروں گا۔ اسپر شاید کوئی
یہ کہے کہ جیسے بے اولادوں کیلئے حضورؐ کی شفاعت کافی ہے ایسے ہی اولاد والوں کیلئے
بھی کافی تھی اولاد کی شفاعت کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمکو زیادہ
تسلی کیلئے اسکی ضرورت تھی دو وجہ سے ایک یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو ادب و خ
کے ساتھ شفاعت فرمائیں گے اور بچہ ضد کیساتھ شفاعت کریگا یہ بچے جسطرح یہاں والد
پر ضد کرتے ہیں قیامت میں اللہ تعالیٰ پر بھی ضد اور ناز و نخرے کریں گے چنانچہ احادیث
میں آتا ہے کہ بچہ جنت کے دروازے پر جاکر کھڑا ہو جائیگا اُس سے کہا جائیگا اندر جاؤ
نہیں جاتے پوچھیں گے کیوں؟ کہے گا جب تک ہمارے باپ ماں ہمارے ساتھ نہوں
اُسوقت تک ہم جنت میں نہیں جاسکتے تو اُس سے حق تعالیٰ فرمائیں گے ایہا الطفل ا
ربہ ادخل ابویک الجنۃ اے اپنے پروردگار سے ضد کرنے والے بچے جا اپنے باپ ماں
کو بھی جنت میں لیجا۔ دوسرے عقلاً عدد بڑھنے سے زیادہ قوۃ ہوتی ہے گو حضور صلی اللہ
وسلم کو انضمام ضمیمہ کی ضرورت نہیں آپ تنہا ہی اکفی ہیں مگر طبعاً عدد بڑھنے سے تسلی
ہوتی ہے۔ نیز حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی مسلمان کا بچہ مرتا ہے اور ملائکہ اسکی روح کو
آسمانوں پر پہونچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن سے ارشاد فرماتے ہیں اا خذتم ولد عبدی
اللھم نعم ثم یقول ھل قبضتم ثمرۃ فواد عبدی قالوا اللھم نعم فیقول فماذا
عبدی قالوا اللھم حمدک وصبر فیقول ابنو العبدی بیتاً فی الجنۃ وسموہ بیت
(او کما قال) کیا تمنے میرے بندہ کے بچہ کو لیلیا وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں پھر فرماتے ہیں کیا

میرے بندہ کے جگر گوشہ کو لیلیا وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں پھر فرماتے ہیں کہ میری بندہ نے
کیا کہا فرشتے عرض کرتے ہیں اے اللہ اُس نے آپکی حمد کی (مراد شکر ہے) اور صبر کیا اسپر
حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں (کہ گواہ رہو میں نے اپنے بندہ کو بخشدیا اور) اُسکے لئے جنت میں
ایک محل تیار کرو اور اُس کا نام بیت الحمد رکھو۔ یہ تو چھوٹوں کے مرنے پر وعدہ ہے جس سے ثابت
ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بچوں کے مرنے پر نعم البدل عطا فرماتے ہیں یعنی مغفرت اور جنت کا محل
اور بڑون کے مرنے پر بھی اسیطرح اجر و ثواب کا وعدہ ہے حدیث میں ہے من اخذ صفیہ
(ای حبیبہ) فصبر لم یکن لہ ثواب الا الجنۃ (اوکما قال حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ
میں جس شخص کے محبوب (اور پیارے) کو لیلوں (جو عام ہے ہر محبوب کو خواہ چھوٹا ہو یا
بڑا ہو یا ہمسر ہو جیسے بھائی اور بیوی وغیرہ ۱۲) پھر وہ صبر کرے تو اُس کا اجر جنت کے سوا
کچھ نہیں (یعنی وہ جنت میں ضرور پہونچے گا ۱۲) یہاں بھی نعم البدل کا وعدہ ہے اور جنت سے
بہتر نعم البدل کیا ہوگا اسی مضمون کو ایک بدوی نے بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے
جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور حضرت عبداللہ بن عباس کو بہت صدمہ
ہوا تو بدوی نے آکر اشعار میں اُنکو تسلی دی اشعار تو اہل عرب کی گھٹی میں ہیں بچہ بچہ یہانتک
کہ عورتیں بھی عرب میں شاعر ہوتی ہیں حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ مجھے اس
بدوی سے بہتر کسی نے تسلی نہیں دی چنانچہ کہتا ہے ؎

اصبر نکن بک صابرین فانما ۔۔۔ صبر الرعیۃ بعد صبر الرأس

اے ابن عباس آپ صبر کیجئے تاکہ ہم بھی آپ کی وجہ سے صابر بنیں کیونکہ رعیت کا صبر
سردار کے صبر کے تابع ہے (مطلب یہ ہے کہ آپ مقتدای دین ہیں آپ کے افعال کا
سب اتباع کرتے ہیں پس ایسے حوادث میں آپ صابر رہیں گے تو ہم بھی مصائب میں صابر
رہا کریں گے اگر آپنے صبر نکیا تو عوام بھی صبر نکریں گے ۔ سبحان اللہ! کیسے اچھے عنوان سے
صبر کی ترغیب دی ۱۲) آگے کہتا ہے ؎

خیر من العباس اجرک بعدہٗ ۔۔۔ واللہ خیر منک للعباس

آپ کیلئے حضرت عباس کے زندہ رہنے سے وہ اجر بہتر ہے جو اُن کے وصال پر آپکو ملا۔

کیونکہ حضرت عباس اگر زندہ رہتے تو بہت سے بہت حضرت عباس آپ کو ملتے اور آپ کے حق میں ثواب ان سے بہتر ہے کیونکہ ثواب کی حقیقت ہے رضائے خدا تو یوں کہئے کہ حضرت عباس کے وصال پر صبر کرنے سے خدا آپکو ملا اور یقیناً خدا تعالیٰ اس سے بہتر ہیں اور حضرت عباس کیلئے خدا آپ سے بہتر ہے کیونکہ وہ مرکر خدا کے پاس پہونچ گئے اگر نہ مرتے تو دنیا میں رہتے جسمیں رؤیت الٰہی نہیں ہو سکتی۔ اور حضرت عباس اگر آج نہ مرتے تو کسی نہ کسی دن ضرور مرتے کیونکہ حرارتِ غریزیہ کی رفتار ایک خاص حد پر منتھی ہو جاتی ہے کبھی نہ کبھی ضرور ختم ہو گی خواہ مرض سے ہو یا بدون مرض کے چنانچہ کانپور میں ایک بوڑھے میاں اس طرح ختم ہو گئے کہ گھر میں آکر ماما سے کھانیکو کہا ماما کھانا لیکر آئی تو یہاں بڑے میاں ختم ہو چکے تھے حالانکہ وہ مریض نہ تھے بس وہی بات تھی کہ حرارت غریزیہ اپنی حد پر پہونچکر ختم ہو گئی تھی اسی طرح مرنیوالے کے متعلق یہ سوچے کہ اگر وہ اسوقت نہ مرتا بلکہ زیادہ دن تک بیمار رہکر صاحب فراش بنکر مرتا تو شاید مبغوض ہو کر مرتا کا عزہ بھی گھبرا جاتے اور اس میں اسکا بھی ضرر تھا کیونکہ تم اسکو اس حالت میں یاد نکرتے ثواب بھی نہ پہونچاتے کیونکہ ثواب اُسی کو پہونچاتے ہیں جسکے مرنیکا صدمہ ہوتا ہے اور جسکے مرنے پر خوشی ہو کہ اچھا ہوا پاپ کٹا اُسکو بہت کم یاد کیا جاتا ہے اسی طرح تمھارا بھی نفع اسی میں ہے کہ اپنا عزیز محبوب حالت میں مرے کیونکہ تم اُسکو یاد کرتے ہو تو وہ بھی تمھارے واسطے دعا کرتا ہے پس تمکو اُس سے نفع پہونچتا ہے اور اُسکو تمسے نفع پہونچتا ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ فلاں شخص تو عالم اور بزرگ ہیں انکو ہماری دعا اور ایصال ثواب کی کیا ضرورت ہے تو مرتے کے متعلق یہ نفع عام نہ ہوا۔ صاحبو! وہاں چھوٹے بڑے کا حساب نہیں بلکہ وہاں بعض مواقع پر چھوٹے بڑوں کو اور شاگرد استاد کو اور مرید پیر کو بخشوائیں گے اور ہر شخص کو اپنی مغفرت کیلئے چھوٹی چھوٹی باتوں کی تلاش ہو گی چنانچہ ایک شخص گرفتار ہو کر جہنم کی طرف جاتا ہوا ایک ولی کو راستہ میں دیکھکر پہچانے گا اور کہیگا کہ میں نے فلاں دن آپکو وضو کرایا تھا آج میری مدد کیجئے یہ سنتے ہی وہ بزرگ اسکی شفاعت کریں گے اور بخشوالیں گے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر یہ حقیقت خوب منکشف تھی اسی لئے حاجی صاحب بیعت میں بہت جلدی

فرماتے تھے حضرت کے یہاں قیود و شرائط نہ تھے اور فرماتے تھے کہ ہم تو اس نیت سے بیعت کرتے ہیں کہ یہ دونوں جانب سے دستگیری ہے پس قیامت میں ہم میں اور اُسمیں جو مرحوم ہوگا وہ مغضوب کو ساتھ لیلے گا اور عکس کا احتمال سبقت رحمتی کے خلاف ہے انشاء اللہ دونوں میں سے ایک تو مرحوم ہو ہی گا سبحان اللہ! حضرت کو اپنے مریدوں کے متعلق بھی یہ امید تھی کہ شاید وہی ہمکو بخشوالیں۔ غرض یہ تجارت کیسی عمدہ ہے کہ ہر حالت میں اجر اور نعم البدل ہی ملتا ہے۔ پھر اس سے بڑھکر یہ کہ نعم البدل کے ساتھ آپکی اصلی چیز بھی آپ کو واپس دیدینگے کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جتنے اعزہ مرتے ہیں اولاد ہو یا بھائی اور باپ اور بیوی وغیرہ سبکی مفارقت چندروزہ ہے برزخ ہی میں ملجائیں گے اور آخرت میں ملنا تو سب ہی جانتے ہیں۔ یہ واقعات تو اس عالم میں پہونچکر ہونگے۔ اور عین موت کے وقت یہ حالت ہوتی ہے کہ ملائکہ مسلمان کی روح کو قبض کر کے حریر کے ٹکڑے میں عزت کی ساتھ لپیٹ کر لیجاتے ہیں پھر راستہ میں فرشتے باہم چھینا جھپٹی کرتے ہیں وہ کہتا ہے مجھے دو وہ کہتا ہے کہ اب میں لوں گا پھر آسمانوں کے دروازے اسکے لئے کھل جاتے اور تمام فضائے زمین و آسمان اسکی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے پھر آسمان والے اچھے اچھے القاب و اسماء سے اسکو یاد کرتے اور اسکی تعریف کرتے ہیں پھر ارواح انسانیہ اس کا استقبال کرتی ہیں اور بہت عزت کیساتھ اسکو عالم ارواح میں لیجاتی ہیں اور اس سے باتیں کرتی ہیں جیسے مہمان سے میزبان باتیں کیا کرتا ہے اور ضروری باتیں کر کے زائد سوالات بھی کرتی ہیں کہ فلاں شخص کیسا ہے فلاں کیسا ہے جنمیں سے بعض کی نسبت یہ نووارد یہ کہتا ہے کہ وہ تو مجھ سے پہلے مرچکا ہے کیا وہ یہاں نہیں آیا اسپر سب ارواح افسوس کر کے کہتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جہنم میں گیا یہاں نہیں آیا۔ صاحبو! ان واقعات کو یاد کرو اور سمجھ لو کہ ہمارا عزیز عزت و آسائش میں پہونچا ہے اور جو یہ سمجھے کہ میرا عزیز عزت و آسائش میں ہے اسکو رنج کیوں ہو رہا یہ کہ احتمال تو عذاب کا بھی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال بھی مفید ہے تم اس احتمال سے اسکو ثواب پہونچاؤ اور اسکے بعد امید رکھو کہ انشاء اللہ بخشدیا گیا رہا یہ کہ احتمال تو پھر بھی رہا کیونکہ ایصالِ ثواب کے بعد وحی تو نہ آئے گی تو یقین مغفرت اب بھی نہوا اسکا جواب

رشیم ۱۲ ع ۵

یہ ہے کہ دنیا بامید قائم تو آخرت بھی بامید قائم۔ تم اسباب مغفرت کو جمع کر کے مغفرت کی
امید رکھو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ظنیات سے بھی تسلی ہو جاتی ہے
اور قطعیات سے تسلی تو انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتی۔ صاحبو! تجربہ یہ ہے
کہ ان ظنیات ہی سے آپکو تسلی ہو جائے گی آپ ان باتوں کو دل میں مستحضر کر کے دیکھئے
انشاء اللہ آپ کو اس سے بہت کچھ تسلی ہوگی اور غم ہلکا ہو جائیگا چنانچہ حضرت ابوہریرہ
رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ میرا بچہ مر گیا ہے جس کا مجھے بہت صدمہ ہے
کوئی ایسی بات سناؤ جس سے میرا غم ہلکا ہو جائے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم سے سنا ہے ان الاطفال من دعامیص الجنۃ کہ یہ بچے جو مر جاتے ہیں
یہ جنت کے دعامیص ہوتے ہیں۔ دعموص ایک کیڑا ہے جو پانی کے اندر ادہر سے اُدہر
بھاگا پھرتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ بچے جنت میں ادہر اُدہر بھاگے پھریں گے ہر ایک درجہ
میں گھستے پھریں گے کہ انکو کوئی روک ٹوک نہ ہوگی جس گھر میں چاہیں چلے جائیں گے جیسی
یہاں دنیا میں بھی بچے کسی گھر سے نہیں رُکتے جسکے گھر میں چاہتے ہیں گھس جاتے ہیں
اور ہر جگہ انکی چاہ ہوتی ہے کیونکہ چھوٹا بچہ تو جانور کا بھی بھلا معلوم ہوتا ہے انسان
کا بچہ تو کیوں نہ بھلا معلوم ہوگا ہر شخص کو چھوٹے بچہ پر پیار بھی آتا ہے اور اسکی تکلیف
پر رحم بھی آتا ہے حتیٰ کہ بھنگی کے بچہ پر بھی رحم آتا ہے رامپور کا قصہ ہے کہ قاضی سراج الحق
صاحب مرحوم کے گھر میں بھنگن کمانے گئی اور اپنے بچہ کو باہر دروازہ پر بٹھلا گئی وہ رونے
لگا قاضی صاحب باہر بیٹھک میں بیٹھے تھے وہ بچہ کے رونے کی آواز سنکر بیقرار ہو گئے
اور فوراً اسکو گود میں اٹھا لیا اور اسکو بہلاتے رہے۔ لوگ بھنگیوں کے بچوں کو گود میں
لینے سے اپنے کپڑوں اور بدن کو ناپاک سمجھنے لگتے ہیں یہ خیال غلط ہے خشک بچہ کو گود
میں لینے سے نہ ہمارا بدن ؏ ناپاک ہوتا ہے نہ لباس ہاں اگر بھیگا ہوا ہو اور غالب گمان
یہ ہو کہ اسکے کپڑوں اور بدن پر نجاست لگی ہوئی ہے تو بیشک اس سے جسم اور لباس

؏ اس تعلیم اسلامی میں غور کرنا چاہیئے کہ اسلام نے کسی قوم کی چھوت چھات سے مسلمانوں کو ناپاک نہیں بنایا بخلاف دوسرے مذاہب کے کہ انکی یہاں چھوتی قوموں کو ہاتھ لگانا تحت و بال کا سبب ہے کہ انکا دہرم خراب ہو جاتا ہے گو وہ انسان کو کتے اور سور سے بھی بدتر سمجھتے ہیں ۱۲ ظ

کے ناپاک ہوجانیکا احتمال ہی مگر یہ کوئی بڑی بات نہیں ایک لوٹہ پانی سے سب پاک ہوسکتے ہیں مگر عام طور پر بھنگیوں کے بچوں سے لوگ گھن کرتے ہیں اسلئے قاضی صاحب نے واقعی یہ بڑا کام کیا انکو بہت اجر ملا ہوگا ہم جیسوں سے تو ایسا نہو سکتا مگر جس سے یہ کام ہوسکے اسکو بڑا ثواب ملے گا کیونکہ اسمیں تواضع بھی ہے اور انسان کے بچہ سے ہمدردی بھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو تواضع و رحم یہ دو صفتیں بہت محبوب ہیں یہ تو آخرت کا نفع ہے اور دنیا کا نفع یہ ہے کہ وہ بھنگن ؂ تو قاضی صاحب کی جان نثار ہوگئی ہوگی جب تم اپنی چھوٹی قوموں کی اولاد سے ایسی ہمدردی کروگے تو وہ ہر وقت تمھاری خدمت کیلئے جان و دل سے حاضر رہیں گے تو جس طرح یہاں بچے ہر شخص کو محبوب ہیں اور ہر اک کو ان پر رحم آتا ہے اور کسی گھر سے انکو نہیں روکا جاتا اسی طرح جنت میں یہ بچے جہاں چاہیں بھاگے بھاگے پھریں گے۔ سو ان حالات کو سوچکر تسلی حاصل کرو جیسا کہ راوی کہتے ہیں کہ یہ حدیث سنکر حالانکہ خبر واحد تھی جو ظنی ہوتی ہے مجھے بہت تسلی حاصل ہوئی کہ سارا غم جاتا رہا۔ اب تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہم لوگ صرف ایک پہلو کو دیکھتے ہیں کہ ہائے بچہ مرگیا دوسرے پہلو کو نہیں دیکھتے کہ وہ مرکر کہاں اور کس حالت میں گیا۔ ان باتوں کو سوچو تو ضرور غم ہلکا ہوجائیگا۔ اور سنئے حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو صحابہ کو غیب سے اسطرح تسلی دی گئی ان فی اللہ عزاء من کل مصیبۃ وخلفا من کل فائت فباللہ فثقوا و ایاہ فارجوا فانما المحروم من حرم الثواب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر مصیبت سے تسلی کیلئے کافی ہے اور وہ ہر فوت ہونے والی چیز کا عوض ہیں اسی پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید رکھو کیونکہ محروم تو وہ ہے جو ثواب (یعنی رضائے حق) سے محروم رہے۔ صاحبو! یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ تمھارے عزیز کے بدلے تمکو خدا ملتا ہے بس ایتو ایسے موقعہ پر یوں کہنا چاہئے ؂

؂ ذرا مخالفین اسلام اس واقعہ میں غور کریں اور بتلائیں کہ کیا کوئی برہمن اور پنڈت اور اعلیٰ ہندو ذات کا آدمی بھی ایک بھنگن کے بچہ کو گود میں اٹھا سکتا ہے اور اسکی ساتھ اپنی اولاد جیسا برتاؤ کرسکتا ہرگز نہیں پھر حیرت ہی نہیں کہ اب بھی یہ لوگ مسلمانوں کو بیرحم اور اپنے کو رحم دل کہتے ہیں بخدا! مسلمانوں سے زیادہ رحمدل کوئی قوم نہیں ہوسکتی ۱۲ ظ

روزہا گر رفت گو رو باک نیست   تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

کیا اس سے بھی آپکی تسلی نہو گی کہ آپ کو اپنے عزیز کے بدلہ میں خدا مل جائے جسکی جنت بھی ہے اور دوزخ بھی ہے یقیناً جنت کے ملنے سے خدا کا ملنا بدرجہا بہتر ہے اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ہارون رشید نے جو مسلمانوں کا بڑا بادشاہ اور خلیفہ تھا عید کے دن جشن کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ دربار میں جتنی چیزیں موجود ہیں اسمیں سے جس چیز پر جو شخص ہاتھ رکھدیگا وہ اسی کی ہو جائے گی درباریوں نے اس اعلان کے بعد ہاتھ رکھنا شروع کیا کسی نے جواہرات پر ہاتھ رکھا کسی نے سونے چاندی پر ایک باندی نے جو ہارون رشید کو پنکھا جھل رہی تھی خلیفہ کی کمر پر ہاتھ رکھدیا۔ خلیفہ نے اس حرکت پر برہم ہو کر سوال کیا کہ یہ کیا حرکت تھی کہا حضور کا اعلان عام تھا کہ جو جسپر ہاتھ رکھدے وہ اسی کی ہے اسمیں کوئی استثناء نہ تھا تو میں نے دیکھا کہ یہ درباری بیوقوف ہیں جو سونے چاندی اور جواہرات پر ہاتھ دھر رہے ہیں میں نے سوچا کہ ایسی چیز پر ہاتھ رکھنا چاہیے جسکے ہاتھ میں یہ سب چیزیں ہیں اسلئے میں نے حضور پر ہاتھ رکھدیا کہ جب آپ میرے ہونگے تو سب چیزیں میری ملک ہو جائیں گی اس جواب کو سنکر ہارون بہت خوش ہوئے (اور فرمایا کہ میں تیرا ہو گیا ۱۲) واقعی یہ باندی بہت سمجھدار تھی تو بتلایئے ان واقعاتِ مصیبت میں کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ان کے ذریعہ سے خدا ہمکو ملتا ہے جسکی جنت بھی ہے اور دوزخ بھی۔ شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آیا ہو کہ دوزخ ہماری ہو گئی تو کیا نفع ہوا کیا ہم دوزخ میں رہیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ افسوس آپنے بات کو سمجھا ہی نہیں۔ دنیا میں جیلخانہ بادشاہ کی ملک ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ جیلخانہ میں رہتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم جسکو چاہو گے بخشوالو گے اور جہنم سے نکلوالو گے اسپر شاید آپ یہ کہیں کہ کیا کفار کو بھی بخشوالیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ جسکے تعلق سے جہنم بواسطہ آپ کی ملک ہوئی ہے جب وہ کفار کو بخشنا نہ چاہیں گے تو تم بھی نہ چاہو گے یہ تو آخرت کا نعم البدل تھا۔ اب یہ سمجھئے کہ دنیا میں بھی ہر فوت ہونیوالی چیز کا نعم البدل ہمکو عطا ہوتا ہے خواہ مال و اولاد فوت ہو یا کوئی عزیز و قریب چنانچہ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں

کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مصیبت کے وقت کیلئے ہمکو یہ دعا تعلیم فرمائی تھی انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم عندک احتسب مصیبتی فأجرنی فیھا وابدلنی بھا خیرا منھا (اے اللہ میں آپ سے اس مصیبت کا ثواب مانگتی ہوں پس مجھے اس کا اجر عطا فرمایئے اور اس کا نعم البدل دیجئے ۱۲) حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ جب میری شوہر ابو سلمہ کا انتقال ہوا تو میں نے یہ دعا پڑھی مگر وابدلنی بھا خیرا منھا کہتے ہوئے دل رکتا تھا کیونکہ میں اپنے دل میں یہ کہتی تھی کہ ابو سلمہ سے بہتر کون ہوگا اور حضور کے ملنے کا وہم بھی نہ ہوتا تھا کیونکہ ؎ آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ + حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے دل پر جبر کر کے یہ بھی کہا تو خدا تعالیٰ نے مجھے ابو سلمہ کے عوض حضور صلے اللہ علیہ وسلم عطا فرمائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز لیگئی اور دوسری چیز دیگئی۔ نصوص میں تجارت پر صاف اشارات موجود ہیں اسی لئے اعمال کا وزن ہوگا جیسا تجارت میں وزن ہوا کرتا ہے اور جب وہاں اعمال بھی جو کہ اعراض ہیں اعیان بنجائیگے جیسا کہ وزن کا مقتضی ہے تو اعیان تو اعیان ہیں ہی۔ اور مصائب کے بارہ میں لفظ اخذ و اعطاء و ابدال وارد ہے یہ بھی معنی تجارت پر دال ہے اور تصدق اموال میں لفظ اقراض اور بذل نفس و بذلِ مال میں لفظ اشتری وارد ہے۔ غرض جو چیز بھی ہمارے ہاتھ سے جاتی ہے اس کا عوض اور نعم البدل ہمکو ملتا ہے۔ اعمال کے متعلق مجھے ایک اور نص یاد آئی جسمیں لفظ ایتاء بمعنی اعطاء ہے والذین یؤتون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ انھم الی ربھم راجعون اولئک یسارعون فی الخیرات وھم لھا سابقون ۵ (ترجمہ) اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حالت میں کہ انکے دل لرزاں و ترساں ہوتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف واپس جانیوالے ہیں یہ لوگ بھلائی میں ترقی کرتے اور اسکی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسکے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو گناہ کر کے ڈرتے ہیں فرمایا نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو تصدق

رواہ فی المستدرک وصححہ جامع

اور صلوٰۃ وصیام بجالاکر ڈرتے ہیں کہ شاید قبول نہو اور خدا کے سامنے جاکر ہمکو شرمندگی ہو (کہ وہاں یہ کہا جائے کہ تمنے کیسا عمل ہمارے یہاں بھیجا ۱۲) حضرت عائشہ کے سوال سے یہ معلوم ہوا کہ اس آیت میں یؤتون اعطار مال کیساتھ خاص نہیں بلکہ ہر عمل کو شامل ہے جبھی تو انھوں نے اسکو اعمال گناہ پر محمول کیا اور بعض لوگوں نے اسمیں یوں کہا ہے کہ حضرت عائشہ نے یہ سوال یأتون کی قرارت کے متعلق کیا ہے جو بمعنی یفعلون ہے اس صورت میں ایتار سے استدلال ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ ترمذی کی حدیث میں اسکی تصریح ہے کہ یوتون کے متعلق سوال کیا اور قرارت شاذہ بوجہ شذوذ کے ثابت نہیں اور یہ حدیث صحیح ہے پس صحیح کو غیر صحیح پر محمول نہیں کرسکتے اور اگر اسکو مان بھی لیا جاوے تب بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر عام ہونا ضروری ہے ورنہ شاذ کا مفسر اور متواتر کا غیر مفسر رہنا لازم آویگا تو اس تفسیر کا تعلق ایتار سے بھی ہوگا پس یہ استدلال باقی رہا جب یہ ہے تو آیت میں ایتاء بمعنی ایتاء مال نہیں ہے بلکہ بمعنی ایتار الوجود ہے جسکا حاصل ایجاد ہے معنی یہ ہوئے کہ وہ جس عمل صالح کو وجود دیتے ہیں اُسکو کرکے ڈرتے رہتے ہیں کہ دیکھئے قبول ہوا یا نہیں بیفکر نہیں ہوجاتے۔ تو یہاں لفظ ایتاء بمعنی اعطار ہے جو تجارت کے مناسب ہے یہ ہیں وہ نصوص جن سے اعمال و احوال کا تجارت ہونا معلوم ہوتا ہے اُن ہی میں سے ایک وہ آیت بھی ہے جسکو میں نے تلاوت کیا ہے یا ایہا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسریٰ ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یؤتکم خیرا مما اخذ منکم کہ ان قیدیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تمھارے دلوں میں خیر ہوگی (یعنی ایمان) تو اللہ تعالیٰ تمکو اس سے بہتر چیز دیں گے جو تم سے لیگئی ہے۔ یہاں بھی نقصان مال پر نعم البدل کا وعدہ ہے جسکو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے حاصل یہ ہوا کہ مومن کو ہر نقصان کا عوض اور نعم البدل ملتا ہے اور ان نصوص مذکورہ پر نظر کرکے ہمکو اب اس نص اخیر کی تعمیم کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ دوسری نصوص سے تعمیم ثابت ہے گو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مما اخذ منکم میں ما عام ہے مال کو اور غیر مال کو جسمیں سب اعمال اور اعیان داخل ہیں خصوصاً جبکہ قاعدہ فقہیہ یہ ہے کہ اعتبار عموم

عہ فالایتار علی ہذا عام لکل عمل کعمومہ فی قولہ تعالیٰ ثم سئلوا الفتنۃ لآتوہا ای لاخذوہا والباشروہا ولا یتوقف العموم علی قرارۃ یأتون بالقصر من الاتیان واسہل التوجیہات فیہا ان یکون یأتون تفسیرا لیؤتون فطقیۃ قرارۃ ۱۲ منہ۔

نص ہے خصوص مورد کا اعتبار نہیں مگر مجھے خود اس قاعدہ ہی کے عموم میں کلام ہے اسلئے
میں اس آیت پر تعمیم کا مدار نہیں کرتا بلکہ مجموعۂ نصوص کے اعتبار سے اس مضمون کو عام
کرتا ہوں۔ مگر اس کی تلاوت اس لحاظ سے ہوئی ہے کہ ایک مناسب سے دوسرے مناسب
کی طرف اشارہ کرنا ابلغ ہے اور تمام نصوص کا پڑھنا دشوار تھا بلکہ کسی ایک کا اختیار
ضروری تھا جسکے لئے وجہ مرجح میں نے بالکل تمہید کے شروع میں بیان کردی۔
خلاصہ یہ کہ معاملات تشریعیہ کا تجارت ہونا تو ظاہر ہے کہ ایک عمل ہم نے پیش کیا اودہر سے
اسکی قیمت مل گئی مگر اسکے علاوہ ہمارے ساتھ جسقدر معاملات تکوین میں بھی ہوتے ہیں
ان سب کی حقیقت بھی تجارت ہی ہے جیسا مذکور ہوا اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھکر غم بہت
ہلکا ہوجائیگا۔ باقی طبعی غم کا میں انکار نہیں کرتا وہ تو ہوگا اور ہونا چاہیئے کیونکہ اُسی کی وجہ
سے اجر ملتا ہے اور اس سے شان عبدیت ظاہر ہوتی ہے اگر انسان پر رنج وغم وارد نہو تو
فرعون بے سامان ہوجائے مگر ضرورت اسکی ہے کہ اس غم کو ہلکا کیا جائے کیونکہ غم کا بڑہنا
خود مصیبت ہی جس سے راحت فوت ہونے کے علاوہ بعض اوقات جو اصل دولت ہی اجر
وہ بھی ضایع ہوجاتی ہے اور غم ہلکا ہونے کی وہی تدبیر ہے جسکا ذکر ہورہا ہے یعنی جب انسان
یہ سمجھیگا کہ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ مجکو نعم البدل عطا فرماتے ہیں تو غم ہلکا ہوجائیگا پھر وہ نعم
البدل بھی اسقدر ہے کہ اُسکا انداز لگانا دشوار ہے اور مصائب پر صبر کرنا تو نہایت دشوار
عمل ہے اسپر وہ غیر متناہی ملنا تو کیا عجب ہے جسپر آیت انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر
حساب میں متنبہ بھی فرمایا ہے ہاں تو خفیف خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجر مل جاتا ہی
چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے آسمان وزمین کا درمیانی فضا
بھر جاتا ہے اور سبحان اللہ کہنے سے آدہی میزان عمل اور الحمد للہ سے پوری میزان عمل بھر جاتی
ہے یہ اسلئے فرمایا کہ شاید کسی کو اللہ اکبر کا ثواب سنکر یہ احتمال ہو کہ معلوم میزان عمل بھی
کسی چیز سے بھری ہوگی کیونکہ ممکن ہے وہ آسمان وزمین کی فضا سے بھی زیادہ ہو تو ایک
عمل سے اگر فضا بھی بھر جاتا ہو تو ممکن ہے کہ وہ میزان بھرنے کے لئے کافی نہ ہو اور ہمکو سابقہ
پڑیگا۔ میزان ہی سے خصوص طالب علموں کو ایسے احتمالات بہت ہوتے ہیں کیونکہ ان کے

نزدیک تو کٹورا بھی حوض کے برابر ہوسکتا ہے جیسا ایک حکایت ہے کہ ایک بادشاہ
و وزیر میں گفتگو ہورہی تھی بادشاہ کہتا تھا کہ طلبہ عربی بہت عاقل ہوتے ہیں وزیر کہتا
تھا کہ ان سے بڑھکر بیوقوف کوئی نہیں اتفاق سے ایک طالب علم جوتیاں چٹخاتے خستہ
حال سامنے سے گذرے بادشاہ نے اُنکو بلایا اور وزیر سے کہا کہ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے دیکھو
یہ طالب علم اتفاق سے سب کے سامنے آگیا میں نے اسکو انتخاب کرکے نہیں بلایا اب میں
اسکی عقل کا امتحان کرکے تمکو دکھلاتا ہوں کہ عربی طلبہ کیسے عاقل ہوتے ہیں۔ طالب علم کو
بادشاہ نے عزت سے بٹھلایا اور سامنے ایک حوض تھا اُسکی طرف اشارہ کرکے اول وزیر
سے سوال کیا کہ بتلاؤ اس میں کتنے کٹورے پانی کے آسکتے ہیں وزیر نے کہا کہ بدون شمار
کے اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ حوض کو خالی کیا جائے اور کٹورہ بھر بھر کر پانی اسمیں
ڈالا جائے تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسمیں کتنے کٹورے آسکتے ہیں۔ بادشاہ نے اسکے بعد طالبعلم
صاحب سے دریافت کیا کہ مولانا آپ بتلائیں کہ اسمیں کتنے کٹورے پانی آسکتا ہے طالبعلم
نے کہا کہ یہ سوال ہی مہمل ہے پہلے کٹورا تو معین ہونا چاہئے کہ وہ کٹورا کتنا بڑا ہے اگر کٹورا
حوض کی برابر ہے تو ایک کٹورا پانی آسکتا ہے اگر اس سے آدھا ہے تو دو کٹورے اگر تہائی ہے
تو تین اگر سواں حصہ ہے تو سو کٹورے اگر ہزارواں حصہ ہے تو ایک ہزار کٹورے اور
اگر لاکھواں حصہ ہے تو ایک لاکھ کٹورے غرض جو نسبت مساحت میں حوض سے کٹورے
کو ہوگی اُسی نسبت سے اسمیں کٹورے آسکیں گے۔ اسلئے اول کٹورا متعین کرنا چاہئے اس کے
بعد سوال کرنا چاہئے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ اب انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تم
قلمدان وزارت اس طالب علم کے حوالہ کرو اور خود جاکر طالبعلمی کرو۔ مگر تمھاری خاندان
میں وزارت چلی آرہی ہے اسلئے معاف کرتا ہوں اور تمکو اس عہدہ پر بحال رکھتا ہوں اسکے
بعد مولوی صاحب سے کہا کہ مولانا آپ کو بہت تکلیف دی گئی معاف کیجئے گا اب آپ جاسکتے
ہیں وہ سلام کرکے چلتے ہوئے اور اسکے دل میں وزارت کی ذرا بھی ہوس پیدا نہ ہوئی حالانکہ
بادشاہ اُسکی قابلیت وزارت کو تسلیم کرچکا تھا کیونکہ اس زمانہ میں طلبہ کو دنیا کی ہوس
نہ تھی طلبہ اُس زمانہ میں سب صوفی ہوتے تھے اسی لئے پہلے زمانہ میں خانقاہوں کی اور تعلیم

تصوف کی ضرورت نہ تھی کیونکہ سب ماں کے پیٹ سے صوفی ہی پیدا ہوتے تھے اور اُنکا
وہی مذاق ہوتا تھا جو حضرت غوث اعظم کا اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک سنجر بادشاہ
ملک نیمروز نے آپ کے مصارف کے لئے آپکو ایک معتدبہ حصہ ملک کا پیش کرنا چاہا آپ نے
جواب میں یہ رباعی لکھی ع

چون چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد — در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب — من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

ایک عالم کی حکایت رسالہ القاسم دور قدیم میں لکھی تھی کہ وہ خدمت دین میں مشغول رہا
کرتے تھے کسب معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا ایک نانبائی آپکا معتقد تھا اور جان نثار تھا۔
اور ایسے شخص سے مانگ کر کھانا بھی جائز ہے اس سے آپنے کہہ رکھا تھا کہ بھائی جب کبھی
ہمکو بھوک ستائے گی ہم بے تکلف تمھارے پاس آجایا کرینگے مگر ایک شرط ہے وہ یہ کہ ہمارے
سامنے وہ ٹکڑے رکھدیا کرنا جو مسافروں کے آگے سے بچ جاتے ہیں اگر سالم روٹی دوگے
تو ہم نہ کھائیں گے نانبائی نے اس خیال سے یہ شرط منظور کرلی کہ اسکے خلاف میں مولانا کو
تکلیف ہوگی اور ٹکڑوں سے بھی رہ جائیں گے چنانچہ جب بھوک لگتی مولوی صاحب اُسکی
دوکان پر پہونچ جاتے اور وہ مسافروں کے سامنے کے ٹکڑے بچے ہوئے ان کے آگے رکھدیتا
اُنکو پانی میں بھگو کر کھا لیتے اور پھر علمی مشغلہ میں مشغول ہوجاتے اتفاق سے ایک دن جو گئے
تو نانبائی نے کہا کہ آج تو ٹکڑے نہیں ہیں یا تو مسافروں نے ٹکڑے چھوڑے نہیں یا کوئی بہت
کھانیوالا آگیا ہوگا جو ٹکڑے بھی کھا گیا تو مولوی صاحب خوش خوش وہاں سے یہ فرماتے ہوئے
واپس آگئے تلک اذا کرۃ خاسرۃ کہ آج کی واپسی تو بڑے خسارہ کی ہوئی آپکو فاقہ میں بھی
لطیفہ سوجھا کیونکہ قرآن سے اقتباس کرنا تو لطائف میں سے ہے۔ طلبہ کی حکایتیں اس قسم
کی بہت سی ہیں ایک حکایت تو والد صاحب سے سنی ہے کہ طلبہ ایک گھڑا اپنا لیا کرتے تھے جبکا منہ
تنگ کردیا کرتے جو خط گھر سے آتا اُسکو بغیر دیکھے پڑھے گھڑے میں ڈالدیتے اسی طرح برابر گھڑے میں خطوط
ڈالتے رہتے یہانتک کہ جب سات آٹھ سال میں علم سے فارغ ہوتے اُسوقت وہ گھڑا توڑا
جاتا اور تمام خطوط پڑھتے کسی میں رنج کی خبر ہوتی تو اُسکو دیکھکر رو لیتے کسی میں خوشخبری ہوتی

ع
انظر الی فقیہ قطع
الیہم امر الافات
الکاتبہ من
الفاتہ کالبحر طیبہ
من الجاھر والحتاب
الی القراءۃ وفرح
الجواب اللہم اللہ

٢٥
ان تقال ان
المنفقہ بغیر رفع
وذالک کما لغیر
فی سبیل الجماعۃ
ازوا فات فوت
انسکارا ربیع جماعۃ
سعنیۃ ۱۲
او کان منقول الحال
فی طلب العلم فغیر
۱۲ اشرف

اسکو دیکھکر ہنس لیتے ؎

کہ گریم وگہ خندم دیوانہ چنیں باشد،

اور ایک حکایت اور سنی ہے کہ ایک دن ایک طالب علم کے پاس تیل نتھا تو وہ بڑے پریشان ہوئے اتفاق سے اُسی وقت ایک رئیس کا جلوس نکلا جسمیں مشعلیں اور فانوس وغیرہ بہت روشن تھے آپ کتاب ہاتھ میں لیکر اُس جلوس کے ساتھ ہو لئے اور مطالعہ کرتے چلے گئے یہانتک کہ جلوس رئیس کے محل تک پہونچا آپ بھی اُسکی ساتھ محل میں چلے گئے خدام نے روکنا چاہا مگر رئیس نے منع کر دیا یہانتک کہ روشنی کے فانوس وغیرہ خاص آرام کے کمرہ میں پہونچے آپ وہاں ہی چلے گئے اور ایک تخت پر بیٹھکر کتاب دیکھتے رہے اور ایسے مستغرق تھے کہ نہ کسی عورت کی طرف نظر اٹھائی نہ باندی کی طرف۔ رئیس اُنکے اس استغراق پر محو ہو گیا جب مولوی صاحب مطالعہ سے فارغ ہوئے اُسوقت آپکو ہوش آیا اور کتاب بند کر کے اِدہر اُدہر دیکھکر گھبرائے کہ میں کہاں آگیا اور کسطرح آگیا۔ رئیس نے انکی پریشانی دیکھکر عرض کیا کہ مولانا آپ ذرا پریشان نہوں آپنے تو مجھے اپنا گرویدہ بنالیا ہے واقعی علمی شوق اسی کا نام ہے جو آپکے اندر دیکھا اب میری درخواست یہ ہے کہ آپ میرے غریب خانہ ہی پر مقیم رہیں یہیں کھانا کھایا کریں اور یہیں مطالعہ کیا کریں میں آپکی خدمت کو اپنی سعادت سمجھونگا مولوی صاحب بولے کہ میں اس قید کو پسند نہیں کر سکتا میں آزاد رہنا چاہتا ہوں ہاں البتہ مجھے اسکی تکلیف ہے کہ بعض دفعہ میرے پاس تیل نہیں ہوتا جس سے مطالعہ کا حرج ہوتا ہے۔ اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے پس اگر آپ اتنا کر دیں تو عنایت ہوگی کہ کسی بنئے سے کہدیجئے کہ جب میں تیل لینا چاہوں مجھے تیل دیدیا کرے اور آپ کے حساب میں دام لکھدیا کرے مجھ سے داموں کا مطالبہ نکیا کرے اس سے زائد کی مجھے ضرورت نہیں چنانچہ رئیس نے تیل کا انتظام کر دیا۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت کوئی بزرگ فرماتے ہیں ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تو چہ دانی کہ دریں گرد سواری باشد

اور شیرازی فرماتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

اسی طرح کا ایک قصہ استغراق کا حضرت شبلی کا ہے کہ ایک دن وہ حضرت جنید کے گھر میں بلا اطلاع کے گھس گئے حضرت جنید کی بیوی پردہ کے خیال سے اٹھنے لگیں حضرت جنید نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور کہا کہ ان سے پردہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اسوقت اپنے حواس[۵] میں نہیں ہیں چنانچہ وہ دیر تک بیٹھے ہوئے ہنس ہنس کر مقامات میں گفتگو کرتے رہے اور حضرت جنید اپنی بیوی کو اٹھنے سے روکتے رہے یہانتک کہ کسی بات پر حضرت شبلی پھوٹ کر روئے تو حضرت جنید نے بیوی کو اشارہ کیا کہ اب چلی جاؤ اب انکو ہوش آگیا ہے۔ تو بعض دفعہ استغراق ایسا قوی ہوتا ہے جسمیں صاحب استغراق کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ یہاں کوئی عورت بھی ہے یا نہیں مگر اس کا پہچاننا حضرت جنید جیسوں کا کام ہے تو ایک زمانہ میں تو طلبہ کی حالت یہ تھی اور اب یہ حالت ہے کہ ایک طالب علم نے میرے ایک دوست رئیس کو خط لکھا کہ میں عربی پڑھنا چاہتا ہوں اور گھر سے بوجہ تنگی کے خرچ نہیں آسکتا آپ میرے لئے عـ۱۵ روپئے ماہوار تنخواہ مقرر کردیجئے اسکے ساتھ ہی میری نسبت یہ بھی لکھدیا کہ اس نے مجھکو یہ مشورہ دیا ہے وہ صاحب بہت عاقل ہیں خدا مال دے تو اسکی ساتھ عقل بھی دے انھوں نے وہ خط میرے پاس بھیجدیا کہ اس شخص کے متعلق کیا راے ہے میں نے لکھا کہ اس کذاب کو ایک پیسہ نہ دیا جائے وہ کبھی کبھی میرے پاس بھی آتے ہیں میں اسکی خبر لونگا۔ مگر وہ خط بہت دنوں سے میرے پاس رکھا ہوا ہے ابتک تو وہ صاحب آئے نہیں یا تو انکو جواب نہ جانے سے شبہ ہوگیا کہ اس واقعہ کی مجھے اطلاع ہوگئی ان صاحب نے لکھدیا کہ اس نے آپکی امداد سے منع کردیا ہے اسلئے معذوری ہے (یا اس شخص نے دوسرے طلبہ کے ذریعہ سے خانقاہ میں اس خط کے متعلق تذکرہ سن لیا) اسلئے انھوں نے آنا ہی بند کردیا۔ میں کٹورہ والے طالب علم کا ذکر کررہا تھا غرض جب طلبہ کے نزدیک کٹورا بھی حوض کے برابر ہوسکتا ہے تو میزان عمل انکے نزدیک زمین و آسمان سے بڑا ہو تو کیا بعید ہے کیونکہ میزان عمل تو اللہ تعالیٰ

عـ۵ فکان داخلا فی غیر اولی الاربۃ من الرجال فلا یصح قیاسہ علی الاعمی وقد امر بالحجاب عنہ فی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم افعمیاوان انتما لکون الاعمی من اولی الاربۃ یمیل الیہ النساء وہو یشعر بمکانہن ایضاً بالحدس والقول وصوت الحلی فیمیل بقلبہ الیہن بخلاف المستغرق تاثرح کالحیوان او کالطفل الذی لایشتہی ۱۲ ظ ❖

کی میزان ہے اسلئے حضور نے اس شبہ کو رفع کرنے کیلئے فرمایا کہ الحمد للہ یملأ المیزان
الحمد للہ سے میزان عمل بھر جاتا ہے اب وہ شبہ رفع ہو گیا کہ شاید میزان خالی رہے۔ اسپر
شاید کسی کو یہ وسوسہ ہو کہ بس اب نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے ایکبار الحمد للہ کہہ لینا کافی
ہے بڑا قصہ تو میزان عمل کا ہے وہ تو اس سے بھر ہی جائیگا جیسے ایک طالب علم نے
گانوں میں جاکر نماز کا وعظ کہا اور یہ کہا کہ بے نمازی سور کتے کے مثل ہیں اس حملہ پر
گانو والوں کو جوش آگیا اور سب نے چڑھائی کر کے مولوی صاحب کو مارنا چاہا میزبان نے
یہ رنگ دیکھکر مولوی صاحب سے کہا کہ آج خیر نہیں لوگ آپ پر چڑھائی کر کے آرہے ہیں
کہا کیوں؟ کہا آپنے وعظ میں بے نمازیوں کو سور کتا ہی بنایا تھا بولے بس اتنی بات
پر چڑھائی کر رہے ہیں کہا جی ہاں۔ کہنے لگے تو تم بیفکر رہو میں ابھی سبکو ٹھنڈا کئے دیتا
ہوں یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ واقعی یہ تاویل کا دروازہ کھلا رہے تو بات کا بدلنا
کچھ بھی مشکل نہیں چنانچہ گانوں والے آئے اور مولوی صاحب پر حملہ کرنا چاہا انھوں نے
پوچھا کہ بھائی آخر میری کچھ خطا بھی ہے کہا اس سے بڑھکر کیا خطا ہو گی کہ تمنے ہمکو سور کتا
بنایا کہا میں نے تمکو نہیں کہا تھا بلکہ بے نمازیوں کو کہا تھا گانوں والوں نے کہا پھر ہم بھی
تو بے نمازی ہیں۔ مولوی صاحب بولے ہرگز نہیں تم بے نمازی کیوں ہوتے بتلاؤ کیا تمنے
کبھی نئے کپڑے پہنکر آخری جمعہ کی نماز نہیں پڑھی بولے جی ہاں آخری جمعہ کی تو نماز پڑھلی ہے
کہا اور عید بقرعید کی نماز بولے وہ بھی پڑھتے ہیں۔ کہا پھر تم بے نمازی کدھر سے ہوئے بے نمازی
تو وہ ہے جو ایک دفعہ بھی عمر بھر میں خدا کے سامنے نہ جھکا ہو بس اس جواب سے سب خوش
ہو گئے تو جیسے اس طالب علم نے عید بقرعید کی نماز سے گانوں والوں کو نمازی بنادیا تھا
ایسے ہی شاید کوئی یہ سمجھے کہ سبحان اللہ الحمد للہ سے میزان عمل تو بھر ہی جائیگا پھر اور عمل
کی کیا ضرورت۔ اسکے دو جواب ہیں ایک الزامی ایک تحقیقی۔ الزامی جواب تو یہ ہے کہ
سبحان اللہ الحمد للہ سے میزان کا ایک پلہ ہی تو بھریگا (کیونکہ اعمال صالحہ کا ثواب ایک
ہی پلہ میں رکھا جاتا ہے دوسرا پلہ تو گناہوں کیلئے ہے ۱۲) تو ایک پلہ کے بھر جانے سے
کیا نفع جب تک دوسرے پلہ کا حال معلوم نہو (کیونکہ اگر وہ بھی بھر گیا تو آپ جنت

میں نہ جاسکیں گے بلکہ اعراف میں رہیں گے اور اگر وہ بہت زیادہ بھر گیا کہ اعمال صالحہ کے پلہ سے بھی بھاری ہوگیا تو جہنم میں جانا پڑیگا ۱۲) اسلئے دوسرے پلہ کی فکر بھی لازم ہے جسمیں گناہ رکھے جائیں گے اور ترک صلوٰۃ و ترک صیام و ترک زکوٰۃ و ترک حج یہ سب معاصی ہیں اگر گناہوں کا پلہ بھاری ہوگیا تو نیکیوں کا پلہ بھر جانیسے کیا ہوگا اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو سبحان اللہ والحمد للہ کا ثواب بیان فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کلمات میں یہ خاصیت ہے یہ ایسا ہے جیسے طبیب یہ کہے کہ بنفشہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ دماغ کا تنقیہ کرتا اور مواد فاسد کو دفع کرتا ہے مگر سب جانتے ہیں کہ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ جب تک اسکے ساتھ کوئی مضر شے استعمال نکی جائے جو اسکی خاصیت کو باطل کردے اب اگر کوئی سنکھیا کھاکر بنفشہ پی لے تو بتلایئے بنفشہ سے کیا خاک نفع ہوگا اور اگر اس صورت میں بنفشہ کی خاصیت کا ظہور نہو تو کیا حکیم کے دعوے کو غلط کہا جائیگا ہرگز نہیں ایسے ہی یہاں سمجھو کہ سبحان اللہ الحمد للہ کی واقعی یہ خاصیت ہے کہ میزان عمل کو بھر دیتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ کوئی منافی نہ پایا جاوے۔ تو اب سمجھیئے کہ حق تعالیٰ کی کسقدر عنایت ہے کہ ایک سبحان اللہ الحمد للہ پر اسقدر ثواب عطا فرماتے ہیں۔ دنیا میں تو والدین سبق کے ایک ایک لفظ پر ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے البتہ بعض لوگ مکتب جانے پر ایک ہفتہ میں بچوں کو ایک آنہ تو دیدیتے ہیں اور ایک صاحب نے بیان کیا کہ ہمارے ابا جان مہینہ بھر تک حقہ بھرنے پر دو پیسے منصوری دیا کرتے تھے جو وزن میں تو ڈبل تھے مگر قوت میں کم تھے اگر کسی بچہ کو باپ نے عید بقر عید کے موقع پر ایک روپیہ دیدیا تو خوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں خصوص پہلے زمانہ میں جبکہ روپیہ کم تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ والد صاحب نے عید کے دن ہم دونوں بھائیوں کو دو دو آنہ کے پیسے دیئے بھائی اکبر علی نے تو لیلئے میں نے لینے سے انکار کردیا۔ والد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تمنے کیوں واپس کردیئے میں نے کہا یہ تو تھوڑے ہیں۔ فرمایا ہمارے والد تو ہمکو عید کے دن دو پیسے دیا کرتے تھے اور ہم اُس سے ہی بہت خوش ہوجاتے تھے میں نے کہا ہم میں اور آپ میں فرق ہے فرمایا وہ کیا۔ میں نے کہا فرق یہ ہے کہ آپ غریب کے

بیٹھے تھے اور ہم امیر کے بیٹے ہیں ۔ اسپر بھائی اشارہ سے کہنے لگے کہ یہ کیا کہتے ہو گستاخی کرتے ہو میں نے کہا اسمیں گستاخی کیا ہے ہم ان کو اپنے دادا پر ترجیح دے رہے ہیں اسمیں تو اپنے والد کی تعظیم ہے والد صاحب ہنسنے لگے اور ایک ایک روپیہ عنایت فرمایا جب ہم خوش ہوئے مگر آج کل ایک روپیہ کی بھی قدر نہیں اب تو بچے دو تین روپیہ سے کم میں خوش نہیں ہوتے ۔ غرض ہم تو اپنی اولاد کو ایک ہفتہ کی پڑھائی کے صلہ میں ایک آنہ دیتے ہیں اور یہ بھی سب نہیں دیتے بلکہ بعض والدین ہی ایسا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایک سبحان اللہ کے عوض میں اسقدر دیتے ہیں کہ اٹھائے نہ اوٹھے اسپر مجھے ایک بات یاد آئی وہ یہ کہ دیانند نے تناسخ کو ثابت کر کے (اور وہ ثبوت بھی اُسی کے زعم میں ہے ورنہ درحقیقت اُسکے پاس اسکی کچھ دلیل نہیں) نجات ابدیہ پر اعتراض کیا ہے کہ مسلمان جو اعمال صالحہ کے عوض میں نجات ابدیہ کے قائل ہیں یہ عقل کے خلاف ہے کیونکہ اسکی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی آدمی پر پانچ من بوجہ لاد دیا جائے جس سے اُس کا کو بچ نکلے پس متناہی عمل کا غیر متناہی صلہ نہونا چاہیئے مجھے حیرت ہے کہ اس شخص کو عاقل کس نے کہدیا پس ایسی دلیل سے آپ اُسکی عقل کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور گو یہ اس بیعقلی کی بات کا جواب دینا ہمارے ذمہ لازم نتھا عقلا ء خود اسکو سنکر ہنسیں گے مگر ضعفاء کی حفاظت کیلئے اس کا جواب دیا جاتا ہے وہ یہ کہ انسان پر پانچ من بوجھ لادنا اُسوقت موجب تکلیف ہے جبکہ ایک دم سے لاد دیا جائے اور اگر غیر متناہی ثواب غیر متناہی مدت میں دیا جاوے تو اسمیں کیا اشکال ہے اور مسلمان جو نجات ابدیہ کے قائل ہیں تو وہ اسکی ساتھ اسکے بھی تو قائل ہیں کہ اہل جنت ہمیشہ زندہ رہیں گے اُنکو کبھی موت نہ آئے گی (دوسرا لادنے کی بھی ایک ہی کہی بھلا نجات ابدیہ سے کمر پر لادنا کیونکر لازم آگیا کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم ایک شخص کو اسقدر خزانہ دیدیں جو کبھی ختم نہو اور وہ خزانہ ایک مقام پر محفوظ کر کے کنجی اس شخص کے حوالہ کر دیجائے کہ ضرورت کے وقت جتنا چاہے نکالے اور خرچ کرے اور اگر اس شخص کے نزدیک عمر غیر متناہی عطا ہونا ہی لادنے کے مثل ہے تو اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کیونکہ عمر طویل سے کسی پر بھی کچھ گرانی نہیں ہوتی بشرطیکہ قویٰ دماغیہ وجسمانیہ

معطل ہوں بلکہ ایسی زندگی کا تو کفار میں دنیا ہی کے اندر ہر کس طالب ہے ولتجدنھم احرص الناس علی حیوۃ ومن الذین اشرکوا یود احدھم لو یعمر الف سنۃ الخ) غرض آپ کو ہر عمل صالح پر بے انتہا اجر ملتا ہے اور ہر مصیبت میں نعم البدل عطا ہوتا ہے یہانتک کہ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل نعم اہل مصائب کے اجر کا مشاہدہ کریں گے تو وہ تمنا کریں گے کاش ہمکو دنیا میں ہماری کھالیں مقراض سے قطع کیجاتیں تاکہ آج ہمکو بھی یہ ثواب حاصل ہوتا پس اس ثواب کے استحضار سے آپکو غم ہلکا کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سب مصائب درحقیقت تجارت میں داخل ہیں۔ یہ تو علاج عام ہے جو عوام کیلئے مناسب ہے اور ایک علاج خاص ہے جسکو خواص استعمال کرتے ہیں اُس کا نام تفویض ہے جسکی حقیقت قطع تجویز ہے یعنی وہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردیتے ہیں کہ وہ جو چاہیں ان میں تصرف کریں۔ اپنی طرف سے وہ کوئی حالت یا نظام تجویز نہیں کرتے۔ اور تمام تر پریشانی کا سبب تجویز ہی ہے کہ ہمنے ہر چیز کا ایک نظام خاص اپنے ذہن میں قائم رکھا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہیئے اولاد کو اسطرح پر ہونا چاہیئے پھر اس نظام کے خلاف واقع ہونیسے کلفت ہوتی ہے اور زیادہ حصہ اس نظام کا جو ہماری طرف سے تجویز ہوتا ہے غیر اختیاری ہی ہے تو غیر اختیاری امور کیلئے نظام تجویز کرنا حماقت نہیں تو کیا ہی اسی قطع تجویز کیلئے حدیث میں ہے اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمساء واذا امسیت فلا تحدث نفسک بالصباح کہ جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ اور شام ہو تو صبح کے متعلق خیال نہ لاؤ۔ راحت اسی میں ہے اسی لئے اہل اللہ نے تجویز کو قطع کرکے یہ مذہب اختیار کرلیا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو | دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور یہ مذہب بنالیا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من | دل فدائے یار دل رنجان من

انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اُنکو اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں تصرف کریں پھر اسکے بھی دو طریق ہیں۔ کبھی تو استحضار ثواب سے تفویض حاصل ہوتی ہے کہ اس سے ہمکو ثواب ملیگا شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو وہی پہلا علاج ہو گیا۔ مگر نہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے پہلی

صورت میں تو استحضار ثواب خود علاج تھا اور اس صورت میں اصل علاج تفویض ہے اور
استحضار ثواب تقویت تفویض کیلئے ہے۔ اور کبھی محض رضائے حق کیلئے تفویض کیجاتی
ہے استحضار ثواب کو بھی اسمیں دخل نہیں ہوتا گو ثواب بھی مل جائے مگر یہ ثواب کیلئے تفویض
نہیں کرتا گو ثواب سے استغنا بھی نہیں ہوتا بلکہ اپنے کو مستحق نہیں سمجھتا صرف استحقاق کی
نفی ہوتی ہے کہ اگر ثواب نہ ملے تو عین عدل ہے کیونکہ میں اس کا مستحق نہیں یہ شخص محض اسلئے
تفویض کرتا ہے کہ محبوب کا حق یہی ہے کہ اسکے سامنے اپنی رائے اور تجویز کو فنا کردیا جائے
یہ تفویض کا اعلیٰ درجہ ہے کیونکہ جو تفویض ثواب کیلئے ہوتی ہے وہاں عمل بفوت ثواب سے
انقطاع تفویض کا احتمال ہوسکتا ہے اور تفویض للرضا میں یہ احتمال نہیں رہا یہ کہ تفویض
کے بعد بھی بقاء رضا میں تو شبہ و احتمال ہوسکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو جبتک
تفویض باقی ہے رضا بھی باقی ہے۔ دوسرے صوفی ابن الحال ہوتا ہے وہ آئندہ کی فکر نہیں
کرتا وہ بقاء رضا میں بھی تفویض سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ علاج چونکہ خاص ہے اسلئے میں نے
اسکو تتمیم کے طور پر بیان کردیا ہے ورنہ اصل علاج عام وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ استحضار ۳۲
ثواب کا مراقبہ کرے اور یہ بات سمجھ لے کہ ہر مصیبت پر نعم البدل ملتا ہے اور آخرت میں تو
ملتا ہی ہے۔ دنیا میں بھی نعم البدل ملتا ہے اور خدا پر بھروسہ کرکے میں نہایت زور کیساتھ
کہتا ہوں کہ دنیا میں بھی اسکو نعم البدل کا مشاہدہ ضرور ہوگا مگر اسکے لئے ایک شرط ہے وہ
یہ کہ حق تعالیٰ کے معاملات میں غور کرتا رہے کہ اس واقعہ میں کیا حکمت ہے اگر غور کرتا رہیگا
تو ہر واقعہ کی مصلحت سمجھ میں آجائے گی۔ بحمد اللہ مجھے تو خدا نے یہ دولت عطا فرمائی ہے مجھے
ہر واقعہ میں کھلی آنکھوں مصلحت و حکمت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آجکل جو مجھے عذر ہے اسکی
نسبت میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس کا میرے دل پر کسقدر حظ ہے کیونکہ میں عرصہ سے یہ چاہتا
تھا کہ سفر منقطع کردوں کیونکہ مجھے سفر سے کلفت ہوتی تھی اور میں اسکے لئے بہانہ اور عذر
تلاش کرتا تھا لیکن مجھے خبر نہ تھی کہ میرے جسم ہی میں ایک چیز ایسی موجود ہے جو میری اس
کلفت کے رفع کا ذریعہ بنجائے گی یعنی مجھے آنت اترنے کا مدت سے مرض تھا لیکن پہلے اس سے
کوئی تکلیف نہ تھی اب کچھ عرصہ سے اسمیں خاص تکلیف شروع ہوگئی کہ اپنے موقعہ پر سے اسکو

ہٹنا تکلیف کا سبب ہوتا ہے اور ادنی سبب سے وہ ہٹ جاتی ہے جس سے تحرز خصوص سفر میں مشکل ہے لہذا اب میں نے سفر منقطع کر دیا تو خدا نے مجھے یہ عذر ایسا دیا جس سے میری تکالیف کا انسداد ہو گیا اسی طرح ہر وقت کوئی نہ کوئی مصلحت اور فائدہ ہر واقعہ میں سمجھ میں آجاتا ہے حتی کہ کسی عزیز کی موت میں بھی اور مصیبت و رنج کے واقعات میں بھی اور کم از کم یہ فائدہ تو ہر واقعہ میں مشاہد ہے کہ اس سے اخلاق کی اصلاح ہو جاتی اور اپنی حقیقت و عجز کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔ تو صاحبو! اگر غم بھی ہو مگر غم کی حکمت سمجھ میں آجائے تو غم ہلکا ہو جائیگا یہی وجہ ہے کہ انبیاء و اولیاء کو غم سے پریشانی کم ہوتی ہے۔ پس انسان کو جو مصیبت پیش آئے اسوقت یہ سمجھ لے کہ مجھے اسمیں نفع ضرور ہو گا آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی گو دنیوی نفع ابھی سمجھ میں نہ آئے مگر غور کرتے کرتے وہ بھی سمجھ میں آنے لگے گا اور نہ سمجھ میں آئے تو آخرت کا نفع تو ہے ہی اور وہی ہمارا اصلی گھر ہے اسکے نفع کو مقدم سمجھنا چاہیئے گو دنیا کا نفع بھی اس درجہ مطلوب ہے مگر آخرت کی برابر نہیں اور یوں تو آدمی سفر میں ریل میں اور سرا میں بھی اپنی راحت کا اہتمام کرتا ہے کہ جگہ اچھی اور گرمی سردی کا آرام ہو تو اسی درجہ میں دنیا کی راحت کا بھی بقدر ضرورت اہتمام کرنے کا مضائقہ نہیں کیونکہ دنیا کی مثال آخرت کے سامنے سرا جیسی ہے اسلئے دنیا کی مصلحت و منفعت بھی ایک درجہ میں مطلوب ہے، اور شریعت نے بھی اجازت دی ہے اور یہاں سے ایک شبہ کا جواب بھی ہو گیا وہ یہ کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ علماء شریعت دنیا کما نیسے اور دنیا کی راحت و منفعت سے روکتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں قنوج میں ایک صاحب نے مجھ سے خود کہا کہ میں نے تو تمام شریعت کا خلاصہ یہ سمجھا ہے کہ نہ غم میں روؤ! نہ خوشی میں ہنسو ابس پتھر بنکر رہو اور مر جاؤ میں نے کہا سبحان اللہ آپنے خوب خلاصہ نکالا بلکہ شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی حال میں پریشان نہ ہو بلکہ راحت سے رہو غم میں بھی اور خوشی میں بھی کیونکہ شریعت غم کی ہلکا کرنیکا طریقہ بتلاتی ہے اور راحت کے متعلق ایسے امور کی تعلیم دیتی ہے جس سے اسباب راحت میں ترقی ہو زوال نہ ہو۔ واللہ لوگوں نے شریعت کو سمجھا نہیں اسلئے یہ غلط خلاصہ نکالا گیا یہ خلاصہ ویسا ہی ہے جیسے مولانا جامی نے قصہ یوسف و زلیخا کا خلاصہ نکالا تھا وہ سفر میں ایک شخص کے رفیق تھے روٹی تھوڑی تھی اس نے مولانا جامی کو باتوں میں لگانا چاہا تاکہ خود روٹی زیادہ

۳۴

کہا جائے اور کہا مولانا آپنے یوسف وزلیخا کا قصہ لکھا ہے ذرا وہ قصہ بیان تو کیجئے مولانا جامی سمجھ گئے کہ اسکا مقصود کچھ اور ہے فرمایا جی ہاں قصہ تو بہت لمبا ہے مگر خلاصہ اُس کا یہ ہے۔ پیری۔ بود پسرے داشت گم کردہ باز یافت + ایک بڑے میاں تھے اُنکا ایک لڑکا تھا وہ گم ہو گیا تھا پھر ملگیا یہ کہکر کہانا کھلانے لگے۔ نیز یہ ایسا خلاصہ تھا جیسے ایک صاحب نے یہاں خانقاہ میں رہکر تصوف کا خلاصہ نکالا تھا کہ مجھے تو یہاں کی تمام تعلیم کا خلاصہ یہ معلوم ہوا کہ پیر کی تعظیم خوب کرتے رہو میں نے کہا سبحان اللہ اچھا خلاصہ نکالا گویا مشائخ مخلوق کو اپنا بندہ بنانا چاہتے ہیں نعوذ باللہ اور نہ معلوم یہ خلاصہ انھوں نے کس تعلیم سے سمجھا حالانکہ یہاں تو تعظیم کی ممانعت ہے ہاں اطاعت کا حکم ہے کیونکہ اس طریق میں بدون تقلید و انقیاد کے کام نہیں چل سکتا ان حضرت کا نام بدر تھا میں نے اُنکو بَدَر کر دیا یعنی اُن کو سکون سے حرکت میں لے آیا۔ (اسکی لطافت اہل ذوق لسان سے مخفی نہیں کیونکہ رقامت سکوں ہی اور اخراج تحریک ہے اسی طرح بدر میں دال کا سکون ہے اور بَدَر میں حرکت ہے ۱۲) میں یہ کہہ رہا تھا کہ جن لوگوں نے شریعت کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ دنیا میں بیٹھ بنکر رہو انھوں نے شریعت کو اور علماء کے مطلب کو نہیں سمجھا ایک مولوی صاحب جو مالدار بھی تھے اُن سے ترقی مال کے متعلق میری گفتگو ہوئی مگر وہ سمجھتے نہ تھے بالآخر میں نے یہ کہا کہ میاں تم تو مولوی ہو میں تمکو علمی اصطلاح میں سمجھاتا ہوں کہ علماء کی تعلیم کا حاصل اس باب میں یہ ہے کہ مال کو مقصود بالذات نہ بناؤ ورنہ بدذات ہو جاؤ گے بلکہ مقصود بالغیر بناؤ تو بالخیر رہو گے ورنہ مطلقاً جمع مال سے علماء منع نہیں کرتے اور وہ کیسے منع کر سکتے ہیں جبکہ حدیث میں حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ مصرح ہے کہ ایک مرتبہ وہ غسل فرما رہے تھے کہ سونے کی ٹڈیاں اُنپر برسنے لگیں اور وہ اُنکو جمع کرنے لگے وحی آئی اے ایوب کیا میں نے تمکو اس سے مستغنی نہیں کر دیا ہے (کیونکہ ایوب علیہ السلام بہت مالدار تھے) تو آپنے عرض کیا بلٰی یارب ولکن لا غنی لی عن برکتک کہ بیشک اے پروردگار آپنے مجھے اس سے غنی کر دیا ہے لیکن میں آپکی نعمت کی ترقی سے مستغنی نہیں ہوں۔ اگر مال جمع کرنا مطلقاً مذموم ہوتا تو ایوب علیہ السلام کا یہ جواب مقبول نہوتا۔ نیز حضرت کعب بن مالک نے ایک دفعہ

اپنا تمام مال صدقہ کرنا چاہا تو حضور نے ارشاد فرمایا امسك علیك بعض مالك هو خیر لك کہ اپنے مال میں سے کچھ حصہ اپنے واسطے بھی رکھ لو یہ بہتر ہوگا چنانچہ انھوں نے خیبر کا حصہ روک لیا۔ نیز خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ اپنے ازواج مطہرات کو سال بھر کا نفقہ دیدیا کرتے تھے یہ بھی ایک گونہ جمع مال ہے۔ اور حضرت سفیان ثوری رح کا مقولہ ہے کہ حلال مال کی قدر کرو اسکو فضول ضائع نکرو ایک زمانہ تو وہ تھا جسمیں مال کا جمع کرنا دین کے واسطے مضر تھا اور اب وہ زمانہ ہے کہ مال کا جمع نکرنا دین کے واسطے مضر ہے پھر فرمایا کہ اگر ہمارے پاس یہ چند دراہم و دنانیر نہوتے تو یہ اہل دولت تو ہمکو اپنا رومال بنا لیتے یعنی ہمکو پامال کردیتے۔ اب کس کا منہ ہے جو علماء کو بدنام کرے کہ یہ دنیا کمانے اور مال جمع کرنیسے روکتے اور ترقی کے مخالف ہیں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ آجکل جن اہل ترقی کو ترقی کی فکر ہے انکو صرف آمدنی کی فکر ہے مگر اسکی ساتھ ہی وہ خرچ بھی بہت کرتے ہیں پھر اس طرح ترقی کیسے ہوگی۔ ترقی کی صورت تو یہ ہے کہ ترقی آمدنی کی ساتھ خرچ کو بھی کم کیا جائے پس ان لوگوں کا اپنے کو حامی ترقی کہنا غلط ہے یہ دعوے بلا دلیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس میرٹھ کا مقولہ ہے کہ آمدنی کی فکر سے زیادہ خرچ کی فکر لازم ہے اگر خرچ کی فکر ہو تو تھوڑی آمدنی بھی کافی ہو جاتی ہے اور خرچ کا انتظام نہو تو بہت آمدنی بھی کافی نہیں آجکل لوگوں کی زیادہ پریشانی کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے خرچ کا انتظام نہیں کرتے اسی لئے ۵۰ اور ۱۰۰ روپے کی تنخواہ بھی انکو قلیل معلوم ہوتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مدرسی سے پہلے میں نے ذہن میں اپنے لئے ۱۰ روپے تنخواہ تجویز کی تھی کہ بس ہم دو میاں بی بی کیلئے اتنا بہت ہے مگر آجکل تو ۱۰ روپیہ کی تنخواہ کا نام بھی لینا عار ہے چنانچہ ہمارے ہی قریب ایک قصبہ میں چند مستورات نے جمع ہو کر اپنے اپنے شوہروں کی تنخواہوں کا تذکرہ کیا۔ انمیں سے ایک عورت کے خاوند کی تنخواہ شاید ۲۰ تھی جب اسکی باری آئی تو وہ یہ کہتی ہوئی شرمائی کہ ۲۰ روپیہ تنخواہ ہے اسلئے وہ یوں کہتی ہے کہ تنخواہ تو انکی ۲۰ ہی روپیہ ہے مگر ماشاء اللہ اوپر کی آمدنی کافی ہے ایک عورت نے کہا اری کمبخت توبہ کر حرام مال پر ماشاء اللہ کہتی ہے غرض شریعت تو دنیا میں راحت کے ساتھ

رہنے کی بھی اجازت بلکہ تعلیم دیتی ہے لیکن اُسکو مقصود بالذات بنانے کو روکتی ہے پس اگر دنیا کا کچھ نقصان ہوجاوے اور اُسمیں دنیا یا آخرت کا نفع ہوجاوے تو وہ نقصان حقیقت میں کچھ نقصان نہیں وہ ایک تجارت ہے اپنے دل کو سمجھا لینا چاہئیے میں نے اوپر کہا تھا کہ دنیوی نقصان سے خود دنیا میں نفع ہوتا ہے جو غور سے سمجھ میں آتا ہے مجکو اسپر ایک حکایت یاد آگئی۔ بریلی میں ایک صاحب یتیم خانہ کے مہتمم تھے انھوں نے میرے نام ایک فتوی کیلئے خط لکھا اور پتہ میں اپنے نام کے ساتھ گورنر یتیم خانہ لکھا۔ آجکل ایک آفت یہ بھی ہوگئی کہ جاہ مقصود بالذات ہوگیا جاہ کیلئے اپنے الئے خانہ ساز عہدے پھر اُن عہدوں کے انگریزی نام تجویز کرتے ہیں تو اُن صاحب نے اپنے کو گورنر لکھا مگر وہ ایسے گورنر تھے کہ جواب کیلئے آپنے ٹکٹ تک نہ بھیجا تھا میں اُسوقت تک ایسے خطوط کا جواب بیرنگ دیدیا کرتا تھا اس کا جواب بھی میں نے بیرنگ بھیجدیا تو گورنر صاحب نے واپس کردیا اور مجھے ایک آنہ دینا پڑا کیونکہ اُسوقت ایک ہی آنہ محصول تھا اتفاق سے اُسی زمانہ میں میرا جانا بریلی ہوگیا میں نے بھائی سے یہ قصہ بیان کیا کہ میں ان گورنر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں مجھے اُن سے ایک آنہ وصول کرنا ہے یہ کیسے گورنر ہیں کہ استفتا بھیجیں اور جواب کیلئے ٹکٹ نہ رکھیں اور بیرنگ جواب دیا جائے تو محصول بھی ہمارے ذمہ ڈالیں اُسوقت بعض لوگ اور بھی بیٹھے تھے جب وہ چلے گئے تو بھائی نے کہا کہ تمنے غضب کیا اسوقت اُن گورنر صاحب کے صاحبزادے بھی موجود تھے۔ میں نے کہا یہ اچھا ہوا کہ میرا مدعی حاصل ہوگیا کیونکہ میں تو انکو اس تہذیب پر تنبیہ کرنیکے لئے ہی ملنا چاہتا تھا اب مجھے اُن سے ملنے کی ضرورت نہیں صاحبزادے ضرور مطلع کردیں گے دیکھئے ان گورنر صاحب کی حرکت سے میرا ایک آنہ کا نقصان تو ہوا مگر اس میں بھی حکمت تھی وہ یہ کہ میں نے آئندہ کیلئے قانون مقرر کرلیا کہ ایسے خطوط کا جواب بھی نہیں دیتا جنمیں ٹکٹ نہو۔ یہ مجکو نفع ہوا۔ صاحبو! میرے پاس کوئی چھ مہینہ رہے تو میں اُن واقعات الٰہیہ کی اسرار و حکم اُسکو برابر بتلاتا رہونگا جو روزانہ مجھے پیش آتے رہتے ہیں ہاں البتہ ان کے واقعات کا میں ذمہ دار نہیں کیونکہ اپنے واقعات کا علم اُنہی کو ہو سکتا

ہے اور وہی اسکے منافع وحکم کو سمجھ سکتے ہیں گور نر کے قصہ پر ایک مضمون ذہن میں آگیا
آجکل تفاخر و تکبر کا مرض ایسا عام ہوا ہے کہ علماء میں بھی یہ مرض سرایت کرگیا چنانچہ بعض
نوجوان اہل علم اپنے ناموں کے ساتھ فاضل دیوبند لکھنے لگے ہیں میں کہتا ہوں کہ ہاں تم
فاضل ہو مگر فضیلت سے نہیں بلکہ فضول سے کیونکہ جو لوگ واقعی صاحب فضیلت تھے انکی
تو یہ حالت تھی کہ اپنا نام بھی پورا نہ لکھتے تھے حضرت شیخ العلماء مولانا محمود حسن صاحب
قدس سرہ نے ہمیشہ اپنے دستخط میں بندہ محمود ہی لکھا نام بھی پورا نہ لکھا فاضل یا عالم تو
وہ اپنے کو کب لکھتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے کو عالم ہی نہیں سمجھتے تھے ایک دفعہ
خود فرمایا کہ ساری عمر کے علمی مشغلہ سے ہمکو تو یہ حاصل ہوا کہ جہل مرکب سے جہل بسیط میں آگئے
یعنی اپنے جہل کا علم ہو گیا۔ اور اسی تفاخر کا یہ اثر ہے کہ اپنے ناموں کیساتھ نسبتیں لکھتے
ہیں کوئی سبحانی بنتا ہے کوئی یزدانی آجکل چھوٹی قوموں کو بھی انصاری بننے کی فکر ہوئی ہے
ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ اسلام میں مساوات ہے اسلئے چھوٹی قوموں کو ذلیل کرنے کی
کوئی وجہ نہیں ہے لہذا مناسب ہے کہ انکو بڑے بڑے القاب سے یاد کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ
فرماتے ہیں ولا تنابزوا بالالقاب (سبحان اللہ آیت کا مطلب آپنے خوب سمجھا آیت کا
مطلب تو یہ ہے کہ اسکو برے لقب سے یاد نکرو یہ تو مطلب نہیں کہ غیر واقعی بڑے بڑے القاب سے
یاد کرو) پھر آپنے لکھا کہ چھوٹی قوموں کو اعظمی حنفی نعمانی وغیرہ القاب دیئے جائیں میں نے
لکھا کہ یہ تو آپکو معلوم ہے کہ شریعت نے نکاح وغیرہ میں جو کفارت کے احکام مقرر کئے
ہیں وہ مصالح پر مبنی ہیں۔ اور یہ بھی آپکو معلوم ہے کہ انتساب الی غیر الآباء حرام ہے تو
اگر ان لوگوں کو بڑے بڑے القاب مذکورہ دیئے گئے تو چند روز میں لوگ انکو حضرت امام
اعظم رحۃ کی اولاد سمجھنے لگیں گے جیسا کہ ایک صاحب نے اپنے نام کیساتھ نعمانی لکھنا شروع
کیا تھا اور عام لوگ انکو امام صاحب کی اولاد میں سمجھنے لگے۔ پھر اس تفاخر نے یہانتک ترقی
کی کہ بعض لوگ انسان سے حیوان بننے لگے کوئی اپنے نام کیساتھ طوطی ہند لکھتا ہے کوئی
بلبل ہند میں نے کہا کہ اب چند روز میں لوگ خر ہند اور زاغ ہند بھی بننے لگیں گے اب میں
اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں وہ یہ کہ بڑا سبب دنیوی نقصان سے پریشان ہونے کا

یہ بھی ہے کہ مال وجاہ کو مقصود بالذات سمجھنے لگے اسلئے اسکے فوت کے وقت اسکے نعم البدل پر نظر نہیں جاتی کیونکہ مقصود بالذات کا کوئی بدل نہیں ہوتا اگر انکو مقصود بالذات نہ سمجھا جاوے تو اسکے بدل ملنے پر قناعت ہو جاوے اس مرتبہ میں علماء اسکو مطلوب بنانے سے منع کرتے ہیں ورنہ علماء کسب حلال اور جمع مال سے مطلقاً منع نہیں کرتے بلکہ کسب حلال کو تو فرض کہتے ہیں کیونکہ حدیث میں اس کا امر ہے چنانچہ میں نے ایک دفعہ ایک بیان میں کہا تھا کہ ترقی کے ہم مخالف نہیں البتہ بعض ترقی کے مخالف ہیں اور اسکو آپ بھی تسلیم کرینگے کیونکہ اگر ہر ترقی مطلوب ہے تو ورم بھی ایک ترقی ہے اس کا علاج کیوں کیا جاتا ہے پس جو درجہ آپ کے یہاں ترقی ورم کا ہے وہی درجہ ہمارے یہاں بعض ترقی درم کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مال کے ایسے درپے ہو کہ دین برباد ہو جائے ؎

مبادا دلِ آں فرومایہ شاد کہ از بہر دنیا دہد دین بباد

اگر مال کے ساتھ دین پوری طرح محفوظ رہے تو پھر تمکو ترقی دنیا سے کون روکتا ہے جتنی چاہو ترقی کرو خواہ بادشاہ ہو جاؤ خواہ وزیر ہو جاؤ خواہ ہفت اقلیم کو فتح کر لو مگر حدود کے اندر رہو لیکن تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے۔ حدود کی تمیز آپ کو خود نہ ہوگی بلکہ اسکے لئے آپکو اول کسی عالم کے پاس رہنے کی ضرورت ہوگی جو مسائل واحکام سے آپکو واقف کرے پھر محقق شیخ کے پاس رہنے کی ضرورت ہوگی وہ آپکو صدرا شمس بازغہ نہ پڑھائیگا بلکہ اسکی صحبت وتقریری سے آپکو حدود کا امتیاز ہو جائے گا۔ اکبر حسین صاحب جج مرحوم فرماتے ہیں ؎ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا۔

اور صحبت علماء ومشائخ کیلئے اسکی ضرورت نہیں کہ آپ اپنی ملازمت وغیرہ کو ترک کر کے ان کے پاس رہیں بلکہ اسکی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی تعطیلات کا کچھ حصہ انکی خدمت میں گذارو۔ چھوٹی چھوٹی تعطیلوں کو تو اپنی تفریح وغیرہ میں صرف کرو ہاں بڑی چھٹی کی تنصیف کر کے نصف حصہ انکے پاس رہو اور نصف حصہ اپنے وطن وغیرہ میں رہو اتنا بھی اگر آپ کرتے رہیں تو کافی ہے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو یوں کہا جائیگا کہ آپکو دین کی طلب ہی نہیں۔ ابھی کچھ دن گذرے ہیں ایک صاحب عہدہ دار میرے پاس آئے تھے وہ کچھ شبہات بیان

رنے لگے ہیں تے کہاکہ آپ کے شبہات کے جوابات تو حاضر ہیں مگر ممکن ہے کہ ان جوابات سے آپکی تسلی نہ ہو۔ کیونکہ آپ کے شبہات تو برسوں کے پرانے ہیں اور آپ تشفی چاہتے ہیں ایک جلسہ میں یہ ٹھیک نہیں بلکہ ضرورت اسکی ہے کہ آپ چھ مہینے یہاں رہیں تو امید ہے کہ آپ کی تسلی ہوجائے گی۔ اور اگر کسی کو یہ ڈر ہو کہ ہم متقی بنجائیں گے تو دنیا کے مزے جاتے رہیں گے تو میں کہتا ہوں کہ تم یہ نیت کرلو کہ متقی نہ بنیں گے مگر خدا کیلئے علماء ومشائخ کی صحبت میں رہکر ایک دفعہ دین کو سمجھ تو لو اس کا یہ اثر ہوگا کہ تمکو متقی بننے کیلئے کوئی دقت پیش نہ آئیگی بلکہ تم خودبخود عمل کے مشتاق ہوجاوگے اور تمکو اسوقت اعمال دینیہ میں وہ حظ اور لذت آئیگی کہ دنیا کی تمام لذتوں کو بھول جاؤگے۔ علیگڈھ کے ایک طالبعلم ایم اے میرے پاس آتے ہیں پہلے وہ بھی آزاد تھے مگر اب اُنکی یہ حالت ہے کہ دین کا انکو عشق ہوگیا ہے اور اُنکی حالت یہاں کے صلحاء کی برکت سے اس کا مصداق ہوگئی ؎

بگفتا من گل ناچیز بودم ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اب وہ دنیا سے اسقدر متنفر ہیں کہ اُن کے چچا نے ایک دفعہ اُن سے فرمائش کی کہ ایک بنئے کے نام سودی قرض کا رقعہ لکھدو اُنھوں نے صاف انکار کردیا چچا کو ناگوار ہوا اُن کے والد کو اطلاع ہوئی اُنکو بھی ناگوار ہوا اور کہا تمنے چچا کے حکم کی مخالفت کیوں کی۔ کہا وہ مجھسے خدا کے حکم کی مخالفت کراتے تھے اور یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا ہاں میری ذات میں وہ کوئی تصرف کریں اسکے لئے میں جان ودل سے حاضر ہوں۔ مگر دین میں تصرف کریں تو یہ مجھکو گوارا نہیں پھر خدا نے غیب سے یہ سامان کیا کہ اُن کے چچا کو خواب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یا کسی بزرگ کی زیارت ہوئی اور اُنھوں نے انکو اس حرکت پر تنبیہ کی اور بھتیجے کی تائید کی چچا نے خواب سے بیدار ہوکر توبہ استغفار کیا اور بھتیجہ کو خط میں یہ سب واقعہ لکھکر اُن سے معافی طلب کی اور سب راضی ہوگئے واقعی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے سب کام غیب سے خود درست کردیتے ہیں۔ اب آپکی یہ حالت ہوگی کہ اگر پہلے عنہ۲ کافی ہوتے تھے تو اب عنہ۵ کافی ہونگے اور دین برباد کرکے دنیا کمانے کی ہوس نہوگی

ہوس نہ ہونے پر قصہ یاد آگیا۔ اناؤ میں ایک سب جج تھے اُن کے پاس دو تعلقداروں کا مقدمہ آیا انمیں سے ایک نے ایک لاکھ روپیے رشوت میں پیش کئے سب جج صاحب نے اپنے نوکر کو حکم دیا اس نالائق کو باہر نکالدو۔ ہر چند کہ تعلقدار کے سامنے ایک سب جج کی کوئی حیثیت نہیں مگر ایسے وقت وہ بھی کچھ نہیں بول سکتا جو خوشامد میں رشوت دیتا ہوا اور دوسرا اُس سے استغنا برتتا ہو۔ دوسرے فریق کو خبر ہوئی کہ ایک لاکھ روپیہ واپس کردیا گیا وہ سوا لاکھ روپیہ لیکر آیا سب جج صاحب نے اسکو بھی نوکروں سے نکلوادیا بتلایئے وہ کیا بات تھی کہ اس شخص نے سوا دو لاکھ روپئے پر لات ماردی یقیناً اُسکو رشوت لینے میں تکلیف تھی اور اسپر لات مارنے میں راحت تھی۔ مگر چونکہ وہ عالم نتھے اسلئے ایک حرکت انھوں نے خلاف بھی کی وہ یہ کہ غصہ میں فرمایا کہ پہلے میرا خیال اس مقدمہ میں انصاف کرنے کا تھا مگر چونکہ ان دونوں نے میرا دل بہت دکھایا ہے اسلئے اب ایسا فیصلہ کرونگا کہ دونوں سر پکڑ کر روئیں گے چنانچہ ایسا ہی فیصلہ کیا اور لطیفہ یہ ہوا کہ فیصلہ سنانیسے پہلے انکی بدلی بھی ہوگئی مگر انھوں نے دو چار دن میں خوب محنت کرکے رات اور دن کا سارا وقت فیصلہ لکھنے میں صرف کیا اور جانیسے ایک دن پہلے فیصلہ سنا کر مقدمہ ختم کرکے چلے گئے پھر دونوں نے ہر چند ہائی کورٹ وغیرہ میں اپیل کیا مگر ظالم نے ایسا مدلل فیصلہ لکھا تھا کہ کہیں نہ ٹوٹ سکا۔ صاحبو! اب ایسے شخص کو دنیا کی ہوس کیونکر ہوسکتی ہے بلکہ اب اُسکو تھوڑی آمدنی کافی ہوگی اور تھوڑی سی عزت کافی ہوگی اور تمام افکار سے آزاد ہوکر صرف ایک کی فکر میں گرفتار رہے گا اور اس آزادی پر خوش ہوکر یوں کہے گا

نہ براشتر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم ؎ نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

اور یوں کہے گا ؎

گر دو صد زنجیر آرے بگسلم ؎ غیر زلف آں نگارے مقبلم

کیونکہ وہ زنجیر تو ایسی ہے کہ ؎

اسیرت نخواہد رہائی زبند ؎ شکارت نجوید خلاص از کمند

وہ تو ایسی قید ہے جیسے کسی عاشق کو اُس کا محبوب جو کہ مدتوں کے بعد ترس ترس کر ملا ہو

(باقی آئندہ)

پیچھے سے آکر اس طور سے کہ اسکو خبر بھی نہ ہو اسکو بغل میں دبا لے اور اتنا زور سے دبائے کہ اسکو طبعاً ناگوار بھی ہو مگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو محبوب کے چہرہ پر نظر پڑی تو گو یہ قید ہے کہ جاتے ہوئے کو روک لیا ایک جگہ محبوس کر دیا قید بھی با مشقت ہے کہ زور سے دبا لیا کیونکہ معشوق تو موٹا تازہ تھا اسکو کوئی فکر و غم تھوڑا ہی تھا جو دبلا ہوتا اور عشاق اکثر تو حلے غم عشق کے لاغر و نحیف ہوتے ہیں جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر — عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
لیک عشق عاشقاں تن زہ کند — عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

اب اگر محبوب اس سے یوں کہے کہ تجکو تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں اور ساتھ ہی یہ حرکت بھی لگا دے کہ تجھے چھوڑ کر اسطرح رقیب کو بغل میں لیلوں کہ وہ بھی اس کا مدت سے مشتاق ہے تو یقیناً عاشق یوں کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور کہے گا ؎

نکلجائے دم تیرے قدموں کے نیچے — یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

تو جب ایک انسان کی محبت کا یہ حال ہے جو آپ ہی جیسا آدمی ہے مگر ذرا چمڑے کا رنگ کھلا ہوا ہے تو حق تعالیٰ کی محبت کا کیا حال ہونا چاہئے جسکی نظیر کوئی بھی نہیں شیخ فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودے ز آب و گل — رباید ہمہ صبر و آرام دل
عجب داری از سالکان طریق — کہ باشند در بحر معنی غریق،
دما دم شراب الم در کشند — وگر تلخ بینند دم در کشند

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود — گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

مولانا نے مجنون کے واقعہ پر یہ شعر لکھا ہے واقعہ یہ تھا کہ مجنون ایک دفعہ لیلیٰ کی زیارت کو اونٹنی پر سوار ہو کر چلا اونٹنی کے ساتھ اسکا بچہ بھی تھا جو پیچھے رہ رہ جاتا تھا

اور اونٹنی بار بار اسکو مڑکر دیکھتی اور جسوقت مجنون اپنے خیال میں مستغرق ہوتا اور باگ ڈھیلی
ہو جاتی اونٹنی پیچھے کو لوٹ جاتی پھر اسکو ہوش آتا اور یہ اسکو آگے بڑھاتا پھر مستغرق ہو جاتا
اور اونٹنی پیچھے لوٹ جاتی جب بار بار ایسا ہوا اور راستہ کچھ طے نہوا تو بیقرار ہوکر کہا ؎

ھوی ناقتی خلفی وقدامی الھوی فانی وایاھا لمختلفان

اور اوپر سے فوراً کود پڑا اونٹنی کو بٹھلا کر اترنیکا بھی انتظار نکیا اوپر سے کودا تو میاں کا
پیر بیکار ہو گیا چلنے کے قابل بھی نرہا تو اب آپنے لیٹے لیٹے لڑھکنا شروع کیا اور کہا ؎

فان قطعت رجلی مشیت علی العصا + وان قطعت اخری حبوت حبیت

اگر میرا ایک پیر کٹ جائے تو لاٹھی کے سہارے آؤں گا اگر دوسرا کٹ جائے تو گھسٹ
آؤں گا ۱۲) مولانا اسیر فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود گوے گشتن بہر اواولیٰ بود

چونکہ وہ لڑھک رہا تھا اسی لئے گوے گشتن فرمایا۔ جب لیلیٰ کی محبت میں یہ حال ہو گیا
تو محبوب حقیقی کے عشاق پر کیا تعجب کرتے ہو۔ اب اسکو نہ کسی کا مرنا معلوم ہوگا نہ جینا
ہر حال میں خوش رہے گا۔ اب اسکو نہ مال وزر خدا سے مانع ہوگا نہ فاقہ اور تنگدستی
کیونکہ بعض لوگ مال وزر کے ساتھ بھی خدا سے علاقہ رکھتے ہیں اور بعض لوگ خالی
ہاتھ ہوکر بھی خدا سے دور ہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چو ہر ساعت از تو بجاے رود دل بہ تنہائی اندر صفاے نہ بینی

اور اگر سلطنت ہو زمینداری ہو مگر دل خدا سے لگا ہوا ہے تو پھر یہ حال ہوگا ؎

گرت مال وزر ہست و زرع وتجارت چو دل با خدا ایست خلوت نشینی

مگر ابتدا میں ایسی قوت نہیں ہوتی بلکہ چندروز اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

اگر کسی میں فطری قوت ہو کہ مادر زاد ولی ہو ابتدا ہی سے خدا کے ساتھ تعلق
ہو تو مبارک ہو ورنہ اگر کسی میں یہ قوت فطری نہو تو جسطرح ورزش سے جسم میں
قوت آجاتی ہے واللہ اسی طرح یہاں بھی بزرگوں کی صحبت سے اور ان کی تعلیم سے

عمل کرنے سے دل میں قوت آجاتی ہے مگر صحبت کا نام سنکر ڈر مت جانا وہ تمسے چکی
نہ پسوائیں گے بیفکر رہو بلکہ آسان اور سہل طریق سے دل میں خدا کی محبت پیدا کر دینگے
پھر دل میں ایسی قوت ہوگی کہ نہ بیماری سے گھبرائے گا نہ فقر و فاقہ سے نہ کسی عزیز کے مرنے
جینے سے چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام بیماری میں بھی خوش تھے حالانکہ بیماری ایسی
سخت تھی کہ تمام جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے اعزہ و اقارب سبنے چھوڑ دیا تھا صرف ایک
آپ کی بی بی حضرت رحمت علیہا السلام خدمت گذار تھیں اور اسی حالت میں تمام اولاد
مر گئی مویشی اور غلام بھی مر گئے پہلے بڑے مالدار تھے اب مفلس ہو گئے تو حضرت رحمت
نے عرض کیا کہ اے حضرت اب تو بہت تکلیف ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے تو بی بی
سے فرمایا کہ اے رحمت یہ تو بتلاؤ کہ ہم راحت و آرام میں کتنی مدت رہے فرمایا اسی
سال فرمایا کہ اسی سال تو کم از کم کلفت برداشت کرلیں پھر حق تعالیٰ سے عرض کرینگے
ورنہ یہ کیا کہ جب خدا کی نعمتیں اسی سال کھائیں چار دن کیلئے اگر وہ آزمائے تو اس سے
گھبرا جائے اور اسکی آزمائش کا تحمل نکرے۔ بتلایئے پھر اس سے بڑھکر کیا راحت
ہوگی کہ کلفت بھی کلفت نرہے راحت ہو جائے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا میں مؤمن کو جسقدر
تکالیف پہونچتی ہیں سبکا نعم البدل اُسکو دونوں جہان میں ملتا ہے پس درحقیقت یہ ایک تجارت
ہے کہ ایک چیز دی گئی اور ایک چیز لیگئی اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو انشاء اللہ رنج
و غم کو ترقی نہوگی اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمکو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل صالح کی اور صبر کی
توفیق ہو چونکہ طبیعت مضمحل ہے اسلئے زیادہ بیان کی ہمت نہیں قدر ضرورت پر اکتفا کرتا
ہوں وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب
العالمین۔

نوٹ۔ بعد بیان کے دریافت فرمایا کہ کتنی دیر ہوئی عرض کیا گیا کہ پونے دو گھنٹے بیان
ہوا فرمایا اتنی دیر ہوگئی تو میں نے ناحق ہی معذرت کی ۱۲ ظ

اشرف علی

قواعد وضوابط رسالہ المبلغ

(۱) اس رسالہ میں حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ جامع شریعت و طریقت واقف اسرار حقیقت مرشد نا و مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم کے صرف مواعظ حسنہ ماہوار شائع ہوتے ہیں (۲) رسالہ ہذا کا مقصود مسلمانوں خصوصاً سالکین طریقت کے ظاہر و باطن کی اور شکوک و اوہام متعلقہ عقائد و احکام کی اصلاح ہے جو حضرت مولانا صاحب دام ظلہم العالی کے مواعظ کا خاص ممتاز فائدہ ہے۔ (۳) اس رسالہ کے ہر مہینہ میں چالیس صفحے ہوتے ہیں مگر چونکہ ہر وعظ پورے چالیس ہی صفحہ کا نہیں ہوتا بعض وعظ کم صفحات کے اور اکثر زائد صفحات کے ہوتے ہیں اسلئے ہر مہینہ پورا وعظ ارسال نہیں ہوتا بلکہ ہر رسالہ میں کسی وعظ کے اخیر کے صفحات اور دوسرے وعظ کی شروع کے صفحات شامل کرکے چالیس صفحے پورے کر دیئے جاتے ہیں لہذا سب حضرات خریداران ہر رسالہ کو بحفاظت رکھیں تاکہ جس وعظ کے کسی مہینہ میں شروع کے چند اوراق ارسال ہوئے ہیں دوسرے مہینہ میں جب اسکے اخیر صفحات دفتر سے موصول ہوں تو دونوں ملاکر وعظ پورا کر لیا جائے۔ رسالہ کا نمبر اور مہینہ کا نام ہر صفحہ کے نیچے لکھا ہوتا ہے اس سے تو سال بھر کے بارہ پرچے دیکھ لئے جاویں کہ پورے وصول ہوگئے یا نہیں اور وعظ کا نام ہر صفحہ کے اوپر لکھا ہوتا ہے اس سے ہر وعظ کے اوراق ملا کر پورا کر لیا جا سکتا ہے (۴) یہ رسالہ ہر مہینہ کا اسی مہینہ کی کسی تاریخ میں شائع ہو جاتا ہے اگر کسی مہینہ کا رسالہ نہ پہونچے تو فوراً خط و کتابت کرکے پیسے خراب نہ کئے جاویں بلکہ دوسرے ماہ کے رسالہ تک انتظار کریں اگر دوسرے ماہ میں پہلے ماہ کا اور اس ماہ کا دونوں کا رسالہ پہونچ جائے فبہا اور اگر دوسرے ماہ کا رسالہ پہونچ جاوے اور پہلے ماہ کا نہ پہونچے تو فوراً پہلے ماہ کے رسالہ کی اطلاع دفتر کو کر دیجاوے تو دوبارہ بیرنگ روانہ کر دیا جاتا ہے اگر دوسرے رسالہ کے پہونچنے پر بھی اطلاع نہ دیگئی تو پھر رسالہ قیمتاً ملتا ہے (۵) رسالہ کی قیمت سالانہ مع محصولڈاک دو روپیہ چھ آنہ (عـہ) اور بصورت وی پی دو روپیہ بارہ آنہ (عـہ) اور ممالک غیر سے چار شلنگ چھ پنس مقرر ہے اور ایک پرچہ کی قیمت مع محصول چار آنہ (۴) ہے اور ممالک غیر سے چھ پنس ہے قیمت ہر صورت میں پیشگی لیجاتی ہے (۶) ہر خریدار کو شروع سال سے خریدار ہونا ضروری ہے جو صاحب درمیان سال میں خریدار ہونگے انکو شروع سال سے کل رسالے روانہ کرکے شروع ہی سے خریدار سمجھا جاوے گا رسالہ کا سال شوال سے شروع ہوتا ہے (۷) یہ رسالہ کسی صاحب کی خدمت میں بلا طلب و تحریک روانہ نہیں کیا جاتا بعض حضرات خود طلب فرماتے ہیں اور بعض حضرات اپنے اعتماد پر دوسرے حضرات کی خدمت میں روانہ کرنیکی فرمایش کرتے ہیں لہذا اگر کسی صاحب کی خدمت میں بغیر انکی طلب کے رسالہ پہونچے تو یہ سمجھ لیں کہ انکے کسی معتمد نے بھیجا یا ہے لہذا اسکا ڈاک کو کسی حال میں واپس فرمایا جاوے (۸) رسالہ ہذا کی متعلق جملہ خط و کتابت و ترسیل زر بپتہ ذیل ہونی فرمایئے

احقر محمد شبیر علی مدیر رسالہ النور والمبلغ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر۔

رسالہ المبلغ ع۱۲ جلد ۱ بابتہ ماہ رمضان ۱۳۴۹ھ (رجسٹرڈ حرف اے نمبر ۲۰۲۷)

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ ۹۰ مسمی بہ

الفانی

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب دام ظلہم

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنی اہتمام سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الغانی

اَین	کہاں ہوا	تھانہ بھون بر مکان جناب بھائی منشی اکبر علی صاحب مرحوم
متٰی	کب ہوا	۳۰ جمادی الاخری ۱۳۳۱ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ
کیف	کس ہیئت سے ہوا	جالسًا
لِمَ	سبب کیا تھا	برادرم مرحوم مولانا سعید احمد صاحب عفر اللہ لہٗ کی وفات حسرت آیات پر تعزیت کیلئے مہمانوں کا اجتماع ہوا اسلئے انکی درخواست پر بیان ہوا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	ہم لوگ دنیا کے فنا و زوال سے غافل ہیں اور آخرت کے بقا سے بھی اسلئے زیادہ پریشانی ہوتی ہے پس راحت کا طریقہ فنائے دنیا و بقائے آخرت کا استحضار ہے۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عمومًا۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۱۰۰ تقریبًا۔ مجمع مستورات پردہ میں اسکے علاوہ تھا
الاشتات	متفرقات	یہ وعظ احقر جامع کا اول ضبط کردہ وعظ ہے پھر اتفاق سے اسکی تبییض میں بھی بہت دیر ہوگئی اسلئے ممکن ہے کہ ضبط اچھی طرح نہوا ہو ۱۲

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم **امابعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرحیم بسم اللہ الرحمن الرحیم ما عندکم ینفد وما عند اللہ باق ط ولنجزین الذین صبروا اجرھم باحسن ما کانو

بعلمون ٥ یہ ایک مختصر سی آیت ہے اسمیں حق تعالی جل شانہ عم نوالہ نے ہمکو ایک بڑے کام کی بات تعلیم فرمائی ہے جس سے ہماری تمام پریشانیوں کا علاج ہو جائیگا اور یہ مضمون بہت ظاہر ہے جسمیں کوئی پیچیدگی نہیں اور یہ قرآن وحدیث کا کمال ہے کہ اسکی کوئی بات پیچیدہ نہیں شریعت مقدسہ کی تعلیم بہت صاف تعلیم ہے کیونکہ قرآن مجید ایسے لوگوں کیلئے نازل ہوا ہے جنمیں مختلف فرقے اور مختلف حالات ہیں اس لئے قرآن کے علوم بہت سہل ہیں اور اسکی باتیں دل لگتی ہیں تاکہ سبکو فائدہ پہونچے اس لئے اگر قرآن سے ایک عامی منتفع ہے تو ایک فلسفی بھی اس سے مستفید ہے ہر شخص خواہ عامی ہو یا عالم اس سے مستفید ہونے میں یکساں ہے گو استفادہ کا درجہ مختلف ہو ہر شخص کو اسکے مرتبہ کے موافق اس سے نفع ہوتا ہے اسکی یہ شان ہے ٥

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد
برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اسلئے بعض لوگوں نے قرآن شریف کو بارش سے تشبیہ دی ہے کہ ہر زمین کو اپنی استعداد کے موافق اس سے سیرابی و سرسبزی حاصل ہوتی ہے۔ اور جسطرح یہ صفت قرآن شریف کی ہے ایسے ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جو اور تعلیمات حدیث میں ہیں انکی بھی یہی شان ہے کیونکہ وہ بھی وحی الٰہی ہے صرف اتنا فرق ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو ہے اس لئے جو مضمون حدیث میں ہو اسکا سمجھنا اور سمجھانا بھی بہت سہل ہے جیسے قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا سہل ہے اور کیوں نہو وہ ایسے متکلم کا کلام ہے جسکو ہر مشکل کا آسان کرنا سہل ہے پس قرآن وحدیث کی تعلیم کا سہل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں اور یہ سہولت تذکیر کے حصہ میں ہے اور استنباط کا حصہ صرف مجتہدین کے ساتھ خاص ہے اسی لئے یسرنا میں للذکر اور لیتنشروتنذر کی قید ہے اور بعض مضامین میں یستنبطونہ کی قید ہے انہی سہل و در تذکیری مضامین میں سے یہ بھی ایک مضمون ہے جو اس آیت میں مذکور ہے اگر اسمیں تدبر کیا جائے تو اس سے ہماری بہت بڑی غلطی رفع ہو گی۔ تدبر کی قید میں نے اسلئے لگائی کہ شریعت کی تعلیم باوجود سہل ہونے کے ہمکو مخفی اسلئے معلوم ہوتی ہے کہ ہم اسمیں تدبر سے کام نہیں لیتے۔ اور عدم تدبر سے تو دنیوی حسی باتیں بھی خفی ہو جاتی ہیں

ف تمہید

ف تعلیم قرآن سہل و عام ہے

ف حدیث کی شان بھی مثل قرآن کے ہے

ف تعلیم شریعت بوجہ عدم تدبر کے مخفی ہو جاتی ہے

علمی مضامین کا تو ذکر ہی کیا۔ مضامین علمیہ کا تعلق چونکہ بلا واسطہ عقل سے ہے وہاں
تو بدون تدبر کے کام نہیں چل سکتا مگر محسوسات میں بھی باوجودیکہ اُن کا تعلق حس سے
تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور بدون تدبر کے بعض دفعہ سخت غلطی ہو جاتی ہے۔ اسی
مضمون کو دیکھ لیجئے کہ باوجود واضح ہونے کے عدم تدبر کی وجہ سے خفی ہو گیا ترجمہ آیت
کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو تمہارے پاس ہے وہ ختم اور فنا ہو جائیگا ایک جملہ
تو یہ ہے دوسرا جملہ اسی کی تتمیم و تکمیل کیلئے ہے کہ جو خدا کے پاس ہے وہ پائدار و باقی
رہنے والا ہے۔ ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کوئی پیچیدہ
اور خفی مضمون ارشاد نہیں فرمایا بلکہ ایک واضح آسان و سرسری مضمون ہے مگر عرفی اصطلاح
کے موافق وہ سرسری نہیں کیونکہ واقع میں بڑا اعلیٰ مضمون ہے مگر چونکہ ہم اسمیں تدبر نہیں
کرتے اسلئے سرسری سمجھا جاتا ہے۔ غرض ایک معنی کے لحاظ سے تو یہ سرسری بھی ہے یعنی
سہل ہونے کی وجہ سے مگر آجکل سرسری بات معمولی اور بیوقعت بات کو کہا جاتا ہے
سو اس معنی کر قرآن کا کوئی مضمون بھی سرسری نہیں ہر مضمون باوقعت اور اعلیٰ درجہ
کا ہے ہاں دوسرے معنی کے لحاظ سے اسکو سرسری کہنا صحیح ہے کہ واضح اور صاف اور
آسان مضمون ہے مگر چونکہ ہم اسمیں غور نہیں کرتے اسلئے ہمکو قرآن کی باتیں غیر واضح
معلوم ہوتی ہیں اور اُن سے ہمکو اجنبیت سی ہے۔ اور باوجودیکہ مضمون اعلیٰ درجہ کا ہے
اور نہایت باوقعت ہے، مگر آجکل اسکی زیادہ وقعت نہیں کیجاتی جسکی ایک وجہ کثرت سماع
و کثرت مشاہدہ بھی ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس بات کو بار بار سنا جائے یا بار بار دیکھا
جائے وہ طبعی امر ہو جاتا ہے اسلئے اُسکی زیادہ عظمت نہیں ہوتی پھر اس بات کو اگر اہتمام
کے ساتھ کوئی بیان کرے تو تعجب ہوتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نیا مضمون ہے،
اسلئے انسان اسمیں کسی قدر معذور بھی ہے مگر خدا نے انسان کو عقل بھی دی ہے اور فطرت
دی ہے اسلئے اگر دونوں کے مقتضامیں تزاحم ہو تو اسوقت اُسکو شریعت کی تعلیم پر
عمل کرنا چاہیے کیونکہ شریعت کی تعلیم میں دونوں کی رعایت ہے مثلاً کسی چیز کے فوت
ہونے سے رنج پہونچے تو عقل اسوقت رنج کرنے سے منع کرتی ہے کیونکہ وہ یہ کہتی ہے

ف: کثرت سماع و مشاہدہ سے باوقعت بات بھی معمولی ہو جاتی ہے۔

ف: شریعت نے عقل و طبع دونوں کی رعایت کی ہے۔

کہ رنج کرنے سے وہ شے واپس نہیں آسکتی اسلئے رنج فضول ہے اور طبیعت رنج کا تقاضا
کرتی ہے مگر طبیعت کا یہ اثر اور تقاضا ایک حکم غیر واقعی پر مبنی ہے کہ یہ چیز ہمسے جدا کیوں ہوئی
یہ حکم غیر واقعی اسلئے ہے کہ تمھارے قبضہ میں تو خود اپنی ذات بھی نہیں اگر تمکو اپنی ہی ذات
پر قبضہ ہوتا تو کوئی شخص بھی بیمار یا مفلس نہوا کرتا مگر انسان کی ذات میں جو تصرفات
و تغیرات رات دن ہوتے رہتے ہیں وہ اسکو بتلاتے ہیں کہ یہ خود مختار نہیں بلکہ دوسرے
کے قبضہ میں ہے تو جب یہ اپنی ذات میں بھی خود مختار نہیں تو دوسری چیزوں میں اسکو
دخل در معقول کا کیا حق ہے تو چونکہ یہ حکم عقل کے خلاف تھا اسلئے عقل نے اسکو رد کر دیا
شریعت کی خوبی دیکھئے کہ دونوں کی رعایت کی گئی کہ حزن بھی ہو مگر اسکو غالب نکرو شریعت
نے عقل کی بھی رعایت کی اور طبیعت کی بھی - اسی طرح یہاں جس مسئلہ کا ذکر ہے اسمیں
عقل کا مقتضا یہ ہے کہ فناء دنیا سے کبھی غفلت نہو کیونکہ جب واقع میں اسکو بقا نہیں
اور فنا اسکی ساتھ لگا ہوا ہے تو اس سے غفلت بڑی غلطی ہے دیکھو اگر بادشاہ کسی خزانچی
کے سپرد خزانہ کر دے اور اسکو معلوم ہے کہ یہ میرے پاس بطور امانت کے ہی جو چند روز کے
بعد لیلیا جائیگا اسکو لازم ہے کہ اس کی امانت ہونے سے غافل نہو اگر کوئی خزانچی خزانہ
کو اپنی ملک سمجھکر اسمیں مالکانہ تصرف کرنے لگے تو یقیناً سب اسکو احمق بتائیں گے اسی طرح
فنائے دنیا سے غفلت عقل کے نزدیک سخت غلطی ہے - مگر طبیعت غفلت کو مقتضی ہے
کیونکہ فنائے دنیا کو بار بار دیکھتے دیکھتے مساوات سی ہو جاتی ہے اور جس چیز کی مساوات
سی ہو جائے اس سے طبیعت کو غفلت ہو جاتی ہے شریعت نے یہاں بھی دونوں کو معتدل
کر دیا اور دونوں کی رعایت فرمائی کہ غفلت کا تو مضائقہ نہیں مگر نہ اتنی غفلت کہ احکام
عقلیہ بالکل برباد ہو جائیں اگر تھوڑی سی غفلت بھی نہو تو انسان معطل ہو جائے کیونکہ
جسکے سامنے ہر دم موت ہی کھڑی ہو وہ کوئی کام اچھی طرح نہیں کر سکتا مگر اسکے لئے ایک حد
ہے جسکے آگے طبیعت کے احکام ختم ہو جاتے ہیں اور وہ حد یہی ہے کہ اتنی غفلت کا تو
مضائقہ نہیں جسکے انتظام معاش میں ضرورت ہے مگر اتنی نہو جس سے احکام عقلیہ بالکل
برباد ہو جائیں کہ دنیا سے ایسی دلبستگی ہو کہ گویا ہمیشہ یہیں رہنا ہے جو شخص دنیا سے

فنائے دنیا سے بالکل غفلت مقتضائے عقل کے خلاف ہے اور طبیعت کا تقاضا ہے کہ غفلت ہو شریعت نے دونوں کی رعایت کی ہے۔

ایسی دلبستگی کرے اسکی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی مسافر سرائے میں دل لگالے اور ایک رات کے قیام کیلئے وہاں خوبصورت مکان تعمیر کرنے اور باغ وغیرہ لگانے لگے یقیناً سب اسکو بیوقوف کہیں گے کہ صرف رات بھر کا تو قیام اور اسکے لئے اسقدر سامان جو وطن اصلی کے مناسب تھا۔ پس ہمکو جو فنائے دنیا سے غفلت ہے اسکا تو مضائقہ نہیں مگر اس کا حد سے بڑھ جانا یہ محل شکایت ہے۔ ہماری حالت ایسی ہے جیسے ایک چمار کی حکایت ہے کہ کسی نے اسکے ایک جوتہ مارا تو وہ کہتا ہے اب کے تو مار اُس نے پھر مارا تو پھر بھی کہا کہ اب کے تو مار غرض وہ مارتا رہا اور یہ برابر یوں ہی کہتا رہا اب کے تو مار اسی طرح ہم بھی رات دن فنائے دنیا کو واقع دیکھتے رہتے ہیں مگر اپنی فنا سے غافل ہیں گویا بزبان حال یوں کہتے ہیں کہ اب کے تو موت آئے اب کے تو طاعون آئے اے صاحبو! مشاہدہ سے زیادہ کیا ہوگا جب مشاہدہ سے بھی ہمارا غفلت کا پردہ نہ اٹھا تو کب اٹھے گا۔ یہ غفلت تو ہماری زوال دنیا کے متعلق ہے جو کہ مشاہد ہے رہا بقائے آخرت تو ہر چند کہ وہ مشاہد نہیں مگر اعتقادی مسئلہ ہے اور اعتقادیات کا دل میں مضبوطی کیساتھ جما رہنا ضروری ہے اور جو بات دل میں جمی ہوئی ہو اُس سے اجنبیت نہونا چاہیئے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کوئی یہ کہے کہ تم مر وگے اور خدا کے سامنے جاؤگے قبر میں سوال جواب ہوگا قیامت میں نامۂ اعمال سامنے ہوگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خواب دیکھ رہے ہیں افسوس کی بات ہے کہ جس چیز کا درجۂ حال میں دلمیں جما ہوا ہونا چاہیئے تھا وہ ایسی ہوگئی جیسے خواب ہو اور اسکی علامت یہ ہے کہ ناصحین سے الجھتے ہیں اور بعضے تو بیدھڑک کہدیتے ہیں ع اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔ اور جو ان سے ذرا اچھے ہیں وہ ناصحین کی نصیحت کے جواب میں یوں کہدیتے ہیں کہ میاں اللہ غفور رحیم ہے آخرت کی فکر کہانتک کریں۔ اللہ میاں سب بخشدیں گے گویا ان کے نزدیک آخرت میں فقط ایک ہی جزو کا ظہور ہوگا دوسرے جزو کا یعنی عذاب کا ظہور نہوگا۔ کیوں صاحب! جہاں یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ بخشدیں گے وہاں یہ خطرہ کیوں نہوا کہ شاید کسی بات پر پکڑ ہونے لگے شاید دوزخ میں بھیجدئے جائیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ حالت تھی کہ کام بہت کرکے بھی ڈرتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا

ف بقائے آخرت سے غفلت کی شکایت اور اسکی وجہ۔

ف ہمکو آخرت کی باتیں خواب سی معلوم ہوتی ہیں اور اسکی دلیل۔

ف ان لوگوں کی غلطی کا ازالہ جو نصیحت کے جواب میں اللہ غفور رحیم سنا دیتے ہیں۔

حضرت صحابہ کرام کا کام کرکے بھی ڈرنا اور اسمیں حضرت عمرؓ کا واقعہ

کہ کیا تم اسپر راضی ہو کہ ہمنے جو اعمال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں اُن کا اجر تو ہمارے واسطے سالم رہے اور جو اعمال حضور کے بعد کئے ہیں اُن پر گرفت نکل جائے چاہے ثواب بھی ندیا جائے تو حضرت ابو موسی رضنے فرمایا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیے ہیں اُن کا اجر بھی سالم رہے گا اور جو حضور کے بعد کئے ہیں اُن کا بھی ثواب ملیگا کیونکہ ہمنے حضور کے بعد بھی بہت کام کئے ہیں اور ظاہر میں یہ بات صحیح بھی تھی کیونکہ صحابہ نے زیادہ تر فتوحات وغزوات حضور کے بعد ہی کی ہیں حضرت عمر کی مدت خلافت میں جسقدر فتوحات ہوئی ہیں کہ اسلام مشرق سے مغرب تک پھیل گیا اُن سے پہلے اسقدر فتوحات نہیں ہوئیں مگر باوجود اسکے حضرت عمر رضنے فرمایا کہ بھائی میں تو اسپر راضی ہوں کہ جو اعمال ہمنے حضور کے سامنے کئے ہیں وہ سالم رہیں اور اُنکا ثواب ہمکو ملجائے اور جو اعمال بعد میں کئے ہیں اُن سے برابر سرابر چھوٹ جائیں کہ گرفت ہی نہو تو غنیمت ہے ثواب تو کیا ہوتا اور حضرت عمر کو جو اُن اعمال پر ثواب کی امید ہوئی جو حضور کے سامنے کئے تھے تو وہ بھی اس لحاظ سے نتھی کہ وہ اپنے اعمال ہیں بلکہ محض اسوجہ سے امید تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو اعمال حضور کے سامنے کئے ہیں وہ حضور کی برکت سے ٹھیک ٹھیک ہو گئے ہونگے انمیں خلوص و نورانیت وغیرہ حضور کی برکت سے آگیا تھا حقیقت میں یہی باتیں ہیں جنسے ہم غافل ہیں اور یہ ایک باریک بات ہے جسکی ہمکو خبر نہیں کہ ہم جو بعضے کام کرتے ہیں کبھی تو وہ اپنی قوت سے ہوتا ہے اور کبھی اہل اللہ کی نظر و توجہ سے ہوتا ہے اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہ را تنہا مرو بے قلاوز اندریں صحرا مشو

یعنی باطنی راستہ کیلئے کوئی رفیق ساتھ لیلو تنہا اس راستہ کو طے کرنیکا ارادہ نکرو کیونکہ تم تنہا اسکو قطع نہیں کر سکتے اسپر شبہ ہو سکتا تھا کہ بعض اہل اللہ کا پیر و مرشد کوئی نتھا اور وہ بدون مرشد کے واصل ہو گئے اس کا جواب مولانا نے یہ دیا ہے ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ہم بعون ہمت مردان رسید

کہ جو لوگ شاذ و نادر تنہا اس راہ کو طے کرنیوالے نظر آتے ہیں وہ بھی حقیقت میں تنہا منزل مقصود پر نہیں پہونچے بلکہ کسی کامل کی مخفی مدد اور پوشیدہ نظر کی برکت سے واصل ہوئے ہیں

ایک تو لفظ نادر بڑھا کر بتلا دیا کہ اول تو ظاہر میں بھی اس کا وقوع نادر ہے دوسرے حقیقت کے لحاظ سے وہ بھی تنہا نہیں چل رہا بلکہ کسی کامل کی مدد اسکی ساتھ ہے گو اسکو خبر نہو کہ کون میری مدد کر رہا ہے جیسے آفتاب کی حرارت سے پھل پختہ ہوتا ہے مگر کھانیوالے کو خبر بھی نہیں کہ میری لئے اسکو کس چیز نے پکایا کس چیز نے تیار کیا اسی طرح ہر زمانہ میں کوئی فیض کا ئندہ آفتاب طریقت ہوتا ہے جسکی نورانیت سے اُسکے زمانہ والوں کو مدد پہونچتی ہے مگر لوگوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ہمکو کون چلا رہا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تنہا چل رہے ہیں مگر یہ غلط ہے تو حضرت عمر رضؓ نے اس راز کو سمجھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو ہماری اعمال میں نورانیت حضور کی برکت سے تھی حضور کے بعد وہ نورانیت نہیں رہی گو ظاہر میں اعمال کا ذخیرہ بعد میں بھی بہت کچھ نظر آ رہا ہے مگر چونکہ نورانیت ویسی نہیں تو انکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کے سامنے ہزاروں ٹوکرے امرود و انار وغیرہ کے پیش کرے مگر ہوں سڑے ہوئے تو کیا اس انبار کی محض اسلئے کہ ظاہر میں بڑا انبار تو ہے کچھ قدر ہو سکتی ہے سلاطین دنیا تو سارے انبار کو ہمارے منہ پر دیکر مار دینگے اسلئے حضرت عمر کو اپنے ان اعمال کی متعلق خطرہ تھا اور فرماتے تھے کہ ثواب تو بہت دور ہے میں اسپر ہی راضی ہوں کہ ان پر گرفت نہو اور الٹے منہ پر نہ مارے جائیں۔ حضرت عمر رضؓ پر خوف کا غلبہ تھا اور حضرت ابو موسیٰ پر حالت رجار غالب تھی جب حضرت عمر رضؓ کی طاعات کے باب میں یہ حالت تھی باوجودیکہ آج انکی برابر کوئی بھی نہیں ہو سکتا ہے تو پھر ان اللہ کے بندوں کو جو اللہ غفور رحیم کہکر ناصحین کا منہ بند کرتے ہیں معاصی کے باب میں یہ خوف کیوں نہیں ہوتا کہ شاید ہماری پکڑ ہونے لگے۔ تو آخرت سے باوجودیکہ اعتقادی مسئلہ ہے ہمکو اسقدر غفلت ہے کہ خبر ہی نہیں اسی طرح فنائے دنیا ظاہر ہے مگر کبھی بھولکر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن ہم بھی ختم ہوں گے جسکی دلیل یہ ہے کہ آخرت کیلئے سامان سے بے پروائی ہے نہ رہن چھوڑنے کی فکر ہے نہ قرض ادا کرنیکا خیال ہے نہ موروثی زمین چھوڑنیکا قصد ہے گویا اللہ میاں کے ذمہ ہے کہ ان کا قرض ادا کر دینگے اور موروثی چھوڑ دینگے غرض ایک عالم لایعنی مشغلہ میں مبتلا ہے کوئی زیور کی دُھن میں ہے کوئی مکان بنانے میں منہمک ہے یہ کسی کو یاد نہیں کہ

ف آفتاب باطن ہر زمانہ میں ہوتا ہے جسکی توجہ سے بہت لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور انکو خبر بھی نہیں ہوتی

۸

ف حضرت عمر رضؓ پر خوف غالب تھا اور حضرت ابو موسیٰ پر رجار

ف فنائے دنیا سے غفلت کی دلیل

ایک دن ہم نہوں گے تو یہ ایسا مضمون ہی جو واقع مین ظاہر ہے مگر غفلت نے اسکو خفی بنا رکھا ہے اسواسطے اللہ تعالیٰ نے جابجا ہمکو بار بار متنبہ فرمایا ہے جنمیں سے ایک مقام یہ بھی ہے جسکو میں اسوقت بیان کرنا چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے لوگو! سنلو کہ تمھارے واسطے دو قسم کی چیزیں ہیں ایک وہ جو تمھارے پاس ہیں جنمیں تمنے دل لگا رکھا ہے وہ تو ختم ہونے والی ہیں اور دوسری وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی پاس ہیں وہ باقی ہیں اور وہ چیزیں بھی تمھاری ہی ہیں مگر تم ان سے ایسے غافل ہو گویا وہ غیر کی ہیں حالانکہ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کچھ تو بچہ کے پاس روپیہ ہو اور باقی سرمایہ باپ کے قبضہ میں ہو بچہ کے پاس جو روپیہ ہے وہ اسکو اپنا سمجھتا ہے مگر ٹھیکرا سمجھکر برباد کر دیتا ہے اور جو سرمایہ باپ کے پاس ہی اسکو اپنا روپیہ نہیں سمجھتا حالانکہ وہ بھی اسی کے واسطے ہے مگر باپ اسلئے اسکو نہیں دیتا کہ برباد کر دیگا وہ اسکو خاص موقع کے واسطے اپنی بچہ کیلئے محفوظ کرتا ہے تو جیسے وہ بچہ احمق ہے کہ باپ کے پاس کے سرمایہ کو اپنا نہیں سمجھتا ایسے ہی ہم بیوقوف ہیں کہ اپنی چیز اسی کو سمجھتے ہیں جو ہمارے ہاتھ میں ہے اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے واسطے اپنے پاس رکھی ہیں انکو اپنی نہیں سمجھتے وہ گویا کسی غیر کیلئے ہیں۔ اے صاحبو! وہ بھی ہماری ہیں مگر جب تک انکی قدر نکروگے وہ نہ ملیں گی اور قدر یہی ہے کہ انکو مانگو یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مانگو یا نہ مانگو چاہو یا نہ چاہو یعنی قدر کرو یا نکرو زبردستی تمھارے سر مڑھ دی جائے اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں انلزمکموھا وانتم لہا کٰرھون ٥ (کیا ہم اپنی نعمت کو تمھارے سر چیکا دیں حالانکہ تم اس سے کراہت ہی کرتے رہو ۱۲) آخر انکو اسکی ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ تمھارے سر چیکا دیں کیا خدا کے پاس جگہ نہیں ہے یا وہ دولتیں رکھی رکھی سڑ جائیں گی ہرگز نہیں؟ خدا کے پاس جگہ کم نہیں اور نہ وہ نعمتیں سڑنیوالی ہیں اسلئے بدون مانگے نہیں ملیں گی اور مانگنے کے بعد کچھ بھی دیر نہ لگے گی حدیث قدسی میں بالفاظ نبوی وارد ہے من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا و من تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا الخ۔ کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اسکی طرف دو بالشت جاتا ہوں ا......... اور جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہی

حاشیہ: بریخے آرزوئے جنت

نعمتیں اللہ کے پاس جو ہیں ہماری ہی ہیں ہم غافل ہیں اور انکی مثال

۹

اسکے پانے کا طریق سمجھ لو وہ بھی ہماری ہیں اگر مانگنے کی ضرورت ہے

مانگنے کے بعد بھی دیر نہ ہوگی

ہیں اُسکی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف چلکر آتا ہے میں اُسکی طرف دوڑ کر جاتا ہوں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔ ایک حدیث میں یہ آیا ہے من لم یسئل اللہ یغضب علیہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اُس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں۔ دوسرے آقاؤں کی تو یہ حالت ہے کہ اُن سے اگر برابر مانگتے رہو تو تنگ آجاتے ہیں اور جو اُن سے مانگتا نہ ہو اُس سے خوش رہتے ہیں اور تعریف کے طور پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا بے زبان ہے کبھی کچھ نہیں مانگتا۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ جو اُن سے نہ مانگے اُس سے خفا ہوتے ہیں اور جو برابر مانگتا رہے اُس سے خوش ہوتے ہیں یہانتک ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر چیز مانگو یہانتک کہ جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی مانگو نمک نہ رہے وہ بھی ان ہی سے مانگو۔ یہ اسلئے فرمایا تاکہ لوگوں کے دلوں سے یہ خیال نکل جائے کہ اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چھوٹی چیزیں کیا مانگیں؟ ظاہر میں تو یہ خیال مستحسن معلوم ہوتا ہے مگر اسمیں نفس کا کید ہے جسپر شارع علیہ السلام نے ہمکو متنبہ فرمایا ہے وہ کید یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چیزیں نہیں مانگتا وہ اپنے خیال میں بڑی چیزوں کو گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بڑی سمجھتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سلطنت ہفت اقلیم اور جوتی کا تسمہ برابر ہے دوسرے کیا چھوٹی چیزوں کیلئے کوئی اور خدا ہے اگر نہیں تو اُسی سے کیوں نہیں مانگتے۔ اور مغفرت وجنت مانگنے کا تو قرآن میں جابجا امر ہے سارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا السمٰوٰت والارض (اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو جسکا عرض[ف] آسمان وزمین کے برابر ہے ایک حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء اللہ تعالیٰ اُن لوگونکو پسند فرماتے ہیں جو دعا میں الحاح کرتے ہیں تو دیکھو ہمارے آقا کیسے کریم ہیں اب بھی کوئی نہ مانگے تو اُسکی محرومی اور بد قسمتی ہے ؎

تجھ سی کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا
اُسکے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر

صاحبو! اللہ تعالیٰ سے مانگو انھوں نے حفاظت سے اپنے پاس تمہارے لئے بہت سی نعمتیں

[ف] جسکے عرض میں آسمان زمین سما جائیں اُسکے طول کا کیا کہنا ۱۲ ظ

حاشیہ: جو اللہ تعالیٰ سے نہ مانگتا اسپر وہ غصہ ہوتے ہیں

حاشیہ: بعض لوگ اللہ تعالیٰ سے معمولی چیزوں کا سوال کرنا بھی بے ادبی سمجھتے ہیں یہ نفس کا کید ہے

لی ہیں اور جو نعمتیں تمھارے پاس ہیں اُسکو تو چور لیجائیں ڈاکو چھین لیں مگر افسوس کہ ہم اُسپر
فریفتہ ہیں اور جو محفوظ ہیں اُنکو اپنی حماقت سے بھولے ہوے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی غلطی پر ہمکو تنبیہ
فرماتے ہیں کہ جو تمھارے پاس ہی واقع میں وہ تو غیر کی چیز ہے یعنی امانت چندروزہ ہی جو ایک وقت
میں تمسے چھین لیجائیگی یا موت کے بعد وارثوں کو ملیگی اور جو ہمارے پاس ہی واقع میں وہ تمہاری
چیز ہے جو ہمیشہ تمھارے پاس رہیگی مگر ہمنے اس مضمون کو بھلا رکھا ہی علماً بھی وعملاً بھی۔ علماً
ذہول کے یہ معنی ہیں کہ اُسکا استحضار نہیں ہے ورنہ اس کا عقیدہ تو ہم سب مسلمان اپنے دل میں
پاتے ہیں۔ مگر جس اعتقاد سے کام نہ لیا جائے اُسکی ایسی مثال ہے جیسے ایک زمانہ قبل شاہزادہ کی
حکایت ہے کہ وہ بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً سانپ نکل آیا تو وہ کہنے لگا ارے بلاتا کسی مرد کو کسی نے
کہا حضور بھی تو ماشاء اللہ مرد ہیں کہا ارے ہاں خوب یاد دلایا اچھا لاٹھی لاؤ پھر نہ معلوم سانپ
مارا یا نہیں تو ظاہر ہے کہ اُسکو اپنے مرد ہونیکا اعتقاد ضرور تھا مگر ایسے اعتقاد سے کیا نفع! جو وقت
پر یاد نہ آئے حتی کہ دوسروں کو یاد دلانیکی ضرورت پڑے۔ گو اعتقاد کے بارہ میں یہ تو نہیں کہسکتے کہ
ذہول کے بعد بالکل بیکار ہے کیونکہ اہل سنت کا عقیدہ ہی کہ ایسا اعتقاد بھی اخیر میں کام آجائیگا
پٹ کٹکر اس عقیدہ ہی کی بدولت کسی وقت جنت میں پہونچ جائیں گے جسکی دلیل یہ آیت ہے
فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ جب ذرہ برابر نیکی بھی ضایع
نہیں تو ضعیف اعتقاد اور ضعیف ایمان کی جزا بھی ضرور ملنا چاہئے اور اُسکی یہی صورت ہے
کہ کسی وقت یہ لوگ جہنم سے نکال لئے جائیں تو ہر چند کہ یہ اعتقاد بھی ایک درجہ میں نافع ہی
مگر جب وقت پر پوری طرح کام نہ آیا اور مرتے ہی جنت میں جانا نصیب نہوا تو یہ اعتقاد نافع
کامل نہوا۔ اسلئے میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ اس باب میں علماً بھی کوتاہی کرتے ہیں اور عملاً بھی
مگر عمل کے مقابلہ میں علم کے دو درجے ہیں ایک اعتقاد ایک استحضار اور ہماری کوتاہی دوسرے
درجہ میں ہی یعنی ہم استحضار میں کوتاہی کرتے ہیں اب عدم استحضار کا ایک قوی سبب سنئے وہ یہ
کہ شیطان نے یہاں ہمکو یہ سبق پڑھا رکھا ہے کہ ہماری قسمت کہاں کہ ہم جنت میں پہلے ہی
پہونچ جائیں اسلئے اسکی سعی نہیں اور اسلئے استحضار بھی نہیں استحضار اُسی چیز کا ہوتا ہے
جسکے لئے سعی ہو میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ! تمھاری قسمت کھانے پینے میں تو بڑی تیز ہے

ف: اس مضمون کو ہم علماً و عملاً بھلائے ہوئے ہیں اور اسکی تفصیل

ف: جس اعتقاد کا استحضار نہو اسکی مثال

ف: اعتقاد بلا استحضار بھی نافع ہے مگر نافع کامل نہیں

ف: شیطان کی ایک دھوکہ

اسمیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جاؤ اور کہو کہ ہماری یہ قسمت کہاں
کہ دو وقت پیٹ بھر کے روٹی کھایا کریں یہ تو بڑے لوگوں کی قسمت ہی اور اگر یہ کہو کہ چاہتے
تو ہم بھی ہیں کہ جنت میں مرتے ہی پہونچ جائیں تو میں کہونگا کہ یہ چاہنا آپکا ایسا ہے
جیسے کوئی یہ چاہے کہ بدون ہاتھ ہلائے روٹی منہ میں پہونچ جائے اسکو سب یہ کہتے ہیں
کہ یہ روٹی کھانا نہیں چاہتا اگر چاہتا تو اُسکے اسباب اختیار کرتا ایسے ہی ہمارے بھائی یہ تو
چاہتے ہیں کہ کھڑے جنت میں پہونچ جائیں مگر ہاتھ نہیں ہلاتے اسکے اسباب اختیار نہیں
کرتے اور دنیا کی جس بات کو چاہتے ہیں اُسکے لئے خوب کوشش کرتے ہیں پس حاصل یہ ہے
کہ روٹیاں کھانا تو تم چاہا ہوا اور دین کی باتوں کو اللہ میاں چاہیں کہ اگر خدا نے چاہا اور قسمت
میں ہوا تو دیندار بنجائیں گے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے چاہنے ہی سے
ہوگی مگر جسطرح دنیا کے اسباب تدابیر اختیار کرتے ہو اسی طرح دین کے اسباب بھی تو اختیار
کئے ہوتے اُسکی تدبیر بھی تو کی ہوتی اسکے بعد نتیجہ کو خدا کے سپرد کیا ہوتا یہ کیا کہ اسباب و تدابیر کو
بھی ترک کر کے بیٹھ گئے حالانکہ دنیا کے کاموں میں کوئی بھی تدبیر کو ترک نہیں کرتا اس کا تو یہ
حاصل ہوا کہ اپنے مطلب میں تو تم بڑے ہوشیار ہو مگر آخرت کو مطلوب ہی نہیں سمجھتے اُسکی
وقعت دل میں نہیں جبھی تو یہ بہلتے ہیں اسی کی شکایت ہے بخصوص عورتوں میں یہ عدم
استحضار بہت ہی زیادہ ہی چنانچہ جسوقت عورتیں زیور پہنتی یا کپڑے قطع کرنے بیٹھتی ہیں
اسوقت یوں معلوم ہوتا ہے کہ انکو کوسوں بھی اس کا گمان نہیں کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے
اور عام طور سے یہ ذہول اسقدر ہے کہ اگر کوئی ہمارے سامنے مرتا بھی ہی تب بھی ہمکو اپنی موت
یاد نہیں آتی میں بقسم کہتا ہوں کہ بہت لوگوں کو اپنی موت یاد نہیں آتی جسکی دلیل یہ ہی کہ
عین جنازہ کی ہمراہی ہنسی دل لگی کی باتیں ہوتی ہیں[عـ] قبرستان میں جا کر بھی مقدمات کے
فیصلے اور تذکرے ہوتے ہیں۔ واللہ اگر اپنی موت اسوقت یاد ہو تو انسان سب چوکڑی
بھول جائے جیسے ایک بڑھیا کی حکایت ہی کہ اُسکی بیٹی بیمار تھی یہ محبت میں دعا کرتی تھی

اعمال فی الدنیا کی حالت اور اسکی شکایت۔

[عـ] حضرت عبداللہ ابن مسعود نے ایک شخص کو قبر پر کھڑے ہوئے ہنستا ہوا دیکھا فرمایا بخدا میں تجھسے عمر بھر کلام نکروں گا تو ایسی جگہ بھی ہنستا ہے (جہاں رونا چاہیے تھا ۱۲) جامع۔

کہ اے اللہ! یہ اچھی ہو جاوے اور اسکی جگہ میں مرجاؤں ایک دن اتفاق سے محلہ کی گائے نے ہانڈی میں منہ ڈالدیا اور سینگ ہانڈی میں پھنس گئے وہ اسی صورت سے بڑھیا کے گھر میں آگھسی یہ دیکھکر ڈر گئی اور یہ سمجھی کہ جس موت کی میں تمنا کرتی تھی وہ سامنے آگئی بس یہ عزرائیل فرشتہ ہی جو میری روح نکالنے آیا ہے تو وہ گھبرا کر کہنے لگی اے موت میں مہستی نہیں ہوں مہستی تو وہ پلنگ پر پڑی ہے۔ میں تو غریب بڑھیا ہوں ۵

گفت اے موت من نہ مہستیم — پیر زال غریب محنتیم

صاحبو! ہم اپنی موت کو یاد رکھتے تو ہوش اڑ جاتے اور اُسکی علامات ظاہر ہوتیں مگر ہمارے اندر اسکی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی۔ اور اگر اپنی موت یاد آتی تو پھر دوسرے مردہ پر بھی اتنا نہ روتے کیونکہ اگر کوئی قید سے چھوٹ جاوے تو اسمیں اتنے رنج کی کیا بات ہے گو طبعاً حزن ہوتا مگر عقلاً تو یہ خوشی کی بات ہے اسوقت اس بات کی خوشی ہونا چاہیئے تھی کہ ایک دن ہم بھی قید خانہ سے چھوٹنے والے ہیں جیسا یہ چھوٹ گیا عارف اسی کو فرماتے ہیں ۵

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

اہل اللہ تو موت کے دن کی تمنا کرتے ہیں اور یہاں ہم کو اُسکے نام سے بھی جاڑہ بخار چڑھتا ہے۔ تو موت کو ہم اتنا بھولے ہوئے ہیں کہ دوسرے کو مرتے دیکھکر بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ منزل ہمارے سامنے بھی ہے بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ بس موت اسی کے واسطے تھی اور اگر کوئی یاد بھی کرتا ہے تو بطور وظیفہ کے مگر کیا اگر کوئی لڈو مٹھائی کا نام لیکر وظیفہ پڑھا کرے تو اس سے اُس کا منہ میٹھا ہو ہرگز نہیں اسیطرح موت کا وظیفہ پڑھنے سے کام نہیں چل سکتا اسکو موت کی یاد نہیں کہسکتے موت کی یاد یہ ہے کہ زیوروں کی کثرت سے نفرت ہو جاوے گھر میں زیادہ سامان اور بکھیڑا ناگوار معلوم ہو جیسے سفر میں زیادہ اسباب برا معلوم ہوتا ہے یہانتک کہ سفر میں اتنا مختصر سامان ساتھ لیتے ہیں جسکے عدد شمار میں آجائیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ سفر آخرت سامنے ہے اور گھر میں اسقدر سامان ہے جسکی تفصیل گھر والے کو بھی معلوم نہیں ہم بلا تدن لدتے جاتے ہیں اور گناہوں کا بوجھ جو گردن پر لادا جا رہا ہے وہ اس کے علاوہ ہے یہ تو علمی کوتاہی تھی اور عملی کوتاہی یہ ہے کہ آخرت

ملفوظ: اسکی بیوی کا نام ہے ۱۲

ملفوظ: شوق لقا میں تمنائے موت جائز ہے ۱۲

کیلئے کوشش نہیں کرتے۔ بس بڑی کوشش یہ ہوگی کہ بیٹھکر دو آنسو بہالئے گویا اللہ میاں کی نہر میں پانی کم ہوگیا تھا دو آنسو بہاکر اللہ میاں پر احسان کیا اور انکو خرید لیا۔ بس انکے نزدیک دو آنسو بہانیسے ساری گناہ انکے واسطے جائز ہوگئے یہ سبکا کفارہ ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ آنسو بہانے میں کوئی دقت نہیں کچھ خرچ نہیں کچھ کرنا نہیں پڑتا اسلئے رونا اختیار کرلیا جیسے ایک بدوی کیساتھ سفر میں ایک کتا تھا وہ راستہ میں مرنے لگا اور بدوی رونے لگا ایک مسافر نے رونیکا سبب پوچھا کہا یہ کتا میرا رفیق ہے اور آج مر رہا ہے اسواسطے رو رہا ہوں کہا اسکو مرض کیا ہے کہا بھوک سے مر رہا ہے مسافر نے دیکھا کہ ایک طرف پوٹلا بندھا رکھا ہے پوچھا اسمیں کیا ہے کہا روٹی کے سوکھے ٹکڑے ہیں کہا پھر کتے کو کیوں نہ کھلا دیئے جس سے تجکو اسقدر محبت ہے،

گفت ناید بے درم در راہ نان + لیک ہست آب دو دیدہ رائیگان

مجھے ایسی محبت نہیں کہ رقم کی چیز اسکو کھلا دوں اور رونے کا کیا ہے مفت کے آنسو ہیں دو گھڑی بہالوں گا یہی حال ہمارا ہے کہ ایسے مواقع پر ہمنے صرف رونا سیکھا ہے جسمیں کچھ خرچ نہیں۔ صاحبو! بقسم بتاؤ کہ جتنی کوشش تم بھوک کے وقت غلہ لانے اور آٹا پسوانے روٹی پکوانے میں کرتے ہو کیا آخرت کے واسطے بھی کبھی اتنی کوشش کی ہے۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی نصیحت کرتا ہے تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق دینگے تو آخرت کا سامان کرینگے گویا اسمیں بھی نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی خطا ہے انکی کچھ خطا نہیں کبھی کہتے ہیں کہ ہماری تو قسمت پھوٹی ہوئی ہے ہمیں دنیا کے دھندوں سے کہاں فرصت ہے اسمیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی خطا بتلائی جاتی ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ کیا دین ہے۔ اور جو بڑا خیال آخرت کا ہوا تو بزرگوں سے دعا کہ نیکی درخواست کیجاتی ہے جیسے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ سے ایک سوداگر نے بمبئی میں کہا تھا کہ حضرت دعا فرمایئے مجھے بھی حج کی توفیق ہو جائے فرمایا ہاں ہم دعا کرینگے اور ایک کام تم کرو کہ جہاز کی روانگی کے دن مجھے اپنی ذات پر پورا اختیار دیدو کہ جو میں کہوں اسکے خلاف نکرو۔ کہا حضرت اختیار لیکر کیا کرینگے فرمایا جسوقت جہاز روانہ ہوگا تمکو پکڑ کر جہاز میں سوار کردونگا وہ حیلے حوالے کرنے لگا تو حضرت نے فرمایا پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ تم تو بیوی کی بغل میں رہو اور راتدن گلچھرے اڑاؤ اور ہم دعا کرکے ہو رہیں۔ یہی حال ہمارا ہے

ف ایک بدوی اور کتے کی حکایت

ف ہم آخرت کیلئے بھی کچھ نہیں کرتے صرف باتیں بنایا کرتے ہیں۔

ف بڑی کوشش ہوئی تو بزرگوں سے دعا کرالیتے ہیں اسکی حکایت

که خود کچھ نه کرینگے ہاں ناصحین سے کہیں گے که آپ دعا کریں۔ خصوصاً ان بوڑھی عورتوں کا
تو یه حال ہے که دین کا کوئی کام ہو تو سب سے کم ہمت اور دنیا کا کام ہو تو یه شیطان کی خالہ
سب سے پہلے اس کام کو کرینگی اسمیں سب سے زیاده باہمت ہو جائیں گی۔ الله میاں کا دھیان
بھی نہیں آتا ہاں بہو بیٹیوں کے لئے زیور کپڑے کا رات دن تقاضا ہی ہم تو انکو کم ہمت
اسوقت سمجھتے که یه دنیا کے کاموں میں بھی کم ہمت ہوتیں حالانکه خود دنیا کی یه حالت ہے که
کوشش سے کبھی تو حاصل ہوتی ہے اور کبھی کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور آخرت کیلئے
سعی کسی حال میں ناکام نہیں اگر کوئی شخص کسی عمل آخرت کا اہتمام کرے اور وه حاصل
بھی نه ہو یا پورا نه ہو جب بھی اسکو ثواب ملتا ہے۔ یہاں سے عوام کی ایک اور غلطی بھی معلوم
ہو گئی وه یه که جب ان سے یه کہا جاتا ہے که میاں قرآن صحیح کر لو تو جواب میں کہتے ہیں کہ کیا اب
میری تعلیم کا وقت ہے اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے۔ یه جواب بالکل غلط ہے کیونکه آپکا کام
صرف کوشش ہے صحت ہو یا نه ہو اگر تم کوشش میں لگ جاؤ پھر بھی کامیابی کا درجه حاصل
نه ہو تب بھی ثواب ملیگا بلکه دونا ثواب ملیگا ایک محنت کا ایک ناکامی کی حسرت اور رنج
کا یا یه کہو که ایک پڑھنے کا ایک مشقت کا اور ناکامی پر ثواب ملنے سے حیرت نه کیجئے حدیث
میں تصریح ہے والذی یتتعتع فیه وهو علیه شاق له اجران یعنی جو شخص قرآن
میں اٹکتا ہوا ور وه اسپر دشوار معلوم ہوتا ہو اسکو دو اجر ملیں گے اسی بناء پر اہل الله نے
ناکامی کو بھی سبب ثواب بنا دیا ہے چنانچه حضرت رابعه نے جب حج کیا تو حج سے فارغ ہو کر
جناب باری میں عرض کیا یا الله! میں نے حج کر لیا اب ثواب دیجئے خواه حج قبول ہوا ہو
یا نه ہوا ہو۔ اگر قبول ہو چکا ہے تب تو حج مبرور پر ثواب دینے کا آپکا وعده ہی ہے اور اگر قبول نہیں
ہوا تو یه سخت مصیبت ہے که ؎

از در دوست چه گویم بچه عنوان رفتم ہمه شوق آمده بودم ہمه حرمان رفتم

اور مصیبت زده کیلئے بھی آپنے ثواب کا وعده فرمایا ہے اسلئے بہر حال ثواب دینا پڑے گا
غرض اس دربار میں کوشش کے بعد ناکامی بھی کامیابی ہے تنخواه ضرور ملے گی۔ اور حضرت
رابعه نے جو یه عنوان اختیار فرمایا یه ناز کا مقام ہے جو ہر اک کا مقام نہیں ہمارے لئے تو نیاز ہی

زیبا نہیں ؎

نازرا روے بباید ہمچو ورد | چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
پیش یوسف نازش و خوبی مکن | جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
عیب باشد چشم نابینا و باز | زشت باشد روے نازیبا و ناز

غرض یہ عنوان ناز کا ہے مگر معنون یہ ہے کہ جب اپنے نزدیک مقبول بنانے کی کوشش کی مگر پھر کوتاہی ہو گئی تو قاعدہ سے گو مقبول ہونے کی قابل نہیں مگر وہ قبول فرما کر اجر عطا فرما دیتے ہیں یہ معنی ہیں عدم قبول میں اجر کے۔ اور یہ مضمون سالکین کے بہت کام کا ہے کہ دین کے راستہ میں اگر کوشش ناکام بھی ہو یا کمزور ہو جب بھی اجر ملیگا۔ صاحبو! اگر وصول الی کمال العمل نہوا تو ثواب و قرب تو وصول الی المقصود ہو جائیگا۔ اگر تمنے قرآن صحیح کرنے کی کوشش کی اور نہوا تو کیا حرج ہے خدا تو راضی ہو گیا۔ ہمارے ایک مجمع نے ایک موقع پر ایک دینی کام کیلئے کوشش کی تھی اور ناکام رہے تو ایک بد دین نے اعتراض کیا کہ ان لوگوں کو کیا حاصل ہوا ایک اللہ کے بندہ نے جھلا کر جواب دیا

؎ سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن | بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشقباز | اے روسیاہ تجھسے تو یہ بھی نہو سکا

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر ست | بیمرادی نے مراد دلبر ست

ارے مراد میں تو مزہ ہے ہی مگر نامرادی میں بھی ایک مزا ہے وہ یہ کہ محبوب نے تو دیکھ لیا کہ ہمنے کسی کو طلب کیا تھا اور وہ نہیں ملا ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم | کہ من نیز از خریداران اویم

کیا یہ تھوڑی دولت ہے کہ تم اُنکے خریداران میں داخل ہو گئے گو ناکام ہی خریدار بھی۔ وائے اسکے حال پر جو خریدار بھی نہ بنا۔ پس آخرت وہ شے ہے کہ اس کا طالب ناکام ہو کر بھی مستحق اجر ہے مگر ایسی مد کوئی نہیں کہ کچھ بھی نکرو اور اجر مل جائے پھر افسوس ہے کہ ہم لوگ دنیا کیلئے تو ہر طرح کی تدبیر و سعی کرتے ہیں جہاں ناکامی سراسر خسارہ ہی اور آخرت کیلئے

سعی نہیں کرتے جہاں ناکامی بھی کامیابی ہے۔ سرمد اُن لوگوں کے جواب میں جو اس طریق میں ناکامی کی شکایت کیا کرتے ہیں کیا خوب فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد | یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد | یا قطع نظر زیار می باید کرد

کہتے ہیں کہ بس ان شکایات کو ختم کرو یا تو محبوب کے ہو رہو اور اسکی رضا پر راضی رہو یا اس محبوب سے قطع نظر کر کے کوئی دوسرا محبوب تلاش کر لو۔ پس اگر خدا تعالیٰ کسی کا بیٹا وغیرہ لیلیں تو اسکو شکایت کا کوئی حق نہیں کیونکہ تم سب اپنے نہیں ہو بلکہ سب خدا کے ہو جب تم اسکے ہو تو تمھاری ہر چیز اُسی کی ہے جب ہر چیز خدا ہی کی ہے تو تمھارا کیا اجارہ ہے اگر وہ لیلیں ایسے ہی اگر تم ذکر کرو نماز پڑھو اور مزہ نہ آئے تو تمھارا کیا بگڑ گیا اسکی تو ایسی مثال ہے جیسے غلام نے آقا کی زمین میں کاشت کی اور پیداوار نہو تو اسکو رونیکی کیا ضرورت ہے اسکا کیا نقصان ہوا۔ اسی طرح تمنے پڑھنا لکھنا سیکھا اور ذکر اللہ کیا اور حلاوت نہ ہوئی تو تمھارا کیا حرج ہے تم کام میں لگے ہو کہ اس دربار کا نامرادی بامرادی ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎ گر مرادت را مذاق شکرست ✤ بے مرادی نے مرادِ دلبرست۔ لیکن اور اسکو بے مرادی کہنا بھی عامل کے گمان کے اعتبار سے دنیا میں ہے اور وہاں تو اسکو پوری مراد ملیگی افسوس ایسی دولت کیلئے تو ہم کوشش نہیں کرتے جسمیں طالب کبھی ناکام نہیں اور دنیا مردار کیلئے ہر وقت مرتے کھپتے ہیں جسمیں ناکامی کے وقت خسارہ ہی خسارہ ہے اور کامیابی بھی محض ناتمام و ناپایدار بالخصوص عورتوں کے مرنے کھپنے کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ان کا ایک کپڑا تیار ہوگا تو اسکے لئے بھی ایک کمیٹی منعقد ہوتی ہے کہ خالہ دیکھنا گوٹ اچھی بھی ہے یا نہیں دیکھنا اسپر بیل لگاؤں یا لچکہ لگاؤں کیا اچھا لگیگا اور جو ان سے کہا جائے کہ دنیا بھر کو ایک کپڑے کی واسطے جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے جو اپنے کو اچھا لگے پہن لو تو یہ جواب دینگی کہ واہ قاعدہ یہی ہے کہ کھائے اپنی پسند کا پہنے دوسرے کی پسند کا نیز عورتوں کا مقولہ یہ بھی ہے کہ پیٹ کا کیا ہے چاہے ڈھیلے پتھر دے بھر لو مگر کپڑا ہو عزت کا۔ صاحبو! یہ ساری ستیاں اور یہ ساری قاعدہ اسواسطے ہیں کہ یہ یاد نہیں ہے کہ ایکدن ہم یہاں نہ ہونگے اسی لئے مجھے تو عورتوں کا تقریبات میں جانا بھی مضر معلوم ہوتا ہے خاصکر کپڑے بدل بدلکر جانا تو بہت ہی اوچھا پن ہے بھلا اسکی کیا ضرورت ہے کہ بچوں کو بھی بڑھیا قیمتی کپڑے پہنائے جاتے ہیں چاہے وہ انہیں

لگ ہی دیں۔ پھر لڑکیونکو تو زیور سے ایسا لادا جاتا ہے کہ سر سے پیر تک زیور ہی زیور ہوتا ہے
وہ ناسمجھ بچی ہے تقریبات کے ہنگامہ میں بعض دفعہ وہ زیور کو نکالکر موقعہ بموقع ڈالدیتی
پھر اسکی تلاش میں تکلیف الگ ہوتی ہے اور جی برے بھلے الگ ہوتے ہیں کیونکہ عورتوں
بدگمانی کا بہت مادہ ہے فوراً کسی کا نام لے دیتی ہیں کہ یہ کام اس کا ہے اسلئے باہر پھرنے
والی بچی کو جو کہ ناسمجھ ہی ہو زیور پہنانا بڑی غلطی ہے مگر عورتوں کو اسکا خبط ہے اور غضب یہ
بچیوں کو بھی اس کا شوق ہوتا ہے اگر ان کے کان ناک نہ بند ہوائی جائیں تو روتی ہیں اور
ضد کر کے بندھوائی ہیں چاہے تکلیف ہی ہو مگر خوشی خوشی اس کلفت کو گوارا کرتی ہیں
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی اپنے مطلب کی عقل تو ہے مگر اسکو خرچ کرتی ہیں دنیا میں
دین میں خرچ نہیں کرتیں اسلئے میں کہتا ہوں کہ عملاً بھی کوتاہی ہے اور حالاً تو بہت ہی کوتاہی
ہے کیونکہ جب عمل نہیں تو حال کہاں سے آئے۔ حال اسے کہتے ہیں کہ کسی چیز کی طرف البتہ
خیال جم جائے کہ وہی ہر دم خیال میں رہے جسکو عارف جامی اسطرح بیان فرماتے ہیں

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی
ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

اور اسکی ایسی مثال ہے جو عورتوں کے مناسب ہے کہ جسوقت انکو کسی کے آنیکا انتظار ہوتا ہے
تو ہر وقت دروازہ کی طرف دھیان رہتا ہے جہاں کسی کی آہٹ سنی اور یہی خیال ہوا
وہ آیا۔ اب سمجھو کہ خدا نے عمل میں یہ برکت رکھی ہے کہ اس سے آخرت کا شوق ہو جاتا ہے
جس سے ہر وقت اسی کا خیال رہتا ہے اسکو حال کہتے ہیں حال کی دوسری مثال عورتوں کے
لئے اور ہے یعنی تماکو کیونکہ عورتوں پر کچھ بلائیں تو قدرتی ہیں ناک میں اور کان میں اور ہاتھ
اور گلے میں زیور کا ہار اور طوق وغیرہ مگر منہ کا اندر کا حصہ بچا ہوا تھا اسمیں کوئی زیور نہ تھا تو
کیسے بچتا اسکے لئے انھوں نے تماکو اور پان تجویز کیا ہے جس سے پہلے پہل تو گھمیر ہوتی ہے
پھر ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ ذرا دیر ہو جائے تو اسی میں دھیان لگا رہتا ہے ایسا شوق
ہو جاتا ہے کہ نہ ملنے سے پریشانی ہوتی ہے بس اسی درجۂ طلب کا نام حال ہے۔ نیک اعمال
سے بھی ایک کیفیت شوق کی پیدا ہو جاتی ہے جسکی وجہ سے خدا تعالیٰ کا تصور ہر دم خیال میں حاضر رہتا
جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس سے کوئی گناہ ہو جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا منوں بوجھ آ گیا

ف۔ اکتفا رفقا کو دنیا میں عملاً تو بہت ہی کوتاہی ہے اور حقیقت حال اور اسکی مثال۔

یا خانہ اسیر گر پڑا اور نیک کام کر لیا تو گویا سلطنت ملگئی نیک اعمال میں یہ اثر ہے کہ اس سے
معاصی سے نفرت اور آخرت کی رغبت ہو جاتی ہے خاصکر اگر کسی بزرگ کی نظر بھی اسپر پڑ جاوے
کیونکہ ع نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا + دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا +
حضرات صحابہ میں سارے لکھے پڑھے نہ تھے بلکہ بعضے تو حسیات تک میں بالکل بھولے
بھالے تھے چنانچہ فتوحات اسلامیہ میں ایک صحابی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں کسی شہزادی
پر نظر پڑ گئی اور اُس سے محبت ہو گئی وہ آئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا
کہ مجھے فلاں عورت سے محبت ہو گئی ہے آپ مجھکو لکھکر ایک یادداشت دیدیجئے کہ اگر ہمکو
فتح ہو گئی تو وہ عورت مجھکو دیدی جاوے آپنے لکھدیا چنانچہ خلفاء کے وقت میں وہاں جہاد
ہوا اور وہ لڑکی گرفتار ہوئی انھوں نے سالار لشکر کو حضور کا تحریری وعدہ دکھلا دیا
انھوں نے اسکو ان کے حوالہ کر دیا پھر اُس لڑکی کا بھائی آیا اور ان سے کہنے لگا کہ اسکو
بیچتے ہو کہا ہاں کہا بتلاؤ کیا لوگے انھوں نے کہا ایک ہزار روپیہ۔ وہ ایک ہزار روپئے لے آیا
تو آپنے کہا یہ تو تھوڑے سے ہیں میں تو سمجھا تھا کہ ایک ہزار روپئے اتنے ہوں گے کہ میرا گھر
بھر جائیگا اس نے سالار لشکر سے شکایت کی کہ بیع کے بعد انکار کرتے ہیں سالار لشکر نے انکو
مجبور کیا کہ جب بیع کر چکے ہو تو اب تمکو رکھنے کا حق نہیں چنانچہ دینا پڑا ایک اور قصہ حدیث
میں آیا ہے کہ ایک اعرابی نے نماز کے بعد یہ دعا کی تھی اللھم ارحمنی ومحمدا ولا تشرک
فی رحمتنا احدا اے اللہ مجھپر رحمت فرمایئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اور ہماری
اس رحمت میں کسی کو شریک نہ کیجئے حضور نے فرمایا لقد تحجرت واسعا کہ تونے ایک
وسیع چیز کو تنگ کر دیا اسکے بعد وہ نماز کی جگہ سے اٹھے اور مسجد کے صحن میں پیشاب
کرنے لگے صحابہ نے روکا اور مہ مہ کہا حضور نے فرمایا کہ اُسکا پیشاب نہ روکو اتو جو ہونا
تھا ہو چکا سبحان اللہ کیسی حکمت کی بات ہے کہ اب اُسکو پریشان کرنے میں ایک
تو اسکے جسمانی ضرر کا اندیشہ ہے دوسرے اگر وہ بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں تک مسجد کو
ناپاک کریگا۔ ایسے وقت پر سب پہلوؤں کا پیش نظر رہنا بڑا کمال ہے۔ پھر حضور نے حکم
دیا کہ پیشاب کی جگہ ایک ڈول پانی کا بہادو اسکے بعد اعرابی کو بلا کر بہت نرمی اور

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا۔ حضرات صحابہ نظر کردہ ہی تو تھے۔

شفقت سے سمجھا دیا کہ مسجد نماز اور ذکر اللہ کیلئے موضوع ہے اسمیں پیشاب وغیرہ
نہ کرنا چاہیئے یہ تو اعرابی کے ساتھ معاملہ تھا حضور کا اور تعلیم یافتہ صحابہ کیساتھ یہ
معاملہ تھا کہ ایک بار دیوار مسجد پر کھنکار دیکھکر غصہ سے آپکا چہرہ مبارک سرخ ہوگیا۔
غرض صحابہ لکھے پڑھے سب تھے بعضے ان میں ایسے بھولے تھے جنکے واقعات آپ نے
ابھی سنے مگر ساری امت سے وہ افضل ہیں حتی کہ حضرت غوث اعظم رح سے کسی نے پوچھا
کہ حضرت معاویہ رض افضل ہیں یا اویس قرنی و عمر بن عبد العزیز۔ فرمایا حضرت معاویہ کے
گھوڑے کی ناک میں جو غبار لگا ہوا ہے وہ بھی اویس قرنی و عمر بن عبد العزیز سے افضل ہے
تو ان کے افضل ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حضور کے نظر کردہ تھے۔ پس عمل کیساتھ
اگر اہل اللہ کی نظر بھی ملجائے تو پھر وہ حال اور قوی ہو جاتا ہے اور جلدی کام بنجاتا ہے
مگر ٹھنڈے رہکر حال حاصل کرنا چاہو تو محال ہے بلکہ اسکی ضرورت ہے کہ جیسے تم کسی آنیوالے کے
انتظار میں ہر وقت دروازہ پر نظر رکھتے ہو ویسے ہی آخرت کا دھیان ہر دم رہنا چاہیئے
تب حال کا درجہ حاصل ہوگا کہ زیور پہننے میں کپڑا رنگنے میں کھانے پینے میں غرض ہر کام
میں آخرت ہی کا دھیان رہے گا کہ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ ہم یہاں نہونگے۔ اسی کی
تعلیم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ایک صحابی کو کہ اے عبد اللہ شام کو صبح
کا خیال نکرو اور صبح کو شام کا خیال نہ باندھو اور اپنے کو میت شمار کرو۔ اور سچ یہ ہے
بدون حال کے محض عمل قابل اطمینان نہیں عمل بلا حال کی ایسی مثال ہے جیسے ریل
گاڑی کو مزدور ڈھکیل کر لیجائیں اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے جیسے انجن ریل
گاڑی کو لیجائے اسی لئے عراقی فرماتے ہیں ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی — کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

رہ قلندر سے عمل مع الحال اور رسم پارسائی سے زہد خشک یعنی عمل بلا حال مراد ہے
کہ اس سے کامیابی دیر میں ہوتی ہے اور غیر راسخ ہوتی ہے اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو

تو اے صاحبو! باوجودیکہ ہر طرح سے ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ دنیا ختم ہونے والی

ف: عمل کیساتھ اگر اہل اللہ کی نظر بھی ہو تو جلدی کام ہو جاتا ہے

ف: عمل بدون حال کے قابل اطمینان نہیں اور اسکی مثال

پھر بھی ہم اس مسئلہ میں علماً و عملاً و حالاً کچے ہیں اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما عندکم ینفد وما عند اللہ باق خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ دنیا کو فانی سمجھو علماً بھی استحضاراً بھی اور اسکو ہر وقت یاد رکھے تاکہ درجۂ حال حاصل ہو جائے۔ اس اعتقاد میں جو شخص پختہ ہوگا اور رسوخ حاصل کر لیگا اُسکو اعمال صالحہ کی زیادہ توفیق ہوگی کیونکہ اصل مرض دنیا سے جی لگانا ہے اسکا علاج یہی ہے کہ فناء دنیا کو سوچا کرے۔ اور دوسری اشیاء کے فنا کے استحضار میں اگر تکلیف ہو مگر اپنی موت کو استحضار تو کچھ مشکل نہیں چاند سورج کے فنا کو کہانتک سوچوگے تم اپنی موت کو سوچا کرو اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اکثروا ذکر ھاذم اللذات یعنی الموت بس علاج کا حاصل یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت مقرر کر کے اس بات کو سوچ لیا کرو کہ اے نفس ایک دن تو مریگا اور دنیا سے تجکو جانا پڑے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس مضمون کے مناسب ایک قطعہ پڑھے دیتا ہوں شاید اسکا مضمون معین استحضار ہو ؎

خلاصہ بیان

حاصل علاج

کل ہوس اس طرح سی ترغیب دیتی تھی مجھے — خوب ملک روس ہے اور سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجے زندگی — اس طرف آواز طبل اُدہر صدای کوس ہے
صبح سی تا شام چلیئے اوسے گلگوں کا دور — شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو جو قید آز کا محبوس ہے
لیگئی یکبارگی گور غریبان کی طرف — جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سی کہ جاہ و حشمت دنیا سے آج — کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

یہ دارا و سکندر وہ تھے جو کبھی تمام دنیا پر حکومت کرتے تھے آج اُنمیں اتنی بھی قوت نہیں کہ اپنی قبر پر سے پیشاب کرنیوالے کو ہٹا دیں۔ اسی مضمون کا ایک اور قطعہ یہی ہے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
بولا سنبھل کے چل تو ذرا راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

یہ اشعار محض ترقیق قلب کے لئے پڑھ دئے ہیں کیونکہ نظم سے رقت زیادہ ہوتی ہے اور وہ محفوظ بھی

رہتی ہے ورنہ ہمارے لئے اصل چیز تو کلام اللہ و حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
ہے بس ہر رات کو اتنا سوچ لیا کرو کہ ایک دن ہمکو جانا ہے موت آنے والی ہے جب
ہمیشہ اتنا نفس کو تنگ کروگے تب نفس اعتدال پر آجائیگا میرا یہ مطلب نہیں کہ ضروری
تعلقات کو ترک کردو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن سے جی نہ لگاؤ اس کا یہ اثر ہوگا کہ گو یہ چیزیں
نفس سے چھوٹیں گی نہیں مگر انکی ہوس نہ رہے گی اور یہی ہوس ہے جس کا علاج ضروری ہے
حضرات انبیاء علیہم السلام نے اسی کا علاج بہت اہتمام سے کیا ہے حدیث کے دیکھنے سے
معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طول امل اور حرص وہوس سے کسقدر
روکا ہے اور اسکے ازالہ کی کسقدر تدابیر بتلائی ہیں۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہماری غفلت
وحرص کو دور فرمائیں اور آخرت کی رغبت اور دنیا سے زہد و بے رغبتی عطا فرمائیں۔
اور اُن مرحوم کی مغفرت فرمائیں جنکے واقعۂ وفات پر یہ بیان ہوا ہے
اور ان کے اعزہ و پسماندگان کو صبر جمیل اور تیاریٔ آخرت
کی توفیق ہو آمین والحمد للہ رب العلمین
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ
سیدنا و مولانا
محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین ٥

نوٹ۔ اس آیت کے دوسرے جزو کے متعلق جسمیں بقائے آخرت کا ذکر ہے دوسرا وعظ
اسی وعظ کے بعد ہوا تھا جس کا نام الباقی ہے اور عرصہ ہوا طبع ہو چکا ہے ناظرین کو اُسکا
مطالعہ بھی اس کی ساتھ ضروری ہے تاکہ آیت کا مکمل مضمون مطالعہ میں آجائے ۱۲ ظ

اشرف علی

۱۷ رجب ۱۳۴۹ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
رواہ البخاری

سلسلہ التبلیغ

کا

وعظ ۱۹ مسمی بہ

سبیل السعید

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمائش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون،

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمی بہ

سبیل السعید

الاین	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ضبط	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طرح ضبط ہوا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون -	۲۳ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ یوم الجمعہ -	۱ گھنٹہ -	جالساً علی الکرسی -	مولانا سعید الدین صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند کی فرمائش پر کہ وہ وقت رخصت کچھ بیان ہو جائے -	عمل کرنے کا اور اتباع شریعت کا طریقہ اور ... بیان ہے -	کلام بڑی محنت سے ... ضبط ہوا	مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی ...	تخمیناً ۱۰۰ -	افسوس ہے کہ اس وعظ کے محرک مولانا سعید الدین صاحب کا ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ بروز جمعہ انتقال ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون - اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ درجہ عطا فرمائیں اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم **اما بعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم ۝ وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے جسمیں حق تعالیٰ نے تمام دین کا خلاصہ ارشاد فرمایا ہے۔ تمام دین اسکی تفسیر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسکو ایسے خاص عنوان سے بیان فرمایا ہے جسکا اثر یہ ہے کہ اسکو سنکر عمل کی رغبت ہوتی ہے۔ اور یہ حق تعا

ہی حکمت ہے کہ وہ احکام جو فی نفسہ آسان ہیں مگر مخالفت نفس و منازعت نفس کے عارض سے دشوار ہو گئے ہیں اُنکو نہایت سہل عنوان سے بلکہ شوق دلانیوالے عنوان سے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ عارضی دشواری شوق کی حرکت سے مغلوب ہو جائے۔ اور یہ دلیل ہے حق تعالیٰ کے شفیق ہونے کی۔ حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا اور جتنے ضوابط و قواعد حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں انمیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب بندوں کی مصلحت کیلئے ہیں۔ وہ ضابطہ محضہ نہیں بلکہ عین شفقت ہے اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بچہ کنوئیں میں گرنے لگے تو اسکو گرنے سے اس طرح روکتے ہیں کہ ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور دو چار طمانچہ لگا کر وہاں سے ہٹا دیتے ہیں شفقت کا ہٹانا یہی ہے نہ یہ کہ اہل حکومت کی طرح ضابطہ سنا دیا جائے جیسے حکام و سلاطین اور اُنکے نواب کا طریقہ ہے کہ منادی کرنیوالا ایک طرف سے منادی کرتا چلا گیا چاہے کوئی سنے یا نہ سنے سمجھے یا نہ سمجھے اور رغبت ہو یا نہ ہو سو یہ ضوابط ہیں۔ اور حق تعالیٰ کے احکام میں ایسے ضوابط نہیں ہیں ہاں صورت ضوابط کی ہے سو اُسکی ایسی مثال ہے جیسے حکیم دوا کی مقدار معین کرتا ہے وقت مقرر کرتا ہے پرہیز متعین کرتا ہے تو ظاہر میں یہ بھی ضوابط ہیں مگر حقیقت میں یہ محض ضوابط نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ ضوابط مرتفع ہو جائیں تو حقیقت میں اہلاک ہوگا۔ طبیب یہ قیدیں صرف مریض کی مصلحت سے لگاتا ہے اپنی مصلحت کیلئے نہیں لگاتا۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے اپنی شان حکومت کے لحاظ سے ضوابط مقرر نہیں فرمائے بلکہ بندوں کی مصالح و منافع کیلئے متعین فرمائے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نکرتے تو بندوں ہی کا ضرر تھا پس احکام میں بظاہر جو کچھ قواعد و ضوابط ہیں اُن کا مبنی شفقت ہے اور اسی شفقت کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام کو ایسے عنوان سے بیان فرماتے ہیں جس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو اُنکے اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہوئی اور شوق پیدا ہو جاتا ہے جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اسکی رعایت کرتا ہے کہ بیٹا سمجھ لے اور اُسکی سمجھ میں بات آجائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی اس طرز شفقت کی پوری رعایت ہے فرماتے ہیں وان ھذا صراطی کہ واقعی یہ میرا راستہ ہے ھذا

ف حق تعالیٰ احکام کو سہل عنوان سے بیان فرماتے ہیں

ف حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا بلکہ شفقت کا معاملہ فرمایا اور احکام میں جتنی قیود ہیں وہ سب ہماری شفقت سے ہیں

۲۵

ف قیود و ضوابط شرعیہ کی مثال

کا اشارہ اوپر کے احکام کی طرف ہے جو اجہاتِ احکام ہیں جو تمام دین کا خلاصہ ہیں مگر وہ تو اجمال بصورتِ تفصیل تھی اور یہ یعنی آیت ان ھذا صراطی مستقیما اجمال بعد تفصیل ہے۔ قبل ازیں کہ میں اس آیت کے عنوان میں طرزِ شفقت کو واضح کروں ایک اشکال کو رفع کردینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ شاید کسی ذہین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ تو اسپر بھی قادر ہیں کہ ہمکو بدون ابتلاء بالاحکام کے جنت عطا فرما دیں اور شفقت کا مقتضیٰ بھی بظاہر یہی تھا کہ ابتلاء سے محفوظ رکھکر ہمکو نجات عطا فرماتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ اسپر قادر ہیں کہ بدون ابتلاء و امتحان کے سب کچھ عطا فرما دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلاء و تکلیف کے بعد ہی دولتِ قرب عطا فرماتے ہیں (اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بعد کا نام ہے

> شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت — فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
>
> حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر — کنایتیست کہ از روزگار ہجراں گفت ۱۲)

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون ۰ رہا یہ کہ اسکی وجہ کیا ہے سو اسکے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے اُن کا طریقہ یہ ہے ابھموا ما ابھمہ اللہ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے۔ تم بھی اسکو مبہم ہی رکھو۔ پس اجمالا ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے گو ہمکو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بیساختہ دل میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاعت بدون ابتلاء مقصود ہوتی تو اسکے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ ملائکہ اطاعت بدون ابتلاء ہی کے کرتے ہیں انمیں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں۔ اور انسان کے اندر مقاومت و منازعتِ احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کیلئے اسمیں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے۔ اور درجہ خاص کی قید میں نے اسلئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو الدین یسر کے خلاف ہوتا اسلئے میں نے یہ قید

ف ایک اشکال کا جواب کہ اللہ تعالیٰ نے شفقت کی وجہ سے کیوں نہ اختیار فرمائی کہ ہمکو احکام کا مکلف ہی نہ فرماتے۔

ف سلف کا طریقہ یہ ہے کہ احکام کی حکمت کی تفصیل نہیں کی تم بھی نہ کرو۔

ف انسان میں منازعت کا مادہ خاص درجہ پر ہے جسکا مقابلہ وقدرت کے باہر نہیں

ف بعد سوق مشقت کے منازعت باقی نہیں رہتی مگر ثواب کم نہیں ہوتا اور اسکی دلیل۔

لگادی اور یہ منازعت بھی ابتداہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں
رہتی بلکہ احکام الٓہیہ امور طبعیہ بنجاتے ہیں حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا
ہے چنانچہ مشی وغیرہ میں ابتداہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت
نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے اسکو فعل اختیاری
کہا جاتا ہے اسپر یہ شبہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہوجاتا ہوگا کیونکہ طاعت بلا منازعت سے
طاعت بمنازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے کہ ابتداء
منازعت کا مقابلہ کرنیکے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اُس نے تو اپنی طرفسے
مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے چنانچہ ہر مسلمان جو نماز وروزہ
کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا ہمیشہ روزہ رکھوں گا خواہ نفس کو کتنا ہی
گراں ہو۔ اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ
نے ہمیشہ کیلئے اس منازعت کا مقابلہ کرنیکا ارادہ کرلیا ہے اسواسطے اُسکو زوالِ منازعت
کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا۔ تو
جیسے مشی کو فعل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں اختیار وارادہ کی ضرورت ہے
گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ
ابتدا میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اسلئے انتہا تک اس مخالفت منازعت
کو حکماً مستمر قرار دیا جائیگا۔ اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا ورنہ عقل کا مقتضا
یہ ہے کہ جب منازعت ختم ہوجاوے اور عبادت میں لذت وحظ پیدا ہوجائے تو اس شخص کو
اجر نہ ملے کیونکہ اب طاعت مع الابتلاء نہیں ہے اسوقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق
نہیں مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ سے محبت نہیں ہے ہم اسکو منازعت ہی کا
اجر دینگے گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اسکو پنشن دینگے لیکن عقل پنشن کو جائز نہیں کرتی
جیسے معتزلہ نے کہا ہے کہ گناہوں پر سزا دینا ضروری ہے۔ عفو ومغفرت خلاف عقل ہے۔
پس یوں کہئے کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہوجاتی ہے جو بعضے پیروں کی حالت سنی گئی ہے
کہ جب کوئی مرید انکی دعوت کرتا ہے تو وہ دعوت کے بعد نذرانہ بھی لیتے ہیں جسکو دانت گھسائی

ف: حق تعالیٰ بندہ پر اپنی عقل سے زیادہ رحیم ہیں

کہنا چاہیئے ایک پیرزادہ کو دعوت کے بعد ۵۰ دئے گئے تو اُس نے پھینکدیئے اور کہا کیا ہماری شان پچاس روپیہ کے لائق ہے۔ غرض دو سَو روپئے لیکر ٹلے۔ تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلا دیا کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں کیونکہ انتہا میں طاعت کا بجالانا کچھ کمال نہیں رہتا بلکہ اُسکے ترک میں تکلف ہوتا ہے اخیر میں وہ حالت ہو جاتی ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہے کان خلقہ القرآن کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی آپکی تو یہ فطرت ہی سی طبیعت تھی مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہو جاتی ہے اور اسوقت اسکے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہو جاتی ہے جیسے ماں بچہ کو بعض دفعہ دودھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے تو وہ اُسکے چپت لگاتی ہے حالانکہ وہ جانتی ہے کہ یہ خود دودھ پئے گا کیونکہ دودھ سے اسکو خود ہی رغبت ہے مگر اظہار شفقت کیلئے چپت لگاتی ہے ایسے ہی منتہی کیلئے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ مبتدی کیلئے بھی وعید محض اظہار شفقت و رحمت کیلئے ہے کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃً حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے یہ خلاف محبت نہیں بلکہ اسکا منشا یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اسکو حق تعالیٰ پر ناز ہے یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیئے میرے اوپر یہ تکالیف اور قیود کیوں ہیں اور بزبان حال یوں کہتا ہے

ف: کاملین کے حق میں بھی وعیدات کی شان کی توضیح

ف: انسان کو فطرۃً حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو احکام میں منازعت محبت کے منافی نہیں اسکی توضیح

ہمنے الفت کی نگاہیں دیکھیں ... جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم

یہ آجکل کے واعظوں کی زیادتی ہے کہ مسلمانوں کو محبت حق سے خالی سمجھتے ہیں اور وعظ میں مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تمکو نہ خدا سے محبت ہے نہ خدا کی عظمت ہے حکام کے سمن اور طلبی پر تو تم فوراً بلا چون و چرا کے عدالت میں حاضر ہوتے ہو خواہ گرمی ہو یا سردی یا برسات کوئی چیز تمکو مانع نہیں ہوتی اور خدا کے احکام میں منہ بناتے اور حیلے نکالتے ہو سو یہ دلیل غلط ہے کیونکہ رعایا کو حکام سے محبت نہیں اُن کے احکام شاقہ سے رعایا کو تعجب نہیں ہوتا لوگ جانتے ہیں کہ حاکم غیر ہے اُس سے ہمکو کیا تعلق اور وہ ہماری راحت و کلفت کا کیوں لحاظ کرے اسلئے اُنکے احکام میں منازعت و کشاکشی نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ سے

ف: واعظین کی زیادتی ہے کہ مسلمانوں کو محبت حق سے خالی سمجھتے ہیں اور انکی دلیل کا جواب

انسان کو محبت ہے اور خاص تعلق ہے اُنکی طرف سے جو حکم اور قید آتی ہے اسمیں بوجہ ناز کے مچلتا ہے کہ ایسے رحیم وکریم نے میرے اوپر مصیبت کیوں ڈالی واعظوں نے اس فرق کو نہیں سمجھا اسلئے خواہ مخواہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت سے خالی بتلا کر اُن کے دلوں کو مجروح کرتے ہیں گویا بس ایک یہی واعظ صاحب تو حق تعالیٰ کے چاہنے والے ہیں حضرت عارف شیرازی رحمۃ ایسے واعظوں کی خوب خبر لی ہے فرماتے ہیں ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می رسند ایں کار دیگر می کنند

اسمیں بعض واعظوں کے دل میں یہ تاویل آچکی ہے کہ حافظ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ خلوت میں جاکر یہ لوگ ذکر وشغل کرتے ہیں جی ہاں بس خوش ہو لو؟ ذرا اس سے آگے بھی تو بڑھ لو ؎ مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس۔

توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

واعظین گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں کہ وہ خود بھی خلاف ورزی احکام کی کسقدر کرتے ہیں پھر وہ بھی اپنے بیان کے موافق محبت سے خالی ہیں اور اگر وہ خالی نہیں تو عوام بھی خالی نہیں بلکہ سبکو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔ اور چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اسی لئے اس مقام پر فرماتے ہیں وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا جسمیں اس راستہ کو اپنی طرف اسی لئے منسوب فرمایا تاکہ سننے والوں کو حظ آئے کہ یہ محبوب کا راستہ ہے اس عنوان سے سبکو اسکی طرف حرکت ہوگی خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا میرا ابتلایا ہوا ہے یا یہ مطلب ہو کہ اسپر چلکر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہونچ سکتے ہو خواہ کچھ ہی مطلب ہو مگر ہر حال میں محبت کا یہی اثر ہے کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں کام کرنے سے محبوب مجھسے راضی ہوجائیگا۔ تو اُسکو اُس کام میں سب مشقتیں آسان ہوجاتی ہیں بلکہ اس سے بڑھکر اگر محبوب کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو مگر اسکا علم ہوجاوے کہ وہ میری مشقتوں کو دیکھ رہا ہے تب بھی یہی اثر ہوتا ہے چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا

اور ذرا اُف نکرتا ننانوے کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی کسی نے پوچھا کہ اسکی کیا وجہ تھی کہ ننانوے کوڑوں پر آہ نکی اخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا میری حالت کو دیکھ رہا تھا کہ اُسکی محبت میں مجھپر یہ مصیبت آئی ہے تو اُسوقت تک مجھے مصیبت کا احساس ہی نہیں ہوا بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا ؎

بجرم عشق تو ام می کشند و غوغائیست ۔ تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

اسکے بعد وہ وہاں سے چلا گیا تو اسوقت مجھے کلفت کا احساس ہوا جب اطلاع محبوب کے علم میں یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم میں تو کیا کچھ اثر ہوگا۔ اسی بناء پر جب یہاں بندوں کو یہ بتلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے یعنی میری رضا کا راستہ ہے یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے یہ سنکر اُنکی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں اُنکو کوئی مشقت محسوس نہوگی کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں آئی ہے اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں تو دیکھئے اللہ تعالی نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھول ہلکا کر دیا یہی وہ بات ہے جسکو میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالی کی کیسی رحمت ہے کہ اول تو دین کو فی نفسہ آسان کیا پھر نفس کی کشاکشی سے جو اسمیں عارضی گرانی اور مشقت آجاتی ہے اُسکو اس طرح دور کیا کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے جس سے ساری مشقت دور ہو گئی کہ اُس کو اپنا راستہ فرمایا اپنی طرف اُس کی نسبت فرمائی اس کا لطف عشاق سے پوچھو کہ محبوب کے نام لگے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔ اور یہیں سے ایک حکایت کی حقیقت معلوم ہوگی جو مولوی منظر صاحب رام پوری نے جو میرے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی خدمت میں موجز میں شریک تھے (میں نے موجز کو موجز ہی پڑھا ہے ورنہ مطول ہو جاتی) رام پور ریاست کا قصہ بیان کیا کہ ایک شخص صاحب قبض ایک صاحب ارشاد کے پاس گیا انھوں نے پوچھا تم کون ہو کہا میں شیطان

نسبت الی المحبوب ... (حاشیہ)

ہوں فرمایا اگر شیطان ہو تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ جواب سنکر اُسکو مردودیت کا یقین ہو گیا کہ جب ایک شیخ صاحب ارشاد نے بھی مجھپر لاحول پڑھ دی تو میرے مردود ہونے میں کچھ شبہ نہیں تو اس نے اپنے خادم سے کہا کہ اب اس زندگی سے موت بہتر ہے اسلئے میں خودکشی کروں گا اگر کچھ کسر رہے تو تم کسر پوری کر دینا چنانچہ اُس نے خودکشی کی اور جان نکلنے کے بعد مرید نے الجھی ہوئی کھال کو الگ کر دیا اسی حالت میں وہ گرفتار کیا گیا اُس نے کہا تم مجھے کیا گرفتار کرتے ہو میں تو خود زندگی سے بیزار ہوں جب میرا پیر نہ رہا تو میں زندہ رہکر کیا کروں گا تم شوق سے مجھے پھانسی دیدو اس بیان سے حاکم کو اُس کے قاتل ہونے میں شبہ پیدا ہوا تو اُس نے واقعہ دریافت کیا اس نے سب واقعہ بتلا دیا یہ خبران صاحب ارشاد شیخ کو بھی پہونچی انھوں نے بھی تصدیق کی کہ ہاں وہ قبض میں مبتلا تھا اور میرے پاس آیا تھا کچھ تعجب نہیں کہ اُس نے خودکشی کر لی ہو۔

یہ حکایت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنی تو فرمایا کہ ہم تو ان صاحب ارشاد کو شیخ سمجھتے تھے مگر معلوم ہوا وہ کچھ بھی نہیں اُن کو چاہیے تھا کہ جب اُس نے کہا تھا کہ میں شیطان ہوں تو جواب میں یوں کہتے کہ پھر کیا حرج ہے شیطان بھی تو اسی کا ہے نسبت اب بھی قطع نہیں ہوئی اس سے تسلّی ہو جاتی۔ شاید تم یہ کہو کہ ان الفاظ سے کیا ہوتا تو تم اسکو کیا جانو؟

جسپر قبض طاری ہو چکا ہو وہ اسکے اثر کو سمجھتا ہے۔ صاحبو! الفاظ میں بڑا اثر ہے اسکو ایک مثال سے سمجھئے مولوی غوث علی صاحب پانی پتی سے کسی نے شیخ اکبر و فرید عطار و مولانا رومی کے متعلق دریافت کیا کہ وحدت الوجود میں گفتگو کرنے والے یہی تین حضرات بڑے ہیں ان میں فرق کیا ہے فرمایا تینوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تین مسافر کسی گانوں میں ایک کنوے پر پہونچے ایک عورت پانی بھر رہی تھی اُس سے پانی مانگا مگر ایک نے تو یوں کہا کہ اماں مجھے پانی پلا دے یہ تو مولانا رومی ہیں۔ دوسرے نے یوں کہا کہ میرے باوا کی جورو مجھے پانی دیدے یہ شیخ اکبر ہیں تیسرے

نا الفاظ میں بڑا اثر ہے اسکی ایک حکایت

نے یوں کہا کہ میرے باوا سے یوں توں کرانے والی مجھے ... پانی دے یہ شیخ فرید ہیں
اب غور کر لیجئے کہ ان الفاظ کے اثر میں فرق ہے یا نہیں اگر کوئی ماں کو اماں کہے تو وہ خوش
ہو گی اور باوا کی جورو یا باوا سے یوں توں کرانے والی کہے تو اس کا منہ نوچنے کو تیار ہو جائیگی
حالانکہ معنی سب کے متحد ہیں مجھپر خود ایک حالت گذری ہے جسمیں الفاظ کے اثر کا مجھے پورا
مشاہدہ ہوا ہے ایک بار مجھے سخت مرض ہوا اور ایک حکیم صاحب کے پاس قارورہ بھیجا
انھوں نے قارورہ دیکھکر یہ کہا اس شخص میں تو حرارت غریزیہ نام کو بھی باقی نہیں یہ زندہ
کیسے ہے قارورہ لیجانے والے نے یہ عقلمندی کی کہ حکیم کا مقولہ مجھسے آکر بیان کر دیا جس کا
مجھپر بہت زیادہ اثر ہوا میں نے اُن کو دھمکایا کہ یہ بات کیا میرے سامنے کہنے کی تھی تمنے
بڑی حماقت کی جاؤ اس کا تدارک کرو انھوں نے تدارک پوچھا میں نے کہا کہ مکان سے
باہر جاؤ اور کچھ دیر میں آکر مجھ سے یوں کہو کہ میں پھر حکیم صاحب کے پاس گیا تھا اونھوں نے
مکرر دیکھکر یہ کہا کہ پہلے جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی حالت اچھی ہے کچھ خطرہ کی بات
نہیں وہ کہنے لگے کہ جب آپکو معلوم ہے کہ میں آپ کی سکھلائی ہوئی بات کہوں گا تو اُسکا
کیا اثر ہوگا میں نے کہا تم خواص اشیاء کو کیا جانو؟ جس طرح میں کہتا ہوں تم اسی طرح
کرو چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اسوقت میں نے محسوس کیا کہ ان لفظوں کے سننے سے
میری پہلی سی حالت نہ رہی بلکہ ایک گونہ قوت طبیعت میں پیدا ہوئی یہانتک کہ رفتہ رفتہ
علاج سے قوت بڑھتی گئی اور حق تعالیٰ نے پوری شفا عطا فرما دی۔ تو الفاظ میں بھی اللہ
تعالیٰ نے اثر رکھا ہے گو ہماری سمجھ میں نہ آئے اطبا سے پوچھو کہ خفقان میں کہربا کی تعلیق
کیوں مفید ہے؟ وہ اسکی وجہ بجز تجربہ کے کچھ نہیں بتلا سکتے اسی طرح اہل طریق کو کلمات
و الفاظ کے اثر کا تجربہ ہو چکا ہے مگر اُن کے تجربہ کو اہل ظاہر نہیں جانتے شاید کسی مولوی کو
یہ شبہ ہو کہ ایسے الفاظ سے تسلی کرنا تو جائز نہ تھا کہ شیطان بھی تو اُسی کا ہے نسبت پھر
بھی باقی ہے کیونکہ اس سے تو کفار بھی اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگیں گے اس کا
جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ فوری علاج سنکھیا سے بھی کیا جاتا ہے پھر بعد میں سنکھیا
کی سنبھال کر لیتے ہیں اس کو بھی اطبا جانتے ہیں اور اہل اللہ کا تجربہ ہے کہ بعض دفعہ

(حاشیہ: مجھے خود تاثیر الفاظ کا تجربہ ہوا ہے — ۳۲ — حکایت سابقہ ... عمل)

اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے تم اس میں اضافت تشریفیہ کیوں لیتے ہو اور خواہ مخواہ اس کو خلاف شرع پر کیوں حمل کرتے ہو معنی لغوی پر کیوں محمول نہیں کرتے آخر شیطان بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے (یعنی اُن کا پیدا کیا ہوا ہے اُن کا بندہ ہے ۱۲) بتلائیے اسمیں کیا خرابی ہے اس قصہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نسبت اور اضافت کا اثر اہل محبت پر کسقدر ہوتا ہے تو جب اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ یہ میرا راستہ ہے اس سے محبت کو ہیجان ہو گیا اور اب موانع کا ارتفاع آسان ہو گیا اب یہ حال ہو جاتا ہے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

اور اب عاشق زبان حال سے اور بعض دفعہ زبان قال سے یوں کہنے لگتا ہے۔

؎ ناخوش تو خوش بود بر جان من
دل فدائے یار دل رنجان من

ان ھذا صراطی مستقیما کو سنکر ایک دفعہ تو کافر کو بھی اس کی طرف حرکت ہوگی اور وہ اس راستہ پر چلنا چاہے گا کیونکہ خدا سے محبت کافر کو بھی ہے۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں اور آپنے بھی دیکھا ہو گا کہ بعض سنیاسی ذکر شغل کرتے ہیں اور لذائذ کو ترک کر دیتے ہیں اس کا منشا وہی محبت ہے گو وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور یہاں سے ایک بات اور بتلاتا ہوں وہ یہ کہ کفار کو اس ذکر الٰہی سے گو آخرت میں کچھ نفع ہو اور یہ ذکر وہاں ان کیلئے نجات کا سبب نہو مگر دنیا میں اُنکو بھی کچھ ملجاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین کہ وہ کسی اچھے کام کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے بلکہ اگر ذاکر طالب آخرت ہے تو اُسکو آخرت میں بھی اجر عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی۔ اور طالب دنیا ہے تو اُسکو دنیا میں کیفیات نفسانیہ ذوق و شوق وغیرہ عطا ہو جاتا ہے یہ اُس کا اجر ہے اسی لئے محقق حضرات نے فرمایا ہے کہ کیفیات نفسانیہ کے درپے نہو کیونکہ وہ تو چٹنی ہے اور چٹنی مطلوب نہیں بلکہ مطلوب غذا ہے اب اگر کوئی چٹنی ہی سے پیٹ بھر لے تو اس کا معدہ خراب ہو جائیگا بس چٹنی کا کام یہ ہے کہ غذا کے ساتھ تھوڑی سی

۳۳ ف. خدا سے کافر کو بھی محبت ہے وہ بھی اذکار اشغال کرتے ہیں اور کیفیات بھی انکو حاصل ہوتی ہیں۔

کیفیات کے متعلق فیصلہ

کھالی جلئے تاکہ غذا اچھی طرح کھائی جائے۔ میں نے اسکے متعلق ایک فیصلہ کیا ہے جو مختصر ہے گو یہ بلفظ دعوے کا ہے مگر میرا مقصود دعوی نہیں بلکہ یہ ایسا ہے جیسے ہم یوں کہتے ہیں کہ میں نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا۔ اور دعوی تو جب ہو کہ یہ فیصلہ میں نے اپنے آپ کیا ہو نہیں نہیں بلکہ یہ اُن حضرات کا طفیل ہے جنکی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ اور طوطا اگر کچھ پڑھنے لگے تو یہ اُس کا کمال نہیں بلکہ پڑھانے والے کا کمال ہے تو وہ فیصلہ اسکے بارہ میں یہ ہے کہ یہ کیفیات محمود تو ہیں مگر مقصود نہیں اور غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنالینا عصیان باطنی اور بدعت باطنیہ ہے اسلیئے ان کے درپے نہو ان کی تمنا نکرو ہاں دعا کا مضائقہ نہیں کیونکہ دعا میں خاصیت یہ ہے کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شکایت و قلق پیدا نہیں ہوتا اور تمنا کے پورا نہونے سے شکایت و قلق ہوتا ہے۔ حق تعالی نے امور اختیاریہ و غیر اختیاریہ کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علے بعض للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن واسئلوا اللہ من فضلہ ان اللہ کان بکل شیء علیما ۰ میرا ذوق یہ ہے کہ اس آیت میں مطلوب کی دو قسمیں کیگئی ہیں۔ ایک موہوب جسکو ما فضل اللہ بہ اور واسئلوا اللہ من فضلہ میں فضل سے تعبیر کیا گیا ہے دوسرے مکسوب جسکو للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن میں اکتساب کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اب حاصل یہ ہوا کہ موہوب کی تمنا کرنا نہ چاہیئے نہیں بلکہ مکسوب کا اہتمام و فکر کرنا چاہیئے مدار نجات اعمال مکسوبہ ہیں اب رہا تمنائے موہوب سے جو ممانعت ہے اُس میں نہی تحریم کیلئے ہے یا کراہت تحریم کے لئے یا کراہت تنزیہ کیلئے اس سے مجھے بحث نہیں عشاق سے پوچھو کہ جب محبوب کسی کام سے منع کر دے تو کیا عاشق محبوب سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ حضور یہ بات آپ کو کس درجہ میں ناپسند ہے کسقدر ناگوار ہے اگر کوئی ایسا سوال کرے گا تو محبوب اُس کو نکال باہر کرے گا کہ تو عاشق نہیں اسکے بعد حق تعالی ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موہوب

اس فیصلہ کی تائید آیت سے

کیلئے ان کا دل للچائے گا ضرور۔ اسلئے دعا کی اجازت دیتے ہیں واسئلوا اللّٰہ من فضلہ کہ دعا کرسلئے ہو آگے بعض اوقات عدم قبول دعا سے پریشان نہ ہونے کی تعلیم ہے ان اللّٰہ کان بکل شیٔ علیما کہ اگر دعا قبول ہونے میں دیر ہو اور قبول کے آثار معلوم نہ ہوں تو گھبراؤ نہیں کیونکہ اللّٰہ تعالیٰ ہر بات کو اچھی طرح جانتے ہیں یعنی وہ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ یہ نعمت جو ہو یہ تمھارے لئے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے۔ یہ تو کیفیات کے متعلق فیصلہ کا ذکر تھا اور اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کیفیات کفار کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں تو جو چیز کافر کو بھی حاصل ہو سکے اُس کے درپے نہ ہونا چاہیئے اور نہ ان کیفیات کے حصول پر اکتفا کرنا چاہیئے کیونکہ نجات کا مدار اعمال مکسوبہ پر ہے ان کیفیات سے قرب و نجات میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوتی۔ (ہاں یہ ضرور ہے کہ عادۃً عمل مجرد عن الکیفیۃ سے عمل مع الکیفیۃ میں خود شان اکتساب کی زیادہ ہوتی ہے اسلئے وہ اکمل ہونیکے سبب افضل ہوگا ۱۲) غرض خدا کا راستہ سُنکر کفار کو بھی حرکت ہوتی ہے اور وہ بھی ایک دفعہ کو بے اختیار اس راستہ پر چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ خدا تعالےٰ سے سبکو محبت ہے جسکی وجہ سے جس چیز کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے اُس سے بھی محبت ہوتی ہے آگے ارشاد ہے کہ بس لذت نسبت ہی پر کفایت نکرنا بلکہ آگے بڑہو اور کام کرو۔ فاتبعوہ کہ اس راستہ کا اتباع کرو اسپر چلو کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو کافر سے نہیں ہو سکتی کیفیات تو کفار کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں مگر صراط خداوندی کا اتباع کافر سے بحالت کفر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو تمہید تھی اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں جو مختصر ہی ہے اور مقصود تو ہمیشہ مختصر ہی ہوتا ہے جیسے روٹی مختصر ہے اور تمہید اُس کی بہت لمبی ہے یہ تو حسیات میں ہے اور طریق باطن میں بھی مقصود مختصر اور تمہید مطول ہوتی ہے چنانچہ مولانا گنگوہی رح کا ارشاد ہے کہ سلوک کا جو حاصل پندرہ سال کے بعد معلوم ہوا ہے اگر پہلے معلوم ہوتا تو اس کیلئے

ہم اتنا وقت صرف نہ کرتے میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ حاصل پندرہ برس کی محنت سے پہلے معلوم ہی کیوں ہوتا (اور یہ بھی حضرت قدس سرہ کا کمال تھا کہ آنکو پندرہ برس میں خلاصہ معلوم ہوگیا بہت سوں کو تو تیس اور چالیس سال کے بعد جا کر کہیں مقصود کا پتہ لگتا ہے ۱۲) بس یہ مختصر ایسا ہے جیسے ایک بڑے دفتر حساب کا خلاصہ میزان الکل ایک سطر میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ کل میزان دس ہزار پانچ سو دس ہے مثلاً۔ یہ لفظ تو ایک سطر سے بھی کم میں آجائیگا مگر کیا آپ اس میزان کو بدون تمام دفتر کو جمع کئے معلوم کر سکتے تھے ہرگز نہیں۔ غرض حق تعالیٰ نے یہاں تو صراط کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور ایک جگہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اُسکی اضافت فرمائی ہے۔ قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا و من اتبعني اور ایک مقام پر انبیاء و علماء کی طرف اُسکی اضافت ہوئی ہے واتبع سبيل من اناب الى اور ایک مقام پر خود سالک کی طرف اضافت کیگئی ہے فمن شاء اتخذ الى ربه سبيلا ۞ گو یہ اضافت صریح نہیں مگر سالک کو اس طریق کے ساتھ تلبس ہونے پر یہ آیت ضرور دال ہے کیونکہ لفظ سبیل اسمیں اتخذ کا مفعول ہے اور فاعل سالک ہے اور متخذ و متخذ میں تلبس ضرور ہوتا ہے اور اضافت سے میری یہی مراد ہے۔ اضافت نحویہ مراد نہیں۔ اب ان اضافات متعددہ کے اسباب سنئے حق تعالیٰ کی طرف تو اس طریق کی اضافت اسلئے ہے کہ وہ واضع طریق ہیں اور منتہائے طریق ہیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اسلئے ہے کہ آپ داعی اور مبلغ ہیں اور یہی وجہ نسبت الی العلماء کی ہے اور سالک کی طرف اضافت کا منشا یہ ہے کہ وہ طالب سبیل ہے اور فقہاء نے اصول میں بیان فرمایا ہے کہ جہاں ایک چیز دو کی طرف منسوب ہو وہاں ان دونوں چیزوں میں نہایت تعلق ہوتا ہے چنانچہ اصولیین نے حرمت مصاہرت کے مسئلہ میں اسکی تقریر کی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ ولد منسوب ہے واطی اور موطوءہ کی طرف اس لئے ان دونوں میں تعلق قوی ہوگیا پس دونوں کے اصول و فروع ایک دوسرے پر حرام

[ف سبیل حق کو کہیں حق تعالیٰ کی طرف مضاف کیا کہیں رسول کی طرف کہیں علماء کی طرف کہیں سالک کی طرف]

[ف ان اضافات متعددہ کے اسباب]

[ف جہاں نسبت دو کی طرف ہو وہاں نہایت درجہ تعلق ہوتا ہے]

ہو جائیں گے تو ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ سبیل حق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی یہ نہایت تعلق مع الرسول کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کو بہت تعلق ہے اور منشا اضافت الی الرسول کا یہ ہے کہ آپ داعی الی طریق اللہ ہیں جسکی طرف ادعوا الی اللہ میں اشارہ ہے اور یہی شان علماء میں بھی موجود ہے مگر بواسطہ رسول کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں یہ شان بلاواسطہ ہے پس واسطہ اور بلاواسطہ کا فرق ہے مگر نفس نسبت مشترک ہے تو قاعدہ مذکورۂ بالا کے موافق یہ اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو علماء سے بہت تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی بواسطہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علماء سے بہت تعلق ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب یہ نسبت مشترک ہے اور سالک کی طرف بھی اسکی اضافت ہے تو جو اس راستہ پر چلنا شروع کرتا ہے اُس سے بھی اللہ تعالیٰ کو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ جب یہ سمجھ گئے تو اب سنو اکہ مجھے یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا ہے جس کا حاصل یہ شعر ہے ؎

چونکہ گل رفت وگلستاں شد خراب ۔۔۔ بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ ۔۔۔ چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی اسوقت مجھے علماء کی شان بیان کرنا اور اُن کا درجہ بتلانا ہے جو اس اضافت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت جو شخص اللہ تعالیٰ تک پہونچنا چاہے اور خدا تعالیٰ کو راضی کرنا چاہے اُسکے لئے بجز اتباع علماء کے کوئی صورت نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے گو حضور کی وفات بھی حیات ہی ہے مگر حیات صوریہ کے مقابلہ میں اُسکو وفات کہنا ضرور صحیح ہے ہاں اللہ تعالیٰ حی لایموت ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے بجز انبیاء کے بلاواسطہ کوئی مستفید نہیں ہو سکتا اور ہم تو صحابہ کیطرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی بلاواسطہ مستفید نہیں ہو سکتے۔ تو اب بجز اتباع علماء کے ہمارے لئے دین پر چلنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ مگر حالت یہ ہے کہ بہت

لوگوں کو اتباع علماء سے آجکل عار ہے بلکہ بعض کو تو اتباع ائمہ سے بھی عار ہے آجکل
بعض لوگوں کو مشکوۃ و بخاری کا ترجمہ پڑھکر اجتہاد کا دعوے ہے مگر اس اجتہاد کی
حالت یہ ہے کہ ایک عامل بالحدیث تنہا نماز پڑھتے تو سکون سے پڑھتے اور امامت
کرتے تو خوب ہل ہل کر نماز پڑھتے کسی نے انکو ٹوکا کہ تم امامت کے وقت اس قدر
کیوں ہلتے ہو تو کہا حدیث میں اس کا حکم آیا ہے اور مشکوۃ کا ترجمہ نکالکر لائے جسمیں
من ام منکم فلیخفف کا ترجمہ لکھا تھا کہ جو شخص امام بنے وہ ہلکی نماز سے مجتہد صاحب
نے ہلکی کو ہل کے پڑھا اور نماز میں ہلنے لگے۔ صاحبو! میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ آجکل
دعویٰ اجتہاد وہی کرتا ہے جسکو علم سے مس ہی نہیں ورنہ صاحبِ علم کبھی دعوی اجتہاد
نہیں کرسکتا کیونکہ جب کمال علم حاصل ہوتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم جاہل
ہیں چنانچہ مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ عمر بھر پڑھتے پڑھاتے
یہ نتیجہ نکلا کہ ہم جہل مرکب سے جہل بسیط میں آگئے بھلا ایسا شخص دعوی اجتہاد کیونکر
کرسکتا ہے۔ بس مدعی وہی لوگ ہیں جنکو علم کی ہوا بھی نہیں لگی انکو اجتہاد کی حقیقت
بھی معلوم نہیں۔ ایک صاحب نے ریل میں مجھسے سوال کیا تھا کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں
میں نے کہا کہ تم اسکی حقیقت اصطلاحی الفاظ میں تو کیا سمجھو گے میں ایک مثال سے
اس پر تنبیہ کئے دیتا ہوں۔ بتلاؤ اگر دو شخص سفر میں ہوں اور صبح کی نماز کا وقت آئے
اور پانی موجود نہو اسلئے دونوں کو تیمم کرنا پڑے مگر ایک نے تو وضو کا تیمم کیا دوسرے نے
بوجہ رات کو احتلام ہوجانے کے غسل کا تیمم کیا تو ان دونوں میں سے امام کون بنے اور
کسکی امامت افضل ہے۔ کہا اس شخص کی جس نے وضو کا تیمم کیا ہے کیونکہ طہارت
تو دونوں کو برابر حاصل ہے اور حدث ایک کا اصغر ہے اور دوسرے کا اکبر اسلئے وضو کے
تیمم والے کی طہارت اقوی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو تمھارا اجتہاد ہے اب سنو فقہاء نے
تیمم غسل والے کو امامت کیلئے افضل فرمایا ہے وہ یہ بات سنکر بڑے حیران ہوئے
اور وجہ پوچھنے لگے کہ فقہاء نے یہ بات کہاں سے فرمائی میں نے کہا کہ فقہاء فرماتے ہیں
کہ جب پانی موجود نہو تو تیمم طہارت کاملہ ہے حدث اکبر کیلئے بھی اور حدث اصغر کیلئے

ف: بعض کو اتباع علماء بلکہ اتباع ائمہ سے بھی عار ہے اور خود کو مجتہد سمجھتے ہیں اور ان کے اجتہاد کی حقیقت۔

ف: صاحب علم کبھی دعوی نہیں کرتا دعوی جاہل ہی کرتا ہے۔

ف: اجتہاد حقیقی کی شان کی توضیح ایک مثال سے۔

بھی جب تیمم طہارت کاملہ ہے تو جس نے غسل کا تیمم کیا ہے وہ افضل ہے کیونکہ نائب اکمل کا اکمل ہے اسلئے غسل والے کا تیمم اکمل ہے اس دلیل کو سُنکر انکی آنکھیں کھل گئیں اور کہنے لگے واقعی اجتہاد کرنا انہی حضرات کا کام تھا صاحبو! تم جب چاہو امتحان کر لو کہ حدیث سے بیس احکام تم مستنبط کرو اور وجہ استنباط پیش نظر رکھو پھر ان احکام کے متعلق فقہاء کا کلام اور اُنکا استدلال معلوم کرو تو واللہ خود قسم کھا کر کہو گے کہ فقہاء حدیث و قرآن کو خوب سمجھتے ہیں۔ اہل حدیث کو فقہاء پر یہ اعتراض ہے کہ یہ احادیث کے خلاف مسائل بیان کرتے ہیں۔ میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی اگر عمل بکل الحدیث ہے تو اس معنی کر تو تم بھی عامل بالحدیث نہیں کیونکہ بہت سی احادیث کو جو حنفیہ کے موافق ہیں تم چھوڑتے ہو اور اگر اس کے معنی عمل ببعض الحدیث ہیں تو اس معنی کر ہم بھی عامل بالحدیث ہیں یہ اور بات ہے کہ تمھارے دلائل بخاری و مسلم میں ہیں اور ہمارے دلائل مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبد الرزاق میں ہیں تو وہ تو بخاری مسلم کے بھی استاد اور استاد الاستاد ہیں گو شاگرد زیادہ مشہور ہو جائے۔ پھر اسکی کیا وجہ کہ تم ائمہ فقہاء کو حدیث کا مخالف کہتے اور اُن پر طعن کرتے ہو۔ اور در اصل ہمکو غیر مقلدوں سے اسی کی زیادہ شکایت ہے کہ وہ ہمارے ائمہ کو بُرا کہتے ہیں۔ اگر وہ ائمہ کو بُرا نہ کہیں تو تقلید یا ترک تقلید سے ہمکو زیادہ بحث نہیں یہ تو ہر شخص کا خدا کے ساتھ اجتہادی معاملہ ہے خواہ تقلید سے خدا کو راضی کرلے یا ترک تقلید سے ہمارا اجتہادی خیال یہ ہے کہ ہم بدوں تقلید کے دین پر عمل نہیں کر سکتے اگر کسی کا اجتہادی خیال یہ ہے کہ ترک تقلید سے بھی دین پر عمل ہو سکتا اور خدا راضی ہو سکتا ہے تو اُس کو اختیار ہے ہم اُس کی ساتھ نہ اُلجھیں گے مگر اسکی کیا وجہ کہ وہ مقلدوں سے اُلجھتے ہیں اور اس سے بڑھکر یہ کہ ہمارے ائمہ کو بُرا کہتے ہیں حالانکہ ہم اُن کے ائمہ کو بُرا نہیں کہتے بلکہ ہم تمام

ف اسی طرح عطاء بن ابی رباح سے سوال کیا گیا کہ عورتیں اگر باہم جماعت کریں تو امامت کیلئے کہیں کون افضل ہے فرمایا جو حاملہ ہو۔ لکون طہرہا اکمل من طہر غیر الحائل بیرا بتہا من الحیض ما دامت حاملاً۔ یہ جواب غیر مجتہد کبھی نہیں دیسکتا ۱۲ ظ۔

محدثین کو بھی اپنا امام سمجھتے اور ان کی عظمت کرتے ہیں اور کسی کی تحقیر کو جائز نہیں سمجھتے
ایک دفعہ میں قنوج گیا تو غیر مقلدوں نے میری دعوت کی حنفیوں نے تو مجھے منع
کیا اور کہا کہ ان لوگوں کا کیا اعتبار کہیں سنکھیا نہ دیدیں مگر میں نے دعوت قبول کی
اور کھانے کے بعد یا قبل ان سے کہا کہ میں آپ کا بالقوہ یا بالفعل نمکخوار ہو گیا
ہوں اسلئے میرے ذمہ آپ کی خیر خواہی لازم ہو گئی اس خیر خواہی کی بنا پر میں آپ
کو دو نصیحت کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ بدگمانی نکرو دوسرے یہ کہ بدزبانی نہ کرو غیر مقلدوں
میں یہ دو مرض زیادہ غالب ہیں اسی وجہ سے وہ ائمہ کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں
ان کے نزدیک تاویل وقیاس کے معنی ہی مخالفتِ حدیث ہیں گو وہ مستند
الی الدلیل ہی ہو ایک عامی نے ایک غیر مقلد عالم کو اسی بنا پر سخت الزام دیا۔
اُن سے پوچھا کہ من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر کے کیا معنی ہیں کہا معنی کیا
ہوتے تاویل ہی کی کیا ضرورت ہے بس جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے عامی نے کہا
کہ حنفی لوگ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے اور حدیث میں ہے لا صلوٰۃ لمن لم
یقرأ بام الکتاب تو یہ لوگ آپ کے اصول پر کہ اسمیں کچھ تاویل نہیں۔ تارک صلوٰۃ
ہوئے اور تارک صلوٰۃ کافر ہے تو کیا حنفی سب کافر ہیں۔ جناب وہ عالم دم بخود ہو گئے
اور ایسے خاموش ہوئے کہ کچھ جواب نہ بن پڑا کیونکہ وہ محض اس بات پر اُن کی
تکفیر نہیں کرتے۔ پس نہ حنفیوں کو کافر کہہ سکے اور نہ حدیث میں تاویل کر سکے کیونکہ
تاویل اور قیاس کرنا ان کے نزدیک شرک وکفر میں داخل ہے مگر عامی نے انکو
الزام دیکر بتلا دیا کہ بدوں تاویل وقیاس کے چارہ نہیں اور یہ الزام دینے والا ایک
عامی لوہار تھا۔ غرض مشکوٰۃ وبخاری کا ترجمہ دیکھکر اجتہاد کرنا جاہلوں کا کام ہے اپنے
منہ میاں مٹھو بننا اور بات ہے مگر وہ کسی محقق عالم کے سامنے اپنے اجتہادات بیان
کریں تو حقیقت معلوم ہو جائے وہ ان کے سب اجتہادیات کی قلعی کھولکر رکھدیگا
اور ان سے اقرار کرا لے گا کہ تم اجتہاد کے ہرگز اہل نہیں اسی لئے کہا گیا ہے ؎

بنمای بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسی نتواں گشت بتصدیق خرے چند

غیر مقلدوں میں بدگمانی وبدزبانی کا مرض زیادہ ہی کی علامت ظاہر ہے

ایک عامی نے ایک غیر مقلد عالم کو سخت الزام دیا

۴۰

عارف فرماتے ہیں ؎

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اجتہاد ایک خاص آن ہے جو امر ذوقی ہے محض کتابوں کے یاد کر لینے کا نام اجتہاد نہیں ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری دارد

ف: دو علموں میں اب بھی اجتہاد باقی ہے اسکو بیان فرمایا

البتہ دو علموں میں اب بھی اجتہاد باقی ہے ایک طب باطنی میں ایک طب ظاہری میں۔ جو شخص ان میں مجتہد نہو اُسکو علاج کرنا جائز نہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آجکل عوام کو اتباع علماء سے عار ہے حتیٰ کہ بعض کو ائمہ کے اتباع سے بھی عار ہے مگر وہ یاد رکھیں کہ خدا کا راستہ بدون اتباع علماء و اتباع ائمہ کے نہیں مل سکتا عوام اگر خدا تک پہونچنا چاہتے ہیں تو اُن کے لئے طریقہ یہی ہے کہ علماء سے احکام پوچھ پوچھ کر اُنکا اتباع کریں۔ اُن کو علماء سے دلائل و حکم دریافت کرنیکا حق نہیں صرف احکام دریافت کرنے کا حق ہے۔ اور علماء کو بھی چاہئے کہ عوام کے سامنے دلائل و حکم بیان نکیا کریں۔

ف: عوام کو علماء سے سوائے احکام دریافت کرنیکا حق نہیں اسپر ایک واقعہ کا ذکر

میرا یہی طرز ہے چنانچہ علیگڈھ میں ایک پروفیسر نے جو عربی ادب کے بڑے ماہر تھے مجھسے ایک حدیث کا متن پڑھکر جسمیں آیا ہے کہ زنا کی کثرت سے طاعون پھیلتا ہے سوال کیا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا کہ حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت و عقوبت میں وجہ ربط سمجھ میں نہیں آئی۔ کہا ربط سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ ربط کے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اسپر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے آپ بدون علم ربط ہی کے حدیث پر ایمان رکھئے کہا اس میں ایک نفع ہے۔ میں نے کہا وہ کیا کہا زیادت اطمینان۔ میں نے کہا خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل؟ کہا دلیل اس کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے و لکن لیطمئن قلبی۔ میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نافع تھی وہ آپ کو بھی نافع ہو بس اس پر وہ خاموش ہو گئے علماء کو عوام کے ساتھ یہی طرز اختیار

کرنا چاہیئے کہ دلائل و حکم و اسرار اُن کے سامنے بیان نکریں اس سے اُن کا دماغ خراب ہوتا ہے پھر وہ کوئی حکم بدون علّت و حکمت معلوم کئے قبول نکریں گے اور بعض احکام کی علل و حکم دقیق ہوتی ہیں عوام بیان کے بعد بھی اُنکو نہیں سمجھ سکتے۔ وہاں عوام یا تو عمل ترک کریں گے یا علماء علت و حکمت کے سمجھانے میں اپنا دماغ اور وقت ضائع کریں گے اس سے بہتر یہی ہے کہ عوام کے سامنے صرف احکام بیان کئے جائیں۔

ف علمار کو ایک نصیحت

یہ تو علمار کا کام ہے اور عوام کا فرض یہ ہے کہ علمار کا اتباع کریں خود اجتہاد نکریں اُن سے احکام دریافت کریں علل و حکم دریافت نکریں۔ علماء کو ایک بات کی اور نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ جسکے سر پر بڑے موجود ہوں اُسکو اپنی شہرت کی کوشش نہ کرنا چاہیئے بلکہ جہانتک ہو اپنے کو گم کرو گمنامی میں رہو کیونکہ بڑا بننا سخت خطرہ کی بات ہے اور شہرت سے دنیوی مصائب کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

خویش را رنجور ساز و زار زار تا ترا بیروں کنند از اشتہار

اشتہار خلق بند محکم ست بند ایں از بند آہن کے کم ست

چشمہا و خشمہا و اشکہا بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

یعنی اشتہاری آدمی مجرم ہوتا ہے (یہ لطیفہ ہے) یہ تو آجکل قانون بھی ہے پس سلامتی اسی میں ہے کہ چھوٹے بنکر رہو اسمیں دین کی بھی سلامتی اور دنیا کی بھی۔

اور جسکے سر پر کوئی بڑا نہو اُسکے لئے میں دوسرا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس کے مستحسن ہونے پر قسم کھا سکتا ہوں وہ یہ کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرے انشاء اللہ [غلطیوں] سے محفوظ رہے گا۔ اسکے بعد میں ایک نئی بات کہتا ہوں جو اکثر لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ کہ مرید کو شیخ کی رائے سے مخالفت کا حق نہیں اگرچہ دوسری شق بھی مباح ہو کیونکہ مرید کا تعلق شیخ سے استاد شاگرد جیسا نہیں ہے بلکہ اس طریق میں مرید شیخ کا معاملہ ایسا ہے جیسے مریض اور طبیب کا معاملہ ہے کہ مریض کو فتوی طبیب کی مخالفت جائز نہیں ایسے ہی یہاں مرید مریض ہے اور شیخ طبیب ہے اس لئے مرید کو شیخ کی مخالفت جائز نہیں ہاں دوسرا شیخ اس شیخ کے اجتہاد سے مزاحمت

ف مرید کو شیخ کی رائے سے مخالفت جائز نہیں

کرسکتا ہے جیسے ایک طبیب دوسرے طبیب سے مزاحمت کرسکتا ہے مگر مرید تو حقیقت میں طبیب نہیں اور جب تک طبیب نہیں اسوقت تک مریض ہے۔ پس اُس کے ذمہ اتباع قول طبیب لازم ہے ہاں یہ شرط ہے کہ اُس کا قول خلاف شریعت نہو اگر مرید کے نزدیک شیخ کا قول خلاف شرع ہو تو مخالفت جائز بلکہ لازم ہے مگر ادب کے ساتھ (گو واقع میں خلاف شریعت نہو مگر یہ تو اپنے علم کا مکلف ہے ۱۲) جیسے حضرت سید صاحب بریلوی کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصور شیخ تعلیم فرمایا تو سید صاحب نے اس سے عذر کیا کہ مجھے اس سے معاف فرمایا جائے شاہ صاحب نے فرمایا ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید ۔۔۔ کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا

سید صاحب نے عرض کیا کہ مےخواری تو ایک گناہ ہے آپ کے حکم سے میں اُس کا ارتکاب کرلوں گا پھر توبہ کرلوں گا مگر تصور شیخ تو میرے نزدیک شرک ہے اس کی کسی حال میں اجازت نہیں حضرت شاہ صاحب نے یہ جواب سُنکر سید صاحب کو سینہ سے لگالیا کہ شاباش جزاک اللہ۔ تمپر مذاق توحید واتباع سنت غالب ہی اب ہم تمکو دوسرے راستہ سے لے چلیں گے تصور شیخ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ غرض نبوت تو ختم ہو چکی ہے مگر سبیل حق منقطع نہیں ہوا اُسکو علماء سے معلوم کرو اور یہ رحمت ہے کہ نبوت ختم ہو گئی ورنہ انکار نبوت سے کفر لازم آجاتا اور بہت سے مسلمان نبی کے انکار سے کافر ہو جاتے اب کفر سے تو بچ گئے کیونکہ حضور کے بعد کوئی نبی نہیں پس حضور کے بعد کسی امتی کے انکار سے کفر لازم نہ آئے گا ہاں گناہ لازم آئے گا اگر علماء و مجتہدین سے مخالفت و منازعت کیگئی۔ صاحبو! مجتہدین کا وجود بھی ہمارے حق میں رحمت ہے کہ ان حضرات نے محنت کرکے احکام دین کو مدون کیا اور ہمکو پکی پکائی روٹی ملگئی مگر بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہمتو خود ہی پکائیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ بہت اچھا پکاکر دیکھ لو پھر دونوں کا موازنہ کرلو خود فرق واضح ہو جائے گا پس اجتہاد نکرو بلکہ اہل اجتہاد کا اتباع کرو۔ مجتہدین فی الاحکام الظاہرہ کا بھی اور مجتہدین

اگر مرید کے نزدیک شیخ کا قول خلاف شرع ہو تو شیخ سے مخالفت لازم ہے اور ادب کے ساتھ اس کی حکایت

نبوت ختم ہونا رحمت ہے۔

فی الاحکام الباطنۃ کا بھی تو یہ سبیل حق قیامت تک بواسطہ علما کے باقی رہے گا جو اتباع علماء ہی سے آپ کو مل سکتا ہے بدون اسکے راستہ نہیں مل سکتا مقصود تو ختم ہو گیا اب ایک بات باقی رہی کہ اس سبیل کی اضافت سالک کی طرف جو کیگئی ہے یہ باعتبار غایت ہونے کے ہے کیونکہ یہ اُس کا مقصود ہے سالک نہ اس کا موجد ہے نہ مبلغ و داعی ہے۔ نہ داعی کا وارث ہے خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ کو علماء سے خاص تعلق ہے پس علماء کو چاہیئے کہ وہ بھی حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کریں تاکہ فیض میں برکت ہو محض تعلق علمی کافی نہیں بلکہ تعلق علمی و حالی کی ضرورت ہے اور عوام کو علماء سے خاص تعلق پیدا کرنا چاہیئے یعنی تعلق اتباع کہ ان کو خدا تعالیٰ اسے بواسطہ علماء ہی کے تعلق ہو سکتا ہے اب میں ختم کرتا ہوں کیونکہ وقت زیادہ نہیں ہے جن حضرات کی فرمایش سے یہ بیان ہوا ہے وہ اسی ریل سے جانے والے ہیں اور اب ریل کا وقت قریب آگیا ہے پس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمکو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ وصلی اللہ علےٰ سیدنا و مولانا محمد و علےٰ آلہ واصحابہ اجمعین

اشرف علی

۵ رجب ۱۳۴۹ھ

رسالہ المبلغ نمبر ۱ جلد دوم بابتہ ماہ شوال ۱۳۴۹ھ (رجسٹرڈ حرف اے نمبر ۲۰۲)

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ نمبر ۹۲ مسمی بہ

اکمال العدۃ

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی و مولائی محمد اشرف علی صاحب دام ظلہم

حسب فرمائش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی ب

اکمال العدۃ و انسلاخ رمضان

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَنْ	ماذا	لِمَنْ اَیْ بیان	مَنْ ضَبَطَ	السّامعین	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کس ہیئت سے ہوا	کس نے بیان کیا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو بتا رہا مقصود کیا تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تعداد	متفرقات
کیرانہ ضلع مظفر نگر مسجد	۲۲ رمضان ۱۳۳۳ھ روز سہ شنبہ	۲ ۱/۲ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	بید ہوا حضرت اقدس	روزہ اور سال بھر کی مفارقت اور تکمیل عدت اور عید کی فضیلت اور اس کی تعیین اور ...	طلبا کو عموماً	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ و غفر لوالدیہ	سو دو سو ...	اس بیان میں ... عجیب ...

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہٖ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہٗ و رسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ اٰلہٖ و اصحابہٖ و بارک و سلم **اما بعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۝ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر و لتکملوا العدۃ و لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم و لعلکم تشکرون

واذا سألک عبادی عنی فانی قریب ط اجیب دعوۃ الداع اذا دعان
فلیستجیبوالی ولیؤمنوابی لعلھم یرشدون ○ ان آیات کا پہلا حصہ یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے جسمیں حق تعالی نے روزہ کے احکام کے مصالح ارشاد فرمائے ہیں اور دوسری آیت کو پہلی آیت کے تقویت کیلئے ارشاد فرمایا ہے۔ یہ حاصل ہے دونوں آیتوں کا مگر اسوقت جو جزو مقصود ہے وہ لتکملوا العدۃ ہے اور مضامین چونکہ اسی کے سیاق و سباق میں ہیں اسلئے سبکی تلاوت کردی گئی حاصل ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالی تمھاری تکلیف کو گوارا نہیں فرماتے بلکہ تمکو آسانی پہونچانا چاہتے ہیں پس روزہ میں دشواری کا اندیشہ نکرو مثلاً گرمی کے موسم میں بعض لوگوں کو دشواری کا خیال ہوتا ہے مگر اس سے اندیشہ نکرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالی روزہ میں تمکو آسانی پہونچانا چاہتے ہیں اگر تم گرمی میں روزہ کی ہمت کروگے اللہ تعالی آسان کردینگے اب سمجھنا چاہئے کہ وہ آسانی کونسی ہے جو یرید اللہ بکم الیسر سے حقیقۃً مراد ہے سو حقیقت میں وہ آسانی معنوی اور روحانی ہے جس کا اثر یہ بھی ہے کہ جسمانی آسانی اُس پر مرتب ہوجاتی ہے روحانی سہولت کا حاصل یہ ہے کہ روزہ سے تمکو دلچسپی عطا کردی گئی اور دلچسپی سے جیسا روح کو آسانی ہوتی ہے جسمانی سہولت بھی اُسپر مرتب ہوجاتی ہے کیونکہ دنیا کے کاموں میں مشاہدہ ہے کہ دلچسپی کے بعد دشوار سے دشوار کام بھی آسان ہوجاتا ہے ہمنے تقریبات شادی میں دیکھا ہے کہ نفیس المزاج لوگوں کو بعض دفعہ بارات کے انتظام میں پسینا آجاتا ہے بھوکے مرتے ہیں مگر کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اسپر فخر کرتے ہیں اور اگر کبھی شکایت بھی کرتے ہیں تو اُن کے لہجہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اندر سے ان کا دل خوش اور شاداں ہے محض لفظی شکایت ہے تو وہ شکایت ایسی ہوتی ہے جسکے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

دل ہمی گوید از و رنجیدہ ام — وز نفاق سست او خندیدہ ام

بعض دفعہ اہل اللہ کے کلمات میں بھی شکایت ہوتی ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کی شکایت کر رہے ہیں مثلاً ایک عاشق کا شعر ہے ؎

کیا ہی لطف خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا۔

مگراُن کے دل سے کوئی پوچھے کہ کیا وہ خدا سے رنجیدہ ہیں یا اُنکو کچھ تکلیف ہے ہرگز نہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

کہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں — جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

اب کیا اُنکو اس سے پریشانی ہے ہرگز نہیں وہ اسکے عوض سلطنت کا لینا بھی پسند نہیں کرتے مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

تا خوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجانِ من

غرض قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز سے دلچسپی ہوتی ہے اُسمیں روحانی تکلیف نہیں ہوتی گو جسمانی تکلیف ہو پھر وہ بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتی اسی لئے بعض دفعہ دنیا والے خوش ہو کر اپنی تکالیف کو بیان کیا کرتے ہیں حالانکہ تکلیف میں خوشی کیسی؟ مگر اسکا راز وہی ہے کہ روح کو دلچسپی کی وجہ سے راحت ہوئی اسلئے جسمانی کلفت کی پروا نہیں کیگئی پھر عادۃ اللہ یہ ہے کہ اسکے بعد ظاہری اور جسمانی سہولت بھی ہو جاتی ہے چنانچہ ذاکرین کو ذکر کے بعد بھوک نہیں لگتی بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ذکر سے پہلے بھوک لگی ہوئی تھی جسکی وجہ سے ذکر کرنا دشوار معلوم ہوتا تھا مگر ذکر شروع کیا گیا تو بھوک جاتی رہی علامہ ابن القیم جو صوفی مشہور نہیں ہیں بلکہ ظاہری عالم سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اسکو تسلیم کرکے کہتے ہیں کہ نور ذکر بمنزلہ غذا کے ہو جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک ذکر سے بھوک جاتے رہنے کا یہ سبب ہے کہ نور ذکر غذا کا کام دینے لگا۔ ایک شاعر اسی مضمون کو بیان کرتا ہے ؎

وذکرک للمشتاق خیر شراب — وکل شراب دونہ کسراب

صوفیہ کے واقعات تقلیل غذا کے بارہ میں ایسے عجیب ہیں جنکو دیکھکر ماننا پڑتا ہے کہ ذکر بمنزلہ غذا کے ہو جاتا ہے چنانچہ کوئی بزرگ چلہ میں غذا کم کرتے جاتے تھے یہانتک کہ بعض دفعہ چالیس دن میں صرف ایک بادام کھاتے تھے۔ اگر آپ اطبا سے دریافت کریں تو وہ ہرگز اسکو تسلیم نکریں گے کہ چالیس دن میں ایک بادام کافی ہو سکتا ہے بس یہی کہنا پڑیگا کہ ذکر اللہ نے غذا کا کام دیا۔ اور اسمیں تعجب کی کیا بات ہے اگر عاشق کو بھوک لگی ہو اور وہ کھانا کھانے بیٹھا ہو اُسوقت اُس کا محبوب آجائے تو عاشق کی

بھوک جاتی رہتی ہے اس کی وہی حقیقت ہے کہ محبوب کو دیکھکر ایسی فرحت ہوئی جس نے غذا کا کام دیا بلکہ سچ پوچھو تو اصلی غذا یہی ہے یعنی فرحت اور جنکو تم غذا کہتے ہو وہ بھی اُسی وقت غذا بنتی ہیں جب فرحت موجود ہو چنانچہ اگر کوئی شخص محزون ہو اُسکو جتنے چاہو مال کھلا دو اُسکے بدن کو کچھ لگتا ہی نہیں ۔ اور فرحت و نشاط کی حالت میں معمولی غذا بھی پلاؤ و قورمہ کا کام دیتی ہے پس معلوم ہوا کہ اصلی غذا فرحت اور بیفکری ہے بلکہ اصلی دوا یہی ہے کیونکہ اطبا کہتے ہیں کہ فاعل صحت و مزیل مرض دوا نہیں بلکہ طبیعت ہے اور طبیعت اسوقت فاعل ہوگی جبکہ اسمیں قوت ہو بس دوا کا کام صرف اتنا ہے کہ طبیعت کو قوت دے پھر کسی کی طبیعت کو دوا دارو کرنے سے قوت حاصل ہوتی ہے اور بعض طبائع کو ترک دوا سے قوت حاصل ہوتی ہے تو یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص دوا نہیں کرتا یہ غلط ہے وہ بھی حقیقت میں دوا کرتا ہے کیونکہ دوا کی حقیقت یعنی قوت طبیعت کا سامان وہاں بھی موجود ہے یہ اور بات ہے کہ اُسکی تقویت طبع کا سامان ترک دوا ہے اور دوسروں کیلئے دوا ہے تو یہ محض ظاہری فرق ہے ورنہ حقیقی دوا سے کوئی خالی نہیں غرض یہ دعویٰ محقق ہو گیا کہ اصلی غذا اور اصلی دوا فرحت و نشاط ہے خواہ دوا سے ہو یا کسی اور چیز سے ہو سو ذاکرین کو ذکر اللہ سے بیحد نشاط و فرحت حاصل ہوتا ہے اسلیئے وہ اُنکو غذا اور دوا کا کام دیجاتا ہے ۔ اور کسی کو اپنے محبوب کے دیکھنے سے نشاط ہوتا ہے اُسکو محبوب کا دیکھ لینا دوا سے بڑھکر نافع ہو جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی عاشق بیمار ہو اور مشرف بھلاک ہو اس حالت میں اُس کا محبوب چلا آوے تو عاشق محبوب کو دیکھکر اوٹھ بیٹھتا ہے ۔ مجھے اپنا واقعہ یاد ہے کہ ایکبار میرے والد صاحب مرحوم الہ آباد میں بیمار ہو گئے میں کانپور سے دیکھنے گیا تو مجھے دیکھکر اوٹھ بیٹھے اور کھڑے ہو گئے اور مجھکو لیکر مارکیٹ گئے حالانکہ اس سے پہلے کروٹ لینے میں بھی تکلف ہوتا تھا تو محبوب کا دیکھنا دوا سے بھی زیادہ نافع ہوتا ہے ۔ ایک دفعہ میں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسۂ دیوبند کی عیادت کو گیا کیونکہ وہ سخت بیمار تھے مولانا کو مجھ سے بہت محبت تھی تو مجھ سے ملکر فرمانے لگے کہ تجھے دیکھکر تو میری بیماری جاتی رہی پہلا واقعہ دنیوی بزرگ کا ہے

اور دوسرا واقعہ دینی بزرگ کا ہے معلوم ہوا کہ اصل قوت کی چیز فرحت ہے یہی تمام غذاؤں
کی جڑ ہے اور یہ بعض دفعہ خود بھی غذا کا کام دیتی ہے ورنہ اقل درجہ یہ تو ضروری ہے کہ بدون
اسکے کوئی غذا غذا نہیں بنتی جب یہ مقدمہ سمجھ گئے تو اب بزرگان دین کی تقلیل غذا پر کوئی
وجہ حیرت نہیں کیونکہ ان حضرات کو ذکر اللہ سے ایسا انشاط حاصل ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی
مفرح یا قوتی اور خمیرہ ایسا انشاط نہیں پیدا کر سکتا تو وہ ایک بادام پر چالیس دن تک کفایت
کر سکتے ہیں کیونکہ ظاہر میں تو انھوں نے ایک بادام کھایا مگر حقیقت میں کثرت ذکر کیوجہ سے
وہ تو سیروں بادام کھا گئے بلکہ بادام سے بھی بڑھکر مقوی غذا کھا گئے۔ پس روزہ میں حقیقی یسر
تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمکو اس سے دلچسپی عطا فرمائی ہے اور دلچسپی کی چیز سے فرحت ہوتی
ہے چنانچہ مشاہد ہے کہ روزہ سے طبیعت کو ایسی تازگی ہوتی ہے کہ باوجود ضعف بدن کے
کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی پھر عادۃ اللہ یہ ہے کہ روزہ میں بلکہ تمام طاعات میں روحانی
یسر کیساتھ جسمانی یسر کے اسباب بھی عطا فرما دیتے ہیں چنانچہ اس سال باوجودیکہ رمضان
سخت گرمیوں میں ہے مگر رمضان کے آتے ہی بادل اور بارش کا سامان ہو گیا جس سے جسمانی
راحت بھی حاصل ہوئی۔ شعبان میں روزہ رکھا تھا تو سخت تکلیف ہوئی تھی مگر بحمد اللہ طبیعت
کو اس سے بھی فرحت ہوتی اسی لئے باوجود جسمانی کلفت کے روزہ گراں نہیں ہوا اور خوبی
کیساتھ پورا ہو گیا۔ رمضان سے پہلے نصف شعبان کا روزہ مشروع ہونے کی یہ بھی ایک حکمت ہے
کہ روزہ سے گونہ مناسبت ہو جائے اسکے بعد جب رمضان آئیگا تو روزہ کا اثر زیادہ نہ ہوگا بلکہ دل
یوں کہے گا کہ جیسا شعبان کا روزہ تھا ویسا ہی رمضان کا ہوگا اس سے زیادہ کیا ہوگا چنانچہ
بحمد اللہ اب رمضان کے روزہ کا اثر زیادہ نہیں ہوا گو کسیقدر ضرور ہوا۔ اور اگر بالکل ہی اثر نہ ہوتا
تو آپ خود اس تجویز کو بدلتے اور اسکی تمنا کرتے کہ کچھ تو اثر ہوتا چنانچہ جاڑوں کے روزہ میں
لوگ کہا کرتے تھے کہ روزہ کا مزہ نہ آیا روزہ کا مزہ تو گرمی کے روزہ میں ہے کہ افطار سے پہلے
چھڑکاؤ ہو رہا ہے ٹھنڈے پانی کا اہتمام ہو رہا ہے کوئی شربت بنا رہا ہے کوئی برف لا رہا ہے
جاڑوں میں تو یہ خیالات تھے اب گرمی کے روزہ سے کیوں گھبراتے ہو یہ تو تمھارا ہی تجویز کردہ ہے
ولقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوہ فقد رأیتموہ وانتم تنظرون ۰ بعض

حضرات صحابہ سے جو غزوۂ بدر میں شریک نہو سکے تھے کیونکہ غزوۂ بدر دفعۃً ہوگیا احسن کا کسی کو گمان بھی نتھا جہاد کا شوق ظاہر کیا تھا کہ اگر غزوۂ بدر کے بعد کبھی جہاد کا موقعہ ہوا تو سب دیکھ لیں گے کہ ہم اُسکے راستہ میں کس طرح جانبازی کرتے ہیں اسکے ایک سال بعد ہی غزوۂ احد ہو گیا جسمیں اول تو مسلمان غالب ہوگئے تھے پھر ان کے قدم اکھڑ گئے اسپر آیت نازل ہوئی کہ تم تو موت کی تمنا کرتے تھے لو اب تو اُسکو اچھی طرح دیکھ لیا یہی حالت روزہ کے متعلق ہماری ہے کہ جاڑوں میں تو گرمیوں کے روزہ کی تمنا کرتے تھے جب گرمیوں میں رمضان آیا تو بہت سے گھبرا گئے۔ اب اگر رمضان میں سختی بھی رہتی تو کیا حرج تھا کیونکہ وہ تو منہ مانگی مراد تھی مگر اللہ تعالی نے آپ پر سختی نہیں کی بلکہ لطف فرمایا کہ گرمی کی تکلیف بھی رفع فرمادی بارش کا سامان کر دیا چنانچہ سارا رمضان بادل و بارش ہی میں گذر گیا۔ اگرچہ اسوقت رمضان کے دن لمبے تو ہیں خصوصاً مجھے اس سال زیادہ لمبے اسلئے معلوم ہوتے ہیں کہ اس سال میں نے رمضان میں سوائے جوابات ڈاک کے اور تلاوت قرآن کے اور سب کام چھوڑ دیئے تعلیم و تلقین بھی بند کر دی تالیف و تصنیف بھی ملتوی کر دی اور ایسی حالت میں قاعدہ ہے کہ دن زیادہ لمبا معلوم ہوتا ہے اگر آدمی ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگا رہے تو دن لمبا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر الحمد للہ کہ دن لمبے ہوتے ہوئے بھی تکلیف کچھ نہیں معلوم ہوئی کیونکہ گرمی کم ہے اور یہ اللہ تعالی کی بڑی رحمت ہے کہ اپنے بندوں کی مدد کام میں بھی کرتے ہیں اسباب میں بھی کرتے ہیں حالانکہ اہل دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ صرف اسباب میں مدد کرتے ہیں کام میں مدد نہیں کرتے آپ اگر کسی معمار کو اپنے کام پر لگائیں تو کام میں آپ اُسکی مدد نہیں کیا کرتے مثلاً جسوقت وہ کام کرنے بیٹھے اُسوقت آپ اُس کا کام بٹوا دیں صرف اسباب میں امداد کرتے ہیں مگر حق تعالی کا لطف یہ ہے کہ اسباب میں بھی مدد کرتے ہیں اور کام میں بھی حقیقت میں جو کچھ تھوڑا بہت کام ہمسے ہو جاتا ہے اللہ تعالی کی مدد سے ہو جاتا ہے بس ہمارے کام کی ایسی مثال ہے جیسے آپ قلم ہاتھ میں لیکر بچہ کا ہاتھ بھی اُسپر رکھ لیں اور ایک خوشخط تحریر لکھدیں اور بچہ کی تعریف کریں کہ شاباش تمنے خوب لکھا اور وہ بچہ نادان بھی یہ سمجھکر کہ میں نے لکھا ہے خوش ہوتا ہے حالانکہ اُس کا تو نام ہی نام ہے

کام تو اور کسی کا تھا یہی حالت ہمارے کام کی ہے ؎

کا زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

لوگوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ روزہ ہمارے منہ میں ہے مگر یہ خبر نہیں کہ منہ کس کے ہاتھ میں ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے یک دہاں پنہان ست در لبہائے وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہائے ہوئے در فگندہ در سما

یہی حال ہمارا ہے کہ ہمکو اس کا خیال نہیں کہ ہمارا منہ کس کے ہاتھ میں ہے کیونکہ اصل میں منہ سے کھانا قلب کے قبضہ میں ہے۔ اگر دل میں تقاضا نہوتا تو کھانا محال ہو جاتا اور دل خدا کے قبضہ میں ہے تو یہ خدا تعالی کی اعانت ہے کہ انھوں نے روزہ کے اندر آپ کے دل سے کھانے پینے کا تقاضا نکالدیا اگر وہ یہ تقاضا نہ نکالتے تو آپ کی کیا محال تھی کہ روزہ رکھ لیتے بس ہماری مثال ایسی ہے جیسے قلم ناز کرنے لگے کہ میں نے ایسا لکھا اور میں ایسا خوش تحریر ہوں اور نادان یہ نہیں دیکھتا کہ وہ خود کس کے قبضہ میں ہے ؎

اے قلم بنگر گر اجلالیستی درمیان اصبعین کیستی

یہ خدا کی رحمت ہے کہ دل کے واسطے لغت بھی ملہم ہے دل کو قلب اسی واسطے کہتے ہیں کہ وہ اولٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے ایک تنکا ہمارے ہاتھ میں ہوا و آندھی میں ثابت قدم رہے اور اس ثبات پر نازاں ہو تو اسکی حماقت ہے کیونکہ چھوڑ دینے کے بعد وہ کہیں سے کہیں ہوگا بس اب جو لوگ اپنی ثابت قدمی پر نازاں ہیں وہ گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں کہ یہ ثابت قدمی اور استقلال اور پابندی اوقات اور ضبط معمولات کسکی بدولت ہے یہ محض خدا کا لطف ہے کہ اُنھوں نے آپ کے دل میں تقاضا پیدا کر دیا ہے۔ ورنہ کچھ بھی نہو سکتا اسی لئے حق تعالی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ ہمنے آپ کے دل کو قوت دی ہم نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور یہ بھی ایک دلیل ہے قرآن کی حقانیت کی ورنہ بشر اپنے کلام میں ضرور لچتا ہے (یعنی) وہ کسی نہ کسی سے ضرور دبتا اور متاثر ہوتا ہی اور قرآن کریم کو دیکھکر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس کا متکلم کسی سے نہیں دبتا اسپر کسی کا ا

نہیں چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بید ہڑک ارشاد ہے ولولا ان ثبتنٰک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا ٥ اور یہ بات اگرچہ بہت ہی ڈر کی بات ہے کہ قلوب خدا کے قبضہ میں ہیں معلوم نہیں کدہر پھیر دیں مگر غور کرنے سے اسمیں ایک لطیف بات نکلتی ہے وہ یہ کہ حقیقت میں یہی بڑی رحمت ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہمکو اپنے ہی قبضہ میں رکھا ہمارے قبضہ میں نہیں دیا۔ کیا بچہ کیلئے ماں کی گود میں رہنا رحمت نہیں بیشک رحمت ہے ورنہ معلوم نہیں کہاں پہونچکر ہلاک ہو اسی طرح ہمارے اندر علم کامل نہیں ہمکو اپنی جان کے ساتھ رحمت کامل نہیں اگر ہمکو ہمارے اختیار پر چھوڑ دیا جاتا تو نہ معلوم ہم اپنے کو کہاں لیجا کر برباد کرتے اگر تین چار برس کا بچہ یہ تمنا کرے کہ میں آزاد ہوتا تو خوب کھاتا پیتا یہ اسکی جہالت ہے اگر باپ اسکو آزاد کردے تو حقیقت معلوم ہو جائے۔ صاحبو! دوسرے کے قبضہ میں ہونا جب مضر ہے جبکہ قبضہ والا رحیم و شفیق نہو اگر قابض رحیم و شفیق ہو تو پھر دوسرے ہی کے قبضہ میں رہنا مفید ہوتا ہے۔ صاحبو! اگر قلوب خدا کے قبضہ میں نہوتے اور وہ روزہ کی حالت میں دل سے کھانے پینے کا تقاضا نہ نکالتے تو روزہ رکھنا دشوار ہو جاتا یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے کھانے پینے کی خواہش ہمارے دل سے نکالدی۔ بس متقی تم نازکرو کہ میں متقی ہوں صاحب تم متقی بنائے گئے ہو ورنہ کیا مجال تھی۔ غرض یہ محض خدا کا فضل ہے کہ اس نے قلوب اپنے قبضہ میں رکھے جس سے ہمارے تقویٰ کا نام روشن ہے۔ اب اس حقیقت پر نظر کرکے معلوم ہوگا کہ سارا کام اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں۔ صاحبو! ایسی مثال آپکو مخلوق میں نہیں مل سکتی کہ کوئی سارے کام میں اول سے آخر تک آپ کی امداد کرے پھر اسپر انعام بھی دے یوں تو ہر کام میں ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مدد سے انجام پاتا ہے مگر روزہ میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اپنی امداد و اعانت کو ظاہر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر دوسرے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ یرید بکم عدم العسر کیونکہ یرید بکم الیسر کے بعد اس کا آنا اسی بات کو چاہتا ہے کہ یہ بمنزلہ تاکید کے ہے اور تاکید یسیر ہی ہے کہ عسر رفع ہو جائے کیونکہ ہر وجودی شئے کا تحقق ثبوت شرائط پر جسطرح موقوف ہے اسی طرح رفع موانع پر بھی موقوف ہے اسوجہ سے یرید اللہ بکم الیسر میں امر وجودی کو بیان کیا گیا

اور لایرید بکم العسر میں امر عدمی یعنی ارتفاع اضداد و موانع کو بیان کیا گیا۔ پس لایرید بکم العـ
سے یرید بکم بعدم العسر مفہوم ہونا ایسا ہے جیسا ان اللہ لا یحب الکافرین سے یبغض
الکافرین کا مراد ہونا۔ ترجمہ ان دو جملوں کا یہ ہوا کہ اللہ تعالی روزہ میں تمکو آسانی دینا ا
تنگی کا رفع کرنا چاہتے ہیں اسکے بعد ارشاد ہے ولتکملوا العدۃ اس جملہ میں ایک عجیب
بات غور کرنے کی ہے وہ یہ کہ اسمیں واؤ عطف کا ہے اور لام غایت کا ہے۔ واؤ عطف
معطوف علیہ کو چاہتا ہے اور لام غایت عامل کو چاہتا ہے۔ پس یہاں دو تقدیریں
ہیں ایک لتکملوا العدۃ کا عامل دوسرا اوس عامل کا معطوف علیہ پس عامل یہی یسر
جو یرید اللہ بکم الیسر سے مفہوم ہوتا ہے اور معطوف علیہ یہ ہے کہ شرع بکم الاحکام المذکورۃ
اوپر کی آیتوں سے مفہوم ہے مشہور توجیہ یہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے تمھا
لئے روزہ کو مشروع کیا اور اسکے احکام میں سہولت کی رعایت کی تاکہ تم ایک مہینہ کی شما
پوری کر لو کیونکہ اس شمار کے پورا کرنے میں تمھارے واسطے منافع ہیں۔ اس سے یہ لازم آ
کہ اکمال عدت مقصود ہے کیونکہ اس پر لام غایت داخل ہوا ہے اور ہر کام میں غایت ز
مطمح نظر ہوتی ہے کیونکہ وہ مقصود ہے مگر اس تقدیر مشہور میں صرف اکمال عدت کی مقصو
ثابت ہوئی یسر کی مقصودیت ثابت نہوئی حالانکہ ظاہراً اثبات یسر زیادہ مہتم بالشان معلو
ہوتا ہے اسلئے دوسری توجیہ یہ ہے کہ یرید اللہ بکم الیسر کو قوت میں اسی جملہ کے کیا جاوے
کہ یرید بکم الیسر اور اسکا عامل شرع الخ کو کہا جاوے پس کلام کا حاصل یہ ہوگا کہ شرع اللہ لـ
ماذکر لیرید بکم الیسر ولیرفع عنکم العسر ولتکملوا العدۃ کہ اللہ تعالی نے روزہ کی احـ
مذکورہ کو اسلئے مشروع کیا کہ وہ تمکو آسانی دینا اور تنگی رفع کرنا چاہتے ہیں اور اسلئے مشر
کیا تاکہ تم شمار کو پورا کر لو۔ اس صورت میں دو مقصود ہوئے ایک یسر کہ اول مذکور ہو
کے سبب اصلی مقصود ہوا اور دوسرا اکمال عدت کہ تاخر فی الذکر دوسرے درجہ میں مقصو
ہوا کیونکہ عادۃ یہی ہے کہ اگر کوئی عارض نہ ہو تو اہم کو ذکر میں مقدم رکھتے ہیں پس آسا
اسی توجیہ پر غایت درجہ کی آیت کی مدلول ہوگی کیونکہ مدخول لام ہونے کا سبب
خود بھی مقصود ہوگی اگرچہ ثواب و قرب و رضا مقصود المقصود ہے مگر آسانی بھی

نفسہ مقصود ہوگی اس تقدیر پر صرف عامل مقدر ہوگا باقی معطوف علیہ ظاہر ہوگا اسلئے
یہی اولیٰ ہے اور ہر حال میں یسر ثابت ہے اب اس اثبات یسر پر جو نتائج مرتب
ہوتے ہیں انکو بیان کرتا ہوں اول یہ کہ بے روزوں کو شرم کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تو
صاف وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزہ میں تمکو آسانی دینا چاہتے ہیں تنگی کو رفع کرنا چاہتے
ہیں۔ اور یہ لوگ روزہ میں دشواری ظاہر کرکے ناحقیقت شناس مخالفین کو فرمان
خداوندی پر ظاہراً اعتراض کا موقعہ دیتے ہیں ارے ظالمو! تمنے روزہ رکھکر تو دیکھا ہوتا اسکے
بعد ہی اسکو دشوار کہا ہوتا سب سے اول تو روزہ میں روحانی یسر آپکو عطا ہوتا کہ اس سے دلچسپی
ہو جاتی پھر جسمانی یسر بھی حاصل ہوتا۔ غرض اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزہ کو آسان
کردیں گے اور مراد کا ارادہ الٰہیہ تخلف ہو نہیں سکتا تو یہ مراد یقیناً متحقق ہوگی چنانچہ مشاہد
ہے۔ کانپور میں ایک شخص نے چالیس سال تک روزہ نہیں رکھا تھا میں نے ان سے کہا کہ
یہ تو بہت آسان چیز ہے تم رکھکر تو دیکھو پھر چاہے رکھنے کے بعد درمیان میں دشواری
معلوم ہوگی توڑ دینا انھوں نے رکھا اور روزہ پورا ہو گیا تو بعد میں اقرار کیا کہ واقعی بہت
آسان چیز ہے۔ پھر رکھنے لگے یہ روزہ کی خاصیت ہے کہ اسمیں ترک طعام و شراب آسان
ہو جاتا ہے اگر کوئی بدون نیت صوم کے دن بھر بھوکا پیاسا رہنا چاہے تو بہت دشوار ہے
مگر نیت کے بعد آسان ہو جاتا ہے ان دونوں صورتوں میں وجہ فرق صرف یہی ہے کہ
پہلی صورت میں صوم نہیں اور دوسری صورت میں صوم ہے۔ شاید کسی کو یہاں یہ شبہ
ہو کہ روزہ میں تو یاس ہو گیا کہ اب شام تک کھا پی نہیں سکتے اسلئے آسان ہو گیا اور بدون
نیت صوم کے امساک عن الطعام اختیاری ہوتا ہے اسلئے صبر نہیں آتا اس کا جواب
یہ ہے کہ یہ بات تو صحیح ہے مگر ایک دوسرا طبعی قاعدہ اسکے معارض ہے وہ یہ کہ امر کے
بعد کام دشوار ہو جاتا ہے اور آزادی میں تکلیف نہیں ہوتی دوسرے وہاں بھی یہ فرض
کرلیا جائے کہ کھانے پینے سے کوئی مانع قوی موجود ہو مثلاً طبیب نے کھانے پینے سے منع
کردیا ہو تو باوجود صبر آجانے کے پھر بھی روزہ کی برابر فاقہ میں سہولت نہیں ہوتی اسپر شاید
یوں کہا جائے کہ مخلوق کا منع کرنا خالق کے منع کرنے کے برابر تھوڑا ہی ہے اسلئے وہاں

صبر نہیں آتا اور یہاں آجاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فرق خدا ہی کے امر کیوجہ سے تو ہوا پس ہمارا مدعا ...... ثابت ہوگیا کہ روزہ کو اللہ تعالیٰ آسان کر دیتے ہیں گو انکی یہی صورت ہوئی کہ روزہ دار کے دل میں روزہ کی عظمت پیدا کر کے اسکو صبر دیدیا۔ بہر حال روزہ بہت آسان ہے اب جو لوگ روزہ نہیں رکھتے انکی کم ہمتی پر افسوس ہے کہ ایسا آسان کام بھی ان سے نہیں ہوتا جسکے آسان کر دینے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے اور مشاہدہ بھی کرا دیا۔ اب آیت کا مطلب سنئے حاصل آیت کا یہ ہوا شرع اللہ لکم الصوم للیسر ولاکمال العدۃ ولتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم جسمیں متعدد غایات ہیں اور ایک غایت پر دوسری غایت مرتب چلی آتی ہے۔ اسمیں خدا تعالیٰ کی ایک نعمت تو یہ ہے کہ روزہ کو مشروع کیا ورنہ ہم کیسے رکھتے دوسرے یہ کہ اسکو آسان کر دیا تیسرے یہ کہ احکام میں ایسی رعایت فرمائی جس سے شمار کا پورا کرنا آسان ہوگیا۔ اسکے بعد خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں آتی ہے تو اسپر خدا کی تکبیر کہو گے یہ چوتھی نعمت ہے اب اسکا دشوار ہونا ایسا ہے جیسا ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میاں لا الٰہ الا اللہ سے زیادہ کیا چیز آسان ہوگی مگر کفار کیلئے یہ سب سے زیادہ دشوار ہے تو اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں کو آسان ہے وہ خدا تعالیٰ کا فضل ہی ہے ورنہ ہم لوگ اپنی قوت سے کوئی کام نہیں کر سکتے جب تک اللہ تعالیٰ اسکو آسان نہ کر دیں۔ عوارف میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں انکی زبان سے کوئی کلمہ ناگوار خلاف شرع نکل گیا تھا اسکے بعد وہ ولی ہوئے صاحب معرفت شیخ ہوئے مگر اس کلمہ کا کہنا یاد بھی نہ رہا اس سے خاص توبہ نہیں کی ایک دن لا الٰہ الا اللہ کہنے کا ارادہ کیا تو زبان سے کلمہ نہ نکلا اور سب باتیں کر سکتے تھے مگر لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ سکتے تھے یہ حالت دیکھکر لرز گئے جناب باری میں دعا کی کہ یہ میرے کس گناہ کی سزا ہے مجھے بتلایا جائے الہام ہوا کہ فلاں زمانہ میں تمنے فلاں کلمہ کہا تھا اور ابتک اس سے استغفار نہیں کیا اسلئے آج اتنے برس کے بعد ہمنے اسکی سزا دی یہ فوراً سجدہ میں گر پڑے اور توبہ کی تو فوراً زبان کھل گئی اسی واقعہ سے سمجھنا چاہیئے کہ کبھی طاعت کی دشواری کا سبب

دوسرے معاصی بھی ہو جاتے ہیں اسکا علاج توبہ و استغفار ہے کبھی دشواری کا سبب وحشت بھی ہوتی ہے کہ ذکر اللہ سے وحشت ہو۔ وحشت کی وجہ سے اللہ اللہ نہ کہہ سکے آپ بہت لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ بہت سا وقت بیکار ضائع کرتے ہیں مگر ذکر اللہ کیلئے انکی زبان نہیں اٹھتی اس سبب کا سبب بھی وہی معصیت ہے کہ اسکی وجہ سے اُن کے دلکو ذکر اللہ سے وحشت ہے اسی کو ایک شاعر کہتا ہے ؎

احب مناجاۃ الحبیب باوجہ ولکن لسان المذنبین کلیل

اسی واسطے بے ضرورت گناہوں کو یاد کرنا اپنے ہاتوں وحشت کا سامان کرنا ہے۔ اسی کے متعلق شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ گناہ معاف ہو جانے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ گناہ دل سے مٹ جائے اور جب تاک وہ مٹے گا نہیں قلب پر وحشت سوار رہیگی جو اس گناہ کی سزا ہے اسکی شرح میں مشائخ طریق کا ارشاد ہے کہ گناہ کے بعد جی بھر کے توبہ کرکے پھر اُسکو جان جان کر یاد نہ کرے کہ اس سے بندہ اور خدا کے درمیان ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے جو محبت اور ترقی سے مانع ہے۔ ایسی ہی دو دوستوں میں اگر کچھ رنجش ہو جائے پھر صفائی ہو جائے تو صفائی کے بعد اُسکو بار بار یاد نکرے۔ غرض توبہ کیلئے تو گناہ کو یاد کرے مگر توبہ کے بعد پھر اُسکو یاد نکرے بلکہ دل سے نکالدے ورنہ اسکی ایسی مثال ہوگی جیسے ایک شخص کو تحصیلداری ملجائے اور وہ روز روز اپنے افسر سے یوں کہے آپ مجھے برخاست تو نہیں کرینگے۔ ظاہر ہے کہ اس حرکت سے افسر کا دل ضرور افسردہ ہوگا اور پہلے خود اسکا دل افسردہ ہوگا جبھی تو اسکی زبان سے بار بار یہ کلمہ نکلتا ہے پس حق تعالیٰ تو تاثر سے بری ہیں مگر تم تو متاثر ہوگے جب تم بار بار گناہ کو یاد کر کے دلکو افسردہ کرلوگے اور محبت میں ترقی نکرسکوگے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہاں سے بھی عطا میں کمی ہوگی کیونکہ جزا و ثمرات کا ترتب عمل پر ہوتا ہے خواہ عمل جوارح ہو یا عمل قلب ہو خوب سمجھ لو گناہوں کے یاد کرنے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا حاجی عبد الرحیم صاحب سہارنپوری ایک قصہ فرماتے تھے کہ حج کے موسم میں ایک شخص جمرۂ عقبہ پر بجائے کنکریوں کے جوتے مار رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا کہ مردود

شیطان تو نے مجھ سے فلاں دن یہ گناہ کرایا فلاں دن وہ گناہ کرایا یہ کہتا جاتا اور جوتے مارتا جاتا تھا۔ یہ حرکت بہت بری تھی ایک تو گناہوں کا یاد کرنا پھر انکو ظاہر کرنا بعض لوگ توبہ کر کے ڈرتے رہتے ہیں کہ مبادا توبہ ٹوٹ جائے۔ یہ فکر بھی اچھا نہیں مولانا اسکو بھی حجاب فرماتے ہیں ؎

ماضی و مستقبلت پردہ خداست

یہ خوف ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ صفائی کے وقت کدورتوں کو یاد نکرنا چاہیئے اس سے کبھی ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ ذکر اللہ بھی نہیں کر سکتے لیکن اگر از خود یہ چیزیں یاد آجائیں تو پھر تجدید استغفار و دعا ضروری ہے۔ یہ تو ذکر نہ کر سکنے کا وہ سبب تھا جو اکثری ہے۔ اور کبھی ذکر نکر سکنے کا سبب کسی حالت محمودہ کا غلبہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جس زمانہ میں وہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں ذکر و شغل کیلئے مقیم تھے اُسوقت اور سب حضرات اپنا اپنا حال حضرت حاجی صاحب سے عرض کرتے تھے مگر مولانا کچھ عرض نہ کرتے تھے تو ایک دن حاجی صاحب نے خود فرمایا کہ مولانا سب لوگ اپنی اپنی حالت بیان کرتے ہیں آپ کچھ نہیں کہتے۔ اسپر مولانا نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت میں کیا حال عرض کروں مجھ سے تو وہ کام ہی پورا نہیں ہوتا جو حضرت نے بتلا رکھا ہے بس ذکر کرنے بیٹھتا ہوں ایسا بوجھ طاری ہوتا ہے کہ زبان و قلب دونوں بند ہو جاتے ہیں حضرت کے فیض میں تو کمی نہیں مگر میری ہی کم نصیبی ہے ؎

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل ۔۔۔ کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

حاجی صاحب نے اس حال کو سنتے ہی فرمایا کہ مولانا مبارک ہو یہ علوم نبوت کا ثقل ہے جو آپکو عطا ہونے والے ہیں اور یہ اُسی ثقل کا نمونہ ہے جو نزول وحی کے وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ہوتا تھا اسوقت قلب و زبان کا ذکر سے بند ہو جانا غایت قرب کی وجہ سے ہے جسکو شاعر کہتا ہے ؎

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے ۔۔۔ تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

اور جب دل کی یہ حالت ہوتی ہے تو زبان ہی نہیں اٹھتی۔ اس واقعہ سے حضرت حاجی صاحب

کا شیخ و مجتہد اور مجدد فن ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے یہ تشخیص ایسے وقت فرمائی جبکہ مولانا محمد قاسم صاحب کے علوم کا ظہور بھی نہوا تھا بعد میں حاجی صاحب کے ارشاد کی تصدیق ظاہر ہوئی۔ اور اگر حاجی صاحب یہ تشخیص نفرماتے تو مولانا تو اس حالت کو بعد ہی سے ناشی سمجھتے رہتے حاجی صاحب ہی کا کام تھا کہ ایسے ایسے جلیل القدر علماء کو سنبھالتے تھے۔

دوسرا قصہ حضرت شیر خاں صاحب کا ہے جو میانجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں تھے جب اُن کا انتقال ہونے لگا نزع کی حالت شروع ہوئی تو لوگوں نے اُنکو کلمہ طیبہ تلقین کیا وہ اس سے منہ پھیر لیتے تھے یہ حالت دیکھکر لوگ گھبرا گئے اور میانجی صاحب کو بلایا میانجی صاحب نے پوچھا کہ شیر خاں کیا حالت ہے فرمایا الحمد للہ اچھا ہوں۔ اسکے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کو منع کر دیجئے کہ مجھے مسمیٰ سے اسم کی طرف متوجہ نکریں۔ حضرت میانجی صاحب نے لوگوں سے کہا کہ ان کو پریشان نکرو یہ مشاہدۂ مسمیٰ میں مستغرق ہیں تم ان کو مسمیٰ سے اسم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو۔ سچ ہے ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

کامل کی حالت کا ناقص کو علم نہیں ہو سکتا۔ انبہٹہ میں حضرت حاجی صاحب کے ایک مرید تھے اور اُنکے بڑے بھائی خاندان نقشبندیہ کے شیخ تھے وہ ان سے کہا کرتے تھے کہ تم مجھسے بھی کچھ حاصل کر لو ورنہ پچتاؤ گے وہ جواب دیا کرتے کہ میرے شیخ مجھے کافی ہیں مجھے کسی سے رجوع کی حاجت نہیں اتفاق سے ان چھوٹے بھائی کا انتقال ہونے لگا تو انکی بھی یہی حالت ہوئی جو شیر خاں صاحب کی حالت تھی کہ لوگ ان کو کلمہ پڑہانا چاہتے تھے اور یہ نہیں پڑہتے تھے اسکی اطلاع بڑے بھائی کو ہوئی وہ آئے اور ان سے کہنے لگے کہ میں تمسے نہ کہتا تھا کہ مجھسے بھی کچھ حاصل کر لو مگر تمنے نہ مانا دیکھا اب کیا حالت ہے کہ کلمہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسپر انھوں نے فوراً آنکھیں کھولدیں اور بڑے جوش میں یہ آیت پڑھی یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین ۵ حالانکہ یہ شخص ترجمۂ قرآن سے واقف نتھے اسوقت انکی زبان سے اس آیت کا نکلنا صاف اسکی دلیل تھی کہ غیب سے اسکی زبان پر یہ آیت جاری کیگئی ہے یہ جواب سنکر وہ شیخ شرمندہ ہو گئے اور حاجی صاحب کے سلسلہ والوں کو خاص مسرت ہوئی۔

بہرحال کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غایت قرب کی وجہ سے زبان ذکر سے بند ہو جاتی ہے اسلئے نزع کی حالت میں کوئی مسلمان اگر کلمہ نہ پڑھے تو اس سے بدگمان نہ ہونا چاہیئے ممکن ہے اسکی وجہ نہایت قرب ہو۔ اور کبھی گناہ کی وجہ سے بھی طاعات بند ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان انما استزلھم الشیطان ببعض ما کسبوا۔ اور جیسے گناہوں میں یہ اثر ہے کہ طاعات کو بند کر دیتے ہیں ایسے ہی طاعات میں یہ بھی اثر ہے کہ انکی وجہ سے دوسری طاعات ہونے لگتی ہیں بلکہ اس کا اثر اولاد میں بھی پہونچتا ہے باپ کی طاعات سے اولاد کو بھی طاعات کی توفیق ہوتی ہے مگر گناہ کا اثر اولاد میں نہیں پہونچتا ہاں دنیوی تکلیف کچھ پہونچ جاتی ہے۔ طاعات کا یہ بھی اثر ہے کہ انکی برکت سے گناہ کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ گناہ مقدر (تقدیر معلق) بھی ٹل جاتا ہے چنانچہ حضرت غوث اعظم رحمہ اللہ کا ایک مرید تھا بہت نمازی تہجد گذار پابند ذکر و شغل اسکو ایک رات میں ستر بار احتلام ہوا وہ بڑا پریشان ہوا کہ یہ کیا مصیبت ہے ساری رات غسل ہی میں گذر گئی نہ تہجد رہا نہ ذکر و شغل صبح کو شیخ سے حالت عرض کی فرمایا کہ تم اس حالت سے مغموم مت ہو مجھے معلوم ہوا تھا کہ تیری تقدیر میں ستر دفعہ زنا کرنا لکھا ہوا ہے۔ میں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ اسکو اس بلا سے نجات دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعا سے بیداری کے زنا کو خواب کے زنا کی طرف منتقل فرما دیا ہے جسمیں گناہ ہی نہیں ہوا۔ اب تم بیفکر رہو بڑی بلا ٹل گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہم ذکر وغیرہ کر رہے ہیں اور آسانی سے کر لیتے ہیں یہ آسانی خدا تعالیٰ کی عطا ہے ورنہ بہت سی مخلوق ایسی بھی ہے جسکو ذکر کی توفیق نہیں اور اُن کے لئے یہ کام سب سے زیادہ دشوار ہے۔ اسپر میں نے استطراداً یہ بھی بتلا دیا تھا کہ بعض دفعہ ذکر سے زبان بند ہونیکا سبب غایت قرب بھی ہوتا ہے۔ بہرحال آپ کو جو کلمہ شریف پڑھنا آسان ہے۔ یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ کبھی یہ بھی بند ہو جاتا ہے اس لئے حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی ذاکر یہ عرض کرتا کہ ذکر سے نفع نہیں معلوم ہوتا تو حضرت یہ جواب دیا کرتے کہ یہ نفع کیا تھوڑا ہے کہ خدا کا نام زبان سے نکل رہا ہے اور یہ شعر پڑھتے ؎

یا بم او را یا نہ یا بم جستجوئی می کنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

ذاکرین اس جواب کی قدر کریں کیونکہ شیطان انکو اس قسم کے دہوکے بہت دیا کرتا ہے
چنانچہ مثنوی میں ایک ذاکر کا قصہ لکھا ہے کہ ایک رات اُسکو شیطان نے بہکایا کہ تمکو
ذکر کرتے تہجد پڑہتے برس گذر گئے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ پیام ہے نہ سلام ہے جب
وہ پوچھتے ہی نہیں تو کیوں سر مارا۔ یہ وسوسہ آنا تھا کہ اس نے اس رات کا تہجد و ذکر
موقوف کر دیا مگر چونکہ خدا کا محبوب بن چکا تھا گو خود اسے اپنی حالت کی خبر نہ تھی اسلئے اللہ
تعالیٰ نے دستگیری فرمائی کہ خواب میں ایک لطیفہ غیبی نے آکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے
سوال کیا کہ آج تمنے ہمکو کیوں بھلا دیا اس نے وہی جواب دیا جو شیطان نے پڑہایا تھا
کہ آپ کو یاد کرتے کرتے برس گذر گئے جب آپنے خبر ہی نہ لی تو میں نے سوچا کہ مجھے ہی سر مارنے
کی کیا ضرورت ہے لطیفہ غیبی نے جواب دیا ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست وین نیاز و سوز و دردت پیک ماست

کہ میاں ایک بار اللہ کہکر جو تمکو دوبارہ اللہ کہنے کی توفیق ہو گئی تو یہی ہمارا جواب ہے
اگر پہلا ذکر قبول نہ ہوتا تو ہم زبان کو ذکر سے بند کر دیتے۔ حضرت حاجی صاحب نے اسکو
خوب روشن کر کے بیان فرمایا کہ اگر ایک حاضری میں بادشاہ ناراض ہو جائے تو کیا دوسری
بار وہ دربار میں گھسنے دیگا ہرگز نہیں پس جب تم ایک مرتبہ نماز کیلئے مسجد میں آگئے اسکے بعد
پھر توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلی نماز قبول ہو گئی اور تم مقبول ہو مردود ہوتے تو دوبارہ مسجد
میں گھسنے نہ دیتے کیونکہ ایسی بھی خدا کی مخلوق بہت ہے جو مسجد سے روک دی گئی ہے چنانچہ
ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا مسجد کا ملا چھلانے لگا کہ لوگ جانوروں کو مسجد
میں چھوڑ دیتے ہیں تو وہ قصائی کہنے لگا ارے ملا اتنا خفا کیوں ہوتا ہے یہ تو بیوقوف
جانور تھا جو مسجد میں چلا آیا کبھی تو نے ہمیں بھی مسجد میں آتا ہوا دیکھا ہے۔ ایسا اور واقعہ
کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک آقا بے نماز تھا اور غلام نمازی تھا دونوں بازار میں جا رہے
تھے کہ نماز کا وقت آگیا غلام نے آقا سے اجازت مانگی کہ میں ذرا نماز پڑھ آؤں آپ تھوڑی
دیر ٹھیریں آقا صاحب مسجد کے باہر بیٹھ گئے وہ اندر جا کر نماز میں مشغول ہوا پھر وظیفہ پڑھنے لگا

جب سب نمازی چلے گئے اور بہت دیر ہو گئی تو آقا نے باہر ہی سے آواز دی کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں غلام نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتا آقا نے کہا کون نہیں آنے دیتا کہا جو تمکو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھکو باہر نہیں آنے دیتا۔ حضرت جو کچھ آپ سے نماز روزہ ہو رہا ہے یہ سب انہیں کا کرایا ہوا ہے اگر وہ توفیق نہ دیں تو سب کام رہ جائے۔ قرآن میں ارشاد ہے ولو ارادوا الخروج لاعدوا لہ عدۃ ولکن کرہ اللہ انبعاثھم فثبطھم وقیل اقعدوا مع القاعدین کہ اللہ تعالیٰ نے غزوہ تبوک میں منافقین کا جانا نہ چاہا تو وہ اس کا سامان بھی نہ کر سکے بلکہ ارادہ بھی نہ کر سکے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وہ ارادہ کر لیتے اور سامان بھی کرتے۔ پس تم اپنی سعی پر ناز نکرو بلکہ تفویض سے کام لو مگر تقدیر کے مسئلہ میں زیادہ غور و خوض بھی نہ کرو اور میں نے جتنا بھی اسکے متعلق بیان کیا ہے محض اس ضرورت سے بیان کیا ہے کہ اپنے علم و عمل پر ناز نہ ہو نہ کہ بندہ کے کسب و اختیار کے نفی کرنے کے لئے حضرات صحابہ جب ایسے واقعات سے گھبرائے تو حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم کیا کریں حضورؐ نے فرمایا قولوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل بس خدا پر نظر رکھو اور تفویض سے کام لو ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست   آنجا جز ایں کہ جاں بسپارند چارہ نیست

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور اللہ تعالیٰ تیر چلانے والے ہوں تو ان سے کیونکر بچا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر چلانے والے کے پاس کھڑا ہو جائے بچا رہے گا کیونکہ تیر دور والے پر چلتا ہے نہ کہ پاس والے پر افلاطون اسی جواب سے دنگ رہ گیا اور کہا یہ جواب نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ پس اسمیں غور و خوض نکرو غور کرنے سے یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو گا ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ مے نہ گیرد فضل شاہ

اگر اس مسئلہ میں شفا چاہتے ہو تو عبدیت اور تفویض اختیار کرو اسی سے انشاء اللہ تسلی ہو جائے گی عقل کو تو بہت آزما لیا اب خدا کے حوالہ کر کے دیکھو مولانا فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

حضرت بہت سے واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ تمام تدبیریں ختم ہو جاتی ہیں اور کام نہیں بنتا بس گرہ اسوقت کھلتی ہے جب بندہ یوں کہتا ہے کہ اے اللہ آپ ہی اس کام کو پورا کریں گے میں عاجز و درماندہ ہوں۔ پس خوب سمجھ لو کہ یہ تیسیر بھی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کو ہمارے لئے آسان کر دیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں یرید اللہ بکم الیسر میں ہمکو اس نعمت پر تنبیہ فرمایا ہے کہ یہ احکام اسواسطے مشروع کئے ہیں کہ انکو تمہارے واسطے آسان کر دیں اور گنتی پورا کرنے کی توفیق دیں پس تم اسکو دشوار نہ سمجھو اور نہ اسکی فکر کرو کہ تیس دن کیونکر پورے ہوں گے اسکے بعد ارشاد ہے ولتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم یعنی اور تاکہ ان نعمتوں پر تم خدا کی بڑائی ظاہر کرو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ھدٰکم فرمایا ہے شرع لکم نہیں فرمایا کیونکہ ھدٰکم سب نعمتوں کو شامل ہے تشریعی نعمتوں کو بھی اور تکوینی نعمتوں کو بھی اور یہاں دونوں قسم کی نعمتیں مذکور ہوئی ہیں کیونکہ تیسیر و اکمال عدۃ تکوینی نعمتیں ہیں تو ان سب نعمتوں پر جنکا میزان الکل ھدٰکم ہے خدا کی تکبیر کہو پھر یہاں لتحمدوا اللہ نہیں بلکہ لتکبروا اللہ فرمایا کیونکہ اس سے حادثہ کی وقعت معلوم ہوتی ہے اور حادثہ عظیمہ پر ہمارے اندر تکبیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ حمد کا اور قرآن شریف میں ہمارے محاورات و جذبات کی بہت رعایت کیگئی ہے۔ میں نے اسی قاعدہ سے ایک لڑکی کے سوال کا جواب دیا تھا ایک مرتبہ جب میں گھر کی لڑکیوں کو تفسیر قرآن پڑھا رہا تھا یہ آیت آئی قاتلھم اللہ انی یؤفکون خدا ان مدعیان اتخاذ ولد کو برباد کرے کہاں بہکے جارہے ہیں تو ایک لڑکی نے سوال کیا کہ اللہ میاں کو کوسنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو عملاً سب کچھ کر سکتے ہیں کوسے تو وہ جو عملاً کچھ نہ کر سکے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو تو کوسنے کی ضرورت نہیں مگر اس جگہ کفار کی جیسی حالت و شرارت مذکور ہے اسکو سنکر خود ہماری طبیعت میں کوسنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جذبہ کو دبانا نہیں چاہا بلکہ اسکی رعایت فرما کر خود ہی فرما دیا قاتلھم اللہ اگر وہ نہ فرماتے تو ہم قرآن میں خود اسکو نہ بڑھا سکتے تو ہمارا جذبہ دبا رہتا اللہ تعالیٰ نے ہمارے جذبات کو پامال کرنا گوارا نہیں فرمایا بلکہ جو بات ہم کہتے خود ہی ہماری طرف سے فرما دی تاکہ اسکی تلاوت کرنے سے ہمارا جذبہ

پورا ہو جاوے۔ یہ جواب اُسی وقت قلب میں القا ہوا اس سے پہلے میں نے کسی جگہ یہ جواب منقول نہ دیکھا تھا اس جواب کی قدر مجھے بعد میں معلوم ہوئی کیونکہ اس سے اور بہت سے اشکالات رفع ہوئے بعض دفعہ اللہ تعالیٰ وقت پر ایسی امداد فرماتے ہیں کہ جس کا پہلے سے گمان بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک بڑی بی نے طاعون کے زمانہ میں ایک بچہ کی زبانی مجھ سے سوال کیا کہ عزرائیل تو ایک ہیں وہ ایک وقت میں اتنی روحیں کیونکر قبض کر لیتے ہیں تو میں نے سوچا بچہ جواب کیا سمجھے گا مگر اللہ تعالیٰ نے ایک مثال میرے قلب میں ڈالدی جسکو بچہ بھی سمجھکر نقل کرسکتا تھا۔ میں نے کہا اُس سے کہنا کبھی تم نے چانول بھی کھائے ہیں دیکھو ایک لقمہ میں ایک دم سے کتنے چانول آجاتے ہیں اور ایک دفعہ میں منہ میں رکھ لیتے ہو وہ بچہ بھی ہنسنے لگا اور سائلہ کی بھی تسلی ہوگئی غرض اس مقام پر لتکبروا اللہ ہمارے جذبات کی رعایت سے فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ نعمتیں بڑی ہیں اور بڑی نعمت کو دیکھکر ہمکو اللہ اکبر کا تقاضا ہوتا ہے نہ الحمد للہ کا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ کی ایسی رعایت فرمائی کہ تکبیر کو ہماری رائے پر نہیں چھوڑا بلکہ خود مشروع کر کے دکھلا دیا۔ چنانچہ عید کے روز تکبیر کہنا ضروری کر دیا گیا نماز عید کی ہر رکعت میں تین تکبیریں زیادہ کہی جاتی ہیں یہ تو واجب ہیں اور راستہ میں بھی عیدگاہ کو جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے بعض ائمہ کے نزدیک جہراً اور ہمارے امام کے نزدیک سراً اور عجب نہیں کہ صلوۃ عید میں تین تکبیریں اسلئے ہوں کہ ایک بمقابلہ یسر کے ہے دوسری بمقابلہ رفع عسر کے تیسری بمقابلہ اکمال عدۃ کے اسکے بعد ارشاد ہے ولعلکم تشکرون اور یہ نعمتیں اسلئے تمکو عطا کیں تاکہ تم ان پر شکر کرو۔ اور یہ عجیب نعمت کا بیان ہے کیونکہ اسکے معنی یہ ہوئے کہ یسر و عدم عسر و اکمال عدۃ و تکبیر ان سب پر شکر کرو اور شکر دوسری عبادات کے اعتبار سے تو اُن عبادات کے متعلق ہے مگر فی نفسہ یہ خود بھی مستقل عبادت ہے اسلئے یہ خود بھی مطلوب و مقصود ہے اس اعتبار سے یہ بھی ایک غایت ہے جسکے لئے یسر و اکمال عدۃ وغیرہ ہمکو عطا کیا گیا۔ پھر چونکہ منعم کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے نعمتوں کا استحضار ہو کر منعم کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور محبت کے بعد محبوب سے قرب کا تقاضا ہوتا ہے تو اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ

اپنے قرب کو بیان فرماتے ہیں واذا سألک عبادی عنی فانی قریب اس تقریر سے تمام آیات واجزار آیات کا ربط بخوبی ظاہر ہو گیا اور جس طرح ان آیات کی تفسیر آج ذہن میں آئی ہے اس سے پہلے کبھی نہیں آئی (آیت واذا سألک عبادی کا ربط پہلی آیت سے مشہور یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمکو صوم اور تکبیر وشکر وغیرہ کا امر کیا ہے تو ممکن ہے کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ نمعلوم خدا تعالیٰ کو ہمارے ان افعال کی خبر بھی ہوتی ہے یا نہیں خصوصاً شکر قلب کی کیونکہ افعال قلبیہ مستور ہوتے ہیں جنکی اطلاع دنیا میں تو کسی کو نہیں ہوتی اور چونکہ طبیعت انسانیہ قیاس الغائب علی الشاہد کی عادی ہے اس لئے بعض لوگوں نے سوال بھی کیا اقریب ربنا فنناجیہ ام بعید فنناد یہ کیا ہمارا پروردگار ہمسے قریب ہے کہ ہم اس سے خفیہ طور پر مناجات کر لیا کریں یا بعید ہے کہ پکارا کریں اسکے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی یہ ربط بھی عمدہ ہے۔ مگر ربط اول احسن ہے اور ربط مشہور پر اس آیت کا پہلی آیت کے متصل آنا امام ابو حنیفہ رح کے اس قول کی تائید کرتا ہے کہ تکبیر عید الفطر راستہ میں سراً ہونا چاہئے جہر کی ضرورت نہیں رہی تکبیر صلوۃ تو وہ چونکہ قرارت کے متصل ہے اور قرارت جہری ہے اسلئے اتصال جہری کی وجہ سے اسمیں بھی جہر ہو گیا دوسرے اسمیں جہر کی یہ بھی وجہ ہے کہ مقتدیوں کو اعلام کی ضرورت ہے کہ اسوقت تکبیر کہہ رہا ہے تو وہ بھی اسکی اقتدا کریں اور تکبیر طریق میں ہر شخص مستقل ہے وہاں اعلام کی ضرورت نہیں اور تکبیر تشریق کا جہر خلاف قیاس نص سے ثابت ہے لقولہ صلے اللہ علیہ وسلم الحج العج والثج وفی تکبیر التشریق تشبیہ بتلبیۃ الحاج فافہم ۱۲ ظ) اور اذا سألک عبادی عنی فانی قریب کی بلاغت عجیب قابل دید ہے کہ فقل انی قریب یا فانہ قریب نہیں فرمایا بلکہ بلا واسطہ فانی قریب فرمایا ہے یہ ایسا ہی جیسے کوئی شخص کسی سے سوال کرے کہ فلاں شخص کہاں ہے اور وہ بول پڑے کہ میں تو موجود ہوں اور یہ جبھی ہو گا جبکہ مجیب کو سائل کیساتھ خاص تعلق ہو اور اگر خاص تعلق نہو تو وہ قریب ہوتے ہوئے بھی خود نہ بولے گا بلکہ جسسے سوال کیا گیا ہے اُن سے کہیگا کہ اس سے کہدو وہ یہاں موجود ہے اور تعلق کی صورت میں ایسا نکرے گا بلکہ خود بول پڑے گا کہ میں تو موجود ہوں اسی طرح یہاں

حق تعالیٰ نے خود بلا واسطہ جواب دیا ہے کہ میں تو قریب ہوں حضور سے نہیں فرمایا کہ ان سے کہدیجئے کہ میں قریب ہوں اسمیں جس خاص تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور وہ تعلق ایسی نعمت ہے کہ اسپر ہزار جانیں قربان کردیجائیں تو تھوڑا ہے پھر اس جواب کا حضور کی زبان سے ادا ہونا بتلاتا ہی کہ رسول کا بولنا خدا ہی کا بولنا ہے ؎

گرچہ قرآن از لب پیغمبر ست ہر کہ گوید حق نگفتا و کافر ست
گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک شان تو مبلغ ہونے کی ہے اور دوسری شان لسان حق ہونے کی ہے کہ حضور اللہ تعالیٰ کیلئے بمنزلہ لسان یعنی ترجمان کے ہیں اس عنوان سی گھبرائیے نہیں کیونکہ جب شجرۂ طور لسان حق ہوگیا اور اس سے ندا آئی انی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدنی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لسان حق ہونا تعجب خیز کیوں ہے پھر حدیث میں اہل قرب کے لئے آیا ہے کنت بصرہ الذی یبصر بہ وسمعہ الذی یسمع بہ ورجلہ التی یمشی بھا اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مقرب کون ہوگا تو آپکی یہ شان سب سے زیادہ ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے خلاصہ ان اجزاء مرتبہ کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو دیکھکر خود بخود آپ کے دل پر شکر کا تقاضا ہوگا کہ آپکی ہی مصلحت و نفع کیلئے صوم کو شروع فرمایا پھر اسمیں تشریعا و تکوینا تیسر و عدم عسر کی رعایت فرمائی تاکہ روزہ کی تکمیل ہوجاوے اور تکمیل کے بعد اس نعمت پر تکبیر کہو اور شکر کرو پھر شکر سے محبت پیدا ہوگی اور محبت سے قرب حق کا تقاضا ہوگا تو اس آیت میں تسلی فرمادی کہ میں تمسے قریب ہوں مجھے تمھارے سب اعمال واقوال کی خبر ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان میں ہر دعا کرنیوالے کی دعا کو قبول کرلیتا ہوں یہاں دعا سے مراد عبادت ہے دعاء ظاہری مراد نہیں جیسا آیۃ ادعونی استجب لکم میں بقرینہ ان الذین یستکبرون عن عبادتی یہی عبادت مراد ہے اور عبادت کو دعا سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ بتلادیا گیا کہ تمھاری عبادت کی حقیقت محض دعاء والتجا ہے جیسے کوئی شخص ڈوبتا ہو تو وہ دوسروں کو پکارتا ہے پس آپکی عبادت کا صرف یہ درجہ ہے اسکے بعد جو کچھ ہے حق تعالیٰ کی عطا و فضل ہے اگر ہم اپنی عبادت پر ناز

کرنے لگیں تو اسکی ایسی مثال ہوگی جیسے ڈوبنے والے کی پکار سنکر کسی نے اُسکو بچالیا ہو
اور وہ ڈوبنے والا اسکے بعد فخر کرنے لگے کہ میں شناور ہوں۔ ارے تجھے خبر بھی ہے کہ دوسرے
نے تجکو بچالیا ورنہ محض پکارنے سے تو کہاں بچ سکتا تھا اور حقیقت میں ہمارا تو پکارنا بھی
انہی کی عطا ہے اگر وہ طلب دل میں پیدا نکریں تو ہم سے پکارنا بھی نہو سکتا مولانا فرماتے ہیں

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو ○ ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

اسکے بعد فرماتے ہیں فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی کہ جب ہم تمہارا کام کر دیتے ہیں اب تم
بھی ہمارا کہنا مانو کہ میری باتوں کی تصدیق کرو اور عملاً اُسکی تعمیل کرو لعلھم یرشدون تاکہ
تمکو رشد و فلاح حاصل ہو اور ہدایت میں ترقی ہو (یہ ترجمہ لفظی نہیں حاصل ہوا) اسمیں بتلا دیا کہ
ہم جو تمسے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا کہنا مانو تو اسمیں ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کا نفع بھی تمہارے ہی
لئے ہے اب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میرا کہنا مانو ایسا ہے جیسا ہم بچہ سے کہا کرتے ہیں کہ میاں
ہماری ایک بات مان لو اور وہ یہ ہے کہ کھانا کھالو اس عنوان سے اُس پر گرانی نہوگی اور وہ
اپنے کام تمہاری خاطر سے کرلیگا اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے جو کام بتلایا ہے وہ ہمارا ہی کام
ہے ہمارے ہی فائدہ کا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانا ہے کہ اُسکو اپنا کام قرار دیتے
ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہمارا کہنا مان لو۔ یہ تو مختصر طور سے آیت کی تفسیر تھی۔ اور اصل مقصود اکمال
کا بیان کرنا تھا اب میں اصل مقصود کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں پس سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے اکمال
عدت کی مقصودیت کو بیان کو فرمایا ہے کہ ہمنے احکام صوم میں آسانی کی رعایت اسلئے کی ہے
تاکہ اس مدت کو جو روزہ کیلئے مقرر کیگئی ہے پورا کرلو ہر چند کہ اس عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
اکمال عدت خود مقصود ہے مگر درحقیقت خود اسی مقصود سے بھی مقصود دوسری چیز ہے
جسکے لئے اکمال عدت ذریعہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ ذرائع کو بھی مقصود بناکر
سکھلاتے ہیں تاکہ مخاطب ذریعہ کا پورا اہتمام کرے تو نتیجہ اسپر خود مرتب ہو جائیگا اور یہی
اصول صوفیہ نے قرآن سے سیکھا ہے چنانچہ وہ طالبین کو یہی تعلیم کرتے ہیں کہ مقصود عمل
ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ عمل اختیاری ہے اور وصول غیر اختیاری ہے تم عمل کے مکلف
ہو اسی کو مقصود سمجھکر بجالاتے رہو اسپر وصول خود مرتب ہو جائیگا۔ اب سمجھئے کہ وہ مقصود

کیا ہے جسکے لئے اکمال عدت اصل ہیں ذریعہ ہے وہ تقوی ہے جسکو اللہ تعالی نے صوم کے ذکر میں ابتداء ہی بیان فرمایا ہے یا ایہا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ایاما معدودات ط اور تقوی کی حقیقت ہے دنیا میں گناہوں سے بچنا اور آخرت میں عذاب سے نجات پانا یہ نفع ہے اکمال کا۔ اسکے بعد یہ بھی سمجھئے کہ اکمال عدت کے دو درجے ہیں ایک اکمال ظاہری کہ رمضان کا پورا مہینہ روزہ میں تمام ہو جائے ایک اکمال معنوی کہ اُس پر یہ غایت مرتب ہو جو اکمال سے مطلوب ہے پس روزہ کا حقیقی پورا کرنا یہ ہے کہ ہم ہر دن یہ دیکھتے رہیں کہ گناہوں سے کسقدر بچے اور آئندہ کیلئے کسقدر اہتمام کیا۔ اگر یہ غایت مرتب نہوئی تو اکمال عدت محض ظاہری ہوگی حقیقی اکمال حاصل نہوگا اسی لئے حدیث میں ہے من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ ان یدع شرابہ وطعامہ جو شخص روزہ میں بیہودہ باتیں اور بیہودہ کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالی کو اُسکے بھوکا پیاسا رہنے کی کچھ پروا نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کو اکمال عدت کا یہ درجہ مطلوب ہے جس پر تقوی مرتب ہو پس ہمکو اپنی حالت کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ ہم رمضان میں گناہوں سے کسقدر بچے اور کتنا اس کا اہتمام کیا افسوس کیساتھ کہا جاتا ہے کہ ہم لوگوں کو روزہ میں گناہوں سے بچنے کا ذرا بھی اہتمام نہیں ہماری وہی حالت ہے جو پہلے تھی بلکہ بعضوں کے تو رمضان میں گناہ پہلے سے بھی بڑھ گئے اور یہ وہ لوگ ہیں جنکا مذاق یہ ہے ؎

ہر گناہے کہ کنی در شب آدینہ کن تا کہ از صدر نشینان جہنم باشی

یہ وہ بیباک لوگ ہیں جنکو متبرک زمانہ میں بھی تنبہ نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں گناہ کرنیکا وبال اور دنوں سے زیادہ ہے۔ قاعدہ سے تو یہ چاہئے تھا کہ جن لوگوں نے ان متبرک دنوں کو یوں برباد کیا ہے اُنکے لئے ان ایام کی مکافات کا کوئی طریقہ نہوتا مگر خدا تعالی کی رحمت بے انتہا ہے وہ اب بھی رحمت کرنے کو موجود ہیں اگر ان بقیہ دنوں کی درستی کرلیجائے اور ابتک کے گناہوں سے توبہ کرلی جائے۔ صاحبو! ہمیں اس رحمت کی قدر کرنا چاہئے ورنہ پھر یہ وقت شاید نہ ملے۔ اور اگر ایسا نکیا گیا تو ایک اور اندیشہ ہے وہ

یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بد دعا نہ لگ جائے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو بد دعا دی ہے جسنے رمضان میں بھی اپنے گناہوں کی مغفرت نکرائی ہو حضور نے تین شخصوں کو بد دعا دی ہے ایک وہ جس نے اپنے باپ ماں دونوں کو یا ایک کو اُن کے بڑہاپے میں پایا اور انکو خدمت وغیرہ سے راضی کرکے جنتی نہ بنا دوسرے وہ جسکے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا اور اُس نے حضور پر درود و سلام نہیں بھیجا تیسرے وہ جس نے رمضان کو ختم کر دیا اور اپنی گناہوں کی مغفرت نہیں کرائی کیا۔ حضور کی بد دعا سے بچنا ضرور نہیں اسلئے اس کا اہتمام ضروری ہے کم از کم رمضان میں تو گناہوں سے بچنے کا اہتمام کیا جائے اور پچھلے گناہوں سے توبہ کیجائے مگر قربان جائیے حضور کے کہ گو آپ نے بظاہر ان لوگوں کو بد دعا دی ہے مگر بد دعا بھی ایسے عنوان سے ہے جسمیں دعا کی بھی جھلک ہے کیونکہ آپ نے رغم انفہ رغم انفہ فرمایا ہے کہ اسکی ناک خاک میں ملے یہ ایسی بد دعا ہے جیسے قدسیہ بیگم والیہ بھوپال اپنی باندیوں کو غصہ میں کہا کرتی تھی کہ تمھاری چوٹی کٹواؤنگی تمکو گدہے پر سوار کراؤنگی پھر سبکو حج میں ساتھ لیگئیں اور وہاں احرام کھولتے ہوئے سبکی چوٹیاں کٹیں اور عمرہ لانے کیلئے گدہے پر بھی سوار ہونیکا موقعہ ہوا ہوگا اسی طرح رغم انفہ کے معنی یہ ہیں کہ اسکو سجدہ کی توفیق ہو اور یہ اس موقعہ کے مناسب بھی ہے کیونکہ گناہ بعد کا سبب ہے اور سجدہ قرب کا سبب ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ رمضان کا روزہ کے ساتھ پورا ہو جانا بڑی نعمت ہے کیونکہ اس سے ہمکو گناہوں سے بچنے کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جہنم سے نجات ہوگی پس ہمکو خوش اسلوبی کے ساتھ رمضان کو پورا کرنا چاہئے اور خوش اسلوبی یہی ہے کہ گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کیا جائے اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں اور اخیر میں اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج میں نے جس طرح ان آیات کی تفسیر بیان کی ہے اس سے آپکو معانی قرآن اور بلاغت قرآن کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ قرآن کی تعلیم کیسی پاکیزہ ہے اس کا طرز بیان کیسا بلیغ ہے اسکی آیات و اجزاء آیات میں کیسا عجیب ربط ہے اسمیں ہمارے جذبات کی کیسی رعایت ہے پس آج قرآن کا کچھ نمونہ

آپ کے سامنے بیان کرنے میں یہ عرض کرونگا کہ میرا یہ بیان پہلے بیان سے مرتبط ہے
جو شعبان میں ہوا تھا کہ اُس میں الفاظ قرآن کے حسن کا بیان تھا آج معانی قرآن کے
حسن کا بیان تھا حالانکہ میں پوری طرح اُس کے حسن کو بیان نہیں کر سکا مگر انشاء اللہ
کچھ نمونہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا جسکے بعد آپ یہ ضرور کہیں گے کہ قرآن کی شان یہ ہے

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد — برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اور اُس کی یہ شان ہے

مخدرات سراپردہ ہائے قرآنی — چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی

واقعی کسی نے سچ کہا ہے

چیست قرآن ای کلام حق شناس — رونمائے رب ناس آمد بہ ناس
حرف حرفش راست در بر معنئے — معنئے در معنئے در معنئے

واللہ قرآن کے حسن کی حالت یہ ہے کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بس اب میں مقصود عرض کر چکا مگر پھر عرض کرتا ہوں کہ ان بقیہ ایام رمضان کی
قدر کرنا چاہیے اسمیں نماز کا اور خصوصاً تراویح کا اہتمام کرنا چاہیے مگر جو حافظ اجرت
لیکر قرآن سنائے اسکے پیچھے تراویح نہ پڑھیں اس سے افضل یہ ہے کہ الم ترکیف سے تراویح
پڑھ لی جائے اور اگر ہمت ہو تو رمضان کے بقیہ ایام میں اعتکاف کا بھی اہتمام کیا جائے
اعتکاف بڑی اچھی عبادت ہے جسکی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے کو خدا کے دروازہ پر
ڈالکر زبان حال سے یوں عرض کرتا ہے کہ

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما — باشد کہ از بہر خدا سوئے غریبان بنگری

کہ اے اللہ ہم چاہے اچھے ہیں یا برے ہیں آپ ہی کے ہیں اور آپ ہی کے در کے
ہمارے لئے کوئی دوسرا در نہیں اس کا جو اثر ہوتا ہے اسکو ایک مثال سے سمجھئے
ایک غلام اپنے آقا سے یوں کہہ رہا تھا

ترا بندہ چوں من بیفتد بسے — مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

کہ آپ کو تو مجھ جیسے غلام اور بھی مل سکتے ہیں مگر مجھے آپ سے بہتر آقا نہیں مل سکتا
اس کا اثر جو کچھ ہوا ہوگا دل کو معلوم ہے ایک اور حکایت شیخ نے لکھی ہے کہ ایک
بزرگ رات کو تہجد میں اٹھے غیب سے ندا آئی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں اور یہ
آواز اس طور سے آئی کہ ایک مرید نے بھی سنلی پیر کیلئے وہ حالت بہت سخت
ہے جسمیں مرید بھی اس سے پھرنے لگیں مگر عارف اسکی پروا نہیں کرتا اُسکے معمولات
میں ذرا فرق نہیں آیا کرتا چنانچہ وہ بزرگ تہجد میں مشغول ہوگئے اور اگلی رات آئی
تو معمول کے موافق پھر تہجد کو اٹھے ایک عاشق مرید کو پیر کی اس حالت پر ترس آیا اور اُسنے
کہا کہ جب وہاں کچھ قبول ہی نہیں تو آپ کیوں مشقت برداشت کرتے ہیں پڑے کے
سو بھی رہیے شیخ آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا ؎

توانی ازاں دل بپرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

کہ بیٹا یہ تو صحیح ہے کہ اُن کے یہاں میرا عمل قبول نہیں مگر اُن کو چھوڑ کر کیسے بیٹھ رہوں
کہ دوسرا در بھی تو کوئی نہیں بس یہ کہنا تھا کہ رحمت کو جوش آیا اور غیب سے دوسری
آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہے دگر نیستت

کہ جاؤ تمھاری اس بیکسی پر رحم کر کے کہ تمھارے لئے دوسرا کوئی دروازہ نہیں ہے ہمنے
تمکو قبول کرلیا پس اعتکاف کی حقیقت یہی ہے کہ بندہ یہ کہکر اپنے کو کریم کے دروازہ
پر لا ڈالے کہ آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ؎

میفگن کہ دستم نگیرد کسے

انشاء اللہ یہ عبادت ضرور رنگ لائے گی۔

ایک عبادت رمضان میں قابل اہتمام یہ ہے کہ لیلۃ القدر کی تلاش کیجائے
حدیث میں آتا ہے کہ عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں اسکو تلاش کرو۔ اگر کسی کو سب
میں جاگنے کی ہمت نہ ہو تو کم از کم ستائیسویں رات میں تو ضرور جاگ لے یعنی اور راتوں
سے کچھ زیادہ جاگ لے تمام رات جاگنا شرط نہیں اور اسمیں جسقدر ہو سکے نمازیں پڑھتا

رہے جب اس سے تھک جائے تلاوت قرآن یا ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے رہتا ستائیسویں رات کے متعلق بہت سے حضرات صحابہ کا جزم ہے کہ لیلۃ القدر یہی ہے۔ مگر اسکے متعلق بعض لوگوں کو شاید ایک فلسفی شبہ پیدا ہوگا وہ یہ کہ چاند میں آجکل اختلاف ہے تو جو رات یہاں ستائیسویں ہوگی وہ بعض جگہ اٹھائیسویں ہوگی تو کیا لیلۃ القدر دو ہونگی اور اگر ایک ہوئی تو کسکی رویت کا اعتبار ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہیں اور یہ تو خود سائنس والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیل و نہار کرۃ النسیم سے نیچے ہی نیچے ہیں کرۃ النسیم کے اوپر رات دن نہیں بلکہ یکساں حالت ہے یہ جواب جب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور اس سے ایک بات ابھی اور دل میں آئی ہے وہ یہ کہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام سے مسجد اقصےٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے سیر سمٰوات کا ذکر نہیں فرمایا جس سے بعض اہل باطل نے سیر سمٰوات کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں سیر سمٰوات کا ذکر اسواسطے نہیں کیا گیا کہ وہاں لیلاً کی قید بھی مذکور ہے پس ضروری ہوا کہ اسی قدر سیر بیان کیجائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی اور ظاہر ہے کہ سیر سمٰوات لیل و نہار کے باہر ہوئی ہے سمٰوات میں لیل و نہار کا تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سمٰوات کی نفی پر استدلال محض لغو ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سمٰوات رات میں نہیں ہوئی سو یہ مسلم ہے بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوئی نہ رات میں وہ تو ایسے مقام پر ہوئی ہے جہاں رات ہے نہ دن بہر حال وہاں لیل و نہار نہیں ہے اسواسطے لیلۃ القدر کی جو شان و برکات ہیں وہ لیل و نہار کے ساتھ مقید نہیں بلکہ ارادۂ حق کے تابع ہیں تو اس کی مثال بارش کی طرح ہے کہ یہاں کے کرۃ النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرۃ النسیم کے نیچے کل بارش ہے اگر شب قدر بھی ایسی ہو کہ یہاں آج ہے اور کلکتہ میں کل ہے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا پھر معنوی بارش برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے اس لئے بیفکر ہو کر آپ اپنی ہی تاریخوں کے حساب سے کام کیجئے اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں کو اور کام کو دیکھتے ہیں

وہ سبکو اُن کے حساب کے موافق لیلۃ القدر کی برکات عطا فرماویں گے پس رمضان کو
اس طرح خوش اسلوبی سے گذاریئے کہ جو دن رہ گئے ہیں ان میں طاعات کا اہتمام کیجئے
اور گناہوں سے دور رہئے تاکہ وہ خوش ہوکر آپ سے رخصت ہو اور خوش ہوکر جناب
باری میں شفاعت کرے کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ قرآن اور صوم دونوں قیامت
میں روزہ داروں کی شفاعت کرینگے قرآن کہے گا خداوندا میں نے اسکو نیند سے اور آرام
سے روکا تھا میری شفاعت اسکے حق میں قبول کیجائے۔ روزہ کہے گا کہ میں نے اسکو کھانے
پینے اور شہوت پورا کرنے سے روکا تھا میری شفاعت اسکے حق میں قبول کیجئے یہ ہے
حقیقی وداع رمضان اور وہ جو آخری جمعہ میں الوداع الوداع یا شہر رمضان پڑھا جاتا ہے
وہ تو بدعت ہے شریعت میں اس کا کہیں ثبوت نہیں اور ہمارے ایک فارسی کے اُستاد
رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جیسے رمضان کے جانیکا غم ہوتا ہے اُسکے آنے کی خوشی بھی
ہونی چاہیئے تو اگر جانے پر خطبۃ الوداع پڑھتے ہو تو اس کے آنے پر بھی ایک خطبہ مرحبا
کا پڑھنا چاہیئے کہ مرحبا مرحبا یا شہر رمضان خصوصاً جبکہ یہ دیکھا جاے کہ اظہار سرور کی
تو شریعت میں اصل بھی ہے اور اظہار غم کی کوئی اصل نہیں نیز حضور صلے اللہ علیہ وسلم
نے رمضان کے آنے سے پہلے تو مسلمانوں کو رمضان کے لئے مستعد ہوجانیکا ارشاد فرمایا ہے
جانے کے وقت کوئی حسرت و رنج ظاہر نہیں فرمایا۔

الحمد للہ کہ ضرورت کے موافق اکمال رمضان کے متعلق کافی بیان ہوچکا صرف ایک جزو
رہ گیا کہ عید کے دن صدقہ فطر ادا کرنیکا اہتمام کرنا چاہیئے کیونکہ وہ بھی صوم رمضان ہی
کا مکمل ہے حدیث میں ہے کہ روزہ کے حقوق و آداب میں جو کچھ کوتاہی ہوجاتی ہے صدقہ
فطر سے اس کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمکو توفیق عمل دے اور فہم سلیم
عطا فرمائے آمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علی
آلہ و اصحابہ اجمعین ۰ واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین ۰

اشرف علی

۱۰ رجب سنہ ۴۹ھ

قواعد وضوابط رسالہ المبلغ

(۱) اس رسالہ میں حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ جامع شریعت و طریقت واقف اسرار حقیقت مرشدنا و مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم کے صرف مواعظ حسنہ ماہوار شائع ہوتے ہیں (۲) رسالہ ہذا کا مقصود مسلمانوں خصوصاً سالکین طریقت کے ظاہر و باطن کی درستی و شکوک و اوہام متعلقہ عقائد و احکام کی اصلاح ہے جو حضرت مولانا صاحب دام ظلہم العالی کے مواعظ کا خاص ممتاز فائدہ ہے (۳) اس رسالہ کے ہر مہینہ میں چالیس صفحے ہوتے ہیں مگر چونکہ ہر وعظ پورے چالیس ہی صفحہ کا نہیں ہوتا بعض وعظ کم صفحے کے اور اکثر زائد صفحات کے ہوتے ہیں اسلئے ہر مہینہ پورا وعظ ارسال نہیں ہوتا بلکہ ہر رسالہ میں کسی وعظ کے اخیر کے صفحات اور دوسرے وعظ کی شروع کے صفحات شامل کر کے چالیس صفحے پورے کر دئے جاتے ہیں لہذا سب حضرات خریداران ہر رسالہ کو بحفاظت رکھیں تاکہ جس وعظ کے کسی مہینہ میں شروع کے چند اوراق ارسال ہوئے ہیں دوسرے مہینہ میں جب اسکے اخیر صفحات دفتر سے موصول ہوں تو دونوں ملا کر وعظ پورا کر لیا جائے۔ رسالہ کا نمبر اور مہینہ کا نام ہر صفحہ کے نیچے لکھا ہوتا ہے اس سے تو سال بھر کے بارہ پرچے دیکھ لئے جاویں کہ پورے وصول ہو گئے یا نہیں اور وعظ کا نام ہر صفحہ کے اوپر لکھا ہوتا ہے اس سے ہر وعظ کے اوراق ملا کر وعظ پورا کر لیا جا سکتا ہے (۴) یہ رسالہ ہر مہینہ کا اسی مہینہ کی کسی تاریخ میں شائع ہو جاتا ہے اگر کسی مہینہ کا رسالہ نہ پہونچے تو فوراً خط و کتابت کر کے پیسے خراب نہ کئے جاویں بلکہ دوسرے ماہ کے رسالہ تک انتظار کریں اگر دوسرے ماہ میں پہلے ماہ کا اور اس ماہ کا دونوں کا رسالہ پہونچ جائے فبہا اور اگر دوسرے ماہ کا رسالہ پہونچ جاوے اور پہلے ماہ کا نہ پہونچے تو فوراً پہلے ماہ کے رسالہ کی اطلاع دفتر کو کر دی جاوے تو دوبارہ بیرنگ روانہ کر دیا جاتا ہے اگر دوسرے رسالہ کی پہونچنے پر بھی اطلاع نہ دیگئی تو پھر رسالہ قیمتاً ملتا ہے (۵) رسالہ کی قیمت سالانہ مع محصولڈاک دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ۲) اور بصورت وی پی دو روپیہ بارہ آنہ (عہ۲) اور ممالک غیر سے چار شلنگ چھ پنس مقرر ہے اور ایک پرچہ کی قیمت مع محصول چار آنہ (۴) اور ممالک غیر سے چھ پنس ہے قیمت ہر صورت میں پیشگی لیجاتی ہے (۶) ہر خریدار کو شروع سال سے خریدار ہونا ضروری ہے جو صاحب درمیان سال میں خریدار ہونگے انکو شروع سال سے کل رسالے روانہ کر کے شروع ہی سے خریدار سمجھا جاویگا رسالہ کا سال شوال سے شروع ہوتا ہے (۷) یہ رسالہ کسی صاحب کی خدمت میں بلا طلب و تحریک روانہ نہیں کیا جاتا بعض حضرات خود طلب فرماتے ہیں اور بعض حضرات اپنے اعتماد پر دوسرے حضرات کی خدمت میں روانہ کرنے کی فرمایش کرتے ہیں لہذا اگر کسی صاحب کی خدمت میں بغیر انکی طلب کے رسالہ پہونچے تو یہ سمجھ لیں کہ ان کے کسی معتمد نے بھجوایا ہے لہذا اسکا دیلیو کسی حال میں واپس نہ فرمایا جاوے (۸) رسالہ ہذا کے متعلق جملہ خط و کتابت و ترسیل زر پتہ ذیل پر فرمایئے

المشتہر

احقر محمد شبیر علی مدیر رسالہ النور و المبلغ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ التبلیغ

کا

وعظ ۱۲ المسمی بہ

الرحیل (الی) الخلیل

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اپنے اہتمام سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمیٰ ب

الرحیل الی الخلیل

اين	متى	كم	كيف	لم	ماذا	من بيّن	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے بیان فرمایا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تعداد	متفرقات
خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔	۲۲ رجب ۱۳۴۸ھ بروز جمعہ بوقت صبح	۳ گھنٹہ	جالسا علی الکرسی	بعض عزیزوں کی وفات پر [illegible]	انسان کا ہر وقت [illegible]	سلطان العلماء [illegible]	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔	تقریباً ۵۰	

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ ان هذه تذکرة فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا ۰ وما تشاءون الا ان یشاء اللہ

ان اللہ کان علیما حکیما ۝ یدخل من یشاء فی رحمتہ ؕ والظلمین اعد لھم عذابا
الیما ۝ اسوقت زیادہ تر مجھے صرف آیت اولیٰ کے متعلق بیان کرنا ہے مگر دوسری آیتیں
اسلئے پڑھ دی ہیں تاکہ آیت اولیٰ کی تعیین ہو جائے کیونکہ وہ آیت قرآن میں اور جگہ بھی
آئی ہے چنانچہ سورۂ مزمل میں بھی ہے ان ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا ۝
اور مجھے اسوقت سورۂ دہر کی آیت مقصود بالبیان ہے تو اسکی تعیین کیلئے اگلی آیتوں کی بھی
تلاوت کردی۔ رہا یہ کہ جب آیت دونوں جگہ ایک ہی ہے تو تعیین آیت دہر کی کیا ضرورت تھی
سو خیال یہ ہے کہ شاید دہر کی آئندہ آیات کے متعلق بھی کچھ بیان ہو جائے اسلئے تعیین
ردی گئی بہرحال یہ ایک ضروری مضمون ہے اسکو غور سے سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان
ھذہ تذکرۃ کہ یہ مضامین یادداشت ہیں ھذہ سے اوپر کے مضامین کیطرف اشارہ ہے
وپر بہت سے مضامین مذکور ہیں جو سب دینی مضامین ہیں اور قرآن میں تو دین ہی کا ذکر ہوگا
وین کا ذکر بھی اگر کہیں ہے تو دین ہی کیلئے ہے محض تکوین من حیث ہو تکوین مقصود بالذکر
ہیں۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو سب امور تکوینیہ کو قرآن میں ٹھونستے ہیں
ر قرآن سے ان کو ثابت کرنیکا اہتمام کرتے ہیں یہ اہتمام منکر ہے کیونکہ یہ قرآن کا مقصود
یں ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن میں تکوین کا ذکر نہیں ہے۔ ضرور ہے لیکن مقصود بالذات
ہیں ہے چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے وھو العزیز الغفور الذی خلق سبع
وات طباقا ۝ ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت ؕ فارجع البصر ھل تری
طور ۝ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر ۝ ولقد
ا السماء الدنیا بمصابیح وجعلنھا رجوما للشیاطین واعتدنا لھم عذاب
عیر ۝ دوسرے مقام پر ارشاد ہے افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینٰھا
ٰھا ومالھا من فروج ۝ والارض مددنٰھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا
ا من کل زوج بھیج ۝ تبصرۃ وذکری لکل عبد منیب الیٰ قولہ کذٰلک الخروج ۝
آیات میں آسمان کی پیدائش اور استواری کا ذکر ہے کہ آسمان میں کچھ شقاق اور فطور
ہے مگر اس سے مقصود صرف تکوین کا بیان نہیں ہے بلکہ اس سے اثبات قدرت مقصود ہے

جس سے امکانِ معاد پر دلیل قائم کرنا مطلوب ہے اسی غرض کیلئے جا بجا سموات کی پیدائش
واستحکام واستواری کا ذکر فرمایا گیا ہے اور سحاب و برق و رعد وغیرہ کا ذکر اثبات
وجود صانع کیلئے کیا گیا ہے محض طبعیات کی تحقیق مطلوب نہیں چنانچہ ہر مقام پر سیاق
وسیاق میں غور کرنیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ مقصود اثبات وجود و توحید صانع ہی ہے اسی
لئے جا بجا تکوینیات کا ذکر کرکے ارشاد ہوا ہے کہ انمیں عقلاء کیلئے آیات ہیں چنانچہ فرماتے
ہیں ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنهار والفلک التی
تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللّٰه من السماء من ماء فاحیا به الارض
بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء
والارض لآیات لقوم یعقلون ۝ اوران آیات سے توحید صانع کا ثابت کرنا مقصود ہے
چنانچہ اس آیت سے اوپر یہ ارشاد ہے والهکم اله واحد لا اله الا هو الرحمن الرحیم
یہ تو سباق ہے جسمیں توحید کا دعوی ہے اور اسکے آگے ارشاد ہے ومن الناس من
یتخذ من دون اللّٰه اندادا یحبونهم کحب اللّٰه والذین آمنوا اشد حبا للّٰه
یہ سیاق ہے جسمیں ابطال شرک ہے اور اگر کسی کو سیاق وسیاق میں تامل کرنا کافی نہ ہو تو
ایک آیت میں خود ساتھ ساتھ ہی اس مضمون کے ذکر کی حکمت کو بیان فرمادیا ہے ارشاد
فرماتے ہیں ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنهار لآیات
لاولی الالباب الذین یذکرون اللّٰه قیاما وقعودا وعلی جنوبهم ویتفکرون
فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحنک فقنا عذاب
النار ۝ اسمیں صاف تعلیم ہے کہ خلق سموات وارض میں اس غرض سے تفکر کرنا چاہئے
کہ خدا تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا علم ہو کہ یہ فضول پیدا نہیں کئے گئے پھر اس سے امکان
وقوع معاد پر استدلال کرکے جنت کی طلب اور جہنم سے استعاذہ کرنا چاہئے پس ثابت ہوگیا
تکوینیات کا ذکر قرآن میں بطور آیات و دلائل کے ہے اور آیات سے مراد اگر استدلال علی الصانع
واثبات معاد کے سوا کچھ اور لیا جائے تو سیاق وسباق آیات کا اس سے آبی ہے اور اگر سیاق
سباق میں تامل نکیا جائے تو بعض آیات میں خود یہی نتیجہ صراحةً مذکور ہے ربنا ما خلقت هذا

بالذات تو اگر تکوینیات کا ذکر قرآن میں ہے بھی جسکو آجکل سائنس کہا جاتا ہے تو مقصود بالذات ہو کر نہیں بلکہ دین کے تابع ہو کر ہے مجھے تو سائنس کا لفظ بولنے سے بھی شرم آتی ہے گو آجکل ان الفاظ کا استعمال کرنا فخر شمار ہوتا ہے مگر ہمکو تو اس فخر سے عار آتی ہے بقول ع آنچہ فخر تست آں ننگ من ست + مگر افسوس اب زمانہ ایسا آگیا کہ اکثر مخاطبین ان الفاظ کے بغیر مطلب ہی سمجھتے نہیں اسلئے بعض دفعہ ہمیں اپنی زبان بگاڑ کر ان الفاظ کو استعمال کرنا پڑتا ہے جیسے ایک وکیل انگریز میرٹھ میں ایک دیہاتی سے کہ رہا تھا کہ مطبل ہی سمجھ گیا ایسے ہی ہمیں ان الفاظ کو بعض دفعہ مخاطبین کی ضرورت سے بولنا پڑتا ہے مگر ہم ان کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں کیونکہ ہمارے سلف کی یہ زبان نہیں تھی - مگر افسوس آجکل طلبہ تک میں یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ان الفاظ کے استعمال کو فخر سمجھتے ہیں اور قصداً اپنی تقریر کو ان الفاظ سے بھرتے ہیں تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ مقرر کوئی ملا ہے بلکہ نو تعلیمیافتہ طبقہ کے مقرر سمجھے جائیں طلبہ آجکل اپنا مولوی ہونا چھپاتے ہیں اور قصداً ان الفاظ کی مشق کرتے ہیں جیسے کانپور میں بعض طالبعلموں کو دیکھا کہ بوٹ اور ترکی ٹوپی پہنکر عینک لگا کر بازار میں نکلتے تھے تاکہ لوگ انکو جنٹلمین سمجھیں مولوی نہ سمجھیں مگر حالت یہ تھی کہ جسطرف سے بھی نکلتے دکاندار پکارتے کہ مولوی صاحب یہاں آئیے میں نے کہا ڈوب مرو کہ تم تو اپنی مولویت کو چھپانا چاہتے ہو مگر وہ چھپ نہیں سکتی صورت کی قدرتی ہیئت کو دیکھکر لوگ پہچان لیتے ہیں کہ یہ مولوی ہیں اب تم اپنی اس قدرتی ہیئت کو بھی بدلو تو ہم جانیں - اور یہ واقعہ ہے کہ طالبعلم چاہے کیسا ہی لباس پہن لے اسکی صورت سے طالبعلمی ظاہر ہو جاتی ہے خواہ اس کا منشا نور حق ہو جو علم دین کا خاصہ ہے جسکو مولانا فرماتے ہیں ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی　　　نیک بیں باشی اگر اہل ولی

اور ایک اردو کا شعر گویا اسی کا ترجمہ ہے گو مولانا کے شعر کے سامنے اسکے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا مگر مخاطبین کی رعایت سے پڑھتا ہوں کہ وہ اسکو جلدی سمجھ جائیں گے -

؎ مرد حقانی کی پیشانی کا نور　　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

خواہ آجکل کے محاورہ میں یہ کہو کہ انکی صورت پر نحوست و نکبت برستی ہے جیسا کہ ڈپٹی

نذیر احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عربی طلبہ کی صورت پر ایسی نحوست و نکبت برستی ہے کہ وہ ہر جگہ پہچان لئے جاتے ہیں خواہ کسی لباس میں ہوں کیسی ہی حالت میں ہوں۔ افسوس یہ لوگ کیا حقیقت سمجھے اس نور کی۔ اگر اس امتیاز کا منشا نحوست و نکبت ہی تو یہ نحوست تو ہر مسلمان میں ہے کیونکہ ہر مسلمان کو کافر سے صورت میں امتیاز ہوتا ہے مسلمان چاہے کیسی ہی وضع اختیار کرلے اگر اُسکے دل میں ایمان ہے تو ہزار کافروں کے اندر اُسکی صورت ممتاز ہوگی چنانچہ اگر کوئی اصلی مسلمان لوگوں سے چندہ وصول کرنیکے واسطے اپنے کو نو مسلم ظاہر کرے تو تاڑنیوالے تاڑ جاتے ہیں کہ یہ نو مسلم نہیں بلکہ اصلی مسلم ہے۔ اگر یہ نحوست ہے تو ڈپٹی صاحب بھی اس نحوست سے خالی نہیں تھے اسپر اگر کوئی یہ کہے کہ اگر طلبہ کے اندر یہ امتیاز بوجہ نور ولایت کے ہی تو وہ تمھارے نزدیک ولی ہوئے پھر ولی مانکر اُنکی مذمت کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہی کہ میں اسلئے مذمت کرتا ہوں کہ وہ اس نور ولایت کی بیقدری کرتے ہیں اور اسکو مٹانا چاہتے ہیں جیسے کسی شخص کے پاس بڑا قیمتی جوہر ہو اور وہ اُسکی قدر نکرتا ہو بلکہ اُسے ضائع کرنا چاہتا ہو تو ہر شخص اسکو احمق کہے گا دوسرے ولایت کی دو قسمیں ہیں ایک ولایت عامہ دوسرے ولایت خاصہ۔ سو طلبہ میں ولایت عامہ کا تحقق ہے اور ولایت عامہ کا اجتماع مذمت کیساتھ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ ولایت عامہ تو ہر مسلمان میں ہے گو وہ کیسا ہی فاسق ہو اور ظاہر ہے کہ مسلم فاسق باوجود اس ولایت کے محل مذمت و زجر بھی ہے غرض آجکل طلبہ اس طبقہ سے یعنی مولویوں کے زمرہ سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ پھر دوسرا راستہ موجود ہے وھل یتاہ النجدین تمکو اگر مولویت سے عار ہے تو دوسرے طبقہ میں چلے جاؤ اور پوری طرح جنٹلمین ہی بنجاؤ۔ مولویت کیساتھ جنٹلمینی کو کیوں جمع کرتے ہو اس سے تو دونوں فرقوں میں قدر نہیں ہوتی ایسا شخص دونوں جگہ ذلیل ہوتا ہے اور اگر کوئی ایک طبقہ میں کامل طور سے داخل ہو تو کم از کم اُس طبقہ میں تو اُسکی تعظیم ہوگی۔ اور عالم کی تو اہل دنیا میں بھی تعظیم ہوتی ہے بشرطیکہ اسمیں طمع نہو جو مانع عظمت ہی جو عالم طمع سے خالی ہو اُسکی علما بھی تعظیم کرتے ہیں اور دنیادار بھی چاہے اُس کا لباس کیسا ہی خستہ کیوں ہو اور اہل دنیا نہ بھی تعظیم کریں تو علما تو ضرور اُسکی رفعت کریں گے چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے

پاس درس میں آئے جو لباس اور صورت سے بہت ہی خستہ حال تھے طلبہ نے اسکی طرف التفات بھی نکیا یہ سمجھے کہ کوئی معمولی شخص ہے اور یہ علوم غامضہ کا درس کیا خاک سمجھے گا مگر اثنار درس میں اسنے ایک سوال کیا تو سب کی آنکھیں کھلگئیں اور طلبہ کے دل میں اسکی وقعت پیدا ہو گئی کیونکہ ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبر نہالی ست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

واقعی علم ایسی چیز ہے کہ ایک بات میں اسکا پتہ چل جاتا ہے، ہاں تصوف کی قلعی کسیطرح نہیں کھلتی کیونکہ خاموش رہیں تو چپ شاہ کہلائیں۔ بولنے لگیں اور ڈھنگ کی بات کہیں تو محقق و عارف کہلائیں اور بے ڈھنگی ہانکیں تو صاحب رموز مجذوب سمجھے جائیں لیکن علم کی قلعی تو ایک ہی بات میں کھل جاتی ہے۔ یہ چھپ نہیں سکتا۔

علی حزیں شاعر کے پاس ایک شخص آیا لباس سے شان و شوکت ٹپکتی تھی علی حزیں سمجھا کہ شاید کوئی تعلیمیافتہ مہذب شخص ہے یہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا اسکی خاطر سے پاؤں سمیٹ لئے جب بات چیت شروع ہوئی تو علی حزیں نے اس سے نام پوچھا کہا ایسف (بجائے یوسف) علی حزیں نے یہ سنتے ہی پاؤں پھیلا دیئے اور کہا بابا اگر تو ایسف ہستی پس من پائے خود چرا کشم کہ اگر تم ایسف ہو تو میں اپنے پیر کیوں سمیٹوں غرض وہ ایک ہی لفظ سے سمجھ گیا کہ مخاطب محض جاہل ہے اور اسی وقت سے تعظیم قطع کر دی کیونکہ تعظیم تو کمال کی ہوتی ہے لباس کی تعظیم نہیں ہوا کرتی۔ اور اہل دنیا کی جو تعظیم لباس کیوجہ سے کیجاتی ہے اسکا منشا عظمت نہیں بلکہ خوف ہے جیسے سانپ کو دیکھکر لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں چنانچہ جب کسی تھانہ دار کو جیلخانہ کی سزا ہو جاتی ہے وہاں جا کر دیکھئے کہ اسکی کیا گت بنتی ہے چونکہ قانوناً جیلخانہ کے بعد وہ دوبارہ حکومت کے عہدہ پر نہیں جا سکتا اسلئے جیلخانہ والے اسکی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں تو اگر انمیں سے کسی پر زمان حکومت میں اسنے ظلم کیا ہو تو اب وہ خوب اس سے بدلہ لیتے ہیں مارتے ہیں منہ پر تھوکتے ہیں اور بری گت بناتے ہیں میں نے تو ایک مرتبہ جیلخانہ کا معائنہ کیا ہے مجھے تو معائنہ ہی سے بیحد وحشت ہوئی اللہ

سبکو اس سے بچانے البتہ اہل کمال جیلخانہ میں پہونچکر بھی ایسے ہوتے ہیں جیسے شیر کٹھرے میں
بند ہوتا ہے اگر کسی نے جیلخانہ میں جانیسے پہلے انکی عظمت کی ہوگی وہ اب بھی انکی عظمت
کریگا انکی ساتھ اہل دنیا کا سا برتاؤ کوئی نہیں کرتا کٹھرے میں بند شدہ شیر کا قصہ مجھسے ایک
عزیز نے بیان کیا ہے کہ شیر کٹھرہ میں بند تھا ایک شخص لکڑی دکھلا کر اُسے دھمکا رہا تھا اور وہ
کٹھرے میں ٹہل رہا تھا ایک دفعہ جو اُسے غصہ آیا اور اس نے آنکھیں نکال کر اسکی طرف دیکھا اور
غرایا چنگھاڑ ماری تو میاں کھڑے ہی کھڑے گر پڑے بڑی دیر کے بعد ہوش آیا اور لوگوں کو
اس حماقت پر ہنسی آئی کہ یہ خواہ مخواہ ہی ڈرا وہ تو لوہے کی سلاخوں میں بند تھا مگر اُسکی وہ ادا
اسی ہیبت ناک تھی جس سے سب مقدمات ذہن سے رخصت ہوگئے عوام کی عادت ہے
کہ شیر کے متعلق اس قسم کی بات کو سُنکر کہا کرتے ہیں صاحب کیوں نہو آخر شیر ہی جو کہا؟
نہ معلوم اس دلیل کا کیا مطلب ہے اور اُسکو شیر کہنا اُسکی عظمت و ہیبت کی دلیل کیونکر ہوگئی
شاید اس لفظ میں وضعاً کچھ عظمت پر دلالت ہوگی۔ سو اسی طرح اہل کمال جیلخانہ میں بھی
باعظمت ہوتے ہیں شکستہ لباس میں بھی انکا رعب و جلال ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے حضور
صلے اللہ علیہ وسلم کی شان دیکھیے کہ آپ لباس ہمیشہ موٹا پہنتے تھے اور کمبل اوڑھا کرتے تھے
مگر اس کمبل ہی میں رعب و جلال کی یہ حالت تھی کہ سفراء دول آپ سے کانپتے تھے ایکمرتبہ کسی
بادشاہ کا سفیر آپکے سامنے آیا تو صورت دیکھکر تھر تھر کانپنے لگا اُسکی تو یہ حالت تھی اور حضور
کی یہ حالت کہ آپ اپنے رعب کو کم کرنا چاہتے تھے کوئی دنیا کا بادشاہ ہوتا تو اس حالت سے
خوش ہوتا کہ مجھے دیکھکر سفراء دول کانپتے ہیں مگر حضور تو دین کے بادشاہ تھے آپ خود
اسکی خواہش کیوں کرتے چنانچہ سفیر کی یہ حالت دیکھکر آپنے اُسکو تسلی دی اور فرمایا کہ
بھائی مجھسے کیوں ڈرتے ہو میں تو ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی
یعنی غریب تھی جو گوشت کو سکھلا کر دوسرے اوقات کیلئے رکھتی تھی حضور نے اسوقت
اپنی تواضع کو ظاہر فرمایا شاید کوئی کہے کہ لباس آپکا سادہ تھا مگر شاید کوئی اور ہیئت رعب
کی ہوگی تو سنئے حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم مجلس میں اسطرح بیٹھا کرتے
تھے کہ نووارد کو یہ بھی خبر نہوتی تھی کہ ان میں سردار کون ہیں اور خادم کون ہیں کوئی صورت

۳۲

امتیاز کی نہتھی اسی لئے نووارد کو پوچھنا پڑتا تھا من محمد فیکم تم میں محمد کون سے ہیں صحابہ فرماتے ھذا الابیض المتکئ یہ گورے چٹے جو سہارا لگائے بیٹھے ہیں یہ تو نشست وبرخاست کی سادگی تھی اور گفتگو کی سادگی یہ تھی کہ دیہات والے حضور سے یا محمد یا ابن عبد المطلب کہکر گفتگو کرتے تھے صاف نام لیا کرتے القاب و آداب کچھ نہ استعمال کرتے تھے اسمیں کچھ تو انکے دیہاتی ہونیکا اثر تھا اور کچھ عرب میں سادگی ہی تھی سنا ہے کہ ابتک بھی انکی یہی معاشرت ہے کہ وہ اپنے امراء و سلاطین کو نام لیکر خطاب کرتے ہیں شیوخ عرب شریف مکہ کو یا حسین یا حسین کہکر خطاب کرتے ہیں اور آجکل ابن سعود کے متعلق بھی سنا گیا ہے کہ انکے بعضے آدمی یا ابن سعود کہکر ان سے خطاب کرتے ہیں۔ اور چلنے میں حضور کی یہ سادگی تھی کہ آپ اکثر صحابہ کے پیچھے چلتے تھے اور کبھی درمیان میں ہو جاتے غرض میمنہ میسرہ اور مقدمہ ساقہ کی کوئی ترتیب نہ تھی بلکہ کبھی کوئی آپ سے آگے ہو جاتا کبھی آپ آگے ہو جاتے اور کبھی آپ سب سے پیچھے ہو جاتے۔ شاید کوئی کہے کہ آپکا حسن ایسا تھا جس سے دیکھنے والے پر رعب پڑتا ہوگا کیونکہ حسن کا بھی رعب ہوتا ہے تو سنئے حسن کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اول نظر میں دیکھنے والیکو مغلوب کردے مگر بار بار دیکھنے سے رعب کم ہو جائے دوسرے وہ جو اول نظر میں مرعوب نکرے اور جوں جوں نظر کرتا جائے دل میں کھبتا چلا جائے

۵ یزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا

اور حضور کا حسن دوسری قسم کا تھا کہ اول نظر میں مرعوب نکرتا تھا ہاں جتنا زیادہ قرب ہوتا اتنا ہی دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے من راہ بدیھۃ ھابہ وہ ہیبت محض حسن کی نہتھی بلکہ کمالات نبوت کی تھی چنانچہ یہی شان حضور کے واسطہ سے اہل اللہ کو عطا ہوتی ہے کہ وہ جیلخانہ میں بھی اور شکستہ حالت میں بھی باعظمت ہوتے ہیں چنانچہ اس شخص نے جسکا اوپر ذکر ہوا تھا کہ شکستہ حالت میں درس میں آبیٹھا تھا جب درس میں سوال کیا اور اس کا کمال ظاہر ہوا تو سب انکی عظمت کرنے لگے بس میں طلبہ سے کہتا ہوں کہ تمھارا فخر یہی ہے کہ جس جماعت میں تمھارا شمار ہے تم انہی کی اصطلاح اور وضع اور طرز اختیار کرو تمھاری اسی میں عزت و عظمت ہے اور اگر مخلوق میں اس سے عزت

۳۳

نہوئی تو کیا پروا ہے خالق کے یہاں تو ضرور عزت ہوگی پھر تم اپنی وضع کیوں بدلتے ہو عارف اسی کو فرماتے ہیں ؂

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی ۔۔۔ یا فرو شو جامۂ تقوی بہ نیل

اسے جامۂ دعوئ تقوی ۔ اور ؂

یا مکن با پیل بانان دوستی ۔۔۔ یا بنا کن خانہ برانداز پیل

اگر مولویوں میں آئے ہو تو مولویوں کی سی حالت بناؤ اور اگر اس وضع سے ننگ و نام کا اندیشہ ہو تو اس کا جواب دوسری غزل میں اس طرح دیا ہے ؂

گرچہ بدنامیست نزد عاقلاں ۔۔۔ مانمی خواہیم ننگ و نام را

تمکو تو ایسی تواضع اور پستی اختیار کرنا چاہئے کہ تمام دنیا پستی و تواضع میں تمہاری شاگرد ہوجائے اور تم اس شعر کے مصداق ہوجاؤ اور بیانگ دہل یوں کہو ؂

افروختن و سوختن و جامہ دریدن ۔۔۔ پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

اسی مضمون کو مولانا اس طرح فرماتے ہیں ؂

آتش عشق ست کاندر نے فتاد ۔۔۔ شورش عشق است کاندر نے فتاد

غرض تم ایسے متواضع ہو جاؤ کہ ہر چیز میں تمہاری ہی تواضع کا اثر ظاہر ہو تمکو ظاہری اسباب عزت کی کچھ ضرورت نہیں انسان تو وہ ہے جو کمالات میں بادشاہ ہو گو ظاہر میں فقیر ہو عارف فرماتے ہیں ؂

مبین حقیر گدایان عشق را کایں قوم ۔۔۔ شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

اور ایک جگہ اپنی گدائی پر فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؂

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی ہیں ۔۔۔ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

لباس اور وضع سے یا اہل دنیا کے طرز گفتگو سے عزت کا طلب کرنا انسان کا کام نہیں اور یہ تو نہایت ہی بھدا پن ہے کہ لباس سے کسی کی قدر و قیمت پر استدلال کیا جائے یہ بات ہمیں شملہ میں پیش آئی ہے جبکہ ہم وہاں وفد بنکر گئے تھے گو آج کل کے وفود میں شرکت کرنا مجھے پسند نہیں ہے کیونکہ وہ بالآخر وفود ہو جاتے ہیں مگر وہ وفد دیوبند کے حضرات کا تھا آجکل

کے وفو وجیسا نہ تھا جب وہاں پہونچے تو مختلف اوقات میں متعدد حضرات کے بیانات ہوئے جمعہ کے دن میرا بیان ٹھہرا تھا چنانچہ میں جمعہ کی نماز کے بعد بیان کو کھڑا ہوا اسدن غریب مسلمان بھی دوسرے دنوں سے اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور میں تو زیادہ غریب بھی نہیں الحمد للہ متوسط حالت ہے تو میرے کپڑے اپنے نزدیک خاصے تھے مگر ایک جنٹلمین صاحب کی نظر میں وہ بھی حقیر معلوم ہوئے چنانچہ وہ صاحب ہمارے بیانات کے اعلان کرنے والے سے جو ایک ریاست کے کرنل تھے کہنے لگے کہ آپ کے مولویوں کا کیسا لباس ہے جیسے پاخانہ سے نکلکر آئے ہوں شاید کرنل صاحب نے دانشمندی کا جواب دیا کہ میں ابھی کچھ نہیں کہتا بیان کے بعد جواب دونگا چنانچہ بیان ہوا اور وہ معترض بھی بہت محظوظ و حیرت زدہ ہوئے اب کچھ نہیں بولتے مگر کرنل صاحب نے خود پوچھا کہ ہاں اب کہئے آپ کیا فرماتے تھے تو وہ معترض بڑے چپ ہوئے اور کہا اب کیا کہوں میں اپنی حماقت پر خود شرمندہ ہوں میں تو ابتک لباس سے لیاقت پر استدلال کرتا تھا اب معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط ہے افسوس یہ تو تعلیمیافتہ لوگ اتنی عقل پر اپنے کو عاقل سمجھتے ہیں جنکے نزدیک لباس معیار لیاقت ہے۔ لباس کو تو معیار لیاقت کوئی احمق بھی نہیں کہسکتا مگر وہ شملہ کی چوٹی پر رہکر بھی جو ان لوگوں کی گویا معراج ہے اس حماقت میں مبتلا تھے اسکے بعد میرا بیان پھر ہوا اور اسوقت یہ حکایت میرے کان میں پڑ چکی تھی تو میں نے ان لوگوں کے کان کھولنا چاہے میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے بعض خیر خواہان کا یہ خیال ہے کہ علمار کو لباس عمدہ پہننا چاہئے اور غالبًا اُن کا یہ خیال خیر خواہی اور دلسوزی ہی کیوجہ سے ہے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ علمار کی عزت ہو کسی کی نظر میں ذلت نہو اس سے اُنکے بیان کی بھی وقعت بڑھیگی تو ہم اس خیر خواہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں (میں نے اُنہی کے محاورات استعمال کئے جیسے میرٹھ میں ایک انگریزی وکیل ایک دیہاتی سے کہہ رہا تھا کہ مطبل بھی سمجھ گیا) مگر دیکھنا یہ ہے کہ علمار قیمتی لباس کہاں سے پہنیں اُنکی آمدنی کی تو حالت یہ ہے کہ کوئی بیس روپیہ کا مدرس ہے کوئی دس پندرہ روپیہ کا کسی مطبع میں مصحح ہے اور جسکے اسی روپئے یا سو روپیہ ماہوار ہوں وہ تو مولویوں میں صاحب معراج ہے اب بتلایئے وہ عمدہ عمدہ اور قیمتی لباس جو آپ کی نظر میں بھی عمدہ اور قیمتی ہو کس طرح پہنیں سوا اسکے دو ذریعے ہیں جنمیں سے

ایک تو ہمارے نزدیک بھی اور آپ کے نزدیک بھی حرام ہے گو آپ کے نزدیک عقلاً حرام ہے اور ہمارے نزدیک شرعاً حرام ہے اور ایک صرف ہمارے نزدیک حرام ہے دوسری صورت تو یہ ہے کہ مولوی بھی آپکی طرح ڈپٹی کلکٹری اور ججی وغیرہ کے منصب حاصل کریں یہ تو ہمارے نزدیک حرام ہے اور پہلی یہ صورت ہے کہ وعظ کے بعد سوال کیا کریں کہ صاحبو ہمیں پھانسی کے ٹکٹ کی ضرورت ہے یہ سب کے نزدیک حرام ہے ہمارے یہاں نقلاً اور آپ کے یہاں عقلاً تو مولوی تو اس حالت میں عمدہ اور قیمتی لباس پہنانیسے معذور ہیں ہاں ایک صورت اور ہے وہ یہ کہ جن خیرخواہوں کی یہ رای ہے وہ خود یا اپنے چند احباب سے چندہ کرکے ہمارے لئے قیمتی جوڑے اپنی پسند کے موافق بنادیں ہم جب تک شملہ میں رہیں گے ان جوڑوں کو پہنکر وعظ کہا کریں گے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ شملہ سے جاتے ہوے وہ جوڑے آپ کے حوالہ کردیں گے ہم اپنے ساتھ نہ لیجائیں گے پھر آپ ان جوڑوں کو بہتر یہ ہے کہ یہاں کی انجمن میں وقف کردیں اور جب کوئی مولوی ہمارے جیسا خراب خستہ لباس والا آوے اسکو وعظ کہنے کیلئے دیدیا کریں کہ تم اس جوڑے کو پہنکر وعظ کہو تاکہ مخاطبین پر اثر ہو بس وہ جوڑے اسی کام کیواسطے رکھے رہیں اس سے آپکا مقصود بھی حاصل ہو جائیگا اور علماء پر بھی قیمتی کپڑے بنانیکا بار نہ پڑے گا اور چونکہ آپ لوگ علماء سے زیادہ صاحب ثروت ہیں آپکو یہ کام کچھ گراں بھی نہوگا خصوصاً جبکہ آپکی ہی پیش کردہ رائے ہے رہا یہ سوال کہ یہاں سے جاکر تمنے کسی اور جگہ اپنے کپڑوں میں وعظ کہا تو وہاں ذلت ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اور جگہ کے مسلمانوں سے بھی اگر انھوں نے ہمارے لباس کو حقیر سمجھا یہی کہیں گے جو آپ سے کہہ رہے ہیں دوسرے آپکو دوسروں سے کیا لینا آپکو تو اپنے یہاں کا انتظام کرنا چاہئے۔ بس اب میں منتظر ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کون کون صاحب ہمارے لئے جوڑے تیار کرکے لاتے ہیں مگر صدای برنخاست بس آجکل قوم کی یہ حالت ہے کہ سارا الزام مولویوں پر رکھتی ہے اور جب ان کے کام کا وقت آتا ہے تو خاموش ہو کر کان دبا لیتے ہیں بلا تشبیہ آجکل مولویوں کی وہ حالت ہو رہی ہے جو بھٹیاری کے لڑکے کی حالت تھی حکایت تو فحش ہے مگر مطابق حال ہے قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرا میں پہونچا اور بھٹیاری

کو آٹا دال وغیرہ کھانا پکانیکی غرض سے دیا اور سپاہی خود بھی چولھے کے پاس ہی پلنگ
بچھا کر بیٹھ گیا تاکہ بھٹیاری چوری نکر سکے جب اُسنے دیکھا کہ یہ تو سر ہی پر سوار ہے تو کھانا
پکا کر سپاہی کے سامنے رکھا اور اپنے لڑکے سے کہا کہ تو بھی بیٹھ جا چنانچہ وہ بھی سپاہی
کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھکر کھانے لگا اور بھٹیاری نے اسطرح چوری کی مکافات کی
سپاہی نے دستر خوان پر سے لڑکے کو اٹھانا خلاف شرافت سمجھا خاموش ہو گیا اور
بھٹیاری خوشامد میں پنکھا لیکر جھیلنے لگی اتفاق سے بھٹیاری کی ریح زور سے صادر ہوئی
کہ سپاہی نے بھی آواز سُنلی اُسنے شرم اتارنے کو فوراً اپنے لڑکے کے ایک چپت مارا کہ
دُور ہو یہ کیا کرتا ہے سپاہی سمجھ گیا کہ اُسنے شرم اتارنیکے لئے لڑکے پر الزام رکھا ہے
تو اُسنے یہ شرارت کی کہ قصداً زور سے ریح صادر کی اور لڑکے کے ایک دھول رسید کیا
اور کہا مُسٹر کریگا کوئی بگڑیگا تو ہی بس وہی حال آجکل مولویوں کا ہے کہ سارا الزام
انہی پر ہے آریہ نو مسلموں کو مرتد کریں تو علماء پر الزام کہ انھوں نے تبلیغ میں کوتاہی کی۔
قادیانی فرقہ مسلمانوں کو کافر بنائے تو مولویوں پر الزام۔ ترکوں کو جنگ میں شکست
ہو تو مولویوں پر الزام اور اگر ان سے کہا جاے کہ بھائی مولوی اپنی جان سے تبلیغ وغیرہ
کیلئے موجود ہیں مگر اُن کے اہل وعیال کیلئے بھی تو کھانے پینے کا انتظام کیا جائے اور دورہ
کیلئے کرایہ کا بندوبست کیا جائے اسکے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اسکا سامان تم کرو تو
اس کا کچھ جواب نہیں گویا ان کے ذمہ دین کی خدمت بالکل ضروری نہیں ہاں بس ان کے
ذمہ تو یہ ضروری ہے کہ مولویوں کو الزام دیا کریں تو ہم اسمیں بھی راضی ہیں۔ اور میں طلبہ سے
کہتا ہوں کہ تم کسی کی تحقیر کی پروا نکرو اگر کوئی تمہارے لباس پر طعن کرے کرنے دو کوئی
تمہارے طرز میں عیب نکالے نکالنے دو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا کافی ہے تم انکو
راضی کرنے کی فکر کرو اور یاد رکھو کہ عشق میں تو ملامت ہوا ہی کرتی ہے تم خدا تعالیٰ کے
عاشق بننا چاہتے ہو تو ملامت سننے کیلئے تیار رہو ۵

نسازد عشق را کنج سلامت ۔۔۔ خوشا رسوائی کوے ملامت

اور اگر کوئی تمکو نحوست ونکبت سے مطعون کرے یا کوئی دیوانہ کہے تو تم اسکو یہ جواب دو۔

ما اگر قلاشش و گر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

عارف شیرازی سلامت کو مٹانے اور ملامت کو گوارا کرنے کے حق میں فرماتے ہیں

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولی ٭ وین دفتر بے معنی غرق مئی ناب اولی

من حال دل ای زاہد با خلق نخواہم گفت ٭ کایں نغمہ اگر گویم با چنگ و رباب اولی

ایک بزرگ نے چنگ و رباب کی تفسیر ملامت سے کی ہے کہ ملامت کے وقت میں یہ نغمہ عشق ظاہر کروں گا کیونکہ محبوب کیلئے ملامت اور ڈھول دھپہ میں بھی لذت ہوتی ہے اور یہ حالت عشاق مجازی تک پر طاری ہوتی ہے وہ بھی اپنے اشعار میں اسکی لذت کو ظاہر کرتے ہیں

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

جو کلام موثر ہو سمجھ لو کہ حال سے نکلا ہے خواہ عشق حقیقی کا حال ہو یا مجازی کا ہو حالات دونوں کو قریب قریب ہی پیش آتے ہیں ابن عطار اسکندری نے ایک عاشق مجازی کی حکایت اسی مضمون پر لکھی ہے کہ لوگوں نے تہمت عشق پر اسکے سو کوڑے مارے تو ننانوے پر اسنے آہ بھی نکلی سویں کوڑے پر آہ کی کسی نے پوچھا کہ ننانوے کوڑے کا تو تحمل کر لیا اور اخیر کے ایک کوڑے کا تحمل نہوا اسکی کیا وجہ ہے کہا ننانوے تک تو محبوب میرے سامنے تھا وہ کھڑا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا کہ میری محبت میں اسکو یہ مصیبت پیش آئی اس لذت میں مجھے الم ضرب کا احساس نہوا ننانوے کے بعد وہ چلا گیا تو مجھے الم کا احساس ہوا اسلئے آہ نکل گئی تو اے صاحبو یہ اس کا محبوب تھا جو تماشائی ہو گیا اور آپکا محبوب تو ہر دم آپکے ساتھ ہے ہر حالت میں آپکو دیکھ رہا ہے جسکی شان یہ ہے لا تاخذہ سنۃ ولا نوم پھر آپکو ملامت اغیار میں زیادہ لذت آنا چاہئے غرض طلبہ نے یہ نیا طرز سیکھا ہے کہ لباس و گفتگو میں تکلف و تصنع برتنے لگے ایسے ہی تکلف کیواسطے ایک بزرگ فرماتے ہیں

جملہ اوراق و کتب در نار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنٹلمینوں کی وضع چھوڑ کر بزرگ کی وضع بنانے لگو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے لئے کوئی خاص وضع نہ بناؤ جو محبوب دے وہ پہنو شال دے شال اوڑھو

کمبل ہی کمبل اوڑھو اور ہر حال میں خوش رہو مگر حدود شرعیہ سے باہر نہ جاؤ ایک شادی میں دو
شخص جمع تھے جو باہم عزیز تھے مگر ایک نے درویشی اختیار کر لی تھی وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے
اور دوسرے رئیس تھے وہ شال اوڑھے ہوئے تھے اور یہ رشتہ میں بڑے تھے جب دونوں ایک
مجلس میں مجتمع ہوئے تو رئیس نے کہا یہ کمبل اتارو کیا خرافات لباس ہے ہمیں برا لگتا ہے
درویش نے شال کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ تم اسکو اتارو مجھے یہ بری لگتی ہے اس حکایت سے
میرا مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے کمبل ہی میں خوش تھا ایسا ہی تمکو ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ جس
حالت میں رکھیں اسی میں خوش رہو اور کسی کے طعن کی پروا نکرو اور دوسرے وقت اگر اللہ تعالیٰ
تمکو شال اوڑھا دیں تو اسوقت شال اوڑھ لو اب کمبل کے پابند نہو کیونکہ انسان کیلئے اللہ تعالیٰ
نے کوئی خاص حالت عبادت کی مقرر نہیں کی بلکہ اسکی ہر حالت جو حدود کے اندر ہو عبادت ہے
ہمارے حاجی صاحب نے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کی تقریر میں یہ نکتہ
ظاہر فرمایا تھا جس سے اس اشکال کا جواب دیا تھا کہ عبادت تو اشجار و احجار و جبال و سموات
و ملائکہ سب کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے الم تر ان اللہ یسجد لہ من فی السموات ومن
فی الارض الآیہ پھر انسان وجن کی تخصیص آیت میں کیوں کیگئی حضرت نے فرمایا کہ اور
مخلوق کی عبادت مثل مزدور یا نوکر کی خدمت کے ہے جو معین ہوتی ہے اور انسان کی عبادت
غلام کی خدمت کے مثل ہے جسکے لئے کوئی صورت معین نہیں غلام ایک وقت میں آقا کا
پاخانہ بھی اٹھاتا ہے اور دوسرے وقت میں آقا کی وردی پہنکر اسکی جگہ جلسوں میں جاتا ہے
تو غلامی جو حقیقت ہے عبدیت کی اسکی پوری شان انسان ہی میں نمایاں ہے کہ اسکے لئے
کوئی خدمت معین نہیں ایک وقت میں تاج کرمنا اسکے سر پر ہے طوق فضلنا اسکی گردن میں ہے
خلافت الٰہی کی مسند پر بیٹھا ہوا ہے اسوقت تمام عالم اس کا مسخر ہے چنانچہ روح کی تجلی ہوتی ہے
تو تمام عالم اسکے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے اور اسوقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا تعالیٰ
کی تجلی ہے چنانچہ اس مقام پر بہت سے پھسل گئے ہیں کہ تجلی روح کو تجلی الٰہی سمجھکر برسوں اسکی
عبادت کرتے رہے۔ اور ایک وقت میں حضرت انسان پاخانہ میں تشریف فرما ہوتے ہیں
اسوقت اس کا ہگنا موتنا بھی عبادت میں داخل ہے یہ بات کسی مخلوق کو حاصل نہیں یہ حضرت

انسان ہی ہیں جو ہر حالت میں عابد ہیں سوتے ہوئے بھی روتے ہوئے بھی ہنستے ہوئے بھی
جاگتے ہوئے بھی پس میں علماء کو کہتا ہوں کہ تم اپنی ہر حالت کو سرکاری وردی سمجھو نہ ذلت
کی پروا کرو نہ عزت کی غرض مخلوق پر نظر ہی نکرو سب سے نظر ہٹا لو عام صوفیہ کا مشہور قول
ہے کہ اظہار عبادت مخلوق پر ریا ہے اور محققین حضرات کا ارشاد ہے کہ اخفاء عبادت خلق
سے ریا ہے کیونکہ مخلوق پر نظر ہی کیوں گئی جو اُس سے اخفا کا اہتمام کیا اگر تم مخلوق کو ایسا
سمجھتے جیسی مسجد کی صفیں تو اُن سے اخفا نکرتے۔ کوئی مسجد کی صفوں سے بھی اخفا کا اہتمام
کیا کرتا ہے بس تم مخلوق کو کالعدم اور لاشے محض سمجھو کسی پر نظر نکرو صرف ایک ذات پر نظر رکھو ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

یہی تو وحدۃ الوجود ہے جو کسی کی زبان سے کسی طرح نکل گیا وہ کافر کہلاے گئے کیونکہ
اسنے زبان عشق میں اسکو ظاہر کیا اور عاشق کی زبان کافی نہیں ہوتی۔ تو صحیح مراد کیلئے
عاقل کی زبان کافی ہوتی ہے چنانچہ محققین اسی وحدۃ الوجود کو زبان عقل سے ظاہر کرتے
ہیں اُنپر کوئی فتویٰ نہیں لگا سکتا۔ مگر جنپر فتویٰ لگایا گیا ہے انکو اسکی بھی پروا نہیں وہ
اپنے کلام میں تاویل بھی نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایمان و کفر مخلوق کے ہاتھ میں
نہیں ہے اور تاویل وہ کرے جو مخلوق پر کچھ بھی نظر کرتا ہو اور جسکی نظر مخلوق پر بالکل نہو اسکو
اسکی بھی ضرورت نہیں۔ پھر جسکی نظر مخلوق سے اسقدر اٹھی ہوئی ہو اور جسکا یہ مذاق ہو کہ اخفاء
طاعت خلق سے بھی ریا ہے وہ بھلا بڑا بننے کی تو کوشش کیوں کریگا کیونکہ بڑا بننے میں
تو اپنے اوپر بھی نظر ہوتی ہے اور مخلوق پر بھی اور فانی کی نظر کسی پر نہیں ہے۔ اور میں تو
یہ کہتا ہوں کہ بڑا بننے کی تدبیر بھی یہ نہیں ہے جو متکبرین نے اختیار کی ہے کہ بڑا بننے کے
سامان کرتے ہیں بلکہ اُسکی تدبیر بھی یہی ہے کہ اپنے کو مٹا دو۔ افسوس بعض شعراء نے تو اسکو
سمجھ لیا اور آجکل اگر علماء نے بھی اسکو نہ سمجھا ایک شاعر کہتا ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

عنقا نے اپنے کو مٹا دیا تو اُس کا نام اسقدر مشہور ہوا کہ مخلوق کی زبان زد ہے اسی طرح
تم اپنے کو مٹا دو گمنام کر دو سب سے الگ ہو جاؤ تو پھر تمہاری محبوبیت کی یہ شان ہوگی کہ تم جہاں ہوگے

۴۰

تو لوگ تمھارے بولنے کے شیدا ہونگے حجرہ میں بیٹھو گے تو مخلوق تمھارے خروج کی متمنی ہوگی
اور یوں کہے گی ؎

بنمائے رخ کہ خلقے والہ شوند وحیراں　　بکشائے لب کہ فریاد از مرد و زن برآید

مگر اس نیت سے اپنے کو نہ مٹانا کیونکہ اس نیت کیساتھ تم مٹتے ہی کے نہیں اس حالت میں
ڈھیلے پتھر کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ فنا بغرض شہرت کبر ہے اسی طرح تفویض بغرض راحت تجویز
ہے بعض لوگ اس غرض سے تفویض کرتے ہیں کہ اسمیں راحت بہت ہے تم اس کا قصد
کرکے تارک تفویض نہ بنو۔ بلکہ فنا کا اسلئے قصد کرو کہ تم واقع میں فنا ہی کے مستحق ہو ؎ وجودك
ذنب لا یقاس بہ ذنب۔ اور تفویض اس نیت سے کرو کہ یہ محبوب کا حق ہے کہ سب کام
اسی کے سپرد کر دیا جائے ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را　　تو دانی حساب کم و بیش را

اگر کہو یہ بڑی دور کی بات ہے تو میں کہتا ہوں کہ دنیوی مقاصد کون سے قریب ہیں وہ بھی
تو دور ہی ہیں کھانا کھاتے ہو بتلاؤ وہ کتنی دور سے حاصل ہوتا ہے کسی نے بویا کسی نے کاٹا
کسی نے پیسا پھر گوندھا اور توے پر ڈالا اور کھانے بیٹھے پھر بھی اول لقمہ سے سیری نہیں ہوتی
بلکہ لقمہ اخیر سے شبع ہوتا ہے بتلاؤ کتنی لمبی مسافت ہے اسی طرح پانی پیتے ہو تو جرعہ اخیر سے
سیرابی ہوتی ہے وہ بھی تو دور ہی ہے اور تفویض تو اس سے زیادہ قریب ہے چنانچہ حضرت
بایزید نے خواب میں حق تعالیٰ سے پوچھا دلنی علی اقرب الطرق الیك کہ مجھے اپنے پاس
پہونچنے کا نزدیک تر راستہ بتلا دیجئے ارشاد ہوا دع نفسك وتعال کہ اپنے آپ کو چھوڑ دو
اور آجاؤ بتلایئے اسمیں کونسا بعد ہے اپنے کو چھوڑ دو بس وہ قریب ہیں ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

یہ مضمون تو بہت طویل ہے گھنٹوں میں بھی ختم نہو گا اب میں مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں
میں یہ کہہ رہا تھا کہ طلبہ کو تکلف و تصنع سے احتراز کرنا چاہئے اسی کے ضمن میں یہ بات بیان
کی تھی کہ طلبہ آجکل انگریزی الفاظ کے استعمال کو فخر سمجھتے ہیں یہ بہت برا ہے اور یہ گفتگو اسمیں
چلی تھی کہ میں نے تکوین کا ترجمہ تفہیم مخاطبین کیلئے سائنس سے کیا تھا غرض تکوین مقصود

قرآن نہیں ہے بلکہ اصل مقصود دین کا بیان ہے تکوین کا ذکر بھی قرآن میں دین ہی کیلئے ہے مقصوداً نہیں ہے تو اس آیت سے اور جسکی میں نے تلاوت کی ہے کچھ مضامین دینیہ مذکور ہیں حق تعالیٰ انکو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں ان ھذہ تذکرۃ کہ یہ یاد داشت ہے یا نصیحت ہے فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا ۵ اب جس کا جی چاہے اپنے رب تک پہونچنے کا راستہ اختیار کرلے۔ یہاں فمن شاء سے تخییر مطلوب نہیں بلکہ ترغیب وتحریض مقصود ہے۔ یہ میں نے اسلئے کہدیا تاکہ کوئی معقولی اسکو تخییر پر محمول نکرے کیونکہ جنپر معقول کا غلبہ ہوتا ہے انکو ذوق لسان نہیں رہتا۔ تو معقولی صاحب تو یہاں فمن شاء دیکھکر یہ کہیں گے کہ اللہ میاں اختیار دے رہے ہیں کہ جسکا جی چاہے راستہ اختیار کرے اور ایسے واقعات بد فہمی کے معقولیوں سے وقوع میں آچکے ہیں چنانچہ ایک معقولی طالب علم حضرت مولانا گنگوہی رح کے یہاں درس حدیث میں شریک تھے مگر حدیث تفسیر میں بھی مشغول تھے جب ترمذی کی اول حدیث آئی لا یقبل اللہ صلوٰۃ بغیر طھور اور اس سے اشتراط وضو پر استدلال کیا گیا۔ تو معقولی صاحب بولے کہ اس سے شرط صحت ہونا تو معلوم نہوا صرف شرط قبول ہونا معلوم ہوا جو اس طرح بھی متحقق ہو سکتا ہے کہ نماز کی صحت تو بدون وضو کے بھی ہوجائے مگر مقبول نہ ہو پھر بعد نماز کے وضو کرے جس سے اب نماز قبول ہوجائے۔ بس اس کا جواب بدون اسکے اور کیا ہے کہ معقول کی وجہ سے انکا ذوق لسان مسخ ہوگیا۔ جسکو ذرا بھی زبان کا ذوق ہوگا وہ لا یقبل اللہ صلوٰۃ بغیر طھور سے تقدم طہور کی ضرورت کو معاً سمجھ لیگا۔ اسی طرح حضرت مولانا گنگوہی رح کے پاس ایک شخص آیا اور مسئلہ پوچھا کہ آدھا چوہا کٹکر کنوئیں میں گر پڑا کتنے ڈول نکالے جائیں تو ایک معقولی صاحب جلدی سے بولے کہ تیرہ ڈول نکالدو۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ تو حمق ہے سارا پانی نکالدو۔ کنواں ناپاک ہوگیا بعد میں معقولی صاحب نے حضرت سے پوچھا کہ پورا چوہا گر پڑے اور مر جائے تو بیس سے تیس ڈول تک کا حکم ہے اور آدھی دم گرنے پر آپنے سارا پانی نکالنا واجب کردیا اسکی کیا دلیل ہے حضرت نے فرمایا کہ تمنے تیرہ ڈول کس دلیل سے بتلائے کہا میں نے بیس اور تیس کا اوسط نکالا پچیس

کال لیا تھا پھر جب پورا چوہا گرتا تو پچیس ڈول ہوتے اب آدھا گرا ہے تو پچیس کا
دہا ساڑھے بارہ ہوتے تھے میں نے کسر کو پورا کر کے تیرہ ڈول بتلا دیئے اور پورا نکالنا
واجب ہو تو الکل اعظم من الجزء کے خلاف لازم آتا ہے اور اپنی حماقت سے یہ نہ سمجھا کہ
جب کٹکر گرا ہے تو کنوئیں میں دم مسفوح گرا اور دم مسفوح کا ایک قطرہ بھی ساری کنوئیں کو
ناپاک کرنیکے لئے کافی ہے اگر معقولی صاحب کو اسکا ہوش ہوتا تو سمجھتے کہ واقعی میرا حساب
غلط تھا۔ ایک واقعہ معقولی کے ساتھ خود مجھے پیش آیا ہے ہیں کانپور میں حدیث پڑھا
رہا تھا ایک معقولی صاحب بھی درس میں آ بیٹھے تھے یہ حدیث آئی من انتمی الی
غیر الویہ لم یرح ریح الجنۃ جو شخص اپنے خاندان کو چھوڑ کر دوسرے خاندان کیطرف
اپنی نسبت کریگا وہ جنت کی خوشبو نہ پائیگا۔ آجکل شہروں میں یہ مرض بہت شائع
ہو گیا ہے۔ شہر میں جا کر جولاہے بھی سید ہو جاتے ہیں چنانچہ کابل سے ایک جولاہہ
ہندوستان آیا اور یہاں آکر پٹھان بنگیا کچھ دنوں کے بعد ایک پٹھان آیا اسنے
جو دیکھا کہ جولاہہ نے اپنے کو پٹھان بنا رکھا ہے تو وہ سید بنگئے اسکے بعد ایک سید صاحب
آئے انھوں نے دیکھا کہ یہاں پٹھان نے اپنے کو سید بنا رکھا ہے تو آپنے یہ کہنا
شروع کیا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں (نعوذ باللہ منہ) لوگوں نے اسپر ہنسنا شروع کیا تو
سید نے کہا کہ جس ملک میں جولاہہ پٹھان اور پٹھان سید بنجاتا ہے وہاں سید اگر
خدا کا بیٹا بنجائے تو کیا تعجب ہے اسنے سبکی قلعی کھولدی تو میں نے اس حدیث کی شرح
میں کہا کہ یہ بہت سخت وعید ہے کہ ایسے شخص کو جنت کی خوشبو بھی نہ آئے گی
تو جنت میں تو کیا جاتا تو معقولی صاحب بولے کہ اس سے دخول جنت کی نفی تو لازم
نہیں آتی ممکن ہی کہ وہ جنت میں داخل ہو کر بھی خوشبو نہ سونگھے میں نے کہا یہ کیونکر
کہنے لگے اسطرح کہ وہ مزکوم ہو جائے۔ میں نے کہا سبحان اللہ جنت میں بھی زکام ہوا تو
جنت کیا ہوئی۔ غرض یہ معقولی محض الفاظ کے چکر میں رہتے ہیں اور امکانات بعیدہ
ہی نکالتے رہتے ہیں چنانچہ ایک معقولی صاحب ایک تیلی کی دکان پر تیل لینے گئے
وہاں دیکھا کہ بیل کی گردن میں گھنٹی پڑی ہوتی ہے پوچھا بھائی اس گھنٹی میں کیا حکمت ہے

تیلی نے کہا کہ ہم لوگ غریب آدمی ہیں سارے کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتے ہیں ہر وقت بیل کی ساتھ نہیں رہ سکتے یہ گھنٹی اسکے گلے میں اسلئے ڈالدی ہے تاکہ اسکے بجنے سے معلوم ہوتا رہے کہ بیل چل رہا ہے اگر گھنٹی بند ہوتی ہے تو ہم اگر بیل کو پھر چلا دیتے ہیں اور چلا کر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ معقولی صاحب بولے کہ گھنٹی کا بجنا بیل کے چلنے کی دلیل تو نہیں ہو سکتی ممکن ہے کہ وہ کھڑا کھڑا سر ہلاتا رہے تیلی نے کہا مولوی صاحب میرے بیل نے منطق نہیں پڑہی آپ جلدی یہاں سے تشریف لیجائیے کہیں وہ منطق نہ سیکھ لے پھر ہماری تو مصیبت آجائے گی۔

یہ غلو فی المعقول کا نتیجہ ہے کہ ان کو مشاہدات و واقعات میں بھی توہمات پیدا ہوتے ہیں پھر کمال یہ کہ محض توہمات ہی پر ورق کے ورق سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں چنانچہ ایک مسئلہ ان کے یہاں مشہور ہے کہ قضیہ موجبہ میں وجود موضوع شرط ہے نہ معلوم اس دعوی کی دلیل کیا ہے محض توہم ہے اور کچھ بھی نہیں مگر اس مسئلہ کو مانکر پھر جو اشکالات وارد کرنے اور انکے جواب دینے شروع کئے ہیں تو بڑی لمبی بحث ہو گئی ہے۔ اللہ بھلا کرے حمد اللہ کا اس نے اسکو رد کیا ہے اور کہا کہ قضیہ موجبہ کیلئے وجود موضوع کی ضرورت نہیں صرف ربط موضوع بالمحمول کافی ہے اور بہت سے مسائل معقولیہ اسی شان کے ہیں۔ تو میں نے ایسے ہی معقولیوں کا وہم رفع کرنیکے لئے کہا ہے کہ یہاں تخییر مراد نہیں اور اگر فمن شاء سے تخییر ہی مراد ہوا کرے تو ایک مقام پر ارشاد ہے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر کیا اسکو بھی تخییر پر محمول کیا جائیگا ہرگز نہیں بلکہ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا میں ترغیب و تسہیل مراد ہے مطلب یہ ہے کہ یہ مضامین تذکرہ ہیں جنسے خدا کا راستہ آسان ہو گیا اسلئے ہم اعلان عام کرتے ہیں کہ جس کا دل چاہے خدا کے رستہ پر چلے اب کچھ دشواری نہیں یہ تو آیت کی تفسیر تھی اس سے میرا مقصود یہ ہے کہ اس آیت میں گو ان ھذہ کا مشار الیہ ظاہراً صرف سورۂ دہر کے مضامین ہیں لیکن یہ شان تمام ہی قرآن کی ہے کیونکہ قرآن میں جابجا قرآن کو تذکرہ اور ذکر اور ذکری کہا گیا ہے جس سے خاص مضامین پر اشارہ نہیں ہے بلکہ سارے قرآن کے مضامین پر اشارہ ہے

چنانچہ ایک مقام پر ہے ان فی ھذا لبلاغاً لقوم عابدین ایک مقام پر ہے ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب اور یہاں یقیناً ذلک سے پورا قرآن مراد ہے اور سورہ عبس میں ہے کلا انہ تذکرۃ فمن شاء ذکرہ فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطھرۃ بایدی سفرۃ کرام بررۃ یہاں تو یقیناً انہ تذکرہ سے تمام قرآن ہی مراد ہے، تو حاصل اس جملہ کا یہ ہوا کہ قرآن (بلکہ تمام شریعت کیونکہ قرآن ساری شریعت کی اصل ہے باقی سب اسی کی شرح ہے اسی واسطے بعض حدیث میں قرآن سے مراد مطلق شریعت بھی وارد ہے چنانچہ اقض بیننا بکتاب اللہ کہنے پر رجم فرمایا گیا جو کہ قرآن میں نہیں ہے غرض قرآن بلکہ سب دین) تذکرہ ہے اور یادداشت ہے کس چیز کی؟ سبیل رب کی کیونکہ آگے اختیار سبیل رب کو اسی صفت تذکرہ پر مرتب کیا گیا ہے رب سبیل کو سمجھئے سبیل کہتے ہیں لغت میں راستہ کو۔ اور راستہ کی دو قسمیں ہیں ایک لمبا راستہ جسکو سفر کہتے ہیں اور ایک مختصر اور قصیر راستہ اب غور کیجئے کہ حق تعالیٰ تک پہونچنے کا راستہ قصیر ہے یا طویل؟ ظاہر ہے کہ طویل ہے۔ یہ راستہ قصیر تو انکے نزدیک ہوگا جو عید بقرعید کے نمازی ہوں ورنہ یہ تو ساری عمر کا قصہ ہے کسی دن بھی اسکے طے کرنیسے بس نہیں کر سکتے اگر ہزار سال کی بھی عمر ہو جب بھی نماز فرض رہے گی روزہ فرض رہے گا زکوٰۃ فرض رہے گی غرض کسی وقت فرائض سے سبکدوشی نہیں ہو سکتی گویا عمر بھر اسی راستہ کو طے کرتے رہتے ہیں جیسے ہمارے حضرت حافظ ضامن صاحبؒ نے اس شخص سے پوچھا کہ آپکا لڑکا کیا پڑھتا ہے کہا قرآن حفظ کرتا ہے فرمایا ارے اس بیچارے کو کیوں جنم روگ لگایا حافظ صاحب میں مزاح بہت تھا اسلئے گفتگو کے عنوان ایسے ہی ہوا کرتے تھے مگر حقیقت اسکی یہ تھی کہ حفظ قرآن ایک دن کا کام نہیں عمر بھر کا کام ہے ساری عمر اسی میں لگا رہے تب تو محفوظ رہتا ہے ورنہ بہت جلد حفظ سے نکل جاتا ہے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ رجب کا مہینہ آتے ہی حفاظ کو قرآن یاد کرنے کی فکر ہوگی دور شروع ہو جائیگا۔ پانی پت میں ایک رئیس ہیں وہ سبعہ قراءت کے حافظ ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر سال ایک قاری کی روایت میں تراویح سناتے ہیں مگر کیا مجال کہ دوسری قراءت کا اسمیں اختلاط ہو جائے اگر قالون

کی روایت شروع کریں گے تو اخیر تک قالون ہی کی روایت رہے گی ورش کی روایت کا اسمیں خلط نہو گا بڑا اچھا حافظہ ہے مگر یہ اسکی بدولت ہی کہ ہر سال رجب سے جو وہ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں پھر کسی کام کو نہیں دیکھتے اسی طرح ساری شریعت ہے کہ یہ عمر بھر کا کام ہے ایک دو دن کا کام نہیں نوافل و مستحبات کو تو آدمی ترک کر سکتا ہے مگر فرائض و واجبات سے عمر بھر چھٹکارا نہیں ہوسکتا پھر مزا یہ ہے کہ فرائض و واجبات اور تلاوت قرآن کی پابندی کرنیسے کچھ نام ہی نہیں ہوتا مستحبات و نوافل کی پابندی میں نام اور امتیاز زیادہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ طالبانِ دنیا وظائف کو ناغہ نہیں کرتے مگر نماز قرآن کو ناغہ کرتے رہتے ہیں فرائض و واجبات کو ضائع کرتے رہتے ہیں کیونکہ اُنکو نام مقصود ہے راستہ کاٹنے کرنا مقصود نہیں ورنہ اہم واقدم کا زیادہ اہتمام کرتے۔ میرٹھ میں ایک رشوت خوار تھے وہ وظیفہ کے تو اتنے پابند کہ اشراق تک وظیفہ پڑھتے اور اس درمیان میں کسی سے بات نکرتے مگر اسی وقت میں اشارات سے رشوت کا معاملہ بھی طے ہوتا رہتا تھا مقدمہ والا اشارہ سے ایک کہتا یہ انگلی کے اشارہ سے دو کہتے پھر اشارات ہی میں معاملہ طے ہوجاتا سو یہ تقویٰ کلابی کہلاتا ہے کہ وظیفہ میں بات کرنیسے تو اتنا پرہیز اور رشوت سے پرہیز نہیں کتے کی بھی یہی حالت ہے کہ ٹانگ کی تو اتنی احتیاط کرتا ہے کہ اُسکو اٹھا کر موتتا ہے تاکہ پیشاب کی چھینٹ نہ پڑجائے اور منہ کو گوہ میں بھی ڈالدیتا ہے جیسے ایک تیلن سے کسی نے پوچھا کہ تیرا میاں کہاں ہے وہ چونکہ نئی نئی دولہن تھی جسکے لئے منہ سے بولنا عیب ہے اُس نے زبان سے تو کچھ جواب ندیا مگر لہنگا اٹھا کر پیشاب کیا اور پیشاب کے اوپر کو پھاندگئی مطلب یہ تھا کہ دریا پار گیا ہے یہی حالت اہل دنیا کے وظائف کی ہے بہرحال خدا کا راستہ قصیر نہیں بلکہ طویل ہے کہ عمر دراز میں بھی طے نہیں ہوسکتا مگر جنکو توفیق دی گئی ہے اُنکے لئے قصیر ہوجاتا ہے گو واقع میں طویل ہے جیسے قیامت کے بارہ میں ارشاد ہے فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ کہ وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا مگر حدیث میں آیا ہے کہ مومن کو اتنا چھوٹا معلوم ہوگا جیسے ایک نماز کے شروع سے اسکے ختم کرنے تک فاصلہ

ہوتا ہے۔ اور اوپر جو حضرت بایزید کے قصہ میں طریق دین کا قصیر ہونا بیان کیا گیا ہے مراد اُس قصر سے سہولت ہی بمقابلہ مشاق دنیا کے۔ اب سمجھئے اور اسی بات کا سمجھانا اس بیان سے مقصود ہے کہ جب خدا کا راستہ طویل ہے اور ہم اسپر چل رہے ہیں تو ہم ہر وقت سفر میں ہوئے اور قرآن اُس سفر کی یادداشت ہے جو اس راستہ سے منازل و مقامات سے ہمکو آگاہ کرتا ہے جب ہم سفر میں ہوئے تو بتلائیے کیا سفر میں بھی چین ہوا کرتا ہے مگر افسوس ہم کیسے بیفکر و مطمئن ہیں گویا وطن میں بیٹھے ہوئے ہیں اے صاحب جسکو ہر وقت سفر درپیش ہو وہ کیونکر مطمئن ہو کر بیٹھ سکتا ہے اور جسکے سامنے اتنا لمبا سفر ہو وہ کیونکر دل کھول کے ہنس سکتا ہے اسی لئے حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اسی باب میں اسطرح بیان کیگئی ہے کان دائم الفکرۃ متواصل الاحزان کہ آپ ہمیشہ فکر و سوچ میں اور رنج و غم میں رہتے تھے اور اس فکر و غم ہی کا یہ اثر تھا کہ آپ کبھی کھلکر ہنستے نہ تھے حدیث میں ہے کان جل ضحکہ التبسم کہ آپکا بڑا ہنسنا یہ ہوتا تھا کہ تبسم فرمالیتے تھے اور یہ بھی حضور ہی کا حوصلہ تھا کہ ہماری خاطر سے تبسم ہی فرمالیتے تھے ورنہ جسکے سامنے وہ احوال شدیدہ ہوں جو حضور پر منکشف تھے اُسکو تو تبسم بھی نہیں ہو سکتا شاید کوئی اسپر یہ شبہ کرنے کہ حضور کو کیا خوف تھا آپ سے تو سب ذنوب کے بخشدیئے جانے کا وعدہ ہو چکا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ بس آپ کے نزدیک جہنم ہی تو ایک خوف کا سبب ہے۔ صاحب اس سے بڑھکر عظمت حق کا انکشاف خوف کا سبب ہے جسپر عظمت حق کا انکشاف ہوگیا ہے وہ جہنم کو تو تصور میں بھی نہیں لاتا پھر اس سے آگے ایک اور مقام ہے جسمیں باوجود مغفرت ذنوب کے بھی جہنم سے اطمینان نہیں (وھو انکشاف قدرۃ الحق) اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لو علمتم ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا یعنی اگر تم وہ باتیں جانتے جو مجھے معلوم ہیں تو بہت کم ہنستے اور زیادہ رویا کرتے۔ اس جگہ کم ہنسنے کے معنی یہ ہیں کہ بالکل نہ ہنستے مگر یہ محاورہ ایسا ہے جیسا اردو میں آپ کہا کرتے ہیں کہ میں ایسا روگ کم پاتا ہوں یعنی نہیں پاتا اور محاورات اکثر تمام زبانوں میں مشترک ہوتے ہیں قرآن

میں اور جگہ بھی یہ استعمال آیا ہے جہاں قلت کے معنی ہو ہی نہیں سکتے عدم ہی کے معنی ہو سکتے ہیں یعنی فقلیلا ما یؤمنون اس جگہ عام واعظوں کی ایک غلطی یاد آئی وہ یہ کہ قرآن مجید میں ہے فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا واعظین اسکو امر سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تم واجب کو ترک کرتے ہو قرآن میں تو کثرت بکاء کا امر ہے اور تم بالکل نہیں روتے۔ مگر یہ ان واعظین کی غلطی ہے یہاں معنی امر مراد نہیں بلکہ امر بمعنی خبر ہے جسمیں کفار کی سزا اور عذاب کا ذکر ہے جسکی دلیل سیاق سباق ہے چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے وقالوا لا تنفروا فی الحر قل نار جہنم اشد حرا لو کانوا یفقہون ٥ اور اسکے بعد ارشاد ہے جزاء بما کانوا یعملون اور درمیان میں ہے فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ بکاء سزا ہے اور ظاہر ہے کہ سزا وہ چیز ہو سکتی ہے جو سزا پانیوالے کے اختیار میں نہو بلکہ سزا دینے والے کے اختیار میں ہو اور اگر یہاں معنی انشاء مراد ہونگے تو ضحک و بکاء مخاطب کے اختیار میں ہوگا اور وہ جزا نہیں ہو سکتا پس ثابت ہو گیا کہ یہاں معنی انشاء مراد نہیں بلکہ خبر دینا مقصود ہے کہ ان مشرکین کی سزا یہ ہے کہ وہ تھوڑے دنوں میں ہنس کھیل لیں اور اسکے بعد زیادہ روئیں گے اپنے اعمال کی سزا میں۔ اور خبر کو انشاء کی صورت میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسا کہ ہمارے محاورہ میں بھی کہا کرتے ہیں کہ اب سر پکڑ کر روؤ تمھاری یہی سزا ہے یعنی اب روؤگے اور اپنے کئے کی سزا بھگتوگے پس اسی طرح قرآن کا یہ محاورہ ہے جس سے معنی امر مقصود نہیں اور اگر بفرض محال امر ہی مقصود ہوتا تو سیاق و سباق کیوجہ سے مخاطب کفار ہی ہوتے مسلمانوں کو پھر بھی خطاب نہ ہوتا اسلئے واعظین کا اس سے مسلمانوں کیلئے کثرت بکاء کا مامور بہ ہونا ثابت کرنا غلط ہے۔ یہ بیچ میں استطراداً ایک فائدہ تفسیریہ بیان کر دیا گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر جو امور عظام و اہوال شدیدہ تھے انکے ہوتے ہوئے کسی کو ہنسنے کی تاب نہیں ہو سکتی تھی یہ حضور ہی کا حوصلہ تھا کہ آپ اسکے باوجود بھی تبسم فرما لیتے تھے اسپر اگر یہ سوال ہو کہ پھر آپ تبسم بھی کیوں فرماتے تھے اسکے دو جواب ہیں ایک یہ کہ

ہماری خاطر سے تاکہ لوگوں کا کلیجہ نہ پھٹ جائے اور وہ یوں نہ کہیں کہ جب حضور ہر وقت غمگین رہتے ہیں تو ہمارا تو پھر کہاں ٹھکانا ہے لوگ اس سے مایوس ہو جاتے اسلئے حضور گاہ گاہ تبسم فرلیا کرتے دوسرے یہ بھی کہسکتے ہیں کہ ضحک و تبسم خاصہ بشریہ ہے کہ ہنسی کی بات پر ہنسی آہی جاتی ہے چاہے اندر سے دل پر کیسا ہی غم کا پہاڑ ہو مشہور ہے کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے کیونکہ خاصہ بشریہ ہے۔ تو صاحبو! جب حضور کی یہ حالت تھی کہ آپ ہمیشہ فکرمند اور اندوہگیں رہتے تھے تو ہم آخر کس بات پر بیفکر ہیں اور ہم دنیا سے خوش اور مطمئن کیونکر ہو گئے حالانکہ یہ بیفکری بھی بہت سخت حالت ہے حق تعالیٰ ایک مقام پر کفار کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ورضوا بالحیوٰۃ الدنیا واطمأنوا بہا کہ وہ دنیا سے خوش اور مطمئن ہو گئے اس سے معلوم ہوا کہ رضا بالدنیا مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اسوقت مذموم ہے جبکہ اسکے ساتھ اطمینان اور بیفکری بھی ہو ورنہ واطمأنوا بہا نہ بڑھایا جاتا۔ پس معلوم ہوا کہ مذمت میں اس اطمینان کو بھی دخل ہے گو یہ اطمینان بالدنیا کفر سے کم ہی ہے مگر ایسا کم ہے جیسا آسمان عرش سے کم ہے مگر فی نفسہ تو بہت بڑا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

آسمان نسبت بعرش آمد فرود   لیک بس عالی ست پیش خاک تود

اسی طرح اطمینان بالدنیا بہت سخت چیز ہے جبھی تو اسکو کفار کی مذمت میں بیان کیا گیا گو کفر سے کم ہو اس جگہ جملہ معترضہ کے طور پر ایک تحقیق لغت کی بھی بیان کردوں کہ آسمان لفظ مفرد نہیں ہے بلکہ مرکب ہے، آس اور مان سے آس بمعنی آسیا چکی کو کہتے ہیں اور مان بمعنی مانند ہے تو یہ لفظ اصل میں آسیامان تھا کثرت استعمال سے تخفیف کر کے آسیا کو آس بنالیا گیا آسمان ہو گیا۔ گو ہمیں فارسی دانی کا دعویٰ نہیں مگر جو لوگ اسکے مدعی ہیں وہ اس نئی تحقیق کو سنلیں غالباً انکے بھی خیال میں یہ بات نہ آئی ہو گی۔ پس آسمان کو آسمان اسلئے کہتے ہیں کہ ان اہل لغت کے نزدیک چکی کی طرح اسمیں بھی حرکت دوریہ ہے۔ غرض رضا بالدنیا و اطمینان بہا گو بمقابلہ کفر کے کم ہے مگر فی نفسہ بہت بڑا مرض ہے اس کا علاج کرنا چاہیئے جسکی ایک صورت یہ ہے جو میں اسوقت بیان کر رہا ہوں

کہ انسان یہ تصور پیش نظر رکھے کہ میں ہر وقت سفر میں ہوں چنانچہ قرآن کی اس آیت سے بطور دلالت التزام کے یہ بات ثابت ہے کہ انسان سفر میں ہے اور اسکے لوازم سے ہے بےچینی اور عدم اطمینان کیونکہ مسافر کو منزل پر پہونچنے سے پہلے اطمینان نہیں ہوا کرتا بلکہ مسافر کے لئے غیر منزل کے ساتھ اطمینان اور رضا خود موانع سفر سے ہے جو مسافر غیر منزل سے دل لگالیگا اور اسی میں قیام کر کے بےفکر ہوجائیگا یقیناً منزل پر نہ پہونچ سکے گا ان سب باتوں کو بھی قرآن نے بتلا دیا ہے کہ دنیا سے رضا اور اطمینان نہ ہونا چاہیئے۔ پس قرآن سے بدلالت مطابقی ہمارا مسافر ہونا بھی ثابت ہے اور بدلالت التزامی سفر کے لوازم بھی ثابت ہیں اور اسکے موانع بھی بتلا دیئے گئے ہیں اب اس مضمون میں کیا شبہ ہے۔ اور سنئے لوازم سفر سے طریق کا مبدا و منتہا بھی ہے سو مبدا کے بیان کی تو اسلئے ضرورت نہیں کہ وہ تو چلنے والے کے سامنے ہے اور منتہا کا ذکر قرآن میں جابجا آیا ہے چنانچہ بار بار فرماتے ہیں والی اللّٰہ ترجع الامور۔ والی ربک الرجعی۔ والی اللّٰہ المصیر ۵ اور ایک مقام پر صاف ارشاد ہے وعلی اللّٰہ قصد السبیل ومنہا جائر کہ سیدھا راستہ ہی خدا تک پہونچتا ہے اور بعضے ٹیڑھے راستے بھی ہیں (اور سیدھے راستہ کی توفیق اسکو ہوتی ہے جو طالب حق ہو) ولو شاء لھدیٰکم اجمعین اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم سبکو (سیدھے راستہ کی طرف جبراً) ہدایت کر دیتے (مگر چونکہ یہ دار الابتلار ہے اسلئے جبر نہیں کیا جاتا لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی) مشہور تفسیر تو یہ ہے وعلی اللّٰہ بیان قصد السبیل ومنہا جائر مگر اسمیں مضاف کا حذف ہے جو بلا ضرورت خلاف اصل ہے اسلئے میرے نزدیک یہاں علی بمعنی الیٰ ہے جو قرآن میں جابجا آیا ہے چنانچہ بما انزل علینا بمعنی بما انزل الینا آیا ہے اور بھی اسکی نظائر تلاش سے ملیں گی اس صورت میں حذف کی ضرورت نہو گی تو منتہائے سفر بھی قرآن میں مذکور ہے۔ پھر لوازم سفر سے علامات بھی ہیں ہر راستہ کی کچھ علامات ہوتی ہیں تو یہاں بھی کچھ علامات ہونا چاہئیں بلکہ یہاں ضرورت زیادہ ہے کیونکہ یہ سبیل محسوس نہیں بلکہ معنوی ہے سو قرآن میں اس

راستہ کی علامات بھی مذکور ہیں فرماتے ہیں ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب۔ شعائر اللہ وہی علامات ہیں جو خدا کی طرف چلنے کی دلیل ہیں یعنی نماز و روزہ اور حج اور تمام عبادات یہ سب اس راستہ کی علامات ہیں جن پر کسی کو چلتا ہوا دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف چل رہا ہے پھر لوازم سفر سے ضیاء بھی ہے کیونکہ راستہ میں تاریکی ہو تو چلنا دشوار ہے۔ سیر فی الطریق رؤیت طریق پر موقوف ہے اور رؤیت بدون ضیا کے نہیں ہو سکتی۔ تو قرآن میں اس راستہ کیلئے بھی ضیاء بھی ثابت ہے چنانچہ فرماتے ہیں ھذا بصائر من ربکم وھدی ورحمۃ لقوم یومنون اسمیں لفظ بصائر سے ضیاء پر دلالت ہے ایک دفعہ مجھے اس آیت میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ اس جگہ تین چیزیں کیوں بیان کیگئیں بصائر و ھدی و رحمۃ پھر سمجھ میں آیا کہ راستہ چلنے میں ایک تو رہبر کی ضرورت ہے وہ تو ھدی ہے پھر رہبر کی عنایت و شفقت کی ضرورت کہ مختصر اور سہل راستہ سے لیجائے وہ رحمت ہے پھر اسکی بھی ضرورت ہے کہ چلنے والا سوانکھا ہو اگر راستہ حسی ہے تو بصر کی ضرورت ہے اور معنوی ہے تو بصیرت کی ضرورت ہے اسکا ذکر بصائر میں ہے مگر بصائر سے مراد اسباب بصیرت ہیں یعنی ضیاء کیونکہ قرآن کو جو بصیرت فرمایا ہے ظاہر ہے کہ وہ اسباب بصیرت میں سے ہے پس قرآن میں ضیاء معنوی موجود ہے جسمیں تامل کرنیسے بصیرت کام کرنے لگتی ہے اور اُسکو راستہ نظر آنے لگتا ہے پس اس آیت سے ضیاء بھی ثابت ہوئی اور دوسری آیات میں تو صاف طور پر لفظ نور وارد ہے لقد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجھم من الظلمت الی النور ۔ غرض قرآن سے سفر اور لوازم سفر سب ثابت ہیں پھر حضرات صوفیہ کے کلام کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو ان سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا اُن کے کلام میں یہ حقیقت نمایاں طور پر مذکور ہے چنانچہ انھوں نے عمل بالشریعۃ کا نام سلوک رکھا ہے جو سفر کے معنی میں ہے اور شریعت پر چلنے والے کو سالک کہتے ہیں اور اعمال کا نام مقامات رکھا جو منازل کے معنی میں ہے شاید کوئی کہے کہ تمکو صوفیہ سے محبت ہے اسلئے خوش اعتقادی کی وجہ سے یوں سمجھ لیا

کہ صوفیہ نے قرآن سے اس مضمون کو سمجھکر یہ نام رکھے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں بہت اچھا
اگر انھوں نے قصداً قرآن سے سمجھکر یہ نام نہیں رکھے تو یہ ماننا پڑے گا کہ انکی طبیعت
میں سلامتی ایسی تھی کہ انکی زبان سے وہی بات نکلی جو خدا تعالیٰ نے قرآن میں بتلائی
ہے مگر جب صوفیہ کے کلام میں یہ مضمون جابجا پوری صراحت سے مذکور ہے تو ہم کیوں
نہ کہیں کہ انھوں نے حقیقت کو قرآن سے سمجھکر یہ نام رکھے ہیں چنانچہ عارف
فرماتے ہیں ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم + جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

اسمیں تو صاف سفر کے معنی پر دلالت ہے کہ مجھکو محبوب کا راستہ طے کرنے میں کسی
منزل پر چین کیونکر آئے جبکہ ہر مقام پر جرس یہ کہتا ہے کہ اسباب باندھو اور آگے چلو
جرس سے مراد شیوخ کا ارشاد ہے کہ وہ کسی مقام پر توقف کی اجازت نہیں دیتے بلکہ ہر
مقام سے آگے بڑھنے کی تاکید کرتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

گو بعض دفعہ توقف کی بھی اجازت ہے جسکی حقیقت آگے بیان کرونگا اگر یاد رہا اور
خدا کرے یاد رہے۔ یا شوق قلب مراد ہے کہ کسی مقام پر شوق کو سکون نہیں کیونکہ
منزل مقصود اس سے بھی آگے ہے شوق کو سکون تو وصال تام کے بعد ہوگا جو جنت
میں حاصل ہوگا اور یہاں تو ہر منزل پر وصال ناقص ہے گو پہلی منزل کے اعتبار سے
کامل ہے غرض شوق کو یا ارشاد شیوخ کو جرس سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ لشکر کے کوچ
کے وقت پہلے گھنٹی بجا کرتی تھی جیسے اب بھی اسٹیشن پر بجا کرتی ہے اور آجکل لشکر کے
کوچ کیوقت بگل بجایا جاتا ہے مگر طبعاً جرس سے بہ نسبت بگل کے ایک گونہ الفت
سی معلوم ہوتی ہے۔ شاید کوئی کہے کہ یہ مولویت کا غلبہ ہے سو الحمد للہ تمنے فضیلت
کا خود اقرار کرلیا والفضل ما شہدت بہ الاعداء۔ ہم تو اسپر خدا کا شکر کرتے ہیں کہ ہمکو پرانی
چیزوں سے الفت ہے جنسے سلف کو الفت تھی اور نئی چیزوں سے وحشت ہے چنانچہ
چراغ کی روشنی سے مجھے زیادہ فرحت ہوتی ہے خصوصاً شمع کی روشنی تو بہت ہی

دلفریب ہے اور برقی روشنی سے تو نگاہ کو خیرگی دلکو تیرگی ہوتی ہے۔ یہ محض قافیہ نہیں بلکہ واقعہ ہے غرض عارف نے اس جگہ سلوک کو بالکل سفر کی شکل میں بیان فرمایا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کس ندانست کہ منزلگہ آں یار کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

یہاں بھی اسکو سفر کی صورت میں بیان فرماتے ہیں منزلگہ سفر ہی کے مناسب ہے اور جرس کا سفر کے مناسب ہونا پہلے معلوم ہو چکا بعض لوگوں نے جرس سے بنا بر غلو شغل انحد کی صوت مراد لی ہے جو کبھی بشکل جرس مسموع ہوتی ہے اور اسکو ملکوتی آواز سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے کیونکہ شغل انحد کی آواز کوئی غیبی آواز نہیں بلکہ محض ہوا ء متموج فی الصماخ کی صوت ہے کان کے پردہ میں جو ہوا ہے جب کان بند کر لئے جاتے ہیں تو اسمیں تموج پیدا ہو کر قسم قسم کی آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ شغل سلف میں نہ تھا بلکہ صوفیہ نے ہندوستان کے اہل ریاضت سے اسکو لیا ہے اس شغل کو یکسوئی پیدا کرنے میں بہت اچھا دخل ہے اور طریق میں یکسوئی کی حاجت ہوتی ہے اسلئے متاخرین نے یہ شغل اختیار کر لیا اسلئے حافظ کے کلام میں جرس سے یہ صوت مراد ہرگز نہیں اسوقت یہ معروف نہ تھا بلکہ مراد وہی شوق قلب ہے یا ارشاد شیوخ مطلب یہ ہے کہ کسی کو محبوب کا اصلی مقام معلوم نہیں بس اتنی بات ہے کہ شوق یوں کہتا رہتا ہے کہ اور آگے چلو اور آگے چلو یا شیوخ ہر مقام پر یوں فرماتے ہیں کہ محبوب آگے ہی بڑھے چلو۔ اسمیں بھی سفر کے معنی ظاہر ہیں اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

کہ گو عالم میں کوئی رخنہ نہیں معلوم ہوتا جس سے منزل محبوب کا پتہ لگے بلکہ راستے سب بند نظر آتے ہیں مگر تمکو یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنے کی کوشش کرنا چاہئے تم دوڑنا شروع کرو راستہ خود بخود نکلتا چلا آئیگا اسکی نظیر ایسی ہے جیسے کسی سڑک پر دو طرفہ درخت کثرت سے ہوں تو دور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے دونوں طرف درخت ملے ہوئے نظر آتے ہیں ناواقف یوں کہتا ہے کہ آگے راستہ نہیں مگر محقق

کہتا ہے کہ تم چلے چلو راستہ ہے یہ درخت دور ہی سے ملے جلے نظر آتے ہیں تم آ
چلو راستہ خود بخود نکلتا آئیگا اب اگر یہ ناواقف مقلد ہے تو یوں کہے گا ؎

درین دریائے بے پایاں درین طوفان موج افزا ✽ دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

اور اگر غیر مقلد ہے تو اپنی نظر قاصر پر اعتماد کر کے رُک جائیگا اور مقصود سے رہ جائے
مگر یہ اُسکی حماقت ہے وہ محقق کے قول پر کیوں نہیں چلتا جو یوں کہتا ہے ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید | خیرہ یوسف وار می باید دوید

اور اگر وہ یہ سمجھے کہ صاحب مجھے تو آگے درخت ملے ہوئے نظر آتے ہیں اگر دوڑ وں
تو اندیشہ ہے کہ درختوں سے ٹکرا کر سر پھوٹ جائیگا تو میں کہتا ہوں پھر کیا مضائقہ
محبوب کے راستہ میں ایک سر کیا ہزار سر بھی پھوٹ جائیں تو تھوڑے ہیں اور اگر جان
بھی جاتی رہے تو عین سعادت ہے ایک طالب سے شیخ نے اُسکی ناکامی کی شکایت
پر تنگ ہو کر فرمایا تھا کہ پھر میں کیا کروں جا اپنا سر پھوڑ لے اُسنے سچ مچ اپنا سر پھوڑا
عاشق کی یہی شان ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ عاشق نواز ہیں فوراً شیخ پر بذریعہ الہام کے
عتاب فرمایا کہ یہ کیا حرکت ہے تم ہمارے طالبوں کے سر پھوڑواتے ہو پس اب تو سر
کا بھی خوف نکرو جب وہ دوسروں سے بھی سر پھڑوانا گوارا نہیں کرتے تو خود تمھارا سر کیوں
پھوڑیں گے تم دوڑنا تو شروع کرو انشاء اللہ راستہ کھلتا چلا جائیگا۔ بہر حال مولانا نے بھی
اسی شعر میں سلوک کو سفر ہی بتلایا ہے۔ عارف شیرازی ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ؎

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من | پیادہ می روم و ہمرہاں سوار انند

مرشد سے کہتے ہیں کہ آپ دستگیری کیجئے کیونکہ میں تو مقامات و منازل کو پیادہ
طے کر رہا ہوں اور ہمراہی سوار ہو کر طے کر رہے ہیں اندیشہ ہے کہ میں پیچھے نہ رہ جاؤں
اسمیں بھی بالکل سفر ہی کا نقشہ بیان فرمایا ہے سوار اور پیادہ سفر ہی کے لوازم سے
ہیں تو صوفیہ کے کلام سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ انسان ہر وقت سفر میں ہے کسی وقت
اُسکو توقف نہیں روزانہ کسی مقام کو طے کرنے میں مشغول ہے مگر مقامات سے مراد اعمال
باطنیہ ہیں یعنی خوف و رجا محبت و انس توکل و رضا شکر و صبر تواضع وغیرہ او

لاہوت وملکوت وناسوت یہ مقامات سلوک نہیں ہیں اور بعضوں نے ایک اور قافیہ
نکالا ہے ہاہوت نہ معلوم یہ لغت بھی ہے یا نہیں بہت لوگ انکو مقامات سلوک سمجھتے
ہیں یہ غلط ہے بلکہ یہ مراتب وجود ہیں انکو اختیار سے کون طے کرتا ہے ؟ کوئی نہیں
ہاہوت درجہ ذات حق ہے اگر یہ لغت صحیح ہو۔ اور لاہوت مرتبہ اجمال صفات ہے
اور جبروت مرتبہ تفصیل صفات ہے اور ملکوت عالم ملائکہ ہے اور ناسوت عالم انسان
ہے تو ہاہوت ۔ ولاہوت ۔ وجبروت کا طے کرنا تو انسان سے محال ہے ذات وصفات
حق کے مراتب کو کون طے کر سکتا ہے کہ امکان کا انقلاب وجوب کی طرف لازم آتا ہے
ور ناسوت کے طے کرنیکی ضرورت ہی نہیں اسمیں تو آپ موجود ہی ہیں اور ملکوت میں
پہونچنا ممکن تو ہے مگر اختیاری نہیں بعد موت کے خود بخود ہر شخص وہاں پہونچ جاے گا
حتی کہ کافر بھی پہونچ جائیگا جہاں اسکی مار کوٹ ہوگی وہ تو ملکوت سے پناہ مانگے گا۔ تو
یہ مقامات سلوک نہیں ہیں بلکہ مقامات سلوک وہی اعمال باطنیہ ہیں جنکی تحصیل کا شریعت
نے امر کیا ہے اور ہر مسلمان خصوصاً سالک ہمیشہ ان کے طے کرنے میں مشغول ہے کسی وقت
توقف نہیں ہوتا یہ دنیا کا سفر نہیں کہ ایک حد پر ختم ہو جائے بلکہ اس سفر کی کہیں انتہا نہیں
ہر دن جو عمل آپ کرتے ہیں اس سے نیا راستہ طے ہوتا ہے آج جو آپنے نماز پڑھی ہے اس سے
بھی کچھ راستہ طے ہوا ہے اور اسکے بعد جو نماز پڑھو گے اس سے بھی راستہ طے ہوگا اور
جتنی دفعہ ذکر اللہ کرتے ہو ہر دفعہ میں کچھ راستہ طے ہوتا رہتا ہے اسی طرح روزانہ ہر ساعت
میں آپ اس راستہ کو قطع کر رہے ہیں ہاں ان مقامات میں بعض دفعہ کچھ توقف
بھی ہوتا ہے جیسا کہ میں نے اوپر کہا تھا اب میں اسکی حقیقت بتلاتا ہوں۔ سو سمجھ لیجئے
کہ اس طریق میں ایسا توقف تو کبھی نہیں ہوتا جیسا سفر دنیا میں اسٹیشن یا منزل پر سفر
دنیا میں ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کیلئے سیر بالکل منقطع ہو جاتی ہے یہاں ایسا نہیں ہے
بلکہ یہاں ہر دم سیر ہی سیر ہے کبھی سیری نہیں ہوتی البتہ بعض دفعہ اگلے مقامات کے
اعتبار سے کسی مقام میں طلتا توقف معلوم ہوتا ہے کہ سالک اپنے کو متوقف سمجھنے لگتا ہے
حالانکہ واقع میں وہ سائر ہے اور اسکی نظیر سفر دنیا میں امریکہ کا ایک واقعہ سنا گیا ہے

ایک دوست نے بیان کیا ہے کہ امریکہ میں اسٹیشن پر ریل ٹھہرتی نہیں کیونکہ اس توقف کو وہ لوگ اضاعت وقت سمجھتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہر اسٹیشن پر ۵ منٹ یا آدھ گھنٹہ ضائع ہوتا ہے وہاں یہ صورت ہے کہ ہر اسٹیشن پر ایک لکڑی کا اسٹیشن متحرک بنا ہے اسمیں پہیئے بھی لگے ہوئے ہیں جب ریل کے آنیکا وقت ہوتا ہے سب لوگ اس لکڑی کے اسٹیشن پر آجاتے ہیں اور جسوقت ریل آتی ہے یہ لکڑی کا اسٹیشن کسی حلقہ کے ذریعہ سے ریل کیساتھ مرتبط ہوجاتا اور اسکی ساتھ ساتھ اپنی جدا لائن پر چلتا رہتا ہے جب مسافر سوار ہوجاتے ہیں اسوقت ریل کے حلقہ سے اس کا حلقہ الگ کردیا جاتا ہے ریل آگے چلی جاتی ہے اور یہ اسٹیشن پیچھے رہ جاتا ہے پھر اسٹیشن کے ملازم اسکو بدستور اپنی جگہ پر لے آتے ہیں توجسوقت ریل سامنے سے آتی اور یہ لکڑی کا اسٹیشن اسکی ساتھ مرتبط ہوتا ہے ریل کے بیٹھنے والے اسوقت یہ سمجھتے ہیں کہ ریل ٹھہر گئی جیساکہ یہاں جب دو ریلیں ایک رفتار سے ایک سمت کو ساتھ ساتھ چلتی ہیں تو ہر اک کے مسافر یہ سمجھتے ہیں کہ گاڑی ٹھہری ہوئی ہے حالانکہ دونوں چل رہی ہیں مگر ہر ایک کو اسوقت توقف کا وہم ہوتا ہے اسی طرح طریق باطن میں سالک کو کبھی توقف کا وہم ہوتا ہے مگر وہ توقف نہیں ہوتا واقع میں یہ چل رہا ہے لیکن اسکو اپنی سیر کا احساس نہیں ہے اور غلطی کا منشا یہ ہوتا ہے کہ ترقی کے کچھ آثار غیر لازمہ ہیں سالک ناواقفی سے انکو آثار لازمہ سمجھکر اُن کے انتفا سے ترقی کے انتفا پر استدلال کرتا ہے پس حقیقی توقف اس سفر میں کبھی نہیں ہوتا اور کسی کو نہیں ہوتا سب برابر مشغول سیر ہیں البتہ اتنا فرق ہے کہ ؎

سیر زاہد ہر مہے یکسالہ راہ ‏ ‏ ‏ سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

زاہد ایک مہینہ میں ایک سال کی راہ طے کرتا ہے اور عارف ذراسی دیر میں تخت شاہ تک پہونچ جاتا ہے اور تخت شاہ پر پہونچکر بھی سیر ختم نہیں ہوتی اور حصول نسبت جسکو اصطلاح میں تکمیل کہتے ہیں اُس کو تکمیل کہنا ایسا ہے جیسے طلبہ کی دستاربندی کو تکمیل کہتے ہیں کیا دستاربندی کے بعد سیر علمی ختم ہوجاتی ہے ہرگز نہیں بلکہ اب تو پہلے سے زیادہ سیر شروع ہوتی ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ راستہ تو ابھی کھلا ہے اور صحیح سیر تو

۱۶

اب ہوگی۔ اے نو آموز طالب العلمو! یہ مت سمجھنا کہ دستار بندی اور سند ملنے کے بعد بس کام ختم ہوگیا بلکہ اصلی کام کا وقت تو اسکے بعد آئیگا ۵ آپ کس سن ہیں ابھی آپنے دیکھا کیا ہے مگر جتنی محنت اسوقت کروگے اتنی ہی سرعت سیر بعد تکمیل کے نصیب ہوگی بس سمجھکر کتابیں پڑھو اور انکو انسان بنکر اپنے اوپر لادو مثل الحمار یحمل اسفارا کا مصداق نہ ہو اسی طرح تخت شاہ پر سالک کا پہونچنا اصطلاحی تکمیل ہے حقیقی تکمیل نہیں بلکہ ابتو اصلی سلوک شروع ہوتا ہے اور سیر کا راستہ ابھی وقت کھلتا ہے یہاں حقیقی تکمیل کہاں کیونکہ اس راستہ کی انتہا ہی نہیں جو کسی حد پر حقیقی تکمیل ہوجائے ۵

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا — کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

اور مولانا فرماتے ہیں ۵

اے برادر بے نہایت درگہیست — ہرچہ بروے می رسی بروے مایست

اور یہاں سے ایک شبہ حل ہوگیا وہ یہ کہ حضرت مولانا گنگوہی رہ نے اپنے مکتوبات میں جا بجا قسم کھا کر یہ فرمایا ہے کہ واللہ میں کچھ نہیں ہوں واللہ مجھے کچھ نہیں آتا محض احباب کا حسن ظن ہے جو میری ساتھ ہے۔ اس کلام سے ایک مطلب تو معاندین نے نکالا وہ کہنے لگے کہ وہ واقعی ہم بھی مولانا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جب وہ خود قسم کھا کر اپنی ناقابلیت کا اظہار کرتے ہیں تو ہم انکی قسم کو سچا کیسے نہ مانیں وہ جھوٹی قسم تھوڑا ہی کھا سکتے ہیں واہ رے کوڑ مغز بلکہ کوڑ مغز کا بچہ اور یہ بچہ کہنا ایسا ہے جیسے محاورہ میں کہا کرتے ہیں سور کا بچہ سور نہیں کہتے بلکہ سور کا بچہ کہتے ہیں یہ اس سے ابلغ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا سور ہونا ایسی کامل صفت ہے کہ نسلا بعد نسل چلی آرہی ہے اس سے باپ کو گالی دینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کی اس صفت کا کمال بیان کرنا چاہتے ہیں کہ تو پورا سور ہے ایسے ہی میں نے کوڑ مغز کا بچہ کہنے سے کمال وصف کا قصد کیا ہے ۵ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ اور حقیقی مطلب نے بعض خواص کو بھی چکر میں ڈالدیا کہ وہ بھی اصل مراد تک نہ پہونچے چنانچہ ایک شیخ بھی مولانا کے اس کلام کی وجہ سے تردد و خلجان میں مبتلا تھے مجھسے کہنے لگے کہ حضرت نے یہ بات قسم کھا کر کیسے فرمائی حالانکہ ہمارے نزدیک تو حضرت

17

میں ہزار ہا کمالات اعلیٰ درجہ کے تھے اب ہم اپنے اعتقاد کی تغلیط کریں تو مشاہدہ کی تغلیط ہے اور اسکی تصدیق کریں تو حضرت کی قسم جھوٹی ہوئی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ نہ آپ اپنے مشاہدہ اور علم کی تکذیب کیجئے اور نہ حضرت کی قسم پر شبہ کیجئے بات یہ ہے کہ جن کمالات کی بنا پر آپ حضرت کے معتقد ہیں حضرت کی نظر ان کمالات پر نہیں ہے بلکہ اُن سے آگے ہے وہ کمالات مستقبلہ متوقعہ کے اعتبار سے قسم کھاکر فرما رہے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں اور جن کمالات کو مولانا میں ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں یعنی کمالات واقعہ مولانا انکی نفی نہیں فرما رہے (اور نہ اُن کا اثبات فرماتے ہیں بلکہ اُنپر حضرت کی نظر ہے ہی نہیں کیونکہ عارف کی نظر اپنے کمالات پر نہیں ہوا کرتی اور اگر کبھی ہوتی بھی ہے تو محض اُنکو عطائے حق سمجھکر ہوتی ہے اُسوقت بھی مولانا کی قسم سچی ہے کہ واللہ میں کچھ نہیں ہوں کسی قابل نہیں ہوں یعنی جو کچھ میرے پاس ہے سب عطا و فضل حق ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب عارف کو فنا رتام حاصل ہو جاتا ہے اُسوقت اپنے کمالات پر تو نظر کیا ہوتی اپنے وجود پر بھی نظر نہیں رہتی بلکہ وہ تو یوں کہتا ہے وجودك ذنب لا یقاس به ذنب اب جو شخص اپنے وجود کو بھی ذنب سمجھے وہ کمالات کو اپنے لئے کیونکر ثابت کریگا وہ تو بجز محبوب کے سبکی نفی کرے گا اپنی بھی اور اپنے کمالات کی بھی اور اُس کا قسم کھاکر یہ کہنا کہ میں کسی قابل نہیں کچھ نہیں ایسا ہو گا جیسے ذرہ آفتاب کو دیکھکر یہ کہے کہ واللہ میں کچھ نہیں یا قل ھو اللہ کا حافظ سبعہ قرارت قرآن کے حافظ کے سامنے یہ کہے کہ واللہ میں حافظ نہیں ہوں پس حضرت کا قسم کھاکر یہ کہنا غلط نہیں کیونکہ اُنپر جس درجہ انکشاف وجود حق و کمالات حق ہے اُس درجہ میں ہر شخص یوں ہی قسم کھاکر اپنے کمالات کی نفی کرنے پر مجبور ہوتا ہے (مگر جاننے والا جانتا ہے کہ یہی خود بہت بڑا کمال ہے کہ وہ اس مقام پر پہونچ گئے واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ جامع) یہ تو ایک عارف کا کلام تھا جسکی میں نے یہ شرح کی اور الحمد للہ مجھے سب اہل اللہ کے کلام کا فہم عطا ہوا ہے میں مجذوبوں کے کلام کو سمجھ لیتا ہوں چنانچہ ایک مجذوب وحشی کہتا ہے ؎

بیزارم ازاں کہنہ خدائی کہ تو داری   ہر روز مرا تازہ خدائے دگری ہست

کچھ ان کو بھی گالیاں کھانے ہی کا شوق ہے ظاہر میں یہ کلام سخت وحشتناک ہے مگر مطلب سننے کے بعد وحشت نہ رہے گی بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی کنہ کا علم تو محال ہے اسی لئے تصور بالکنہ کسی کو نہیں ہو سکتا جسکو بھی ہوتا ہے تصور بالوجہ ہوتا ہے اور تصور بالوجہ سے چارہ نہیں کیونکہ غائب کی ساتھ ارتباط قلب بدون کسی واسطہ اور وجہ کے نہیں ہو سکتا مگر جتنے وجوہ سے بھی تصور ہوتا ہے وہ وجہ ذات حق نہیں اللہ تعالیٰ اُس سے منزہ اور ورار الورار ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　　خاک بر فرق من و تمثیل من

اسمیں تو اللہ تعالیٰ کا تمام تمثیلات سے منزہ ہونا بیان کیا ہے اسکے بعد تمثیلات بیان کرنیکا عذر ظاہر کرتے ہیں ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت　　　ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

کہ عاشق کو بدون کسی تصور کے چین نہیں آتا اسلئے وہ آپکے واسطے اچھی سے اچھی تمثیل بیان کر کے اپنی تسلی کرتا ہے اور اسمیں بعض دفعہ وہ حد سے بھی بہت آگے نکلجاتا ہے چنانچہ ؎ گہ ترا گوید ز مستی بوالحسن　　　یا صغیر السن یا رطب البدن،

مستی کی قید بڑھا کر بتلا دیا کہ ایسی مثال بیان کرنا اور حق تعالیٰ کو صغیر السن وغیرہ کہنا جو بعض مجذوبوں کے کلام میں ہے محض مستی کا اثر ہے ورنہ واقع میں محبوب اس سے منزہ ہے اور بعض صوفیہ کے کلام میں دریا اور ہوا کی تشبیہ وارد ہے وہ بھی محض تسلی اور تفہیم کیلئے ہے ورنہ ذات حق اس سے بھی منزہ ہے بہر حال یہ تو معلوم ہو گیا کہ جسکو بھی تصور حق ہوتا ہے بالکنہ نہیں ہوتا بلکہ وجہ کیساتھ ہوتا ہے لیکن عارفین اور غیر عارفین میں اتنا فرق ہے کہ غیر عارفین کو تو عمر بھر ایک ہی وجہ سے تصور ہوتا ہے اور عارفین کو ہر دن نئے طریقہ سے نئی وجہ سے تصور ہوتا ہے کیونکہ اُنپر تجلیات کا ورود ہے ہر دن نئی تجلی ہوتی ہے پس اس شعر میں اس مضمون کو ظاہر کیا گیا ہے کہ اے زاہد تجھکو جس وجہ سے تصور حق ہوتا ہے وہ وجہ کہنہ ہے میں اُس سے بیزار ہوں مجھکو تو حق تعالیٰ کا تصور ہر دن نئی وجہ سے ہوتا ہے یعنی میں روزانہ ترقی میں ہوں اور تو ایک ہی وجہ پر ٹھہرا ہوا ہے مگر کلام

میں توحش اسلئے ہوگیا کہ اس نے وجہ تصور کو خدا سے تعبیر کیا ہے زاہد کی وجہ کو کہتہ خدا
کہدیا اور اپنی وجوہ متجددہ کو تازہ خدا کہدیا مگر مطلب معلوم ہو جانیکے بعد کچھ اشکال نہیں
کیونکہ مجاز کا استعمال منکر نہیں۔ یہ گفتگو درمیان میں آگئی میں یہ کہرہا تھا کہ اس راستہ
کی انتہا چونکہ نہیں ہے اسلئے کسی حد پر تکمیل حقیقی نہیں ہوسکتی اور جسکو تکمیل کہا جاتا
ہے اُس سے تو سیر کا فتح باب ہوتا ہے کہ ابتک تو قاعدہ بغدادی پڑھ رہے تھے اس
تکمیل کے بعد قائمہ بغدادی شروع ہوتا ہے یعنی پہلے تو بیٹھ بیٹھ کر چل رہے تھے اب
کھڑے کھڑے چلنا ہوگا تکمیل درسی تو دو چار سال میں ہوجائے گی مگر تکمیل حقیقی
تو درسی ہوگی جسکے معنی ہیں تیس سال میں اور یہ بھی حصر کیلئے نہیں بلکہ کثرت مراد ہے
یعنی عمر دراز میں بھی نہوگی۔ غرض نصوص سے اور اقوال صوفیہ سے ہمارا ہر وقت سفر
میں ہونا وضاحت کیساتھ ثابت ہے اسوقت ایک اور آیت یاد آئی ابراہیم علیہ السلام
فرماتے ہیں انی ذاھب الی ربی سیھدین کہ میں اپنے رب کی طرف چل رہا ہوں
اس سے بھی سفر کے معنی ثابت ہیں اور حدیث نے تو مطلع بالکل صاف کردیا کن
فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے مسافر سفر
میں ہوتا ہے یا راستہ چلنے والا راستہ میں ہوتا ہے۔ ابتو ہمارا ہر دم سفر میں ہونا بالکل
واضح ہوگیا۔ کوئی بات مخفی ہی نہ رہی۔ اب حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ یہ راستہ ہے
تو سفر کا اور طویل راستہ ہے مگر حق تعالیٰ اسمیں بندہ کی کیسی اعانت فرماتے اور اسکے
حال پر کیسی عنایت فرماتے ہیں صوفیہ نے لکھا ہے کہ سلوک ایک خاص مقام تک
ہوتا ہے اُسکے بعد جذب ہوتا ہے (جذب کی حقیقت میں آگے بتلاؤنگا) اسکے بغیر کام
نہیں چلتا جو لوگ گمراہ ہوئے ہیں وہ وہی تھے جو سالک محض تھے مجذوب نتھے جیسے
ابلیس و بلغم باعور وغیرہ جذب کے بعد کوئی گمراہ نہیں ہوتا الفانی لا یرد کے یہی معنی ہیں
اب جذب کی حقیقت سنئے۔ جذب کے معنی ہیں لغت میں کشش کرنا کھینچنا۔ اور اصطلاح
میں جذب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اس سے محبت ہوجائے جسکی علامت یہ ہے کہ سالک
پر داعیۂ اضطراریہ غالب ہوجائے اور اس سے کوئی واصل خالی نہیں ہوتا خواہ نقشبندی

ہو یا چشتی۔ البتہ اکثر نقشبندیہ پر جذب کے آثار بادی النظر میں کم ظاہر ہوتے ہیں مگر اس دولت سے وہ بھی مشرف ہوتے ہیں اسی کو عارف جامی فرماتے ہیں ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالارانند کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

اور حضرت شیفتہ ذکر خفی کی نسبت فرماتے ہیں ؎

چہ خوش ست باتو بزمے بنہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

یعنی وہ اس طرح سالک کو لیجاتے ہیں کہ دوسروں کو خبر ہی نہیں ہوتی مگر جذب سے وہ بھی خالی نہیں ہوتے۔ مگر یہ برت سمجھنا کہ راہ مخفی سے لیجانا نقشبندیہ ہی کے ساتھ مختص ہے بلکہ چشتیہ بھی بعضوں کو اسی طرح پہونچاتے ہیں یہ چشتیت اور نقشبندیت محض الوانِ طریق کا نام ہے کہ چشتیہ کا لون یہ ہے کہ وہ اول تخلیہ کرتے ہیں پھر تحلیہ اور نقشبندیہ کا لون یہ ہے وہ اول تحلیہ کرتے ہیں پھر تخلیہ۔ اور یہ بھی متقدمین کا مذاق تھا اب تو دونوں طریق کے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ کرنا چاہیئے اب ہر محقق چشتی بھی ہے اور نقشبندی بھی لیکن یہ فرق ضرور ہے کہ باوجود دونوں کو جمع کرنیکے چشتیہ تخلیہ کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور نقشبندیہ تحلیہ کا اور اس فرق مذاق کی وجہ سے پہلے یہ قاعدہ تھا کہ جس طالب کو جس لون سے مناسبت ہوتی تھی مشائخ اسکو ایک دوسرے کے پاس بھیجدیا کرتے تھے نقشبندیہ اپنے بعض مریدوں کو چشتیہ کے یہاں بھیجدیتے اور چشتیہ بعض طالبوں کو نقشبندیہ کے یہاں بھیجدیتے لیکن آجکل تو ہڑبونگ ہو رہا ہے کہ اکثر مشائخ سبکو اپنے ہی کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں باقی جو محقق ہیں وہ اب بھی طالب کو اسکی مناسبت کی موافق مشورہ دیتے ہیں مولوی محمد منیر صاحب نانوتوی نے ہمارے حضرت حاجی صاحب سے پوچھا کہ حضرت میرے لئے خاندان چشتیہ میں بیعت ہونا مناسب ہے یا نقشبندیہ میں حضرت نے فرمایا کہ پہلے تم ہمارے ایک سوال کا جواب دیدو پھر بتلائیں گے۔ ایک شخص ایسی زمین میں جسکے اندر جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے ہیں تخم پاشی کرنا چاہتا ہے تو بتلاؤ تمھاری رای میں اُسکو پہلے جھاڑ جھنکاڑ صاف کر کے بعد میں تخم پاشی کرنا چاہیئے یا اول تخم پاشی کر دے پھر رفتہ رفتہ جھاڑوں کو بھی صاف کرتا رہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میرے نزدیک تو اسے اول تخم پاشی کر دینا چاہیئے تاکہ کچھ تو

ثمرہ حاصل ہو جائے ایسا نہو کہ جھاڑوں کے صاف کرتے ہی میں عمر ختم ہو جائے حضرت نے فرمایا کہ بس تم نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت ہو جاؤ تمکو اُنہی کے مذاق سے مناسبت ہے سبحان اللہ حضرت نے دقیق مذاق کو کتنی سہل مثال سے حل فرمایا۔ پھر طالب کے مذاق کی کیسی رعایت فرمائی کہ صاف کہدیا کہ تم نقشبندیہ سے بیعت ہو جاؤ یہ نہیں کہ سبکو اپنی ہی یہاں بھرتی کرنے کی فکر کریں جیسا آجکل اکثر ہو رہا ہے۔ غرض چشتیت اور نقشبندیت کی حقیقت یہ ہے کہ تخلیہ اور تحلیہ کے بارہ میں اُن کا مذاق مختلف ہے یہ فرق نہیں جیسا آجکل بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چشتیہ کے یہاں ذکر جہر ہے اور نقشبندیہ کے یہاں ذکر خفی۔ یہ تو ہر شیخ طالب کی طبیعت کے مناسب تجویز کرتا ہے خواہ چشتی ہو یا نقشبندی ہو۔ بہرحال جذب سے نقشبندیہ بھی خالی نہیں ہیں اور چشتیہ کا جذب تو مشہور ہے حاصل یہ کہ بدون جذب کے وصول نہیں ہو سکتا اور بدون وصول کے رجعت سے اطمینان نہیں ہو سکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجذوب خود بھی مطمئن ہو جائے۔ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ واقع میں اُسپر رجعت کا خطرہ نہیں رہتا مگر خود کوئی مطمئن نہیں نہ سالک نہ مجذوب بلکہ ہر شخص لرزان و ترساں ہے مجذوب اسواسطے مطمئن نہیں ہو سکتا کہ جذب کا اُسکو یقین نہیں ہو سکتا کیونکہ بعض دفعہ سلوک بصورت جذب ہوتا ہے جیسا کہ بعض جذب بصورت سلوک ہوتا ہے نقشبندیہ کا جذب اکثر بصورت سلوک ہی ہوتا ہے اسی واسطے ناواقف اُنکے جذب کو نہیں پہچانتا اور اُنکو اس سے خالی سمجھتا ہے کیونکہ اُن پر اسکے آثار ظاہر نہیں ہوتے لیکن باطن اُنکا معمور ہے فرماتے ہیں ؎

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو — کہ بینی خندہ برلبہا و آتش پارہ در دلہا

اور چشتیہ کا سلوک اکثر بصورت جذب ہوتا ہے جس سے ناواقف اُنکو ابتدا ہی سے مجذوب سمجھنے لگتا ہے یہ بھی غلطی ہے تو معلوم ہوا کہ حقیقی جذب کی پہچان دشوار ہے ظاہری علامات اُسکے ادراک کیلئے کافی نہیں ہیں۔ جذب کبھی شورش کی ساتھ ہوتا ہے اور کبھی سکون کیساتھ لطیف ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر — عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر

لیک عشق عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

تو جو شان عشق محبوب کی ہوتی ہے کہ اسمیں شورش و اضطراب نہیں ہوتا کبھی عاشق کا عشق بھی ایسی شان کا ہوتا ہے اور کمال کے بعد تو عشاق کے عشق کی اکثر یہی کیفیت ہو جاتی ہے اسی لئے کاملین کی محبت و عشق کا لوگوں کو پتہ نہیں چلتا بعض لوگ اسکے سکون کو دیکھکر کہتے ہیں کہ انکو محبت کی ہوا بھی نہیں لگی حالانکہ انکو تو ایسی ہوا لگی ہے کہ کرۂ ہوا سے پار ہو کر کرۂ نار میں پہونچکر اُس سے بھی آگے نکل گئے اب وہ ہنس رہے ہیں اور معترض سے کہتے ہیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

لوگ انکو ہنستا ہوا دیکھکر سمجھتے ہیں کہ انکو محبت عشق کا چرکہ نہیں لگا مگر انکو یہ خبر نہیں کہ وہ کتنی بلائیں اور مصیبتیں جھیلکر آج اس قابل ہوئے ہیں کہ وصال محبوب سے مسرور ہو کر ہنسیں اور آج سے پہلے انکی بھی یہ حالت تھی کہ یوں کہرہے تھے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

میں اسکی شرح میں کہا کرتا ہوں کہ حافظ کی مراد ساحلہا سے ادہر کا ساحل ہے یعنی خوض دریا سے قبل کا اُدہر کا ساحل نہیں یعنی عبور دریا کے بعد کا کیونکہ مبتلائے موج دریا کی حال سے بیخبر وہی لوگ ہیں جو اِدہر کے ساحل پر کھڑے ہیں جنھوں نے دریا میں قدم بھی نہیں ڈالا اور جو لوگ اُدہر کے ساحل پر کھڑے ہیں گو ظاہر میں وہ بھی دوسرے ساحل والوں کی طرح چین میں ہیں اور ہنس رہے ہیں مگر وہ مبتلائے موج کے حال سے بیخبر نہیں ہیں وہ اُس خطرہ سے بھی واقف ہیں جسمیں یہ مبتلا گرفتار ہے اور اُس کے علاوہ دوسرے خطرات سے بھی واقف ہیں کیونکہ وہ تمام دریا کو طے کر چکے ہیں اور اُسکے تمام ورطات سے خبردار ہو چکے ہیں وہ تو ایسے باخبر ہیں کہ خود بھی اُن سے پار ہو کر نکل گئے اور دوسروں کو بھی نکال سکتے ہیں بلکہ نکال لیتے ہیں اسی لئے ضرورت اسکی ہے کہ شیخ ساحل رسیدہ اور گرداب طے کردہ ہو یعنی صاحب تمکین ہو اور جو شیخ خود صاحب تلوین ہو اُس سے الگ ہو جانا چاہئے کیونکہ

ع؎ مراد وہ تلوین ہے جو قبل از تمکین ہو اور تمکین کے بعد بھی تلوین پیش آتی ہے مگر وہ مشیخت میں قادح نہیں ۱۲ ظ

وہ تو ابھی اپنے ہی بچانے کی فکر میں ہے وہ دوسروں کو کیا بچائیگا وہ تو خود ہی گرداب میں ہے دوسرونکو کیا خاک نکالے گا اسی حالت کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما ۔۔۔ چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

یعنی جس شیخ پر خود ہی سکر غالب ہو وہ طالبین کی کیا تدبیر کریگا۔ پس راہبر گرگ باران دیدہ کو بنانا چاہیئے جو سرد و گرم سب چکھے ہوئے ہو۔ اور صاحب تمکین گرگ باران دیدہ کی علامت یہ ہے کہ اسکی دو ہی باتوں سے سالک کی تسلی ہو جاتی ہے اور صاحب تلوین باتیں تو بہت بناتا ہے مگر سالک کی اُن سے تسلی نہیں ہوتی اسی علامت کو مولانا فرماتے ہیں ؎

وعدہا باشد حقیقی دلپذیر ۔۔۔ وعدہا باشد مجازی تاسہ گیر

مولانا کی فارسی پہلے زمانہ کی فارسی ہے تاسہ کے معنی ہیں اضطراب مطلب یہ ہے کہ شیخ جو وعدہ کیا کرتا ہے کہ یہ حالت فلاں مقام کے حصول کی علامت ہے اور یہ کیفیت فلاں چیز کا اثر ہے اور اب یہ ہوگا تو یہ وعدے اگر صاحب تمکین کی زبان سے نکلیں گے تو سالک کی معًا تسلی و طمانینت ہو جائے گی اور صاحب تلوین کے وعدوں سے خاک اطمینان حاصل نہیں ہوتا بے اطمینانی رہتی ہے حدیث میں بھی یہ مضمون ہے الصدق طمانینتہ والکذب ریبۃ پس کاملین کو انکی تمکینی حالت دیکھکر عشق و محبت کی کیفیات سے خالی نہ سمجھو انکا عشق پک گیا ہے، اس سلئے اب وہ اندر اندر اپنا کام کر رہا ہے اور صاحب تلوین کا عشق خام ہے اسلئے دنیا جہاں کو سر پر اٹھا رکھا ہے کاملین کی ایسی مثال ہے جیسے پکی ہوئی ہنڈیا کہ آگ نے اسکے رگ و پے میں سرایت کرکے ہر چیز کو بھوندیا ہے اور چونکہ اندر تک آگ پہونچ چکی ہے اسلئے آواز نہیں آتی مگر وہ ٹھنڈی نہیں ہے ذرا ہاتھ لگاؤ گے تو بھوندے گی پس کاملین ڈرتے تو اسلئے ہیں کہ بعض دفعہ پکنے کے بعد سکون ایسا کامل ہوتا ہے کہ خود انکو بھی اپنی مستی کی خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنے کو جذب سے خالی سمجھنے لگتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ فی نفسہ وصول کے بعد اب اُنپر ارتداد و رجعت کا اندیشہ نہیں رہا مولانا نے اسکی مثال یوں دی ہے کہ جیسے بالغ نابالغ نہیں ہو سکتا اور پکا ہوا پھل کچا نہیں ہو سکتا گو سڑ جائیگا بُس جائیگا مگر کچا کبھی نہوگا واقعی مثال سے تو مولانا

بادشاہ ہیں اور انکی کوئی تخصیص نہیں عموماً صوفیہ میں معانی کی تحقیق بلکہ اسکی ساتھ فصاحت لفظی بھی بے نظیر ہوتی ہے انکو الفاظ بھی خوب ملتے ہیں چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ بالغ کسے کہتے ہیں فرمایا کہ طبی بالغ تو وہ ہے جس سے منی نکلے اور حقیقی بالغ وہ ہے جو منی سے نکل جائے (یعنی خودی اور کبر سے پہلا منی لفظ عربی ہے اور دوسرا فارسی لفظ ہے) اسی طرح ایک بزرگ نے دوسرے بزرگ کو جو زیادہ خرچ کرتے تھے لکھا لاخیر فی الاسراف تو دوسرے بزرگ نے انہی لفظوں کو الٹ کر جواب دیا لا اسراف فی الخیر کہ نیک کاموں میں خرچ کرنا اسراف نہیں ہے۔ ایسے ہی کسی مسلمان کے جنازہ کیساتھ ایک بزرگ جارہے تھے راستہ میں ہوا بہت تیز چلی جس سے گرد و غبار بہت اڑا مجمع میں ایک شاعر بھی تھا اس نے کہا مٹی خراب جس سے میت کی تاریخ وفات نکلتی تھی بزرگ نے فرمایا یوں مت کہو بلکہ یوں کہو مات بخیر اسمیں بھی وہی تاریخ نکلتی ہے جو مٹی خراب میں نکلتی تھی انہی حرفوں کو لوٹ پوٹ کر کیسا عمدہ مادہ بنا دیا غرض صوفیہ فرماتے ہیں کہ وصل راجع نہیں ہوتا اور اسکی مثال اوپر بیان ہو چکی اور اسکی بھی صوفیہ نے تصریح کی ہے کہ وصول بدون جذب کے نہیں ہوتا تو حق تعالیٰ کی یہ کیسی بڑی عنایت ہے اور اس طویل راستہ میں انھوں نے کیسی سہولت فرما دی ہے کہ سلوک کے بعد خود ہی جذب فرما لیتے ہیں اور یہ صوفیہ کی گھڑت نہیں ہے بلکہ قرآن سے اس جذب کا ثبوت موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویھدی الیہ من ینیب ط اس آیت میں جذب و سلوک دونوں کا ذکر ہے مگر نہ اس طرح جیسے ایک جاہل نے کہا ہے کہ قرآن سے صوفیہ کے اشغال ثابت ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں سلطانا نصیرا۔ ومقاما محمودا اور یہ ہی اشغال کے بھی نام ہیں گویا اس جاہل کے نزدیک قرآن میں اس جگہ سلطانا نصیرا۔ ومقاما محمودا سے صوفیہ کی اصطلاح مراد ہے یہ بالکل غلط ہے بلکہ یہاں ان الفاظ کے معنی لغوی مراد ہیں اور صوفیہ نے اپنی اصطلاح کو قرآن کے ان الفاظ سے لیا ہے قرآن میں انکی اصطلاح مراد نہیں ایسے ہی ایک جاہل نے کہا تھا کہ مولوی خواہ مخواہ کھانے پر

۲۵

فاتحہ دینے کو بدعت کہتے ہیں حالانکہ قرآن سے اس کا ثبوت ہے کہ قرآن میں ایک سورت ہی فاتحہ کے واسطے نازل ہوئی ہے اور اسی واسطے اسکا نام فاتحہ ہے سبحان اللہ یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمنے اپنے اس عمل بدعت کا نام قرآن سے لیلیا ہے کہ اس عمل میں سورہ فاتحہ کو پڑہنے لگے اور اس کا نام فاتحہ رکھدیا یہ الٹی منطق ہے کہ قرآن میں سورہ فاتحہ کا نزول اور اسکا نام اس عمل کے لئے ہے۔ تو میں قرآن سے جذب کا ثبوت اس طرح نہیں دیتا بلکہ الفاظ قرآنیہ کو لغوی معنی پر رکھکر اور تفسیر سلف کو بحال خود رکھکر ثبوت دیتا ہوں ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسکو چاہتے ہیں اپنی طرف کشش کر لیتے ہیں اجتباء اور جبی کے معنی لغت میں کشش ہی کے ہیں اور جذب کے معنی بھی یہی ہیں تو اس سے صاف ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو اپنی طرف جذب فرماتے ہیں آگے ارشاد ہے ویھدی الیہ من ینیب اور اپنی طرف ہدایت کرتے ہیں اُن لوگوں کو جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اسمیں سلوک کا بیان ہے کیونکہ سلوک کے معنی یہی ہیں انابت الی اللہ خدا کی طرف رجوع کرنا اور طلب میں مشغول ہونا سلوک پر فتح باب کا ترتب ہوتا ہے جسکو ہدایت فرمایا گیا ہے وصول اسپر مرتب نہیں ہوتا وصول اجتباء اور جذب سے ہوتا ہے جب تک اُدہر سے جذب نہو وصول نہیں ہوسکتا جس درجہ کا بھی جذب ہوگا اسی درجہ کا وصول ہوگا اگر جذب کامل ہے وصول کامل ہوگا اگر جذب قلیل ہے تو وصول بھی ناقص ہوگا۔ ایک بزرگ نے جذب کی حقیقت کو حسی مثال میں خوب بیان فرمایا وہ ایک بادشاہ کے بالاخانہ کے نیچے سے جارہے تھے بادشاہ نے آواز دی کہ ذرا یہاں تشریف لائیے مجھے ایک سوال کرنا ہے فرمایا کیونکر آؤں تم اوپر میں نیچے۔ بادشاہ نے فوراً کمند لٹکادی کہ اسے پکڑ لیجئے پھر بادشاہ نے کھینچ لیا فوراً اوپر پہونچ گئے بادشاہ نے پوچھا کہ تم خدا تک کسطرح پہونچے بزرگ نے بیساختہ جوابدیا کہ جسطرح تم تک پہونچا اگر میں ملنا چاہتا اور تم نہ ملنا چاہتے تو قیامت تک بھی میں آپ تک نہ پہونچ سکتا تمنے خود ملنا چاہا تو خود ہی کھینچ لیا اسی طرح اللہ تعالیٰ تک پہونچنا دشوار تھا کیونکہ طویل راستہ کا قطع کرنا بندہ سے کہاں ممکن ہے اگر وہ ملنا نہ چاہتے تو قیامت تک وصول نہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت سے خود ہی ملنا چاہا اور کھینچ لیا

جیسا تمنے کمند سے کھینچ لیا سبحان اللہ اہل اللہ کو دہانت بھی کیسی عطا ہوتی ہے مگر یہ جب عطا ہوتی ہے کہ پڑھا لکھا سب بھلا دو پھر وہ خود علوم کو تمھارے دل میں نقش کرتے ہیں اور جب تک تم اپنے نقش کو نہ مٹاؤگے اسوقت تک دوسرا نقش اسپر کیسے ہوگا مگر مٹانے کی توفیق بھی اُسے ہی ہوتی ہے جسکو وہ کچھ دینا چاہتے ہیں بس یوں کہو کہ جب وہ کچھ دینا چاہتے ہیں تو خود ہی پہلے نقش کو مٹا دیتے ہیں اور خود ہی دوسرا نقش قائم کردیتے ہیں مگر خود بھی لگا رہنا ضرور ہے میں ایک بزرگ سے جوان پڑھ تھے محمد شیر شاہ اُنکا نام تھا ملا ہوں میں نے اُن سے پوچھا کہ محبت حق کا طریقہ بتلائیے فرمایا ذرا اپنے دونوں ہاتھ کو رگڑو میں حیران ہوا کہ میرے سوال کا یہ جواب کیسا مگر تقلیداً میں نے ہاتھوں کو رگڑا پوچھا کہو کچھ گرمی پیدا ہوئی میں نے کہا ہاں ہوئی۔ فرمایا بس یوں ہی رگڑتے رہو ایک دن گرمی پیدا ہوکر شعلہ محبت بھڑک جائیگا دیکھیے معقول کو کیسا محسوس بنا دیا اور واقعی کیسا راستہ کو سہل بنا دیا بس کام میں لگے رہو اسی طرح ایک دن کام بنجائیگا اب میں اُسی کام کو بتلاتا ہوں جو تمھارے کرنے کا ہے سو اُسکا خلاصہ دو چیزیں ہیں انہی میں لگنے سے کام بنتا ہے اور جو بھی پہونچا ہے انہی سے پہونچا ہے میں اسوقت طریقت کا بھانڈا پھوڑ رہا ہوں لوگوں نے خواہ مخواہ اندھیری کوٹھری میں انکو ڈالکر مقفل کر رکھا اسکو تو برسر ممبر کہنا چاہیے وہ دو باتیں یہ ہیں۔ ذکر اور طاعت مگر ان کا طریقہ کسی محقق سے دریافت کرو اپنی رائے سے تجویز نکرو حضرت فرید عطار فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر و پس برآ

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہ را تنہا مرو بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

قلاؤز کے معنی طاعنین کی اصطلاح کے اعتبار سے قل اعوذ یا نہیں بلکہ قلاؤز ترکی لفظ ہے بمعنی رہبر گو وہ قل اعوذ یا ہی ہو مگر راستہ کا جاننے والا ہو محقق ہو اُس سے طریقہ دریافت کرکے ذکر و طاعت میں مشغول ہو انشاء اللہ واصل ہو جاؤگے بس اُن دونوں میں خلل نہ آئے باقی کیفیات و احوال کے درپے ہو تو وہ سب انہی دو کی باندیاں ہیں اور

جب تک محقق مل سکے اُسوقت تک کتاب سے سلوک طے نہ کرو کتابیں بھی مفید ہیں مگر وہ مریض کیلئے نہیں ہیں بلکہ طبیب کیلئے ہیں یہ طبیب کے ذمہ ہے کہ مواقع اشکال میں قرابادین وقانون کا مطالعہ کرکے علاج کرے۔ مریض کو ان کتابوں کا مطالعہ مفید نہیں اور انکو مطالعہ کرکے شیخ سے معارضہ کرنا تو سم قاتل ہے وہ دامن جھاڑ کر الگ ہو جائیگا تمھاری کتاب تو انسان کامل یعنی شیخ ہے تمکو جو مشکل حل کرنا ہو اُسی کے مطالعہ سے کرو اسی کو فرماتے ہیں

وانت الکتاب المبین الذی ۔۔۔ باحرفہ نظهر المضمر

اور فرماتے ہیں

اے لقاء تو جواب ہر سوال ۔۔۔ مشکل از تو حل شود بی قیل و قال

ہاں اگر کسی کو شیخ محقق نہ ملے تو پھر کتابوں کا مطالعہ کرو مگر اُن کتابوں کا جنمیں علوم معاملہ کا بیان ہو اصلاح نفس کے طرق مذکور ہوں اسوقت یہ کتابیں بھی بمنزلہ شیخ کے ہونگی عارف فرماتے ہیں

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است ۔۔۔ صراحی مئے ناب وسفینۂ غزل است

اور یہ جبھی ہے کہ شیخ محقق میسر نہو ورنہ اسکے ہوتے ہوئے کتاب کی کچھ ضرورت نہیں اسی کو دوسرے مقام پر فرماتے ہیں

مقام امن و مے بی غش و رفیق شفیق ۔۔۔ گرت مدام میسر شود زہے توفیق

رفیق شفیق سے شیخ ہی مراد ہے۔ بہر حال سالک کو شیخ کے نہ ملنے کے وقت یا شیخ کی اجازت کے وقت اُن کتابونکا مطالعہ بھی مفید ہوتا ہے جنمیں طرق اصلاح اور علوم معاملہ مذکور ہوں اور جن کتابوں میں علوم مکاشفہ اور اسرار مذکور ہوں انکو ہرگز نہ دیکھا جائے اُنکے متعلق تو صوفیہ خود فرماتے ہیں یحرم النظر فی کتبنا انکو صرف محقق ہی دیکھ سکتا ہے اور وہی ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور اوپر جو میں نے کہا ہے کہ یہ باتیں تو بر سر ممبر کہنا چاہئیں اُن سے بھی میری مراد علوم معاملہ و طرق اصلاح نفس ہی ہیں علوم مکاشفہ واسرار مراد نہیں انکو ممبر پر نہ کہنا چاہیئے ورنہ مخلوق گمراہ ہو جائیگی۔ تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اس راستہ کو کتنا سہل بنا دیا ہے کہ سالک کو خود جذب فرما لیتے ہیں میں اسکی مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے

ہم کسی بچہ کو دور سے دیکھکر ہاتھ پھیلا دیں کہ ہماری گود میں آجا - اور وہ شوق میں دوڑے اور دو قدم دوڑ کر گر پڑے اسوقت ہم خود دوڑ کر اسکو اٹھا لیتے ہیں اور اگر وہ چلے بھی نہیں تو ہم بھی نہیں لیتے بس یہاں بھی اسی کی ضرورت ہے کہ تم اس طویل راستہ کے طے کرنیکا قصد کر کے چلو اور گر پڑو (یعنی عجز و عبدیت کا اظہار کرو) پھر حق تعالیٰ خود تمکو اٹھا کر منزل پر پہونچا دیں گے - اور اس سے زیادہ سہولت اور دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے مبدأ سفر کو حکم دیا پیچھے ہٹنے کا اور منتہائے سفر کو حکم دیا آگے بڑھنے کا یعنی جس مسافت کو ہم طے کر رہے ہیں اسمیں تنہا ہم ہی متحرک نہیں ہیں بلکہ اس سفر کا مبدأ اور منتہا بھی متحرک ہیں مبدأ پیچھے کو ہٹ رہا ہے ہم سے دور ہو رہا ہے اور منتہا آگے کو بڑھ رہا ہے ہم سے نزدیک ہو رہا ہے اب بھلا مسافت جلدی کیوں نہ ختم ہوگی جب تین چیزیں حرکت کر رہی ہیں کہ مسافر خود بھی منتہا کی طرف کو چل رہا ہے اور مبدأ بھی بعید ہو رہا ہے اور منتہا بھی قریب ہو رہا ہے اور یہ میری گھڑت نہیں ہے حدیث میں ہے الا ان الدنیا مدبرۃ والاٰخرۃ مقبلۃ کہ دنیا پیچھے کو ہٹ رہی ہے اور آخرت قریب ہو رہی ہے یہ تو سفر اضطراری کی حالت ہے اور سیر اختیاری جسکو سلوک کہتے ہیں .... اسکی بھی یہی حالت ہے جب بندہ طلب میں قدم رکھتا ہے اسی وقت سے موانع پیچھے ہٹنے لگتے ہیں یعنی خود بخود مرتفع ہونے لگتے اور مقصود قریب ہونے لگتا ہے اور اسمیں مبالغہ نہیں ہے جب حق تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہوتی ہے تو دنیا خود بندہ کو چھوڑ دیتی ہے اور موانع خود بخود مرتفع ہو جاتے ہیں اور یہ جزو اول ہے دعوی کا ہمارے ماموں صاحب فرماتے تھے کہ میاں تارک الدنیا ہونا تو بڑا مشکل ہے مگر جب توفیق حق شامل حال ہوتی ہے تو بندہ متروک الدنیا ہو جاتا ہے کہ دنیا خود اسے چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہے اس نے بیوی کو طلاق دیدی اور بیوی نے خلع کر لیا اور اگر دنیا خود اسے نہ چھوڑے تو یہ لاکھ طلاقیں دے وہ لپٹتی ہے اور جہل سے یہی کہتی ہے کہ تیرے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے میں نے تو طلاق قبول ہی نہیں کی جیسے ایک جاہل عورت نے اپنے مرد کو یہی جواب دیا تھا اور دوسرا جزو دعوی اس حدیث میں مصرح ہے

سیر اضطراری و اختیاری ملی فرد

من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعًا الحدیث اور مبدأ و منتہا کے پیچھے ہٹنے اور آگے بڑھنے کا ایک حسی واقعہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص نے ۹۹ خون کئے تھے پھر اسکو توبہ کا خیال ہوا تو ایک عالم کے پاس گیا اور اپنا قصہ بیان کر کے مسئلہ دریافت کیا کہ اسی حالت میں میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں وہ کوئی جلالی مولوی تھے کہا تیرے واسطے توبہ کہاں یعنی کیا ۹۹ خون ایک ساعت میں معاف ہو سکتے ہیں جا تیری واسطے تو جہنم کا عذاب ہے سائل کو غصہ آیا اس نے تلوار سے انکا بھی خاتمہ کر دیا کہ چلو سو میں ایک ہی کی کسر کیوں رہے اس مولوی نے بھی تو اسکو قتل ہی کر دیا تھا کہ غریب کو رحمت حق سے مایوس کر دیا جس سے کفر کا اندیشہ تھا شیخ کو ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ طالبوں کو مایوس کرے اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ محض نجدی ہونا کافی نہیں وجدی ہونے کی بھی ضرورت ہے وہ مولوی محض نجدی تھا یعنی زاہد خشک اسلئے اس نے طالب کو مایوس کر دیا اگر وجدی بھی ہوتا تو اسکی طلب کو دیکھکر پگھل جاتا۔ رامپور ریاست میں ایک صاحب تلوین درویش تھا اسکو کسی مقام پر قبض ہوا اور یہ یقین ہو گیا کہ میں مردود ہو گیا ہوں تو اس نے خودکشی کا ارادہ کیا پھر سوچا کہ لاؤ کسی دوسرے شیخ ہی سے اپنا حال کہوں شاید گرہ کھل جاوے تو وہاں ایک مشہور شیخ تھے انکے پاس گیا انھوں نے پوچھا کون ہو کہا حضرت میں شیطان ہوں شیخ نے جواب دیا کہ اگر شیطان ہو تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم اس جواب سے سائل کو اپنی مردودیت کا یقین ہو گیا اور اپنے ایک مرید سے کہا کہ میں خودکشی کرتا ہوں اور اگر کچھ کسر رہ جاوے تو تم پورا کر دینا چنانچہ حجرہ میں جا کر اس نے گردن کاٹ لی اور مرید نے اندر جا کر دیکھا تو کچھ کھال الجھی ہوئی رہ گئی تھی اس نے اسکو بھی الگ کر دیا۔ وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ لوگ آگئے اور مرید کو گرفتار کر لیا گیا اس نے کہا مجھے گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں جب میرا شیخ خودکشی کر کے مر گیا تو مجھے ہی جینے کی کیا تمنا ہے تم شوق سے مجھے قتل کر دو پھر واقعہ کی تحقیق کیگئی تو مرید کی براءت ثابت ہوئی اسے رہا کر دیا گیا یہ واقعہ ایک طالب علم نے جو میرے ہم سبق تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے بیان کیا مولانا نے فرمایا افسوس ہم تو اس شیخ کو ابتک کامل سمجھے ہوئے تھے مگر معلوم ہوا کچھ بھی نہیں یونہی

شہرت ہی شہرت ہے اسکو اتنی بھی خبر نہوئی کہ سائل پر کیا حالت ہے اور اس کا علاج کیونکر کرنا چاہیئے اور اگر اس نے اپنے کو شیطان کہا تھا تو انکو جواب میں یوں کہنا تھا کہ پھر کیا مضائقہ ہے شیطان بھی تو اُسی کا ہے نسبت و تعلق تو اب بھی منقطع نہیں ہوا اس جواب سے فوراً قبض کھل جاتا۔ مگر ظالم نے لاحول پڑھکر بیچارہ کو مایوس کردیا دیکھا آپنے وجدی ایسے ہوتے ہیں جو طالب کو کسی حال میں مایوس نہیں کرتے بلکہ اُسکے شریک غم ہو جاتے ہیں اور اُسکے غم کو بٹا کر کچھ اپنے اوپر بھی لے لیتے ہیں یعنی اسکی حالت پر غصہ نہیں کرتے بلکہ اس کی حالت پر غمگین ہو کر ورطہ سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں پھر جب انکی شرکت سے دو دل ایک ہو گئے اب شیطان کا قابو کہاں چل سکتا ہے اب تو یہ پہاڑ کو بھی توڑ دیں گے دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ ہمارے حاجی صاحب رات کو تہجد میں اکثر سورہ یٰسٓ پڑھا کرتے تھے اور اسکی حکمت میں یہ شعر پڑھتے تھے کہ جب دو دل ملجائیں تو یہ پہاڑ کو بھی توڑ دیتے ہیں اور یہاں تین دل ایک ہو جاتے ہیں اس طرح سے کہ ایک مصلی کا دل دوسرا قلب اللیل تیسرا قلب القرآن یعنی یٰسٓ جسکو حدیث میں قلب القرآن فرمایا ہے تو تین دل مجتمع ہو کر شیطان کو کیسے نہ بھگاویں گے خوب لطیفہ ہے غرض اس مولوی نے تجدیت سے کام لیا وجدی نہتا اسلئے طالب کو مایوس کردیا پھر وہ ایک دوسرے عالم کے پاس گیا وہ یا تو محقق تھے یا پہلے واقعہ کو سنکر انپر خوف طاری ہو گیا تھا اُن سے مسئلہ پوچھا تو جواب دیا کہ توبہ تو ہر مسلمان کیلئے ہے خواہ کیسا ہی گنہگار ہو تمھاری توبہ کیوں نہ قبول ہوگی ضرور قبول ہوگی مگر تکمیل توبہ کیلئے ایک شرط ہے وہ یہ کہ جس بستی میں تم رہتے ہو اسکو چھوڑ دو یہاں کی صحبت اچھی نہیں تم فلاں بستی میں جا کر رہو وہاں کے آدمی اچھے ہیں یہ شرط لگانا بتلاتا ہے کہ یہ عالم محض خائف ہی نہتا بلکہ محقق بھتا یہ جواب سنکر سائل نے توبہ کی اور چونکہ طلب کی شان پیدا ہو چکی تھی اسلئے تکمیل توبہ کیلئے وطن سے ہجرت بھی کی اور اس بستی کیطرف چلا جہاں کیلئے عالم نے وصیت کی تھی کچھ ہی دور چلا تھا کہ موت کا وقت آگیا ۵

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

مگر اس نے اپنے کرنیکا کام اسوقت بھی کیا کہ عین نزع کی حالت میں بھی اُس بستی کیطرف

اس نے اپنا سینہ اوبھار دیا اور کام تمام ہوگیا اب رحمت حق کا کام دیکھئے چونکہ طالب اپنا کام کرچکا تھا اور وصول اسکے اختیار سے باہر تھا تو اب محبوب نے وصول کا خود انتظام کردیا جس بستی سے اس نے چلنا شروع کیا تھا اسکو حکم ہوا تباعدی کہ تو دور ہوجا پیچھے ہٹ جا اور جس بستی کی طرف یہ جارہا تھا اسے حکم ہوا تقاربی کہ تو قریب ہوجا چنانچہ ایسا ہی ہوگیا اب ملائکہ رحمت و ملائکہ عذاب دونوں آپہونچے اور ہر جماعت نے اسپر قبضہ کرنا چاہا ملائکہ رحمت نے کہا کہ اسکے مستحق ہم ہیں کیونکہ یہ توبہ کرکے اور گناہوں سے پاک ہوکے مرا ہے ملائکہ عذاب نے کہا کہ نہیں یہ مستحق عذاب ہے کیونکہ تکمیل توبہ کی شرط متحقق نہیں ہوئی ابھی صلحار کی بستی میں بھی نہیں پہونچا تو توبہ کامل نہیں ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ بھی بعض دفعہ اجتہاد کرتے ہیں ہر کام صریح نص ہی سے نہیں کرتے جب انمیں باہم اختلاف ہوا تو حق تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ نے آکر یہ فیصلہ کیا کہ زمین کو ناپ لو جونسی بستی قریب ہو اسی کے موافق حکم ہوگا اگر قریۂ اشرار سے قریب ہو تو اشرار میں داخل کردو اور قریۂ ابرار سے قریب ہو تو ابرار میں داخل کردو چنانچہ پیمایش کرنے سے ایک ہاتھ قریۂ ابرار سے قریب نکلا پس ملائکہ رحمت کے سپرد ہوا تو جسطرح یہاں حسًّا مبدا کو بعید اور منتہا کو قریب کیا گیا اسی طرح اللہ تعالےٰ ہر سالک کیلئے معنیً مبدا کو بعید اور منتہا کو قریب کردیتے ہیں۔ اب بتلایئے یہ راستہ کتنا آسان ہوگیا کہ حق تعالیٰ بندہ کو جذب بھی فرماتے ہیں اور جب تک سلوک رہتا ہے اُسوقت بھی یہ سہولت کرتے ہیں کہ مبدا کو بعید ہونے کا اور منتہا کو قریب ہونیکا حکم دیتے ہیں پس اب اس سفر کے طویل ہونیسے گھبرانا نہ چاہیئے۔ خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ آپ ہر وقت سفر میں ہیں تو آپ کو مسافر کی طرح فکرمند اور بیچین رہنا چاہیئے۔ بیفکر نہوں برابر عمل میں لگے رہیئے اور اپنی طرف سے راستہ قطع کرنے کی برابر ہمت کیجئے پھر اللہ تعالیٰ کی عنایات و اعانات کا لطف دیکھئے کہ وہ کیونکر طویل مسافت کو قصیر اور دشوار گذار طریق کو پھولوں ہلکا بنا دیتے ہیں اگر کبھی سستی ہوجائے تو پھر از سر نو تجدید فکر کیجئے اگر گناہ ہوجائے فوراً توبہ کرلیجئے اس سے پھر بندہ رستہ ہی پر آجاتا ہے۔ اب آیت کا ترجمہ کرکے میں بیان ختم ہی کرنیوالا ہوں اور سچ یہ ہے کہ ختم اسواسطے بھی کررہا ہوں کہ اب مضامین ہی ذہن میں نہیں ہیں ترجمہ یہ ہے

۴۲

حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان هذه تذکرة کہ یہ قرآن اور یہ شریعت یاد داشت ہے اس لفظ
میں بھی ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ لغت میں تذکرہ اُس شئی کو کہتے ہیں جو شے معلوم کی یاد دہانی
کرے تو اسمیں اسطرف اشارہ ہے کہ یہ سفر ایسا ہے جو تمکو پہلے سے معلوم ہے مگر بھول گئے
ہو تو یہ قرآن اسکی یاد دہانی کرتا ہے باقی یہ کہ اس راستہ کے معلوم ہونے کی کیا دلیل
سو اسکو مولانا بیان فرماتے ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند	وز جدائیہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند	از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق	تا بگویم شرح درد اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش	باز جوید روزگار وصل خویش

صاحب ذرا تنہائی میں بیٹھکر اپنے دل سے اپنے ضمیر سے اپنی روح سے باتیں کیجئے
وہ اس کا جواب دیگی کہ آپ کس سفر کو بھولے ہوئے ہیں اس سے آپکو مشاہدہ ہوجاویگا ادہر قرآن
بتلا رہا ہے بیشک یہ آپکو بھولا ہوا سفر یاد دلا رہا ہے اور بتلا رہا ہے کہ تمھارا اصلی وطن
یہ نہیں جہاں اب ہو بلکہ اور ہے جسکی طرف جا رہے ہو۔ اے ہے صاحبو! اپنے وطن کو جا رہے
ہو اور اتنی سُست رفتار کہ بیٹھ بیٹھ کر چل رہے ہو اصل مکان کی طرف تو جانور بھی تیزی سے
چلا کرتے ہیں بیلوں کو دیکھئے کہ وطن کی طرف کس شوق سے قدم اٹھا کر چلتے ہیں حیرت ہے
کہ آپ انسان ہو کر بھی اپنے اصلی وطن کی طرف تیزی کیساتھ قدم نہیں اٹھاتے صاحبو!
سُستی نکرو تیزی کیساتھ چلو تمھارا اصلی وطن اصلی مستقر آگے ہے تم دنیا میں کہاں پھنسے
رہ گئے اس کیساتھ کیوں دل لگا لیا اسکے بعد ارشاد ہے وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ
اسمیں اسکی تعلیم ہے کہ اگر کسی کو اپنے فہم یا عمل پر ناز ہو اور یوں سمجھنے لگے کہ میں نے راستہ
کو بہت جلد طے کیا اور مجھے اسکی معرفت کامل ہے اور میری سیر دوسروں سے کامل ہے
تو وہ اس مضمون سے اپنے ناز کا علاج کرے کہ تمھاری مشیت حق تعالیٰ کی مشیت کے
تابع ہے اُن کے چاہنے سے کام بنا ہے اگر وہ نہ چاہتے تو کچھ بھی نہوتا اسپر اگر یہ سوال ہو
کہ پھر اسکی کیا وجہ کہ حق تعالیٰ نے کسی کیلئے تو وصول چاہا اور کسی کیلئے نہیں چاہا ہمکو

۳۲

ہی وصل کر دیتے تو اچھا تھا اس کا جواب آگے ہے ان اللہ کان علیما حکیما کہ سب کے وصل نہ بنانے میں بھی حکمتیں ہیں اور کسی کے ساتھ تعلق بشیت ہونا کسی کے ساتھ نہ ہونا حکمت کا مقتضی ہے تم اسمیں دخل ندو اللہ تعالیٰ خود سب باتوں کو جانتے ہیں اور جو کام کرتے ہیں حکمت سے کرتے ہیں۔ ایکدفعہ میرے دل میں یہ خطرہ آیا تھا کہ تھانہ بھون کے شاہ ولایت صاحب کے مزار پر جو خرافات ہوتی ہیں اگر یہ نہوتیں تو اچھا تھا چونکہ اس خطرہ میں تقدیر سے منازعت تھی اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی یوں کہرہا ہے ؎

درکارخانۂ عشق از کفر ناگزیر ست | آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

فوراً میرا خطرہ رفع ہو گیا اور عالم میں خیر وشر وایمان وکفر سبکا مطابق حکمت ہونا منکشف ہو گیا محققین نے اس حکمت کو اس سے زیادہ واضح بیان فرمایا ہے کہ صفات الٰہیہ جمیل ہیں اور جمال مقتضی ظہور کو ہے بس اسماء بھی مقتضی ہونگے ظہور کو اور اسماء کی دو قسمیں ہیں جمالیہ جلالیہ پس بعض کائنات مظہر ہیں جمال کے بعض جلال کے اسلئے عالم میں خیر وشر کا ہونا ضروری ہے لیکن اقتضاء سے مراد معنی لغوی نہیں ہے تاکہ اضطرار کا شبہ کیا جائے بلکہ اصطلاحی معنی مراد ہیں وہ اپنی اصطلاح میں مطلق ترتب کو بھی اقتضاء سے تعبیر کر دیتے ہیں گو ترتب درجہ لزوم ووجوب میں نہو اسی لئے تو ان کتب کے مطالعہ کی ہر شخص کو اجازت نہیں دیجاتی کہ لوگ ان اصطلاحات ورموز سے ناواقف ہیں بس اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے حق تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق دیں اور ہم سبکو اپنے راستہ میں سہولت وجذب عطا فرمائیں آمین والحمد للہ رب العلمین وصلے اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

اشرف علی

۵ رجمادی الاخریٰ سنہ ۵۰ھ